سفر تمام ہوا

راحت جبیں



پیش لفظ

میرے نزدیک اچھی کہانی بچپن کی پکی اور گوڑھی سہیلی جیسی ہوتی ہے..... جسے جتنی بار ملیں..... وہ اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے...... کچھ کہتی، سنتی، رازداری برتتی...... دُکھ سُکھ بانٹتی...... یہ کہانیاں نئی ہیں، نہ ان کے کردار...... رنگ، خوشبو، پھول، تتلیاں، آسماں، بادل...... برستا ساون...... ان سب کے سحر سے آزاد ہوئے تو احساس ہوا..... یہ سب اس زندگی کا حصہ ہیں..... زندگی نہیں..... تھوڑا وقت سر کا...... تو پتہ چلا، زندگی کی ندی اتنی بھی رواں دواں نہیں...... کہیں جنگلی گھاس ان پانیوں کی روانی مدھم کردیتی ہے...... تو کہیں ہوا کے تھپیڑے ان میں تلاطم پیدا کردیتے ہیں..... کبھی بھاری پتھر ان کا راستہ روک لیتے ہیں۔ مگر یہ پانی علامت ہیں...... ہمت، کوشش اور جہدِ مسلسل کی...... یہ بھاری پتھر سرکا نہ سکیں...... تب بھی اپنا رستہ نکال ہی لیتے ہیں۔

زندگی جب حقیقت شناس ہوتی ہے تو ایسے ہی کردار تخلیق ہوتے ہیں...... وہ گُلِ صنوبر ہو یا سفر تمام ہوا کی رجا، یا پھر راستے محبت کے کا کہانی کار...... او بے پروا سجن کی شوخ ہیروئن...... کونپلوں سے پھول بننے تک کی تین بہنیں...... میں یہ نہیں کہتی کہ میں نے جو کچھ لکھا، وہ بہت اعلیٰ پائے کا ہے...... ہاں میں نے جو بھی لکھا، دل سے لکھا ہے...... یہ سارے کردار میرے دل میں بستے ہیں...... اور اُمید ہے کہ یہ آپ سے بھی پورے خلوص سے گلے ملتے ہوں گے۔

یہ کہانیاں آپ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ میں پڑھ چکے ہیں۔ اب ان سے کتابی شکل میں لطف اندوز ہوں۔

میں شکرگزار ہوں، القریش پبلی کیشنز کی...... جو اسے کتابی شکل میں لائے اور خصوصاً رامس تنویر احمد کی...... جس نے اس کتاب کو لانے میں خصوصی دلچسپی دکھائی۔ خدا انہیں دین و دنیا میں کامیابی عطا فرمائے۔

سبز موسم ہمیشہ آپ کا مقدر رہوں۔

دُعاگو

راحت جبیں

ترتیب

سفر تمام ہوا

ٹیکسی براؤن لکڑی کے بوسیدہ سے دروازے کے سامنے جا رکی تھی۔ اس میں سے کود کر دو بچے باہر نکلے۔ ''آٹھ سالہ لڑکی اور پانچ سالہ لڑکا'' دونوں خوب صحت مند گپلو اور خوبصورت بچے تھے...... گورے اور گلابی گلابی سے۔ ان کی اٹھان بتاتی تھی کہ وہ آزاد فضاؤں اور صحت مند ماحول کے پُروردہ ہیں۔ لڑکی نے وائٹ ٹائٹس کے ساتھ سرخ شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بال بار بار ماتھے پر بکھر رہے تھے' جنہیں وہ بار بار دائیں ہاتھ سے اک معصومانہ ادا کے ساتھ ہٹاتی تھی۔ اس کی متلاشی و متجس نگاہیں اس براؤن دروازے سے ٹکراتیں تو ان میں اشتیاق سا اُمڈ آتا۔ سیاہ ٹراؤزر شرٹ جس پر ٹویٹی بنے تھے میں ملبوس اس پانچ سالہ بچے کی بڑی بڑی آنکھوں میں نیند اور تھکن بھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا، وہ ابھی ابھی سوکر اٹھا ہے۔ وہ بار بار جمائی لیتا پھر یاد آنے پر منہ پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔

پھر ٹیکسی میں سے ایک مرد اور عورت باہر نکلے۔ سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس مرد نے والٹ کھول کر کرایہ دیا۔

''خیر ہو داتا کی......!'' ٹیکسی ڈرائیور نے نعرہ لگایا اور ٹیکسی زن سے آگے بڑھ گئی۔

مرد نے پلٹ کر گھر کی سمت دیکھا۔ وقت سیلن بن کر اس گھر کے در و دیوار کے سارے رنگ چاٹ گیا تھا۔ سیلن زدہ روغن جھڑی دیواریں۔ اوپر سبز چوبارے کے پاس کونے سے اک شاخ پھوٹ آئی تھی۔ جس کے پتے ہوا میں ہلکورے لیتے تھے۔ چوبارے کے پیچ دار ڈیزائن میں کئی سوراخ تھے اور سب کے سب آباد۔ کہیں چڑیوں کا گھونسلا، کہیں چمگادڑ کا ٹھکانا، کہیں گلہری اپنے بچوں کے ساتھ مقیم اور کہیں صرف باہر کو لٹکتا بکھرتا ہوا خالی گھونسلہ۔

مناسب قد و قامت کی کامنی سی عورت اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ جدید تراش

خراش کے قیمتی سوٹ، نفیس جیولری، خوبصورت و نازک سی رسٹ واچ کلائی پر، دوسری کلائی میں بے حد نازک ونفیس کام والا سونے کا بریسلیٹ، وہ بے حد نکھری اور اجلی اجلی سی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی جلد بے حد شفاف وچمک دار تھی۔ لپ اسٹک نے اس کے خوبصورت ہونٹوں کے خم کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔ سیاہ ریشمی بال بالکل سیدھے کندھے پر جھول رہے تھے۔

اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مرد نے پلٹ کر دیکھا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں اتنے تاثرات گڈمڈ ہو رہے تھے کہ وہ نظریں چرا گئی۔

Papa is it our grand mother's house?

(پاپا! یہ ہماری دادی کا گھر ہے)

اس کی بیٹی نے اپنی اشتیاق بھری آواز میں سوال کیا۔ اس نے اک طویل سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور قصداً مسکرایا۔ پھر بیٹی کو ایک بازو کے حلقے میں لے کر خود سے لپٹا لیا۔

بچے کو باپ کا یہ التفات ذرا نہیں بھایا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ پاپا، شانزے سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ممی البتہ اس کی تھیں۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے ماں کے پاس گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر کھینچنے لگا۔

"تم لوگ اندر چلو! میں آتا ہوں۔"

دروازے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن میں قدم رکھنے سے قبل ہی اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا عورت نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر دونوں بچوں کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔

وہ پلٹا اور بغلی تنگ سی گلی جس میں جابجا کوڑے کے ڈھیر، گندگی اور آوارہ اونگھتے ہوئے کتے تھے۔ اک بوڑھا فقیر وہیں بیٹھا اپنی دن بھر کی ریزگاری گن رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر مٹھی دبائی اور صدا لگانے لگا۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ والٹ نکال کر اک نوٹ کھینچا اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

بوڑھے فقیر کی آنکھیں ابل آئیں۔ اس نے حیرت سے سو کے نوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے کوئی نو دولتیا سمجھ کر دعائیں دینے لگا اور دینے والے کو خبر بھی نہ تھی کہ وہ کون سا نوٹ دے کر آیا ہے۔ وہ اسی طرح چلتے ہوئے عقب میں نکل آیا تھا۔ پھر وہ گھر کے پچھواڑے رک گیا۔ وہاں کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہی خالی پلاٹ۔ خودرو پودوں اور گلی سڑی گھاس سے بھرا

ہوا اور اس سے آگے گوبھی کے کھیتوں کا سلسلہ۔ وہی پچھلی دیوار کے ساتھ دور تک پھیلا ہوا آم کا قدیم بوڑھا درخت، جس پر طوطے ٹیں ٹیں کرتے اور کچے پکے آموں کو کتر کتر کر نیچے پھینکتے جاتے تھے۔ جسکی گھنی شاخوں میں چڑیاں بسیرے کرتی تھیں۔ پھر اس کی نظریں درخت کی جڑ کے پاس خشک پتوں ٹوٹی ٹہنیوں اور مردہ تتلیوں کے پروں سے ڈھکی قبر پر جا رکیں۔ وہ اپنے جم جانے والے قدموں کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک آیا اور قریب جا کر اپنے لباس کی پروا کئے بغیر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

خشک پتے چرچرائے۔

شاخوں میں اونگھتی ہوا ہڑبڑا کر جاگی اور شائیں شائیں کرنے لگی۔

چڑیاں ایک دم چہچہائیں اور پھر سے اڑنے لگیں۔ طوطوں کی ٹیں...... ٹیں نے اس خوابیدہ منظر کو جگا کر رکھ دیا تھا۔

اک گلہری درخت سے کودی۔ کچھ حیرت سے اسے دیکھا پھر تیزی سے جڑ کے پاس غائب ہو گئی۔

پھر اس نے قبر پر منڈلاتی سفید تتلی کو دیکھا۔

وہاں پھول نہیں تھے، مگر تتلی اپنے برف جیسے پروں کے ساتھ منڈلا رہی تھی۔ اس نے فاتحہ پڑھی۔ پھر دونوں ہاتھ قبر پر رکھ دیئے۔

"میں آ گیا ہوں......" اس کی ہلکی سی سرگوشی پر وہ تتلی اس کے گال کو چھوتی غائب ہو گئی۔ اس نے خفیف سا لمس محسوس کیا تو لگا کسی نے عقب سے دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال کر اپنا گال اس کے گال سے مس کیا ہو۔

اس کے ہاتھوں میں لرزش سی اتر آئی۔ آنکھوں میں تحریک سی ہوئی اور سارے جذبے برسنے لگے۔ خشک پتوں میں لپٹی قبر کو بارش کی ضرورت تھی۔

"پاپا! پاپا!" اس کی بیٹی چھت پر سے پکار رہی تھی۔

وہ سر اٹھا کر سبز شاخوں کی اوٹ میں اس کا چہرہ ڈھونڈنے لگا اور ٹھٹک گیا۔

وہ شانزے تھی۔

نہیں رجا تھی۔

شانزے۔ رجا۔

آنسوؤں کی دھند میں وہ شناخت نہ کر پا رہا تھا۔ مگر چیخ اٹھا۔

"ہٹ جاؤ۔ پیچھے ہو جاؤ۔ میں نے کہا نا یہاں نہیں آنا ہے۔" بچی باپ کے یوں چیخ

اٹھنے پر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اس نے بازو میں چہرہ چھپا لیا۔

ہوا کی سرگوشیاں۔

طوطوں کا شور۔

چڑیوں کی چہچہاہٹیں۔

مگر وہ سفید تتلی...... سفید تتلی وہاں نہیں تھی۔

گلہری جڑ کے پاس سے چہرہ نکالے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

* * *

آدھا صحن دھوپ بھرا اور آدھے پر دیوار کا سایہ پھیل گیا تھا۔ پورے صحن میں دھوپ چھاؤں کے ساتھ خاموشی کا راج تھا۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صحن میں چھائی خاموشی کے سینے پر اس کی سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ نے دراڑیں سی ڈال دیں۔ سائیکل چھاؤں میں کھڑی کر کے وہ سیڑھیوں کے پاس ہلکے نیلے رنگ کے واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔ جس کے اوپر لگے آئینے میں اک لمبی خراش آ گئی تھی۔ جو ہر دیکھنے والے کے چہرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیتی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کر گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ کچن کی طرف آ گیا۔ قدسیہ کے گندمی سخت ہاتھ سرعت کے ساتھ روٹیاں بنا رہے تھے۔ ان کی کلائی میں پھنسی دو پتلی سی سونے کی چوڑیوں میں کوئی آواز نہ تھی۔ ان کے چہرے کے خدوخال میں جفاکشی اور محنت جھلکتی تھی۔ یہی جفاکشی اور محنت ان کے اس بیٹے کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت بن کر ظاہر ہوتی تھی۔

''السلام علیکم امی!''

وہ بعجلت پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ گیا...... تازہ روٹی کی سوندھی سوندھی مہک اس کی بھوک بڑھا رہی تھی۔

''وعلیکم السلام...... بہت بھوک لگ رہی ہے؟'' اپنی کسی سوچ سے ہاتھ چھڑا کر وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''بہت...... بس جلدی سے سالن نکال دیں۔ مجھے ٹیوشن پڑھانے جانا ہے۔'' وہ خود ہی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اک ڈھلی ہوئی پیالی اٹھا کر ٹینڈوں کا سالن نکال لیا۔ ماں نے اچار نکال دیا۔ اک کھیرا کاٹ دیا۔ تازہ روٹی سامنے رکھی۔

وہ پہلا نوالہ منہ تک لے گیا۔ پھر ہاتھ روک کر پوچھنے لگا۔

''رجا کہاں ہے؟''

ایسا کب ہوا تھا کہ وہ گھر میں داخل ہوا اور رجا اس کی آہٹ سن کر دوڑی چلی نہ آئی ہو۔

''روٹھی بیٹھی ہے......''

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں......؟ کیونکہ وہ بات بے بات روٹھ جایا کرتی تھی۔

اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کہاں؟ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ ہمیشہ روٹھ کر ایک ہی جگہ جاتی تھی۔ نوالہ واپس رکھ کر وہ باہر نکلا اور چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ سبز پٹیوں والا سفید چوبارہ دھوپ میں لشک رہا تھا۔ اس کی لشکار آنکھوں میں چبھتی تھی کہ ابھی کچھ دن قبل ہی جمال بھائی نے اس کی قلعی کروائی تھی۔ چھت دھوپ سے تپ رہی تھی۔ ایک طرف چوبارہ تھا اور دوسری طرف ہمسائیوں کی دوسری منزل۔ عقب میں اک خالی پلاٹ تھا۔ یہ پلاٹ چاچا بشارت علی کا تھا۔ اس نے چار دیواری کر کے دروازہ لگوا رکھا تھا۔ یہ خالی پلاٹ خودرو پودوں، جنگلی گھاس، کچھ آک کے پودوں اور جڑی بوٹیوں سے اٹا ہوا تھا۔ عقبی دیوار کے ساتھ وہ آم کا درخت خود بخود اگا اور یوں پھیلا کہ اب اس کی شاخیں اوپر چھت پر پھیلی تھیں۔ ان ہی شاخوں میں مٹی کے آب خورے بندھے تھے اور چھوٹے بڑے خالی پنجرے۔ آب خورے پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ چڑیاں آتی تھیں۔ پانی پیتیں اور شاخوں پر پھدکنے لگتیں۔ پھل کا موسم آتا تو سرخ چونچوں والے طوطے بسیرا کر لیتے۔ برسات میں یہیں کہیں چھپ کر کوئل کوکتی تھی۔ اس وقت بھی یہ درخت کچے پکے آموں سے بھرا ہوا تھا اور اسی درخت کی شاخوں کے ہلکے سے سائے میں منڈھیر کے پاس دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپائے وہ اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ ''رجا!'' سمیع نے پکارا۔ مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ سمیع نے اس کے قریب بیٹھ کر ہلکے سے سر سہلایا۔ اچانک جھنجھوڑنے پر وہ ہمیشہ ڈر کر چیخنے لگتی تھی۔ اس کے بال پسینے میں بھیگے ہوئے اور لان کی قمیض بھی جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

''رجا! سویٹی اٹھو نا!''

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ پھر سمیع کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ اک سولہ سترہ سال کی خوبصورت اور پیاری سی لڑکی تھی۔ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت اور بھولپن، بڑی بڑی ڈارک براؤن آنکھوں پر لمبی خمدار پلکیں، اس کے براؤن بال بالکل لڑکوں کے انداز میں کٹے ہوئے اور ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ سمیع نے انگلیوں سے اس کے الجھے ہوئے بال سنوارے۔ دایاں گال جو فرش پر تھا، سرخ ہو کر دہک رہا تھا، اس پر چپکے ہوئے پتے اور تنکے اتارے۔ ساتھ ساتھ وہ پیار بھری سرزنش بھی کر رہا تھا۔ وہ اپنی نیند بھری سرخ سرخ آنکھوں

کے ساتھ درخت کی ٹہنیوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ اک ہونق پن نمایاں ہو گیا تھا۔ پھر اس کی نظریں اک خالی پنجرے پر جا رکیں۔ اک شدید مایوسی اس کے خدوخال سے چھلکنے لگی تھی۔

سمیع نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ پھر ہلکی سی چپت اس کے گال پر رسید کی۔

"تم نے پھر اُڑا دیا......"

"خود ہی اڑ گیا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر بالکل بچوں کے سے انداز میں کہا۔

"سب جانتا ہوں تمہاری چالاکیاں، گندی بچی۔"

اب وہ اس کے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ چھوٹے سے سپید پاؤں میلے ہو رہے تھے۔

تب ہی چوبارے کے اندر سے طبلے کی آواز آنے لگی۔

سمیع نے بے حد ناراضی سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر رجا کو نیچے لے آیا۔ وہ بنا احتجاج کئے ساتھ آ گئی تھی۔ اور اس گھر میں واحد سمیع تھا جس کی بات وہ اتنے آرام سے ضرور ہی مان لیتی تھی۔ اب سے نہیں شاید تب سے جب سمیع اسے گود میں اٹھا کر قلفی کھلانے لے جاتا تھا۔ جب بچے اسے ٹھوکر مار کر بھاگ جاتے تھے۔ وہ زمین پر ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر روتی۔ تب سمیع ہی اپنا کھیل ادھورا چھوڑ کر لپکتا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر چمکارتا تو وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کر کندھے پر سر رکھ کر سسکتی رہتی۔ پھر اونگھنے لگتی۔ ماں کو کام میں مصروف دیکھ کر وہ اس خوف سے کہ اٹھ کر پھر نہ رونے لگے ساری دوپہر یونہی کندھے سے لگائے تھپکتا رہتا۔

وہ اس کے چھوٹے ماموں کی بیٹی تھی۔ مامی کے مرنے کے بعد ماموں نے اسے اپنی بہن کی گود میں دے دیا۔ پھر چند سال کے بعد دوسری شادی رچا کر کراچی گئے تو پلٹ کر نہ دیکھا۔ بھلا اک دماغی طور پر کمزور اور وہ بھی لڑکی انہیں دلچسپی ہی کیا تھی۔ دوسری بیوی نے انہیں تین صحت مند بیٹے اور دو بیٹیاں دی تھیں۔ قدسیہ نے اس بن ماں کی بچی کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ جسمانی طور پر اس کی نشوونما بالکل عمر کے مطابق تھی۔ مگر دماغی طور پر وہ بہت پیچھے رہ گئی سمیع تو شروع ہی سے سب سے سمجھدار بچہ تھا۔ ہر بات غور سے سنتا۔ کبھی کسی چیز کے لئے تنگ نہ کرتا۔ وہ کام میں مصروف ہوتیں تو اسے رجا کے پاس چھوڑ دیتیں۔ یوں وہ رجا کے لئے لازم و ملزوم ہو گیا تھا۔

"جلدی سے ہاتھ منہ بہت اچھی طرح سے دھو کر آؤ۔"

صابن اس کے ہاتھ میں دے کر اسے واش بیسن کے پاس چھوڑ کر وہ خود کچن میں آ گیا تھا۔ امی روٹیاں پکا کر فارغ ہو چکی تھیں۔ اب اس کے لئے چائے بنا رہی تھیں۔

"آ گئی ہے؟"

"جی......" وہ جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ وہ ایم بی اے کر رہا تھا اور اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اسے بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ کبھی پارٹ ٹائم جاب، کبھی ٹیوشنز۔ باپ سر پر نہ تھا کہ بے فکری سے پڑھائی کی طرف توجہ دیتا۔ بھائی کبھی دیتا بھی تھا تو ہزار احسان جتا کر۔

"تمہاری شرٹ پرانی ہو رہی ہے......" انہوں نے بیٹے کی مسکی ہوئی شرٹ دیکھی۔

"ابھی تو فیس کے پیسے پورے کرنے ہیں، بعد میں لے لوں گا۔" سمیع نے بے نیازی سے کہا۔ ان کی نگاہ اپنے ہاتھ کی چوڑیوں پر پڑی۔ ان میں سے چار چوڑیاں یونہی ایک ایک کر کے بکی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا لائق فائق بیٹا محض پیسے کی وجہ سے رہ جائے۔ سمیع نے بھی زیادہ جذباتی ہونا مناسب نہ سمجھا۔ ایک بار وہ ایم بی اے کر کے اچھی جاب ڈھونڈ لیتا تو ماں کی چوڑیاں بھی بنوا ہی دیتا۔

"پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں، پورے ہو جائیں گے۔ اس بار بھائی نے وعدہ کیا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

پھر چائے پی کر باہر نکلا تو وہ ابھی تک بیسن کے سامنے کھڑی ہاتھ دھوئے جا رہی تھی۔ بلکہ صابن کا جھاگ بنا بنا کر کھیل رہی تھی۔ پانی چہرے سے پھسل پھسل کر گریبان بھگو رہا تھا۔ صابن کی ٹکیہ گھل گھل کر آدھی رہ گئی تھی۔

"رجا! اب بس کرو۔ اندر جا کر کھانا کھاؤ۔" اس نے جھنجھلا کر کہا

رجا نے صابن چھوڑا نل بند کیا۔ پھر اسے سائیکل نکالتے دیکھ کر لپک کر پاس آئی اور ہینڈل پکڑ لیا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"طوطا لاؤ گے؟" اس کے بھیگے ہوئے بال گول چہرے کے اطراف میں چپکے ہوئے تھے۔

"ہاں اب بال بناؤ اور کھانا کھا لو......" سمیع نے نرمی سے کہا۔ تو وہ ہنستے ہوئے کچن

میں بھاگ گئی۔

* * *

رات کو وہ خاصی دیر سے آیا تھا۔ دروازہ کھولنے والی نے کھٹاک سے دروازہ کھولا اور بغیر کچھ کہے جا کر صحن کے درمیان میں کھڑی ہو گئی۔ بظاہر وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ سمیع نے سائیکل کھڑی کی، پاس ہی جمال کی موٹر سائیکل کھڑی تھی پھر پلٹ کر چاندنی میں نہائے مجسمے کو دیکھا۔ طلوع ہوتے ہوئے چاند کی چاندنی، ریشمی تھان کی طرح کائنات پر کھلتی جا رہی تھی۔

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

وہ اندر جاتے جاتے رکا۔

"تمہارے لئے نہیں جاگ رہی۔" چاندنی میں ڈوبا مجسمہ تڑخ کر بولا۔

"میں نے کب کہا۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔ مجسمے کے خدوخال بہت واضح نہ تھے۔ مگر جسم سانچے میں ڈھلا تھا۔ کمر سے ذرا اوپر بالوں کی موٹی سی چوٹی سینے پر پڑی تھی۔ وہ اس وقت اپنی ازلی بے نیازی کے ساتھ چوٹی کے بل گن رہی تھی۔

"کھانا کھاؤ جا کر......"

"گرم کر کے نہ دو گی؟" وہ کچن کے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ آواز میں ہلکی سی اپنائیت تھی اور یہ اپنائیت اس کے لئے سمیع کے لہجے میں بہت کم چھلکتی تھی۔ تب ہی اوپر سے کھٹ پٹ ہوئی۔ پھر کسی نے اپنی لرزتی، ڈوبتی آواز میں دریافت کیا۔

"کیا ہوا، کون ہے؟" اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا پھر تنک کر بولی۔

"کون ہو سکتا ہے ابا جی! میں ہوں، سو جائیں آپ۔"

جواباً کچھ بڑبڑاہٹ ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ تب وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے لئے کھانا گرم کرنے کی۔ بڑی امی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی دوا لے کر سوئی ہیں۔ میں جاگ رہی تھی سوچا دروازہ کھول دیتی ہوں۔"

شاید وہ اسی لہجے میں ہر کسی سے بات کرتی تھی۔

اوپر سے ہلکی ہلکی طبلے کی آواز آنے لگی تھی۔ سمیع نے اپنے اندر ناگواری سی محسوس کی۔

"یہ تمہارے ابا جی کو آدھی رات کو بھی نیند نہیں آتی۔"

"تمہارے بھی کچھ ہوتے ہیں۔"

"ہاں، چاچا جی۔"

"کھانا کھا لو۔" وہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ "بچوں کو پڑھا پڑھا کر مزاجاً بھی استانی بنتی جا رہی ہے۔"

وہ سر جھٹک کر کچن میں آ گیا۔ سنک پر ہاتھ دھوئے پھر آہستہ آہستہ برتن نکالنے لگا۔ امی اور رجا شاید سو گئی تھیں اور اچھا ہی ہوا۔ وہ رجا کے لئے طوطا نہیں لا سکا تھا۔ ابھی اس نے پتیلی کا ڈھکن ہی اٹھایا تھا جب آہٹ ہوئی۔

"تم پھر آ گئی ہو۔"

"سوچا...... نیند تو آ نہیں رہی...... یہ احسان بھی کر ہی دوں...... اب کیا ٹھنڈا کھانا زہر مار کرو گے۔"

روشنی میں لڑکی کے خدوخال مکمل واضح ہوئے تھے۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ بس قبول صورت تھی۔ اچھا پہن اوڑھ لیتی تو خوبصورت لگتی۔ بری اب بھی نہ لگتی تھی کامنی سی تھی۔ البتہ اس کے ہونٹ بہت خوبصورت تھے۔ نرم، رسیلے، گلابی رنگ چھلکاتا اوپر کے ہونٹ کا کٹاؤ اتنا پیارا اور واضح تھا کہ اس میں کسی کی نگاہ بھی پھنس سکتی تھی۔ مگر سامنے کھڑے شخص کو اس کی شخصیت یا وجود کی کسی بھی خوبی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے صرف گرم گرم کھانے کی طلب تھی اور نگاہ ان صاف ستھرے ہاتھوں پر تھی جو سرعت سے کھانا گرم کر رہے تھے۔ گرم گرم سالن اس کے سامنے آیا۔ تب اس نے ہاتھوں سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو انوشہ......"

تب انوشہ کے بھیگے لبوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ لیکن یہ مسکراہٹ سمیع کے اگلے جملے پر معدوم ہو گئی۔

"اب تم جاؤ انوشہ! رات بہت ہو گئی ہے۔"

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ ساری احتیاط اسی کے حصے میں کیوں آتی ہے۔ مگر بنا کچھ کہے سرعت سے پلٹ گئی۔

* * *

اسے طوطے اور چڑیاں اچھے لگتے تھے۔ وہ گھنٹوں انہیں بیٹھ کر تکتی رہتی چڑیاں شاخ پر بیٹھ کر جھولتیں۔ یا ایک سے دوسری پر پھدکتیں تو اس کی آنکھوں میں چمک، جوش اور اشتیاق بڑھتا چلا جاتا۔ بلکہ سمیع کو تو لگتا تھا یہ درخت یہاں پر اگا ہی اسی لئے تھا کہ وہ اور اس کے مکین معصوم اور اللہ لوک رجا کا دل بہلا سکیں۔ تتلیاں اگر یہاں آتی تھیں تو وہ تتلیاں نہیں تھیں بلکہ نیک روحیں تھیں جو اس سے ملنے آتی تھیں۔ وہ کیا سوچتی ہے؟ اس کے جذبات واحساسات

کیا ہیں۔ یہ جاننے کی نہ کسی کو ضرورت تھی اور نہ وقت۔

وہ بچوں کی طرح روٹھتی تھی، بچوں کی طرح مان جاتی تھی۔ سمیع نے کس وقت وجتن سے اسے پہلی کتاب ختم کروائی تھی۔ پھر اپنی اسٹڈیز شروع ہوئی تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چپ لگتی تو ہفتوں بات نہیں کرتی تھی۔ بس ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھا کرتی۔ بولنے پر آتی تو سوال در سوال کر کے سامنے والے کو زچ کر دیتی۔ کبھی سب کے سامنے ایسی بات کر جاتی کہ سننے والوں پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔ جیسے جیسے اس نے جسمانی طور پر بلوغت کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ قدسیہ کے لئے اسے سنبھال رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔

جمال چڑ کر کہہ دیتا۔

"اسے اس کے باپ کے پاس بھیجو۔ وہ سنبھالے اپنی پاگل لڑکی کو۔"

جمال کے پاگل کہنے پر جہاں رجا چیختی تھی۔ وہیں سمیع کی بھی اس کے ساتھ کئی بار لڑائی ہوئی تھی۔ رجا نے جب سے محلے میں گلیوں میں پھرتے اور بچوں سے پتھر کھاتے پاگل کو دیکھا تھا وہ اس لفظ سے ڈرتی بھی تھی اور چڑتی بھی۔ قدسیہ اسے کلیجے سے لگا لیتیں۔

"میں تو کبھی اسے سوتیلی ماں کے پاس نہ بھیجوں اور تمہارا لیتی کیا ہے...... یہ تو معصوم فرشتہ ہے۔ گناہوں سے پاک...... اللہ لوک۔"

وہ چپکے چپکے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی تھی۔ قدسیہ نے بھری دوپہر میں اسے اوپر جانے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ ان کی آنکھ لگ گئی۔ تب اس نے کچن سے مٹھی بھر چاول لئے اور اوپر چلی آئی۔ نئے طوطے کا پنجرہ وہیں اک شاخ کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا اور چاول اندر ڈالنے کی کوشش کی۔ پھر فوراً دروازہ بند نہ کر سکی تھی۔ اسیر پرندے نے موقعہ تاک کر اڑان بھری اور درخت کی شاخوں میں غائب ہو گیا۔ اس نے غصے سے پنجرے کو دیوار سے پرے دے مارا۔ وہ درخت کے تنے سے ٹکرایا اور نیچے جا گرا۔ وہ غصے میں طوطے کو مٹھیاں بھینچ بھینچ کر گالیاں دیتی رہی۔ گردن گھما گھما کر شاخوں میں ڈھونڈتی رہی۔ پھر منڈیر سے ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گئی۔ کچھ نظر نہ آیا تو ذرا سی کوشش سے وہاں سے اتر کر درخت کے تنے پر جا بیٹھی۔

تب ہی زیر لب جمال کچھ گنگناتا ہوا اوپر آیا۔ عمر کوئی تیس بتیس سال، لمبے قد کا چاق و چوبند شخص تھا۔ بال ہلکے سے گھنگھریالے، کھلتی ہوئی گندمی رنگت چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی مونچھیں، جو اس کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کثرت سگریٹ نوشی سے ہونٹوں کے کنارے سیاہ پڑے ہوئے۔ اس کے اور سمیع کے درمیان شباہت تو موجود تھی۔ مگر جمال کے

چہرے پر کوئی ایک چیز تھی جو اسے پسندیدہ ہونے سے روک دیتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے سامنے لوگ ان کے قہقہوں کا ساتھ اور پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ جو نہ جرم کر سکتے تھے نہ گناہ، مگر کچھ کرنے کی خواہش دل میں چٹکیاں لیتی اور دوسروں کو کرتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ریلوے میں ملازم تھا۔ گرمیوں میں زیادہ تر سفید پائجامہ اور سفید کڑھائی والے کرتے زیب تن کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس لباس میں وہ جاذب نظر لگتا ہے۔

کمرے سے مسلسل کھانسنے اور طلبہ بجانے کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ اندر جاتے ٹھٹک کر رکا۔ پھر ذرا سا پیچھے ہو کر دیکھا تو ڈپٹ کر بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

رجا نے بے نیازی سے اسے دیکھا اور دوبارہ اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئی۔

"پاگل...... اترو یہاں سے، گر کر ٹانگ تڑواؤ گی۔"

رجا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ پھر غصے میں ہاتھ میں پکڑا آم کھینچ کر اسے دے مارا۔ پھر پتے توڑ توڑ کر پھینکنے لگی۔

جمال اس سے قبل کہ کچھ کہتا۔ سیڑھیوں سے سمیع نمودار ہوا۔ رجا کو یوں درخت پر بیٹھا دیکھا تو لپک کر قریب آیا۔

"لے جاؤ اس پاگل کو، خوامخواہ نئی مصیبت کھڑی کرے گی۔"

"مجھ کو پاگل بولا، پاگل بولا۔"

وہ ٹہنی پر یوں اچھلی کہ سمیع کو لگا وہ گر جائے گی۔ تب ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے سمجھاتے ہوئے چھت پر اتارنے لگا۔ وہ جمال کو گھورتے منہ بسورتے ہوئے اتری تھی۔ سمیع اسے لے کر نیچے چلا گیا۔ اس نے جمال سے کوئی بات نہ کی تھی۔ دونوں بھائیوں میں زیادہ بات چیت ہوتی بھی نہ تھی۔

جمال سر جھٹک کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ مختلف ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا اور اتنا بھرا ہوا تھا کہ پہلی بار اندر داخل ہوتے ہی شدید گھٹن کا احساس ہوتا مگر ظاہر ہے جمال وہاں پہلی بار تو آیا نہ تھا۔

"السلام علیکم چاچا! آج تمہاری کھانسی کچھ بڑھ گئی ہے۔"

پلنگ پر بیٹھے بوڑھے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ سامنے رکھے طبلے پر اب بھی لرز رہے تھے اور ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی عیار و گدلی آنکھوں میں مسکراہٹ ابھری۔ وہ صرف تہمد میں ملبوس تھا۔ جھکے ہوئے کندھے، جسم پر گوشت

نام کو نہیں پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ کھچڑی بال، کثرت سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑتے ہونٹ اور پان کھائے دانت، اسے دیکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ اس شخص نے کبھی صحت مند زندگی نہیں گزاری اور اپنی صحت کو اپنے ہاتھوں برباد کیا تھا۔

یہ انوشہ کا باپ تھا۔ سمیع اور جمال کا سوتیلا چاچا۔

ان کے دادا نے دوسری شادی اک طوائف سے کی تھی۔ مگر کچھ عرصے بعد چھوڑ دیا۔ انور وہیں پلا بڑھا۔ گھنگھروؤں کی جھنکار کے ساتھ طبلے کی تھاپ ملاتا رہا۔ ماں نے مرتے ہوئے اس کا نام ونشاں بتایا تو نکاح نامے کے ثبوت کے ساتھ وارد ہوگیا۔ دادا کو اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنا اور گھر میں رکھنا پڑا۔ تعلیم تو کوئی تھی نہیں۔ دادا نے بہت کوشش کی کہ اسے کوئی دکان وغیرہ کروا دیں۔ مگر سب بیچ باچ کر ریڈیو پر طبلہ نواز کے طور پر بھرتی ہوگیا۔ بڑے بڑے فنکاروں کے ساتھ سنگت کی۔ قدسیہ بیاہ کر اس گھر میں آ چکی تھی۔ سسر کی وفات ہوئی تو اس ڈر سے کہ وہ بالکل ہی بگڑ جائے شوہر کے مشورے سے اک نیک، شریف اور یتیم لڑکی بیاہ لائیں۔ مگر اب انور کو روکنے والا تھا ہی کون نگارخانہ تھا اور انور۔

بھولے بھٹکے آ کر بیوی اور بیٹی کو دیکھ لیتا۔ جن کا سارا خرچہ اس کے بھائی بھابی ہی اٹھا رہے تھے۔ نیک فطرت لوگ تھے۔ کوئی اور ہوتا تو نکال باہر کرتا۔ چپ چاپ سہہ گئے۔ انوشہ کی پرورش قدسیہ نے ہی کی تھی۔ اس کی ماں تو ڈری سہمی دبو سی عورت تھی۔ انوشہ نے بی اے، بی ایڈ کر کے ٹیچنگ کر لی تو ماں کا انتقال ہوگیا۔ باپ نشے کا عادی ہو کر سب کچھ ہی لٹا بیٹھا تھا۔ نگارخانے میں اب اسے غلیظ کتے سے بھی زیادہ دھتکارا جاتا۔ ریڈیو والے منہ نہ لگاتے۔

انوشہ کو باپ سے کچھ خاص لگاؤ تو نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اسے اک اجنبی شخص ہی محسوس ہوتا۔ اس کی باتیں، اس کا انداز، چھچھورا پن، لباس، اسے ہر چیز سے اکتاہٹ اور بیزاری محسوس ہوتی تھی مگر پھر بھی بیٹی تھی۔ اسے لے کر آئی، علاج کروایا، نشہ تو چھوٹ گیا مگر طبلہ اور بدنام ماضی نہ چھوٹ سکا۔ خود جو چاہے کہہ لیتی مگر کوئی اور کچھ کہتا تو غصہ بہت کرتی۔

اب وہ سارا دن اسی کمرے میں بند چائے، سگریٹ پیتا اور طبلہ بجاتا۔ یا پھر بے مقصد ریڈیو پاکستان کے چکر کاٹتا جہاں اب کوئی اسے اندر بھی نہ آنے دیتا تھا۔ اس گھر میں صرف جمال تھا جو کبھی کبھار اسے لفٹ کروا دیتا تھا۔

وجہ، ایک تو اس کی ننگی غلیظ گفتگو، بازار حسن کی نازنینوں کے قصے، جسے سن کر بظاہر وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا۔ مگر اندر ہی اندر چٹکیاں لیتا اور کوئی اور قصہ سنانے پر اکسانے لگتا۔ بظاہر مہذب، خوش گفتار اور خوش اطوار نظر آنے والا جمال، ایسا ہی تھا۔ پڑھی لکھی مہذب اور

پُراعتماد نظر آتی عورت سے مرعوب ہو جاتا۔ محتاط ہو کر نظریں جھکا لیتا اور دعوت دیتی عورت کو للچائی نظروں سے تاڑتا۔ مگر اس سے آگے جانے کی جرأت تھی نہ ہمت۔ شاید لاشعوری طور پر بچپن ہی سے کہیں نہ کہیں اس کے چچا کے عجیب وغریب کردار نے اسے متاثر کیا تھا۔ البتہ سمیع اس سے محفوظ رہا کہ اسے وہ بے فکری ملی ہی نہ تھی۔ باپ کی وفات کے بعد وہ بچپن ہی سے ماں کی مشقت میں شامل ہوگیا تھا۔

"اور دوسری وجہ تھی......انوشہ......"

وہ اسے پسند کرتا تھا اور شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے نہ صرف چاچا کو وقت دیتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً کچھ خرچا پانی بھی تھما دیتا۔ اس لئے وہ تو مکمل طور پر اس کی مٹھی میں تھا۔ مسئلہ ماں کا بھی نہ تھا، وہ جانتا تھا ماں، انوشہ کو کبھی باہر نہ بیاہے گی۔ مسئلہ انوشہ کا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا انوشہ کے دل میں اس کے لئے کیا ہے، کچھ ہے بھی یا نہیں۔

"تم آج بے وقت چلے آئے۔" بہت دیر تک کھانسنے کے بعد چاچا انور نے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں......سوچا چاچے کے پاس بیٹھ کر کوئی قصہ ہی سنا جائے۔ آج صاحب دفتر میں نہ تھا اس لئے آدھی چھٹی لے کر چلا آیا۔"

اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ تازہ ہوا اور دھوپ اندر آ کر کمرے کی گھٹن کم کرنے لگی۔

"یہ انوشہ! تمہارے کمرے کی صفائی نہیں کرتی کیا؟"

"کرتی ہے کیوں نہیں کرتی...... پر عمر بھر کی گندگی اک دو دھلائیوں میں تو نہیں نکلے گی۔" چاچے کا انداز تھوڑا فلسفیانہ ہوگیا۔ وقت آخر قریب ہی تھا۔ کبھی کبھی احساسِ گناہ چٹکیاں سی لینے لگتا۔

"میں تمہاری نہیں، اس کمرے کی صفائی کی بات کر رہا ہوں۔" جمال نے پنکھے کی رفتار تیز کی۔ پھر کرسی پر آن بیٹھا۔ دوسری کرسی پر کھانے کے جھوٹے برتن رکھے تھے گویا چاچا دوپہر کا کھانا کھا چکا تھا۔

"میری صفائی تو اب ممکن ہی نہیں......" وہ بلاوجہ ہنسا۔ "کر دیتی ہے مگر صبح جلدی نکلنا ہوتا ہے اس لئے شام کو کرتی ہے۔" چھاتی مسلتے ہوئے اس نے جواب دیا پھر پوچھنے لگا۔

"سگریٹ نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"کل تو پورا پیکٹ دیا تھا چاچا! تھوڑے پیا کرو......تمہارے پھیپھڑوں کے لئے ٹھیک

نہیں' جمال نے ہمدردی سے کہا۔ مگر جیب سے پیکٹ نکال کر تھما دیا۔ چاچے نے سگریٹ نکالا تو لائٹر سے سلگا دیا۔ چاچے نے ایک، دو کش لئے۔ بہت دیر تک کھانسا، پھر طبلہ وہیں پلنگ پر ایک طرف کر کے چت لیٹ گیا۔ اس کی انگلی میں دبی سگریٹ سے نکلتا دھواں اور سوچیں آپس میں مدغم ہونے لگیں۔

"آدمی رات کو میری آنکھ کھلی تو مجھے لگا میرے پلنگ پر ریشمی تھان کھلا پڑا ہے۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کون ہے؟ اس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں بولی۔

"میں نازلی...... چل انور کہیں بھاگ چلیں۔"

سگریٹ راکھ ہوتی جا رہی تھی اور جمال کے اندر کچھ سلگنے لگا تھا۔

* * *

رجا بار بار فون نمبر گھماتی۔ دوسری طرف سے کوئی بولتا تو چپ کر کے سننے لگتی۔ جب ہیلو ہیلو کے بعد سننے والا زچ ہو کر غصے میں آتا تو ہنستے ہوئے ریسیور رکھ دیتی۔ ایک ہی نمبر تھا جسے وہ بار بار ملا رہی تھی۔ نہ جانے کہاں سے ہاتھ آ لگا تھا۔

انوشہ نے ایک دو بار ٹوکا مگر وہ نہیں مانی۔ انوشہ نے لاک لگا کر چابی قابو میں کر لی۔

"دیں مجھے، مجھے فون کرنا ہے۔" وہ لڑنے لگی۔

"کیا جھگڑا ہے لڑکی؟" سمیع نے اندر آ کر پوچھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ بھیگے بال یونہی بکھرے تھے۔ اخروٹی رنگ کے شلوار قمیص میں بے حد نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

"سامی...... سامی! آپی" وہ اس کا بازو پکڑے شکایت لگا رہی تھی اور انوشہ لاشعوری طور پر انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اوہو...... ہماری گڑیا کو تنگ کیا ہے۔ ہم تمہاری آپی کی پٹائی کریں گے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے تک لے گیا۔

"کب پٹائی کریں گے؟" وہ صوفے پر بیٹھا تو رجا گھٹنوں کے بل صوفے پر بیٹھ کر کندھا ہلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کر تو دیں مگر تمہاری آپی سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے انوشہ کو دیکھا۔

"کیوں؟" رجا نے حیرت سے پوچھا۔

"سکول میں بچوں کی پٹائی کر کے خاصی تربیت یافتہ ہو گئی ہیں۔ جواباً دو چار کھانی نہ پڑ جائیں۔"

"کیا کھانی...... آپ کو بھوک لگی ہے؟"

انوشہ بے ساختہ ہنسی۔

"ارے! تم ابھی تک یہاں ہو...... واش بیسن پر کنگھا نہیں تھا؟" وہ یوں انجان بنا گویا اسے اب دیکھا ہو۔

"میں اپنے ساتھ نہیں لئے پھر رہی۔" وہ تنک کر کہتی باہر نکل گئی۔ سمیع کا اسے یوں نظر انداز کرنا انوشہ کو کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس سے کتراتا تھا۔ کم از کم انوشہ کو تو یہی محسوس ہوتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خود اپنے جذبوں سے بھاگ رہا تھا۔ کچھ بننا چاہتا تھا کیریئر فل ہونا چاہتا تھا۔ صرف اتنا اطمینان تھا کہ ماں جانتی ہے۔ اگرچہ اس نے کبھی اشارتاً بھی ذکر نہ کیا تھا۔ مگر وہ بیٹے کے دل میں جھانک چکی تھیں۔ یونہی ایک دن بات کر رہی تھیں کہ جمال کی نوکری ہو گئی ہے...... انوشہ کی بھی تعلیم مکمل ہو چکی ہے سو اگر دونوں کی شادی طے کر دی جائے تو۔"

جس تیزی سے سمیع کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور جس گم صم انداز میں وہ انہیں تکتا کچھ بول نہ پایا تھا۔ ان کا اندازہ درست نکلا تھا اور حقیقتاً انہوں نے یہ بات اس کے دل کی بات جاننے کے لئے ہی کی تھی۔ اسی لئے وہ آج کل جمال کے لئے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر میں انوشہ آئی تھی اور کنگھا اس کے سامنے میز پر پھینک کر چلی گئی تھی۔ وہ اور رجا تصویروں کا کوئی البم دیکھ رہے تھے رجا نے کنگھا اٹھایا اور بڑے پیار اور بردباری سے اس کے بال بنانے لگی۔ کبھی دائیں طرف مانگ نکالتی، تو کبھی بائیں طرف، کبھی درمیان میں پھر اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگتی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اپنی شرارت پر جگر جگر کر رہی تھیں۔ تازہ شیمپو کئے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ نیوی بلو آدھی آستین کی قمیض پاجامہ میں ملبوس وہ ننھی سی پری لگ رہی تھی۔

اسے یوں ہنستا کھلکھلاتا دیکھ کر سمیع کے اندر ڈھیر سارا دکھ جمع ہونے لگا۔

کاش وہ اک نارمل لڑکی ہوتی۔ اک بھرپور، سمجھدار اور پُر اعتماد نارمل لڑکی، اس وقت وہ کالج میں پڑھ رہی ہوتی۔

وہ اسے کمپیوٹر سکھاتا، ورڈز ورتھ، شیلے، احمد فراز اور غالب کی شاعری ڈسکس کرتا۔ وہ کیسی ہوتی؟ کیا سوچتی، کیا پڑھتی؟

وہ تصور میں اسے اسی روپ میں دیکھ رہا تھا اور دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

انوشہ ٹھٹک سی گئی۔ پھر اس نے رجا کو پکارا۔

"رجا! تمہیں امی بلا رہی ہیں۔" سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تو سمیع نے چونک کر انوشہ کو دیکھا۔

رجا اپنا مشغلہ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ سمیع نے آہستگی سے کنگھا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور جانے کو کہا وہ کچھ منہ بسورتے ہوئے چلی گئی۔

"اسے اپنے ساتھ اتنا بھی اٹیچ مت کرو۔" نہ جانے کیوں انوشہ کے منہ سے نکلا۔

سمیع نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا" وہ میرے ساتھ بچپن سے اٹیچ ہے۔"

انوشہ نے جواب نہیں دیا اور باہر نکل گئی۔ رجا، قدسیہ کے پاس کھڑی تھی۔ جب ہارن کی آواز پر اچھل پڑی۔

"نبیل بھائی آئے ہیں۔"

قدسیہ نے آواز دے کر سمیع کو بتایا۔

"میں کھولوں گی۔" وہ سمیع کے آنے سے قبل ہی دروازہ کھول چکی تھی۔

"ہیلو لٹل اینجل۔" آنے والے نے سر سے کیپ اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔ ٹراؤزر کی جیب سے چاکلیٹ نکال کر ہاتھ میں تھما دی۔

"دو لینے ہیں۔"

"اور تو نہیں ہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مایوسی کا اظہار کیا۔

وہ سمیع کا ہم عمر اور سیکنڈ کزن تھا۔ قد زیادہ بڑا نہ تھا۔ صحت و توانائی کا مجسمہ، بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید چہرہ، بھورے ہلکے گھنگھریالے بال زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ باپ نامور وکیل تھا۔ خود وہ سمیع کا ہم عصر و ہم جماعت تھا۔

"مجھے دو لینے ہیں۔" وہ پاؤں پٹخ کر رو دی۔ یہ تو اس کی ہمیشہ سے ضد تھی۔ ہر چیز اسے دو ہی چاہئے ہوتی ہے۔ خواہ چاکلیٹ ہوں، آم یا کوئی کھلونا، کتاب وغیرہ۔ دو سے کم پر کبھی راضی نہ ہوتی۔ اسی ضد پر ایک دفعہ ایک رشتے دار نے ہنس کر کہا تھا۔

"کہیں دولہا بھی دو نہ مانگ لینا۔"

تو وہ اسی طرح ٹھنک کر بولی۔

"ہاں دو لینے ہیں۔"

وہ خود نبیل کی جیبیں کھنگالنے لگی تو اس نے دوسری بھی نکال کر اسے تھما دی۔

"پکڑو ندیدی لڑکی......"

اندر آ کر اپنے جاندار و خوشگوار انداز میں خالہ کو سلام کیا۔ خیر خیریت دریافت کی انوشہ سے ٹھنڈے ٹھار شربت کی فرمائش کی، سمیع کو ایک دو آوازیں دیں اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

رجا چاکلیٹ کا ریپر کھول رہی تھی۔

"اسے تھوڑی دیر فریج میں رکھ دو۔ گرمی کی وجہ سے پگھل گئی ہے۔"

قدسیہ نے کہا تھا مگر وہ سنی ان سنی کر گئی۔

سمیع کی ایک ٹیوشن جو وہ شام کو پڑھانے جاتا تھا، چھوٹ گئی تھی۔ اس لئے اب وہ شام کے وقت گھر میں ہی ہوتا تھا۔ رجا کی گویا شامت آ گئی تھی۔ کیونکہ سمیع نے اسے دوبارہ سے پڑھانا شروع کر دیا تھا اور پڑھائی سے رجا کی جان جاتی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ کسی کونے میں جا چھپے۔ کبھی کوئی بہانا بناتی، کبھی کوئی مگر اس معاملے میں وہ ایک نہ سنتا تھا۔ اس وقت بھی شام ڈھل رہی تھی۔ رجا، نبیل اور سمیع صحن میں چھوٹی میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سمیع کے گھٹنے پر اخبار کھلا ہوا تھا اور وہ دونوں زور و شور سے کوئی کالم ڈسکس کر رہے تھے۔ رجا میز پر رنگ برنگی کتابوں پر اک کاپی کھولے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی توجہ لکھنے کی طرف نہیں ہے۔

اسے بار بار پیاس لگتی تھی، وہ بار بار گردن اور کان پر خارش کرنے لگتی۔ کبھی سر اٹھا کر نبیل کو دیکھتی تو کبھی سمیع کو۔ پھر سر جھکا کر بے زاری سے کاپی کو۔ پیڈسٹل فین اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سلکی بال بار بار ماتھے پر بکھرتے تھے جسے وہ بائیں ہاتھ سے اک معصومانہ ادا سے ہر بار پیچھے کرتی تھی۔

پاس ہی چارپائی پر قدسیہ چادر اوڑھے لیٹی تھیں اور بے توجہی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ انہیں کل سے بخار آ رہا تھا۔ انوشہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔

"تمہارا دھیان لکھنے کی طرف بالکل نہیں ہے۔" سمیع نے ہلکا سا ڈانٹا۔

"بال تنگ کرتے ہیں۔" تنک کر بال ہٹاتے ہوئے بولی۔

نبیل کو ہنسی آ گئی۔ اپنی کیپ اس کے سر پر رکھ کر سارے بال سامنے سے سمیٹ کر ٹوپی میں قید کر کے اس کے بہانے کا سدباب کر دیا۔ پھر ٹراؤزر سے اک ننھی سی کی چین جس کے ساتھ سرخ رنگ کے شوز لٹک رہے تھے دکھائی۔

"جب یہ پورا پیج لکھ لو گی تو میں یہ دوں گا۔"

"ابھی دیں۔" رجا نے ہاتھ بڑھایا۔

نبیل نے مٹھی بند کر لی اور نوٹ بک کی طرف اشارہ کیا۔

"دولوں گی۔"

"دو ہی ہیں......ایک دو۔" اس نے مٹھی کھول کر جوتے گنے۔

رجا مطمئن ہو گئی۔ قلم تیزی سے چلنے لگا تھا۔

تب ہی جمال چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیاں اور فروٹ کے لفافے تھے۔ قدسیہ کے پاس بیٹھ کر خیریت دریافت کی۔ نبیل سے دو چار باتیں کیں۔ سمیع کی پڑھائی کا حال پوچھا۔ پھر فروٹ لے کر کچن میں چلا گیا۔ انوشہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اسے دیکھا تو چٹکی میں دوپٹے کا کونا پکڑ کر پھیلانے لگی۔

"کھانے میں کتنی دیر ہے؟" اس نے فروٹ فریج میں رکھا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر امی کی دوائیوں کی تفصیل بتانے لگا۔ آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ، کہنیوں سے اوپر تک آستین موڑے وہ بے حد غور سے بات سن رہی تھی۔ داہنی کلائی میں چھ کانچ کی سبز چوڑیاں تھیں۔

"تمہیں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں؟" نسخہ تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے جمال نے یونہی پوچھا۔

انوشہ نے اپنی کلائی کی سمت دیکھا پھر ہاتھ جھٹک کر بے پروائی سے بولی۔

"ارے نہیں، یہ تو یونہی پہن لی تھیں۔"

"سکول ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے؟"

"جی......"

"اگر کچھ پیسے ویسے چاہئیں ہوں تو بلا تکلف مانگ لیا کرو۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ انوشہ نے سر اٹھا کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر گویا ہوئی۔

"گورنمنٹ مجھے تنخواہ دیتی ہے۔"

"اوہ ہاں۔" وہ جھینپ سا گیا۔ "میں یونہی کہہ گیا۔"

"بالکل، میں نے تو آپ سے بھی کہنا تھا جمال بھائی!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر برنر ہلکا کیا۔ "کہ ابا کو نہ تو پیسے دیا کریں اور نہ ہی سگریٹ۔ وہ سگریٹ پان کھانے سے باز ہی نہیں آتے اور صحت دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔"

"تمہارے باپ کے پاس صحت تھی ہی کہاں کہ تباہ ہو......" اس نے دل میں سوچا پھر فوراً بولا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو بلکہ میں کسی دن شام کو انہیں کسی ڈاکٹر کو دکھلا دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر علاج کا فائدہ کیا اگر پرہیز ہی نہ ہو۔"

انوشہ نے بردباری سے کہا۔

"بہرحال سب ٹھیک ہو جائے گا تم زیادہ پریشان نہ ہوا کرو۔"

اس کی یہ مصنوعی سی فکرمندی و تشویش انوشہ کو کبھی غصہ دلاتی تھی تو کبھی ہنسی آ جاتی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی جمال کو اس کے باپ سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے انوشہ سے تو دلچسپی ہے۔

"آپ فکر مت کریں جمال بھائی! میں زیادہ پریشان نہیں ہوا کرتی۔"

اس نے اطمینان سے کہا تو جمال کو کوئی اور بات نہ سوجھی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا پھر شاید اوپر چلا گیا تھا۔ وہ روٹی پکا رہی تھی۔ جب سمیعہ اپنی امی کے ساتھ چلی آئی۔

سمیعہ اس کی سہیلی تھی۔ ابھی مہینہ بھر پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس دفعہ وہ شادی کی تصویریں ساتھ لائی تھی۔

"ابھی بے وقت اس لئے آئی ہوں کہ رات کو انہوں نے مجھے لینے آ جانا ہے۔ لیکن میں نے سوچا تم سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔" سرخ بریزے کے سوٹ میں ہلکے پھلکے زیور کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"تم نے جہیز اور بری کے کپڑے سنبھال کر رکھ دیئے ہیں۔"

"گرمیوں میں شادی کی یہی تو مصیبت ہے۔ ڈھنگ سے کپڑے اور زیور پہننے کے ارمان بھی پورے نہیں ہوتے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

کولڈ ڈرنکس اور فروٹ سے اس کی تواضع کی۔ کھانے کا پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا۔ گھر میں ان کے لئے اچھے اچھے کھانے بن رہے ہیں۔ تم اپنے کریلے سنبھال رکھو۔ اس کی امی، قدسیہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ سمیع اور نبیل اٹھ کر باہر چلے گئے تھے۔ وہ دونوں اندر آ گئیں۔

"تمہارا وہ گونگلو کزن چلا گیا۔"

"کیا؟" سمیعہ کے کہنے پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"نبیل!" اس نے وضاحت کی۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" وہ ہنس دی۔

"میں کیا کروں۔ مجھے سارے گورے مرد پھیکے شلجم لگتے ہیں...... مردوں کو گورا نہیں ہونا چاہئے، عجیب زنانے سے [illegible] لگتے ہیں۔"

"مائی گاڈ......!" اس کے خیالات پر انوشہ نے سر پیٹ لیا۔

"اب تمہارے میاں اگر کالے ہیں تو سارے گورے مردوں کی اس طرح توہین تو نہ کرو۔"

"کالے۔" سمیعہ تڑپ اٹھی۔ "کالے کہاں ہیں۔ بس ذرا سے سانولے ہیں۔"

"دیکھا، کیسے تکلیف ہوئی ہے۔ بائی دا وے ہیں کیسے؟" شاید اس نے یہ سوال غلطی سے کر دیا تھا وہ تو شروع ہو گئی۔

"ایسے ہیں، ویسے ہیں۔ یہ کھاتے ہیں وہ پیتے۔ یہ پسند وہ ناپسند۔ یوں دیکھتے، یوں روٹھتے ہیں۔"

انوشہ نے البم کھول لی۔ تب اس کا دھیان ہٹا۔

رجا بھی آ گئی تھی۔ پلنگ پر اوندھی لیٹ کر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجائے کہنیوں کے بل اونچی ہو کر بڑے اشتیاق سے تصویریں دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہاری نند ہے۔" انوشہ نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں ایک ہی ہے مگر بلا کی تیز۔ مجھے نہیں لگتا کہ مجھے چین سے رہنے دے گی۔" سمیعہ نے منہ بنایا۔ "ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا میری شادی کو اور اس نے باتیں بھی سنانی شروع کر دی ہیں۔"

"چلو ایک دو سال تک اس کی بھی شادی ہو جائے گی۔"

"کہاں...... موصوفہ بیوہ ہیں۔ بھائی اور اس کے گھر پر پورا قبضہ سمجھتی ہیں۔ بھابی برداشت نہیں ہوتی اس سے ساس البتہ میری اچھی ہیں۔"

"تو پھر صبر کرو۔ پھول کے ساتھ کانٹے تو ہوتے ہی ہیں۔"

"ہاں یہی کرنا پڑے گا۔"

"آپی......!" رجا ان کی باتوں سے بے نیاز بول اٹھی۔

"اس کی شادی ہو گئی ہے۔"

اس نے انگلی دلہن کی تصویر پر رکھی ہوئی تھی۔

"ہاں!" وہ ہنس دی۔ رجا اتنے زیور، کپڑوں میں ملبوس دلہن بنی سمیعہ کو پہچان نہ پائی تھی۔

"اسے اب پڑھنا نہیں پڑے گا۔" اس کا واحد مسئلہ ان دنوں یہی تھا۔

"نہیں۔"

"میری شادی ہو تو مجھے بھی پڑھنا نہیں پڑے گا۔" اس نے اگلا سوال کیا۔

"نہیں پڑھنا پڑے گا۔ اب جاؤ تم باہر جا کر بیٹھو۔"

سمیع شاید جمال سے بائیک کی چابی مانگ کر لایا تھا۔ اس وقت کپڑے سے جھاڑ رہا تھا۔ وہ قدسیہ کے کندھے پر سر رکھ کر فرمائش کرنے لگی۔

"امی! میری شادی کر دیں......" قدسیہ اور سمیعہ کی امی ہنسنے لگیں۔

"امی! شادی کے بعد پڑھنا نہیں پڑتا۔"

سمیع نے اس کا جملہ سنا تو مسکراہٹ چھپانے کو رخ بدل لیا۔ وہ دونوں ہنس رہی تھیں جبکہ وہ بضد تھی۔

"اچھا...... بھئی کر دیں گے مگر کس سے کریں دولہا کہاں سے آئے گا۔" سمیعہ کی امی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دولہا؟" رجا نے کچھ لمحے گال پر انگلی رکھ کر سوچا۔ پھر اچھل پڑی۔

"سامی...... سامی سے کر دیں۔"

وہ دونوں پھر سے ہنس دیں۔ "لو بھئی سمیع...... تمہارے لئے تو بیٹھے بیٹھے بیوی کا انتظام ہو گیا۔"

"اسے سمجھا دیں، بھائیوں سے شادی نہیں ہو سکتی۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بائیک نکالنے لگا۔

"نہ...... ہم نہیں بناتے تمہیں بھائی وائی...... گھر کا دولہا گھر کی دلہن۔" سمیعہ کی امی نے کہا تو وہ بنا جواب دیئے باہر نکل گیا۔ سمیعہ اور انوشہ بھی اندر سے آ گئی تھیں۔ رجا اچھلتی کودتی اندر چلی گئی۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد انوشہ، قدسیہ کو کھانا دینے لگی۔ اس کے ابا ابھی تک گھر نہیں آئے تھے۔

"جمال کو آواز دے دو۔ وہ بھی کھا لے۔ سمیع بے وقت نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔"

قدسیہ نے کہا تو وہ جمال کو آواز دیتے ہوئے کچن میں آ گئی۔ جمال نیچے آ کر کسی کام سے اندر آیا تو ٹھٹک گیا۔ رجا، انوشہ کا سرخ دوپٹہ جس کے کناروں پر سفید بیل کاڑھی گئی تھی اوڑھے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں، نظریں جھکی ہوئی، چہرے پر بلا کی سنجیدگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے بے حد تعجب سے سوال کیا۔ اس نے ازلی سنجیدگی سے نظریں جھکائے جواب دیا۔

"میری شادی ہو رہی ہے۔" جمال کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ انوشہ کو آوازیں دینے

لگا۔

انوشہ آئی تو خود بھی ہنس دی۔

جمال نے دوپٹہ کھینچا۔ "اٹھو بچیوں کی شادی نہیں ہوا کرتی۔"

وہ اچھل کر بیڈ پر کھڑی ہوگئی۔ تن کر بولی۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ بڑی ہوگئی ہوں۔"

دوپٹے سے بے نیاز وہ چھوٹی نہیں، بڑی ہی لگ رہی تھی۔

انوشہ کو ایک دم شرم نے آلیا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے پلنگ سے کھینچ لیا۔

"چلو میرے ساتھ۔" وہ اسے لے کر کچن میں چلی گئی۔ جمال ماں کو ہنستے ہوئے بتانے لگا۔

* * *

"میں نے یہ طبلہ اٹھا کر باہر پھینک دینا ہے۔"

تولیہ کرسی پر پھینک کر وہ غصے سے تنک کر بولی۔ جب سے وہ کمرے کی صفائی کر رہی تھی طبلے کی تھپ تھپ اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی۔

انور نے سر اٹھا کر بیٹی کو دیکھا۔

"پھر کسی دن کہو گی، ابا میں نے تجھے اٹھا کر باہر پھینک دینا ہے۔"

"کاش! ایسا ممکن ہوتا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ کبھی کبھی اسے اس شخص سے اتنی بیزاری محسوس ہوتی تھی کہ اس کا واقعی یہی جی چاہتا تھا۔ جب کبھی وہ گھر سے باہر جاتا تو وہ دعا کرتی کاش وہ اب کبھی واپس نہ آئے۔

کیا تھا وہ اس کے لئے، شجر سایہ دار؟

صحرائے زیست میں سایہ فگن بادل کا ٹکڑا؟"

باپ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔

تحفظ کا احساس دیتے، ہر سرد و گرم سہہ کر چھایا بن جانے والے۔

مگر وہ اس کے لئے کیا تھا؟

اک طوائف کا بیٹا چلو اسے بھول بھی جاتی تب بھی وہ کیا تھا؟

گناہوں کی پوٹ، کلنک کا ٹیکہ، تپتی سلگتی دھوپ، جو اس کی پور پور جھلسا کر رکھ دیتا تھا۔

کوئی پوچھتا۔

"تمہارا باپ کون ہے؟"

اس کا جی چاہتا کہہ دے مر گیا۔

اپنے تمام تر بدنام ماضی سمیت جو شخص یہاں بیٹھا ہے اس کے وجود سے ہی انکار کر دے وہ چیزیں اٹھا پٹخ کر رہی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے اس کاٹھ کباڑ کو باہر پھینکوا دیں۔ کمرے میں بیٹھنے کی جگہ تو ملے۔"

"نہ۔" انور نے کھڑکی سے باہر جھانک کر آتے بادلوں کو دیکھا۔ برسات آگئی تھی۔

درختوں پر سارا دن کوئل کوکتی تھی اور رجا اس کی تلاش میں سارے درخت چھانتی شاخوں میں چھپے پرندے احتجاجاً شور مچاتے۔

"تمہاری ماں کی نشانیاں ہیں۔" اس کی چھوٹی چھوٹی مکار سی آنکھوں میں عجیب سے احساسات پیدا ہوئے کہ وہ ایک دم معصوم سا بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اک تنہا اور اداس بوڑھا۔ جو عمر کی نقدی گنوا کر بس سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھا تھا۔

"ساری عمر جس شریف عورت کی قدر نہیں کی اب اس کی نشانیاں سینے سے لگانے کا فائدہ۔" وہ تڑخ کر گویا ہوئی۔

"ہاں قدر تو واقعی نہیں کی۔" اس نے طبلے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر گھٹنوں کے گرد لپیٹ لئے۔ تیز ہوا اس کے الجھے بالوں کو اور الجھا رہی تھی۔ مگر وہ پھر بھی انہیں کھولے رکھنے اور باہر دیکھنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

"قدر تو نہیں کی پر شریف عورت کچے رنگوں جیسی نہیں ہوتی کہ ہاتھ دھوئے تو رنگ غائب۔ وہ تو جب رنگتی ہے تو گاڑھے رنگوں میں رنگتی ہے۔ کبھی نہ اترنے والے پکے رنگ۔"

"پر وہ تمہیں تو نہ رنگ سکی ابا! تمہیں تو وہی کچے رنگ ہی بھائے۔" انوشہ نے کپ، گلاس، پیالیاں اکٹھی کر کے ٹرے میں رکھیں بلکہ پٹخیں۔

"کپڑا ہی خراب ہو تو پکے رنگ بھی کیا کریں۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ کھڑکی کے پٹ کھٹ...... پٹ بجنے لگے تھے۔

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ کپڑا خراب تھا۔"

اس نے کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھائی۔ کمرے میں ایک دم اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ شوریدہ سر ہوائیں بند کھڑکی سے سر ٹکرانے لگیں۔ پھر غصے میں چھوٹی چھوٹی درزوں سے شوں شوں پھنکارنے لگی تھیں۔

انور نے اک طویل سانس بھر کر آنکھیں کھولیں تو کچھ وقت پہلے والی کیفیت یکسر غائب ہو چکی تھی۔

"تیرا غصہ جو ہے نا بالکل نیناں بائی جیسا ہے۔"

"ابا!" مارے غصے کے وہ سرتاپا تھرا کر رہ گئی۔ "کتنی بار کہا ہے مجھے ان طوائفوں سے مت ملایا کر۔"

"اچھا...... اچھا میں تجھ سے کچھ اور پوچھ رہا تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "شادی نہیں کرے گی، اب اٹھائیس کی ہونے جا رہی ہے۔"

"میری فکر کرنے والی نیچے بیٹھی ہیں۔"

"فکر تو وہی کرے گی، حق بھی اسی کا ہے۔ پر تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔ جمال کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جمال۔" وہ تیزی سے پلٹی۔ "جمال بھائی کے بارے میں کون کہتا ہے۔"

"خود جمال کی خواہش ہے۔"

کچھ لمحے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر چبا چبا کر بولی۔ "مجھے ان سے شادی نہیں کرنا۔"

"کیوں؟ کسی اور کے ساتھ دل لگا لیا ہے؟"

"ابا!" وہ چیخ کر رہ گئی۔ پھر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازہ بہت زور سے بند ہوا تھا۔

"اس کا غصہ بالکل......" وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

باہر آندھی اپنے ساتھ سیاہ بادل اڑائے لے جا رہی تھی۔ اور ان کے پیچھے آنے والے بادلوں میں بجلی کی کڑک بھی تھی اور چمک بھی۔ اندھیرا دم بہ دم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ زینے کا دروازہ دھاڑ دھاڑ بج رہا تھا۔ مگر وہ نیچے نہ جا سکی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس کے عین اوپر ساٹھ پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"بھلا کوئی بھی باپ یہ بات اپنی بیٹی سے اس چھچھورے انداز میں پوچھتا ہوگا۔" وہ وہیں بیٹھی روتی رہی، روتی رہی۔

سمیع شاید دروازہ بند کرنے آیا تھا اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"انوشہ! کیا ہوا؟" وہ وہیں اوپر والی سیڑھی پر دروازہ پکڑے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

وہ کچھ نہیں بولی بس روتی رہی۔ رونا نہ جانے باپ کی بات پر آ رہا تھا یا جمال کے پرپوزل پر، بادل گرج کر چمکے اور برس پڑے۔ اس کے اوپر جلتا بلب ایک دم بجھ گیا۔

سمیع آگے آیا۔ "تمہیں ہوا کیا ہے، رو کیوں رہی ہو؟"

"تمہیں کیا تکلیف ہے، تم جاؤ نیچے۔" وہ چیخی۔

وہ کچھ لمحے الجھن آمیز انداز میں اندھیرے میں ڈوبے وجود کو دیکھتا رہا۔ "نیچے آتے ہوئے دروازہ بند کر کے آنا۔"

وہ چلا گیا۔

"سنگدل، کٹھور۔"

دروازہ اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگا تو غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

"طوائفوں کی خوشامدیں کرنے والا طبلچی۔"

بجلی زور سے کڑکی، دل کا غبار بھی کسی قدر کم ہوا۔ تب احساس ہوا وہ بھیگ رہی ہے۔ شیڈ کے نیچے ہونے کی وجہ سے ذرا بچ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ چہرہ اچھی طرح صاف کیا اور نیچے آ گئی۔ سب خبرنامے میں منہمک تھے۔ وہ کونے میں بیٹھ گئی۔ رجا، قدسیہ کی گود میں سر رکھے کسی وزیر کے جنازے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ سر اٹھا کر پوچھنے لگی۔

"امی! یہ مر گیا ہے؟"

"ہاں......"

"اب اسے پڑھنا نہیں پڑے گا؟"

امی کو ہنسی آ گئی تو سمیع سے کہنے لگیں۔ "بس سمیع! خبردار اب جو تم نے میری بیٹی کو پڑھانے کی کوشش کی۔"

سمیع نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جبکہ دھیان کونے میں بیٹھی لڑکی پر اٹکا تھا جو بے توجہی سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

* * *

جمال، انوشہ کے لئے میرون رنگ کا خوبصورت سوٹ لایا تھا۔ یہ کچھ عجیب بات نہ تھی۔ وہ اکثر گھر والوں کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا ہی رہتا تھا۔ انوشہ خوش دلی سے قبول کر لیتی اگر ابا نے جمال کے پرپوزل کی بات نہ کی ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اگر نانی نے اس سے جمال کے رشتے کی بات کی تو وہ انکار کیسے کرے گی۔

"خوامخواہ زحمت کی جمال بھائی! میں گرمیوں میں گہرے رنگ نہیں پہنتی۔" سکول سے آ کر اس نے مشین لگائی تھی۔ جمعہ کا دن تھا اس لئے جلدی گھر آ گئی تھی۔

"میں نے سوچا یہ رنگ تمہاری گوری رنگت پر اچھا لگے گا۔" وہ صحن میں موجود واحد کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میری رنگت کچھ ایسی گوری بھی نہیں۔" انوشہ کپڑے تار پر پھیلانے لگی۔

"تمہیں اچھا نہیں لگا؟" جمال کو کچھ مایوسی سی ہوئی۔

"نہیں اچھا ہے۔" وہ اب بھی اپنے کام میں مصروف تھی۔ سوٹ کو بس ایک نظر ہی دیکھا تھا۔

جمال کو تھوڑا غصہ آ گیا۔ سوٹ کرسی پر رکھ کر وہ اوپر چلا گیا۔ وہ بدستور کام میں مصروف رہی۔ مسجد میں صلوٰۃ و تسبیح پڑھی جا رہی تھی۔ کمرے سے سمیع نکلا اور واش بیسن کے آئینے سے کنگھا اٹھا کر بال بنانے لگا۔ اسے جمعہ پڑھنے جانا تھا۔ آئینے میں سے انوشہ کو دیکھا۔

"چھٹی والے دن نبٹایا کرو ایسے کام، تھک نہیں جاتی ہو؟"

انوشہ نے دوپٹہ جھٹک کر پھیلاتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ آج اتنی توجہ، اتنی مہربانی کس لئے؟

"تم نوکرانی رکھوا دو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سمیع نے کنگھا واپس رکھا اور پاس سے گزرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔ "خدا وہ وقت بھی لائے گا، تم دعا کیا کرو۔"

انوشہ نے اچنبھے سے اسے باہر جاتے دیکھا۔ پھر باقی کپڑے اٹھا کر اوپر آ گئی۔ اندر کمرے سے جمال کے قہقہے اور ابا کی پُرجوش آواز آ رہی تھی۔ ایسا تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا مگر آج وہ قصداً دروازے کے پاس آن رکی۔ مگر کچھ ہی لمحے میں اس کی کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ جسم کا سارا خون سمٹ کر چہرے پہ آ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔

"اللہ کرے یہ مر جائیں۔"

* * *

شام کو قدسیہ نے اس کے بالوں میں تیل کی خوب مالش کی تھی۔ اس کے دکھتے ہوئے سر کو قدرے سکون ملا تھا آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"آج کل میری بیٹی چپ چپ سی رہنے لگی ہے۔"

انگلیوں سے مساج کرتے ہوئے انہوں نے اچانک پوچھا۔

"کچھ نہیں بس یونہی......" وہ اپنی کلائی میں پڑی چوڑیاں گننے لگی تھی۔

"بہت دنوں سے سکول کا کوئی قصہ بھی نہیں سنایا۔"

"کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں وہی روٹین ورک۔"

اس نے جلتی ہوئی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے دبایا۔

"میں نے ماسی حلیمہ کو بلایا تھا۔"

"کیوں؟"

"میں نے اس سے کہا ہے جمال کے لئے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھے۔"

اس کی انگلیاں جہاں تھیں وہیں تھم گئیں۔

"اس نے کہا تھا وہ ایک دو لڑکیوں کی تصویریں لائے گی۔"

"کیا تائی جمال کی خواہش سے آگاہ نہیں؟" انوشہ نے اچنبھے سے سوچا۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ قدسیہ ان دونوں کی خواہش سے بھی آگاہ ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھیں کہ دونوں کا مزاج ملتا ہے اور وہ دونوں اچھی زندگی گزاریں گے۔ انہیں افسوس تھا کہ اپنے بڑے بیٹے کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ شاید کر ہی دیتیں کہ اصولاً تو انہیں جمال کے بارے میں ہی سوچنا چاہئے تھا کہ وہ برسر روزگار تھا اور انوشہ بھی تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ سمیع کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے ابھی کچھ سال درکار تھے۔ مگر مسئلہ دو زندگیوں، دو دلوں کا تھا۔ ان کا فیصلہ تینوں کی زندگیاں خراب کر دیتا۔ انوشہ جمال کے ساتھ زندگی تو گزار دیتی۔ مگر خوش کبھی نہ رہتی۔ پھر سمیع جو انہیں سب سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ ہمیشہ جمال کے غصے اور ضد سے ڈر کر اسے اچھی چیز دلا دیتی تھیں اور سمیع کو بہلا لیا کرتی تھیں۔ ان کے پیار نے سمیع سے بہت چھوٹی عمر سے قربانیاں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ دھیرے دھیرے سمیع کو خود ہی عادت پڑ گئی تھی۔ اچھا کھانا، اچھا لباس، اچھا بستہ، اچھا پھل وہ خود ہی بھائی کے لئے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ مگر انوشہ کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اب اس سے کوئی بے انصافی نہیں کر سکتی تھیں۔

انوشہ کے دل میں اطمینان سا اتر آیا۔ مگر دوسرے لمحے اک عجیب سی سوچ نے سر اٹھایا اور ڈس لیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تائی ایک طوائف کے نشے باز بیٹے کی بیٹی کو اپنی بہو ہی نہ بنانا چاہتی ہوں۔" وہ ایک دم بے چین سی ہو گئی۔

"بس کریں بڑی امی!" انہوں نے مالش بند کر کے بال سلجھانا شروع کر دیئے پھر چوٹی بنا دی۔

* * *

صبح سکول جانے سے پہلے جمال نیچے اترا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے رجا کا بازو دبوچ رکھا تھا۔ وہ مچل مچل کر بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"سنبھالیں اس پاگل کو۔"

"کیا ہوگیا؟" قدسیہ بوکھلائیں۔

جمال نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر قدسیہ کے پاس گری۔ پھر چیختی ہوئی پاس پڑی ٹوکری سے بھنڈیاں اٹھا کر اسے مارنے لگی۔

"خیال تو رکھا کریں اس کا، درخت پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئی تھی۔ مفت کی مصیبت گلے ڈالی ہوئی ہے۔" غصے میں وہ ان ہی پر برس پڑا۔ اندر سمیع پڑھ رہا تھا۔ شور سن کر باہر نکل آیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اسے اس کے باپ کے پاس کیوں نہیں بھجوا دیتیں۔ آپ میں ہمت نہیں ہے تو میں خود اس سے کہہ دیتا ہوں۔ خود عیش کر رہا ہے اور......"

"اچھا تم جاؤ یہاں سے......" قدسیہ نے بیزاری سے کہا۔ ہر بات میں ان کی یہی رٹ ہوتی تھی۔

"مجھے کیا لگائے رکھیں اسے سینے سے، کوئی نقصان ہوگیا تو......"

"میں نے کہا نا تم جاؤ یہاں سے......" قدسیہ کو غصہ آ گیا۔

انوشہ نے بھنڈیوں کی ٹوکری تخت کے نیچے رکھی۔ جمال یونہی غصے میں بولتا باہر نکل گیا۔

رجا نے سمیع کا کالر پکڑ لیا اور جھٹکا دے دے کر شکایت کرنے لگی۔

سمیع نے آہستگی سے اس کا گال تھپتھپا کر غصہ ٹھنڈا کیا۔ اس نے ہاف آستینوں کی قمیض پہن رکھی تھی۔ بازوؤں پر کھرونچیں آ گئی تھیں جن سے ہلکا ہلکا لہو رس رہا تھا۔ ایک مٹھی بند تھی۔ اب تک وہ صرف ایک ہی ہاتھ کو استعمال کر رہی تھی۔

"درخت سے نیچے کیوں اتری تھیں۔ میں نے اور امی نے منع کیا تھا۔ اب آپ گندی بچی بنتی جا رہی ہو۔ اب درخت پر چڑھیں تو میں وہ درخت کٹوا دوں گا۔"

وہ جو خاموشی سے ڈانٹ سن رہی تھی۔ ایک دم بول اٹھی۔

"نہیں سامی......نہیں۔"

"اس میں کیا ہے؟" سمیع نے اس کی مٹھی ہاتھ میں لی تو اس نے جوش سے مٹھی کھول دی۔

"تتلی۔"

وہاں اب تتلی کہاں تھی۔ سفید مسلے ہوئے پر اور مردہ وجود۔ وہ یقیناً اس تتلی کے تعاقب میں نیچے اتری تھی۔ رجا نے دیکھا تو مایوسی سے سر ہلا کر ہاتھ سے پر جھٹک دیئے۔

"ہاتھ پاؤں دھو کر آؤ اور ادھر آپی سے دوائی لگواؤ۔"

"سامی! آپ لگاؤ۔" اس نے آرام سے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اچھا!" سمیع نے اس کے بازو ہٹائے اور انوشہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے باتھ روم میں لے گئی۔ سمیع نے دیکھا قدسیہ گم صم سی چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اس نے عقب سے دونوں ہاتھ ان کے کندھوں پر رکھ کر ہلکے سا دبایا۔

"فکر مت کریں امی! وہ کسی کا کیا لیتی ہے۔ بھائی یونہی بول جاتے ہیں۔"

"میں اب اسے خود سے دور کر ہی نہیں سکتی۔"

"ہم اسے کہیں نہیں بھجوا رہے۔"

قدسیہ کو اچانک خیال آیا۔ انوشہ اور سمیع کی شادی ہو جائے تو وہ رجا کو آرام سے سنبھال سکتے ہیں۔ جبکہ کوئی اور لڑکی شاید اسے کبھی برداشت نہ کرے۔ خود جمال کہاں کرتا تھا جو وہ اس کی بیوی سے توقع رکھیں۔ انہیں ایک بار پھر اپنے فیصلے پر اطمینان ہوا تھا۔

* * *

جمال جب بھی رجا کو اوپر دیکھتا ڈانٹ کر نیچے بھگا دیتا۔ وہ غصے میں آ جاتی۔ چیختی چلاتی چیزیں توڑتی۔ خود اوپر جاتا تو زینے والے دروازے کو اوپر سے بند کر لیتا۔ وہ دروازے کو ٹھوکریں مارتی رہ جاتی۔ قدسیہ کو جمال کے سخت رویے کی شکایت تو تھی مگر رجا بھی بات کہاں سنتی تھی۔ سمیع کا آخری سال تھا اور وہ مصروف بھی کافی ہوگیا تھا۔ کبھی کمبائن سٹڈی کے لئے نبیل کے گھر چلا جاتا۔ کبھی نبیل آ جاتا۔ انوشہ بظاہر تو سکول اور گھر میں مصروف رہتی مگر دل میں جو چبھن تھی وہ اکثر ہی بے چین کر دیتی۔ اس کے ابا کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ مگر وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے مختلف حکیموں کی لال پیلی نیلی بوتلیں اکٹھی کرتا رہتا۔ مگر انوشہ جانتی تھی وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا وہ اب بھی بازار حسن میں اپنی پرانی کرم فرماؤں سے ملنے جاتا تھا۔ جو اس کی طرح تن کا سونا اور عمر کی نقدی گنوا کر تقریباً اسی جیسی زندگی گزار رہی تھیں۔ وہاں پی جانے والی سستی قسم کی شراب اس کے پھیپھڑوں کو بری طرح سے گلا رہی تھی۔

لیکن اس دن رجا واقعی درخت سے گر گئی۔ اس کا بازو فریکچر ہوگیا اور ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔ وہ خون دیکھ کر ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔ گھر میں صرف انوشہ اور قدسیہ ہی تھیں وہ اسے ہسپتال لے گئیں۔ شام کو گھر آئیں تو رجا بالکل چپ تھی۔ وہ شاید ڈری ہوئی اور خوفزدہ تھی اور یہ چپ اگلے کئی دنوں تک اس کے وجود پر چھائی رہی۔

"آپ اوپر دروازے پر تالا لگا دیں۔" سمیع نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"کیسے لگا دوں۔ تمہارے چچا نے اوپر نیچے آنا جانا ہوتا ہے۔" قدسیہ، رجا کا سر گود میں

لئے بیٹھی تھیں۔ وہ جاگ رہی تھی مگر آنکھیں موندے پڑی تھی۔

"چابی چاچا کو دے دیں جب جانا ہو تالا لگا کر جائیں۔"

"ہاں یہی کرنا ہوگا۔"

سمیع نے رجا کے بکھرے بال آہستگی سے سمیٹے اور پھر ناک کھینچ کر بولا۔ "ہماری گڑیا جلد ٹھیک ہو جائے گی۔"

رجا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر سے بند کر لیں۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ بس کبھی کبھی سمیع کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی۔ پھر وہ یہ سوچے بغیر کہ اس کا وقت ضائع ہو رہا ہے اس سے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہتا۔

وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو دروازے پر تالا پڑ گیا۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر بند دروازے کو بجاتی رہتی۔ کبھی کبھی ضد کرنے لگتی۔ قدسیہ سے تو بار بار سیڑھیاں چڑھی نہیں جاتی تھیں۔ انوشہ شام کو اپنے ساتھ اوپر لے جاتی۔ وہ یوں خوش ہوتی گویا اپنی دنیا میں واپس آ گئی ہو۔

* * *

انور کل سے نکلا ہوا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔

"ہوگا اپنی کسی......" جمال نے بظاہر ہنستے ہوئے مذاق کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر انوشہ کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی احساس ہوا۔ کم از کم اسے انوشہ کے سامنے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نے گڑبڑا کر بات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں جا کر پتا کرتا ہوں۔"

"تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" قدسیہ نے دبی آواز میں کہا تا کہ انوشہ نہ سن سکے۔ اگرچہ اس نے سن لیا تھا۔ بظاہر اس کی توجہ بچوں کے ٹیسٹ کی طرف تھی۔ مگر وہ ان سے زیادہ دور تو نہ تھی اور اسے کوئی گلہ بھی نہ تھا جب وہ اپنے سگے باپ سے اتنی بیزار تھی تو وہ لوگ کیوں نہیں ہو سکتے تھے۔

"مگر امی......" جمال نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر قدسیہ نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اپنے بیٹے کی طبیعت وہ سمجھتی تھیں۔ آج تو صرف اک جھجک سی تھی اس ممنوعہ علاقے میں قدم رکھنے کی۔ ایک بار یہ جھجک ختم ہو گئی تو پھر...... اس گھر میں کوئی نیا انور پیدا ہو وہ یہ سوچ کر ہی ہول جاتی تھیں۔

"وہ جلد ہی لوٹ آئے گا......" انہوں نے گویا انوشہ کو تسلی دی تھی۔ وہ سر اٹھا کر ان کی

طرف دیکھتے ہوئے ذرا سا مسکرائی اور پھر سے کام میں مصروف ہو گئی۔ نہ جانے کیوں ٹوٹل میں بار بار غلطی ہو رہی تھی۔

"انوشہ!" انوشہ نے سر اٹھا کر جمال کو دیکھا۔ وہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ بلیک پینٹ اور ہلکی براؤن لائننگ والی شرٹ میں وہ خاصا معقول اور سوبر لگ رہا تھا۔ لیکن انوشہ نے جس دن سے اس کی اور اپنے باپ کی گفتگو سنی تھی۔ اسے اپنے باپ سے ہی نہیں جمال سے بھی گھن آنے لگی تھی۔ لاشعوری طور پر خود کو سمیٹتے ہوئے اس نے دوپٹہ کچھ اور پھیلایا۔ جمال نے انگلیوں میں دبی ادھ جلی سگریٹ کی راکھ جھٹکی۔

"تم پریشان ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ خود کو کمپوز کر چکی تھی۔

"ہونا بھی نہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

"جانتی ہوں۔" وہ پیپرز سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

جمال اسے بے حد غور سے دیکھ رہا تھا۔

"میں جاؤں......؟"

"ضرورت نہیں وہ خود ہی آ جائیں گے۔" وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔

دو دن گزر گئے تب شاید سمیع کو خیال آیا۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی بے خیالی میں ماچس کی تیلیاں جلا رہی تھی۔ دودھ گرم ہونے کو اوپر رکھا تھا۔

"چاچا نہیں لوٹے ابھی تک؟"

اس نے چونک کر ماچس کی تیلی پھینکی پھر بنا اس کی طرف دیکھے بولی۔

"نہیں۔"

سمیع نے اور کچھ نہیں پوچھا تھا وہ خود ہی نہ جانے کیا سوچ کر کہنے لگی۔ "سمیع! تم پتا تو کرو۔"

"میں وہاں جاؤں۔" سمیع کا لہجہ حیرت زدہ اور چبھا ہوا تھا۔

وہ بری طرح شرمندہ ہوئی اتنا کہ اسے رونا آ گیا۔ اس رات وہ بہت جلد سونے چلی گئی تھی۔

* * *

دو دن گزر گئے تھے مگر انور نہیں آیا۔ شاید اس گھر میں کسی کو اس کا انتظار بھی نہ تھا انوشہ کو بھی نہیں، ماسی حلیمہ آئی تھی۔ مختلف لڑکیوں کی تصویریں اور کوائف لے کر۔ رجا بہت اشتیاق

سے تصویریں دیکھ رہی تھی۔ قدسیہ نے آواز دے کر انوشہ کو چائے بنانے کے لئے کہا تھا۔ دونوں کچن کے ساتھ ہی تو بیٹھی تھیں۔ انوشہ ان کی باتیں آسانی سے سن رہی تھی۔ جب گفتگو کا رخ لڑکیوں، جہیز اور ڈیمانڈ سے ہٹ کر انوشہ کی طرف مڑ گیا۔

"میں تو حیران ہوں قدسیہ! تم نے جمال کے لئے انوشہ کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔" ماسی حلیمہ کی آواز میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"اس کی باری آئے تو اس کے بارے میں بھی سوچ لوں گی...... بیٹی ہے میری میں نہیں سوچوں گی تو اور کون سوچے گا۔"

"سچ کہوں تو بیٹی بنانا آسان ہے بہو بنانا مشکل، نیک، سلجھی ہوئی پڑھی لکھی بچی ہے پھر تمہارے ہاتھ میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ باہر رشتہ کرو گی تو لوگ سو طرح کی چھان پھٹک کریں گے۔ بھلا اک شرابی، جواری باپ کی بیٹی کو کون عزت سے بیاہنے آئے گا۔ اب اس کا باپ جیسا بھی ہے، وہ ہے تو تمہارا......"

انوشہ نے ٹرے ان کے درمیان رکھی اور خود تیزی سے پلٹ گئی۔

"اللہ کرے ابا! تم کبھی لوٹ کے نہ آؤ۔" نیم تاریک کمرے میں گھٹنوں میں سر دیئے وہ متضاد قسم کی سوچ کا شکار تھی۔

قدسیہ کی محبتوں اور شفقتوں سے انکار ممکن نہ تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ واقعی بیٹی بنانا آسان ہے مگر بہو...... پھر سمیع، وہ تو اس کے باپ کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ رجا اندر آئی تھی۔ وہ اوپر جانا چاہتی تھی۔

"چابی ابا کے پاس ہے رجا! تالا نہیں کھل رہا۔" اس نے بےزاری سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

رجا ضد میں آ گئی تو اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ غصے میں سیڑھیاں چڑھ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ دروازے کو ٹھوکریں مار رہی تھی۔ قدسیہ نے اسے پیار سے چمکارا۔ انوشہ کو آوازیں دیں۔ وہ سنی اَن سنی کر کے بیٹھی رہی۔ رجا کا شور اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگا تھا۔

"انوشہ! تم ہی اسے بہلا لو۔ اس طرح تو اپنے ہاتھ زخمی کر لے گی۔"

قدسیہ نے دروازے میں آ کر کہا۔ وہ اٹھی اور سیڑھیوں کے پاس جا کر رجا پر برس پڑی۔

"تمہیں ایک بار سنائی نہیں دیتا۔ نہیں جانا ہے اوپر۔ اب اگر تم نے شور کیا تو میں تمہیں

مار بیٹھوں گی۔"

قدسیہ کے ساتھ ساتھ اندر آتا سمیع بھی ٹھٹک گیا۔ دونوں کے لئے انوشہ کا یہ لہجہ نیا ہی تھا۔ رجا جتنی بھی بدتمیزی کر لیتی۔ انوشہ نے کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ قدسیہ کو احساس ہوا۔ آج کل وہ ایسی ہی الجھی الجھی اور تنک مزاج سی ہو کر رہ گئی تھی اور آج شاید اس نے ماسی حلیمہ کی گفتگو سن لی تھی۔

سمیع نے سائیکل کھڑی کی۔

"پیچھے ہٹو انوشہ۔" سمیع کی آواز میں نرمی بدستور قائم تھی۔ وہ جو سیڑھیوں کی دیوار پر ہاتھ ٹکائے رجا کو گھور رہی تھی۔ چونک کر ہاتھ ہٹا لیا اور وہیں کھڑی ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔ اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ اسے رجا کو اس طرح نہیں ڈانٹنا چاہئے تھا۔ سمیع نے رجا سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو انوشہ کے ڈانٹنے پر سخت غصے میں آ گئی تھی۔ اسے دھکا دے دیا۔ پھر اس پر تھوک پھینکنے لگی۔

سمیع سنجیدہ ہو گیا۔ اس وقت وہ رجا کو پیار سے قابو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ چھوڑ دیتا تو وہ یہیں سیڑھیوں پر چاہے ساری رات گزار دیتی۔ مگر نیچے آنے والی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے رجا! سمیع اب تم سے کوئی بات نہیں کرے گا۔" اس سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ گیا، خاموش، اداس اور سنجیدہ۔

رجا اوپر سے دوسری سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ ایک پاؤں آخری سیڑھی پر رکھے دروازے کو ٹھوکریں مار رہی تھی۔ کچھ لمحے اسی مشغلے کو جاری رکھتے ہوئے کن اکھیوں سے سمیع کو بھی دیکھ رہی تھی۔ انوشہ صحن میں بچھی چارپائی پر جا بیٹھی۔ قدسیہ اندر چلی گئی تھیں۔ دیوار چھوٹی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ سکتی تھی۔ رجا کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ سمیع کو یوں خفا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ سیدھی ہوئی۔ دونوں بانہیں عقب سے اس کے گلے میں ڈال کر اپنا گال سمیع کے گال پر ٹکا دیا تھا۔ یہ اس کے پیار کا مخصوص انداز تھا۔ منانے کی ادا تھی۔ سمیع کے دونوں ہاتھ رجا کے بازوؤں پر تھے اور وہ دھیرے دھیرے اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ پھر وہ اسے ساتھ لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔

انوشہ کے اندر بےچینی سی اتر آئی۔ اس نے اندر جاتی رجا کو دیکھا۔ سولہ سترہ برس کی بھرپور لڑکی۔ دوپٹے سے بےنیاز اور جس دن سے اس نے جمال کی گفتگو سنی تھی۔ بھلے وہ کسی کے بھی متعلق تھی۔ یہ بےچینی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ رجا کے کپڑے بہت ڈھیلے ڈھالے سینے لگی تھی۔ بقول قدسیہ اسے ملنگ بنانے لگی تھی۔

یہ ٹھیک ہے سمیع کے ذہن میں کوئی غلاظت نہیں۔ وہ رجا کو اک ایب نارمل بچی ہی سمجھتا ہے۔ مگر وہ مرد تو ہے اور رجا کے ساتھ اس کا رشتہ محرم رشتوں کی بے تکلفی سے بھی بڑھ گیا تھا......

وہ دونوں ہاتھ گود میں دھرے خالی خالی سی بیٹھی الجھ رہی تھی۔

''انوشہ!'' انوشہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

''تم پریشان ہو؟''

''میں کیوں پریشان ہونے لگی۔'' وہ تنک کر بولی۔

''بات تو آرام سے کرو......'' سمیع ہلکے سے مسکرایا۔ نہ جانے اس لڑکی میں کیا تھا کہ اس کی بدمزاجی بھی بری نہیں لگتی تھی۔ انوشہ نے سوچا کہ وہ سمیع سے بات کرے مگر مناسب الفاظ ہی نہ ملے۔ بس سر جھٹک کر رہ گئی۔ سمیع چلا گیا۔ اس وقت تو وہ کوئی بات نہ کر سکی۔ مگر رات کو جب وہ کھانا کھانے بیٹھا تو ضرور کی۔ اسے لیٹ آنا تھا اور قدسیہ سے انوشہ نے کہا تھا کہ وہ کھانا نکال دے گی۔ حالانکہ سمیع نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا تھا کہ وہ یوں آدھی رات کو اس کے لئے جاگے۔

''تم...... تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔'' نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور آواز رات کی تاریکی میں بہت دور تک گئی تھی۔

''آہستہ بولو آدھی رات ہے۔''

وہ کچھ لمحے شرر بار نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر پانی کا گلاس غٹاغٹ چڑھا گیا۔ میز پر گلاس پٹخ کر دونوں ہاتھ سامنے کنارے پر زور سے ٹکائے وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے دوبارہ انوشہ کو دیکھا۔ بولا تو لہجہ تپ رہا تھا۔

''اتنی گھٹیا سوچ تمہارے اندر کس طرح پیدا ہوئی؟''

''اس میں گھٹیا پن کی کیا بات ہے...... میں نے صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ جو فاصلہ اور جو احتیاط تم میرے لئے روا رکھتے ہو وہی رجا کے لئے رکھا کرو۔''

وہ فریج کے پاس کھڑی تھی۔ لہجہ نارمل ہی تھا۔

''انوشہ! رجا ایب نارمل بچی ہے۔''

''تم تو ایب نارمل نہیں ہو۔''

''تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔'' اس کا لہجہ تڑختا ہوا تھا۔

''میں کسی پر شک نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے اک بات بتاؤ۔ میں اک ہوش مند، اپنا برا بھلا

سمجھنے والی لڑکی ہوں اس کے باوجود تم مجھ سے اتنا فاصلہ رکھتے ہو کیوں؟ تمہارے اندر کھوٹ ہے یا میرے اندر؟...... سمیع ہمارا معاشرتی سیٹ اپ کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک گھر میں کئی کئی خاندان مل کر رہتے ہیں۔ لیکن یہ احتیاط ہمیں بچپن سے سکھلائی جاتی ہے۔ اس کے سامنے جانا ہے۔ اس کے سامنے نہیں جانا۔ فلاں کے سامنے خود کو اس طرح ڈھانپنا ہے۔ یہ احتیاط اس برائی کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتی۔ لیکن یہ سب ہم رجا کو نہیں سمجھا سکتے...... وہ کچھ بھی نہیں جانتی ہے۔''

''میں تو جانتا ہوں...... میرے لئے تو ننھی سی بچی ہی ہے جسے میں کندھے سے لگائے پھرا کرتا تھا۔ وہ نہیں سمجھتی، میں تو اپنی حدود سے آگاہ ہوں اور تم نے مجھے ہی......''

اس کے آگ برساتے لہجے میں دکھ کی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ لڑکی اسے جانتی ہی نہ ہو، سمجھتی ہی نہ ہو۔ پھر وہ کیسے سوچ سکتی تھی کہ سمیع کے اندر کوئی غلاظت کوئی کھوٹ ہوگی۔ انوشہ کو سمیع کی حالت دیکھ کر افسوس سا ہوا۔ بھلا کیا ضرورت تھی جس چیز کی طرف اس کا دھیان تک نہ تھا اسے سامنے لانے کی۔ وہ اسے بتانا چاہتی کہ اس کو سمیع پر کوئی شک نہیں ہے۔ وہ تو صرف احتیاطاً ہی۔ مگر سمیع نے کھانا ادھورا چھوڑ دیا۔ اک سلگتی ہوئی نگاہ فریج کے پاس کھڑی اس لڑکی پر ڈالی۔ وہ آج سے پہلے اسے کبھی اتنی بری نہیں لگی تھی۔ پھر بنا کچھ کہے چلا گیا۔ انوشہ انگلیاں چٹخانے لگی۔ اسے پتا تھا۔ آج وہ سو نہیں سکے گا۔ بس ساری رات جلتا کڑھتا رہے گا۔

''ناحق اسے پریشان کیا......''

ادھ کھائی روٹی پر نظریں جمائے وہ سوچ رہی تھی۔

* * *

وہی ہوا تھا۔ جس کی طرف سمیع کا دھیان بھی نہ تھا۔ اب وہ بار بار اس کے سامنے آتی تھی۔ رجا اس کی طرف لپکتی بازو پکڑتی لاڈ سے گلے میں بانہیں ڈالتی۔ کندھے پر سر رکھ کر سامی...... سامی پکارتی۔ وہ ایک دم بدک جاتا۔ اسے پرے دھکیل دیتا۔ مستقل جھنجلاہٹ اعصاب پر سوار رہنے لگی تھی۔ وہ انوشہ کو گھورتا۔ یہ سب اسی کا تو کیا دھرا تھا۔ رجا یونہی بے نیازی سے نبیل کے سامنے آتی تو وہ اسے بہانے سے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے جاتا۔ نبیل کا اس کے گال تھپتھپانا، ناک کھینچنا، کندھے پر بازو پھیلا کر ساتھ لگانا از حد چبھنے لگا تھا۔ لاشعوری طور پر اسے لگتا وہ یہ سب شعوری طور پر کرتا ہے۔ یہ جھنجلاہٹ اتنی بڑھی تھی کہ وہ زیادہ تر گھر سے باہر وقت گزارتا تھا۔

جمال، انور کو لے آیا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت اول فول بکتے اس غلیظ بڈھے کو دیکھ کر انوشہ کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ دھاڑیں مار مار کر روئے یا اسے کسی خیراتی ہسپتال میں پھینک آئے کوئی اس سے پوچھے تو صاف مکر جائے کہ وہ اس کا کچھ لگتا بھی ہے۔

اور صحن میں وہ یوں بیٹھی تھی گویا ساری دنیا سے روٹھ گئی ہو۔ آج وہ سکول بھی نہیں گئی تھی۔ نہائی بھی نہیں تھی اور بال بھی نہیں بنائے تھے۔ مارے باندھے گھر کے کام نبٹا کر اب وہیں بیٹھی تھی۔ اندر سے ابا کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ پانی مانگ رہا تھا۔ مگر وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھی رہی۔ وہ کون سا اسے پکار رہا تھا۔ وہ جن جن کے نام لے رہا تھا وہ انہیں نہیں جانتی تھی۔ مگر یہ نام کلیجے میں تیر کی طرح لگتے تھے...... وہ رو نہیں رہی تھی۔ بس زور زور سے انگلیاں چٹخاتی تھی۔ انور کی آواز بلند ہوتی تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی۔ بس وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ ”سالیاں کتیاں اب نہیں آئیں گی۔“ وہ اب گندی گالیاں بک رہا تھا۔ انوشہ نے گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔ وہ اس وقت ساری دنیا سے چھپ جانا چاہتی تھی۔ انور کی آواز مدھم ہوتے ہوتے بالکل ہی معدوم ہو گئی۔

اس نے سر اٹھا کر ڈوبتے سورج کو دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ اسے نہیں یاد کہ اس نے کبھی خواب بھی دیکھے تھے۔ یہاں ان کے عذابوں سے آشنائی بہت پہلے ہو گئی تھی۔ جب لوگ اسے دیکھ کر کہتے تھے۔

”اچھا...... اچھا یہ اس انور کی بیٹی ہے؟“

ان کے لہجے کی معنی خیزی اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس وقت اور اب بھی اگر اس سے کوئی پوچھے کہ اس کے نزدیک خوش قسمت کون ہے تو وہ کہتی۔

”اک باعزت شخص کی بیٹی۔“ وہ باعزت شخص کی بیٹی نہیں تھی ہاں اک باعزت شخص کی بیوی بننے کا خواب ضرور دیکھا تھا۔ مگر اب تو لگتا تھا واقعی خواب دیکھنا اس کا مقدر نہیں، البتہ اس کا عذاب سہنا اس کی قسمت میں ضرور لکھا گیا ہے۔

انور نے اک بار پھر پکارا تھا۔

انوشہ نے پھر کان بند کر لینے چاہے مگر نہ کر سکی۔ وہ اس بار اس کی ماں کو پکار رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد تھا بے تحاشا، دکھ اور پشیمانی۔

وہ پکارتا رہا...... پکارتا رہا پھر اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم بھی نہیں آؤ گی؟“

وہ تڑپ کر اٹھی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ بستر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

وہ کچھ لمحے دیکھتی رہی پھر گلاس بھرا۔ سرہانے کی طرف بیٹھ کر اس کا سر ذرا سا اونچا کیا اور گلاس لبوں سے لگانا چاہا۔

”کون...... کون؟“ وہ بڑبڑایا۔

”میں ...... انوشہ۔“

”انوشہ......“ اس نے اپنی گدلی آنکھیں کھولیں اور نظریں اس کے چہرے پر لگا دیں۔

”ہاں تم مجھے پتا تھا۔ تم آؤ گی، تم میری بیٹی ہو نا۔“

وہ غٹا غٹ پانی چڑھا گیا انوشہ کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر روئے۔

وہ بے سدھ سا ہو گیا تھا۔ انوشہ باہر نکل آئی۔ اس نے تسلے میں پانی لیا اور تولیہ بھگو کر اس کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے لگی۔ انور نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ نرم اور مہربان نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ انوشہ نے اسے صاف دھلا ہوا کرتہ پہنایا۔ پھر تیل لگا کر اس کے بے حد الجھے ہوئے بال سلجھانے لگی۔

”کچھ کھاؤ گے ابا؟“ انور نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر پشت پر بوسہ دیا۔ یہ بوسہ اک باپ کا بوسہ تھا۔ شفقت و محبت سے بھرا۔

”تو بالکل اپنی ماں جیسی ہے۔“ وہ چیزیں سمیٹنے لگی۔

”خدا تجھے سکھی رکھے، تیرے سارے ارمان پورے کرے۔“

انوشہ کے ہاتھ تھم گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ لیکن اس کے باپ نے کبھی اسے دعا نہیں دی تھی۔ آج وہ دعا بھی دے رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ وہ خاموشی سے نیچے اتر گئی اور یہ پہلی اور آخری دعا تھی۔ جو اس نے اپنی بیٹی کو دی۔ کیونکہ اس کے بعد وہ گرم دودھ لے کر آئی تو وہاں اک بے روح خاموش وجود کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور انوشہ نے دیکھا وہ خالی نہ تھی اس کے دامن میں چند دعاؤں کے پھول پڑے تھے۔ وہ شرابی تھا یا جواری۔ وہ اک طوائف کا بیٹا تھا۔ مگر وہ باپ بھی تو تھا۔ جس کا احساس اسے آخری چند لمحوں میں ہوا۔

* * *

زندگی یوں معمول پر آ گئی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اک بے کار سا وجود خاموشی سے دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ انوشہ نے بھی چند دنوں کے بعد سکول جوائن کر لیا۔ سمیع کے ایگزام شروع ہو گئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مگن تھا اور زندگی رواں دواں تھی۔ بس کبھی کبھی انوشہ

خاموشی سے کمرے میں جا کر ابا کے پلنگ پر جا بیٹھتی اور سر اٹھا کر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی۔ پھر امی کی سنگھار میز، کپڑوں کی الماری، ابا کے کپڑے، چپل، سگریٹ کے خالی پیکٹ اور طبلے، وہ انگلیاں ان کی ہموار سطح پر پھیرتی تو یوں لگتا یہ جاگ اٹھے ہیں۔ بنا بجائے ان میں سے تھاپ نکلنے لگی۔ اک نامعلوم سی وحشت اس کے وجود میں پنجے گاڑتی تو وہ گھبرا کر باہر نکل جاتی۔

قدسیہ چاہتی تھیں اوپر کے کمرے کو ٹھیک کروا کے رنگ و روغن کروا دیں تاکہ جمال کی دلہن کے کام آئے مگر قصداً انوشہ سے نہ کہتی تھیں۔ ایک دن اس نے خود ہی سب کاٹھ کباڑ نکال صحن کے کونے میں ڈھیر کر دیا۔ بس وہی چیزیں رکھیں جنھیں ٹھیک کروا کے کسی کام میں لایا جا سکے۔ جمال نے اپنی پسند سے کمرے میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ انوشہ سے بھی مشورہ لیا۔ اوپر کا کمرہ یکسر بدل گیا تھا۔ جمال کا ارادہ تھا کہ پچھلا پلاٹ جو کہ اب انوشہ کی ملکیت تھا۔ اس پر اک چھوٹا سا خوبصورت گھر بنوائے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ ابھی سے پیسے جمع کرے گا۔ وہ آج کل خوش تھا۔ ہر وہ کام کرنے کی کوشش کرتا جو انوشہ کو پسند ہو۔ رجا سے بھی اس کے تعلقات بہتر ہو گئے تھے۔ وہ اوپر سے نیچے آئی تو جمال جو سیڑھیوں کے پاس کرسی پر بڑے ریلیکس موڈ میں بیٹھا کسی خوش کن احساس میں مگن تھا۔ آہٹ پر چونکا۔

"انوشہ! ارے بھاگی کدھر جا رہی ہو۔ ذرا دیر کو رکو تو۔"

"مجھے کہاں بھاگنا ہے۔" وہ بادل نخواستہ رکتے ہوئے بے زاری سے گویا ہوئی۔

"ذرا دیر بیٹھو تو۔" جمال نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کچھ کام ہے۔"

"کام تو ہوتے رہیں گے۔" اس نے جلدی سے سگریٹ ایک طرف اچھال دی۔ جانتا تھا اسے سگریٹ کی بو کتنی بری لگتی ہے۔ "تھوڑی دیر بیٹھو تو۔" جمال نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔

انوشہ نے یوں اس کا ہاتھ جھٹکا۔ گویا کوئی غلیظ جانور چھو گیا ہو اور تیزی سے پلٹ کر اندر چلی گئی۔ جمال نے بے حد حیرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ الجھ گیا تھا۔ آخر وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہے۔ انوشہ کے انداز میں اس کے لئے واضح بیزاری تھی۔ قدسیہ ادھر ادھر چیزیں سمیٹنے لگی تھیں۔ جمال نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر سیاہ بادل منڈلانے لگے تھے اور ہوا میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ بارش کے آثار نمایاں تھے۔

"یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے؟....." اس نے جھنجھلا کر ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"جمال! تم فارغ ہو مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے؟"

قدسیہ نے اسے وہیں جے دیکھ کر پوچھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

قدسیہ اندر گئیں۔ واپس آئیں تو تین تصویریں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ خود سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے تینوں تصویریں اس کی طرف بڑھا دیں۔

"ذرا دیکھو تو۔"

جمال نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تینوں تصویروں پر اک سرسری نگاہ ڈالی۔ تینوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ یا کم از کم تصویروں میں تو لگ رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ ماں کی طرف دیکھا۔

"یہ کس لئے؟......"

وہ اسے ان لڑکیوں کے بارے میں بتانے لگی۔

"آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟"

"پگلے! شادی نہیں کرو گے؟"

"ان سے......"

"تینوں سے نہیں ان میں سے کسی ایک سے۔" وہ مسکرائیں۔

"ان میں کسی سے نہیں۔" جمال نے تینوں تصویریں واپس کر دیں۔

"تو پھر؟" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

"آپ کو سامنے کی چیز کیوں نظر نہیں آتی۔" جمال نے انگلی کی جنبش سے سگریٹ پر جمی راکھ جھٹکی۔

"کون؟......" وہ ہاتھ میں پکڑی تصویروں پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔

"انوشہ......" جمال کو ان کے یوں کنی کترانے پر حیرت سی ہوئی۔

قدسیہ چپ سی ہو گئیں۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"میرا خیال تھا کہ وہ سمیع......"

"سمیع۔" وہ بری طرح چونکا "سمیع کیوں؟"

"میرا خیال تھا کہ دونوں کا مزاج ملتا ہے۔"

"یہ خیال صرف آپ کا ہے امی جان یا سمیع کا بھی ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولیں، باہر ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔

"بہرحال۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ میں انوشہ کے ساتھ اچھی زندگی گزار سکتا ہوں۔ آپ اس کے بارے میں سوچیں یا پھر کسی کے بارے میں نہیں۔" وہ حتمی انداز و قطعی لہجے میں کہہ کر اوپر چلا گیا۔ وہ عجیب مشکل میں پھنس گئی تھیں۔

"اندر آئیں بڑی امی! بارش میں کیوں بھیگ رہی ہیں......" انوشہ نے برآمدے میں کھڑے ہو کر پکارا۔

رجا بارش میں گول گول گھوم رہی تھی۔ کبھی مٹھیوں میں پانی بھرنے کی کوشش کرتی۔ بارش بھی تیز ہو گئی تھی۔ خلاف معمول وہ بنا رجا کو ٹوکے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ انوشہ نے کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں رکھیں۔ رجا کو اندر جانے کو کہا اور خود کچن میں چلی گئی۔ رجا وہیں کھیلتی رہی۔

بارش نے اس کے وجود میں عجیب سی سرخوشی بھر دی تھی منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتی وہ یہاں وہاں بھاگتی پھر رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی تو یونہی دروازہ کھولنے بھاگ گئی۔ سمیع اس کا حلیہ دیکھ کر بری طرح جھنجھلایا۔ وہ بے تکلفی سے نبیل سے چاکلیٹ مانگنے لگی۔

"اندر چلو۔" سمیع کا لہجہ بے حد غصیلا تھا۔ چاکلیٹ وصول کر کے وہ بھاگتی اچھلتی اندر جانے کے بجائے صحن میں جا رکی تھی۔ سمیع نے دیکھا۔ نبیل کی نگاہیں بار بار اس کے بھیگے سراپے پر پھسل رہی تھیں۔

"یار! یہ رجا تو......" نبیل کے منہ سے نکلا۔ پھر ایک دم خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کا سپید چہرہ سرخ سا ہو گیا تھا۔

سمیع نے ایک جھٹکے سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ "اندر آؤ۔" اس کا لہجہ حد درجہ ترش تھا۔

* * *

سمیع کے ایگزام ختم ہو گئے تھے۔ لیکن وہ آرام کرنے کے بجائے جاب کی تلاش میں سارا دن گھر سے باہر گزارتا۔

البتہ رات کو جلدی گھر آ جاتا تھا۔ اب تو جمال کی بھی بیرونی سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ بھی زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتا۔ جتنا وہ انوشہ کی طرف لپکتا تھا۔ وہ اتنا ہی اس سے کتراتی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد جب سب لوگ ٹی وی کے گرد جمع ہو گئے تھے تو وہ چپکے سے اوپر چلی آئی اوپر خاموشی تھی۔ چاندنی چٹک رہی تھی۔ کہیں کہیں آوارہ بدلیاں تھیں اور سبک خرام ہوا۔ وہ دونوں کہنیاں دیوار پر ٹکا کر دور تک پھیلے مکانوں اور درختوں پر کھیلتی چاندنی کو دیکھنے لگی۔ ذہن بالکل خالی خالی سا تھا۔ وہ بالکل بھی کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ یا سوچنا نہیں چاہتی

تھی۔

"یا اللہ انجام کیا ہے۔ کیا وقت یونہی بنا کسی آہٹ کے گزرتا چلا جائے گا۔ یوں لگتا ہے اب کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ دن سے رات کرنا ہے اور بس۔"

ذہن میں دھیرے دھیرے سوچیں ڈوبنے ابھرنے لگی تھیں۔ تب ہی اک سایہ چپکے سے قریب آن کھڑا ہوا۔

وہ ایک دم ڈر گئی۔ پھر اک طویل سانس لے کر ذرا سا پیچھے ہٹی۔

"جمال بھائی! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔"

"تم مجھ سے ڈرتی ہو؟" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں صرف آپ کی اچانک آمد سے ڈر گئی تھی۔"

"انوشہ! مجھ سے کتراتی کیوں ہو؟"

انوشہ کو اس کا لہجہ عجیب عجیب سا لگا۔ ہلکے سے درد میں ڈوبا ہوا۔ جیسے کسی بہت ہی اپنے سے شکوہ کیا جائے۔ وہ اس کے اس لہجے سے گھبراتی تھی کہ چاہتی بھی تو ان جذبوں کی پذیرائی نہ کر سکتی تھی۔ سمیع نہ ہوتا تب بھی نہیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" جمال چپ سا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ نیچے چلی جائے۔ وہ بزدل نہ تھی مگر اپنے اور جمال کے درمیان تنی خاموشی اسے ہولا رہی تھی۔

"آج موسم اچھا ہے۔"

"کچھ خاص نہیں۔"

اس نے نیچے جانے کو قدم بڑھائے مگر جمال نے اسے بازو سے پکڑ کر دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ مگر بازو نہیں چھوڑا تھا۔

"کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسا۔ اس سمیع کی وجہ سے؟"

"آپ......" مارے غصے کے اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

"کیا ہے اس میں۔ جو تم اس کی طرف داری کرتی ہو اور مجھ میں کیا کمی ہے میں کیا نہیں دے سکتا ہوں تمہیں۔ محبت، عزت، تحفظ، بدصورت ہوں؟ بے روزگار ہوں؟ کوئی ایک کوئی ایک وجہ تو بتاؤ مجھے ٹھکرانے کی۔"

اس کی انگلیاں سخت لوہے کی طرح بازو میں گڑی تھیں۔

"تمہیں بتانا ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ نہ جانے تکلیف، احساسِ توہین سے۔ "تم ہوتے کون

ہو یہ سب پوچھنے والے۔"

"تمہیں بتانا ہوگا انوشہ...... کیوں تم مجھے ٹھکراتی ہو سمیع مجھ سے زیادہ بہتر تو نہیں۔" انوشہ نے خود کو چھڑاتے ہوئے اسے زور سے دھکا دیا۔

"بتاؤں تمہیں، وہ کیوں بہتر ہے؟ اس کے ذہن میں تمہارے جیسی غلاظت نہیں۔" وہ گویا پھنکاری تھی۔

جمال ساکت کھڑا رہ گیا۔ پھر ایک دم ہوش میں آ کر جھپٹا۔ "بتاؤں تمہیں غلاظت کہتے کسے ہیں؟"

وہ دوڑ کر سیڑھیاں اتر گئی۔

واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے سمیع نے بے حد حیرت سے اسے یوں اترتے دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" صحن میں جلتی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

"اوپر کون ہے؟"

"کون ہوگا؟" وہ چڑ کر کہتے ہوئے کچن میں جا گھسی تھی۔ سمیع نے الجھے الجھے انداز میں نل بند کیا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ صحن خالی تھا۔ اندر والے کمرے میں لائٹ جل رہی تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ جانتا تھا جمال اوپر ہے۔ وہ واقعی الجھ گیا تھا۔

اگلے دن جب وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ جمال نے اپنے رویے پر معذرت کی تھی۔ الجھے الجھے بالوں کے ساتھ وہ انوشہ کو خاصا مضطرب سا لگا۔

"مجھے غصہ آ گیا تھا۔ کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی۔" کچن کے دروازے میں کھڑا وہ بڑی آس سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آئندہ احتیاط کیجئے گا۔" وہ نارمل سے لہجے میں گویا ہوئی۔

"مجھے نہیں پتا، تم نے کیسے میرے بارے میں یہ اندازہ لگا لیا۔ میں نے تو کبھی۔"

"بس کریں جمال بھائی! مجھے آپ سے اور کوئی بات نہیں کرنا۔" انوشہ کا لہجہ صاف اور دوٹوک تھا۔

"گویا تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

وہ خاموشی سے اپنے کام میں مگن ہو گئی تھی۔ گویا وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ جمال نے بے حد مایوسی سے اسے دیکھا۔ یہ لڑکی جتنی اس کے دل کے قریب تھی۔ وہ اتنا ہی اس کے دل سے

دور تھا۔ بھلا وہ کیسے اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ محبت مجبوری کا سودا تو نہیں۔ اگر وہ اسے خود سے شادی پر آمادہ کر بھی لے تب بھی۔ تب بھی کیا انوشہ اسے دل سے قبول کر لے گی؟ انوشہ اس کی خود پر جمی نگاہیں محسوس کر رہی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جا چکا تھا۔

انوشہ اک طویل سانس کھینچ کر کام میں مصروف ہو گئی۔

* * *

گھر میں عجیب یاسیت کی فضا چھائی رہتی تھی۔ جمال تو گھر میں رہتا ہی کم تھا۔ کبھی ہوتا تو مستقل کمرے میں بند رہتا۔ اوپر کا کمرہ اب اسی کی ملکیت میں تھا۔ صفائی کے دوران ڈھیروں سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ نکلتی۔ قدسیہ دل مسوس کر رہ جاتیں۔ انہوں نے شادی کی باتیں کی تو اس نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ انوشہ سکول سے آتی تو گھر کے کاموں میں خود کو الجھائے رکھتی اور تو اور رجا کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ بس ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھتی۔ سمیع نے دانستہ اسے نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اب پہلے کی طرح اس کی طرف لپکتی نہ تھی۔ کبھی کبھی چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ جاتی۔ سمیع مصروف رہتا، وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ کئی بار سمیع نے اسے ڈانٹا تھا۔ ساری دنیا کی ناراضی اور ڈانٹ ایک طرف مگر سمیع کی بات کچھ اور تھی۔ رجا کی حالت اس بچے کی طرح تھی جو ماں سے ناراض ہو مگر منتظر ہو کہ ماں اسے بلا لے گی۔ پکار کر ایک بار پیار کرے گی۔

کبھی کبھی سمیع کو خود پر غصہ آنے لگتا۔ وہ کیوں بے وقوف انوشہ کی باتوں میں آ کر رجا کے ساتھ یہ سب کر رہا تھا۔ مگر اہم بات تو یہی تھی کہ اس نے کبھی بھی انوشہ کو بے وقوف نہیں سمجھا تھا۔ وہ اچھی خاصی سمجھدار اور پریکٹیکل لڑکی تھی۔ پھر بھی اسے لگتا، وہ رجا کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ مگر آج جو بات انوشہ نے کہی ہے۔ وہ کل کوئی اور بھی کہہ سکتا تھا۔ اس کی توجہ ذرا بھی ٹی وی کی طرف نہیں تھی۔ جمال آیا تب وہ اپنی سوچوں سے چونکا۔

"کھانا لاؤں؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"جی......" سمیع نے کہا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

جمال خاموشی سے ٹی وی کے چینل بدلتا رہا۔ دونوں بھائیوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ تب ہی رجا بھاگتی ہوئی آئی۔ وہ قدسیہ کے پاس آئی تھی۔ سمیع کو دیکھا تو میز پر پاؤں رکھ کر پائنچہ اٹھا کر اسے دکھانے لگی۔ کسی زہریلے کیڑے نے پنڈلی پر کاٹ لیا تھا۔ جلد سرخ ہو رہی تھی۔ سمیع قدرے گھبرا کر مکمل طور پر رجا کی طرف پلٹا۔ وہ کچھ بھی نہ بول رہی تھی مگر آنکھیں

لبالب پانی سے بھری تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟ تم کہاں تھیں؟"

وہ کچھ نہیں بولی، نچلا ہونٹ کاٹ کاٹ کر سرخ کرتی رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں......؟"

نگاہ بھٹک کر جمال تک گئی۔ جس کی نگاہ ملائم گوری پنڈلی سے اوپر تک سفر کر رہی تھی۔
اس کی نگاہ میں کچھ تو ایسا تھا کہ سمیع کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے سرعت سے پائنچہ کھینچا اور درشت لہجے میں بولا۔

"امی کچن میں ہیں۔ جاؤ ان کے پاس۔"

رجا کو سمیع سے اتنی سختی کی امید نہیں تھی۔ وہ کچن میں بھاگ تو گئی مگر اس کے رونے کی آواز اندر آنے لگی تھی۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ بس روئے جا رہی تھی۔ سمیع لب بھینچے ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"رجا تو خاموش ہی نہیں ہو رہی سمیع! تم ہی چپ کرا دو۔" قدسیہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھ کر کہا۔

"سمیع صاحب آج کل اونچی ہواؤں میں ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت کہاں۔" جمال نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"رجا کی ٹانگ پر کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ کچھ لگا دیں۔"

دسترخوان میں لپٹی روٹی نکالتے ہوئے سمیع نے کہا۔

"ارے اس نے مجھے تو بتایا نہیں۔" قدسیہ حیرت سے کہتی تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"تمہاری نوکری کا کچھ بنا؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جمال نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" سمیع نے مختصراً کہا۔ وہ اس وقت جمال سے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"ہو جائے تو اچھا ہے۔ میں کب تک اس گھر کا خرچ۔"

جملہ اس نے دانستہ ادھورا چھوڑا تھا۔

سمیع کے لئے نوالہ اتارنا مشکل ہو گیا تھا۔

* * *

کچھ دنوں سے جمال کے اندر اک عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ انوشتہ کو یکسر نظرانداز کرنے لگا تھا۔ راتوں کو تو اکثر ہی دیر سے آنے لگا تھا۔ مگر اس کے مزاج میں جو چڑچڑا پن اور بے دلی نمایاں ہوئی تھی، وہ غائب ہو گئی تھی۔ قدسیہ اس کے انتظار میں آدھی

رات تک جاگا کرتیں۔ وہ واپس آتا تو اس کی آنکھوں میں چمک دوگنی ہوتی۔ لبوں پر گنگناہٹ۔ وہ بے پروائی سے کہتا۔

"کتنی بار کہا ہے امی! میرے لئے مت جاگا کریں۔ میرا کیا ہے، دیوار پھلانگ کر آ جایا کروں گا۔"

"دیوار چور پھلانگ کر آتے ہیں جمال بیٹے۔"

وہ رسانیت سے کہتیں۔ مگر اندر ہی اندر سہم جاتیں۔ جمال کے انداز بدلے بدلے سے لگتے تھے۔ اس کے ملبوس سے اٹھی خوشبو کی لپٹیں انہیں ہولا دیتیں۔

"کہیں اس کے قدم بھی۔" اس سے آگے تو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔

"اگر انوشہ مان جائے تو شاید جمال سنبھل جائے۔"

وہ ماں بن کر سوچتیں۔ مگر انوشہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ یتیم لڑکی کے ساتھ کیسے زبردستی کرتیں۔

جمال صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہ ان دنوں عجیب خلفشار کا شکار تھا۔ متضاد قسم کے جذبات اس کے وجود میں ہلچل سی مچائے رکھتے۔

موسم بدل رہا تھا۔ فضاء میں نئے موسم کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ دھوپ ساری ڈھل چکی تھی۔ رجا درخت کی شاخوں سے پتے نوچ نوچ کر نیچے پھینک رہی تھی۔ نہ جانے کس کا غصہ ان پر نکال رہی تھی۔

جمال نے اک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور اک لمبا کش کھینچتے ہوئے سوچا۔ "بے چاری لڑکی۔"

وہ اس وقت انوشہ کو سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ پھر اس کے اندر غصہ ابلنے لگتا۔ اسے سمیع سے نفرت محسوس ہوتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر انوشہ نے سمیع کو اس پر ترجیح کیوں دی۔ وہ رجا کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ لئے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے بہت گہری سوچ میں تھی۔ ایسے میں کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔

جمال کے اردگرد ہلکی سی کھنکتی ہنسی گھنگھروؤں کی جھنکار میں مدغم ہونے لگی تو مبہم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

"ہاں چاچا انور! تم نے یونہی نہیں اپنی عمر گنوا دی۔"

بہت دیر تک وہ اسی خوبصورت احساس میں گھرا رہا لیکن اک تیزی سے ابھرتی سوچ۔

"رجا کی شکل پری گل سے کتنی ملتی ہے۔"

اس نے آخری کش لے کر باقی سگریٹ باہر اچھالا اور خود باہر آ گیا۔ رجا کے ساکت وجود میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تھی۔

"ہاں واقعی!" اس نے گویا قریب سے دیکھ کر تصدیق کی تھی۔ سیاہ آدھی آستین کے کڑھائی والے کرتے پائجامہ میں اس کی گوری رنگت لشک رہی تھی۔ بے حد سلکی بال پیشانی پر ہلکورے لے رہے تھے۔

"وہی ناک، وہی سیاہ گھور آنکھیں، وہی لب گلابیاں چھلکاتے ہوئے۔"

"رجا کیا سوچ رہی ہو؟" وہ آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

رجا کچھ بھی نہیں بولی تھی۔

جمال نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے ہاتھوں میں لے کر دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ چھوٹے چھوٹے نرم گلابی ہاتھ۔

"ہاں۔ پری گل کے ہاتھ ایسے نہیں ہیں۔" اس نے سوچا۔

رجا نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"رجا گڑیا خفا ہے ہم سے۔" جمال نے آہستگی سے اس کا گال چھوا۔

رجا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ اپنے خیالات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔

"میں رجا کو طوطا لا کر دوں گا، سفید والا۔"

رجا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے گردن گھما کر جمال کو دیکھا۔

"ہاں کل ہی لے آؤں گا۔ تم تو بہت پیاری لڑکی ہو۔"

اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر تھپتھپایا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش اتر آئی تھی۔

"بتاؤں تمہیں، وہ کیوں بہتر ہے۔ اس کے ذہن میں تمہارے جیسی غلاظت نہیں۔" وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ جسم کے اک اک مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ کیا کرنے لگا تھا۔

"جمال بھیا، لاؤ گے نا...... میں دو لوں گی۔" رجا کی چپ ٹوٹی تھی۔

وہ بھاگتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ اور پھر رات گئے تک گھر نہ آیا تھا۔

* * *

اگلے دن رجا نے اس کی جان کھانی شروع کر دی کہ وہ طوطا کیوں نہیں لایا۔

"تم ساری رات گھر نہیں آئے۔ جمال! کیوں ماں کو پریشان کرتے ہو۔"

قدسیہ نے تھکے تھکے سے لہجے میں شکوہ کیا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی تھیں۔ جمال نے جواب نہیں دیا۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگا۔

انوشہ سرف میں اپنا سوٹ بھگو رہی تھی۔ جمال کی چپ اسے کچھ عجیب سی لگی۔ تب ہی پوچھ بیٹھی۔

"کھانا لاؤں جمال بھائی۔"

"نہیں......" جمال نے اسے دیکھا اور اوپر چڑھ گیا۔ انوشہ کو اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے خوف سا محسوس ہوا۔

"یہ لڑکا مجھے بہت دکھ دینے لگا ہے۔" قدسیہ زیر لب بڑبڑائیں۔ انوشہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

رجا جمال کے پیچھے ہی اوپر آئی تھی۔ اسی طوطے طوطے کی رٹ سے جمال کو زچ کر رہی تھی۔

"اب تم میرے پیچھے آئیں تو میں تمہیں تھپڑ دے ماروں گا۔"

اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بے حد نفرت اور غصے سے رجا کو پیچھے دھکیلا اور اندر گھس کر دھاڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ غصے سے بند دروازے کو ٹھوکریں مارتی رہی۔ پھر جا کر منڈیر پر پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھ گئی۔ غصہ پھر بھی ٹھنڈا نہ ہوا تو ذرا آگے جھک کر کھسکی اور ٹہنی پر جا کر بیٹھی۔

جمال نے پلنگ پر کچھ لمحے سونے کی کوشش کی۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ کمرے میں حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے جیب سے ٹٹول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اک سگریٹ سلگا کر اٹھا اور کھڑکی کھول دی۔ پھر وہ جھنجلا گیا اور اس کی جھنجلاہٹ کوفت میں بدل گئی، رجا درخت پر بیٹھی تھی۔

"بھاڑ میں جائے۔" اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ آئینے نے اس کا اصل روپ دکھایا تھا۔ اب وہ خود کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہا تھا۔

سمیع اوپر آیا تھا۔ وہ رجا کو یوں درخت پر بیٹھنے پر ڈانٹ رہا تھا۔ اترنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ ناراض تھی۔ اس لئے ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔ سمیع نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور جانے کس

چیز کا لالچ دیا تھا۔ رجا نے قدرے اشتیاق سے سمیع کو دیکھا۔ پھر بجائے آرام سے اترنے کے ایک دم چھلانگ لگا دی اور پوری کی پوری اس پر جا گری تھی۔ سمیع جو کہ پنجوں کے بل بیٹھا تھا خود کو سنبھال نہ سکا اور عقب میں گرا۔

رجا کی بچوں کی سی معصوم ہنسی سے فضا کھلکھلا اٹھی۔ وہ بجائے اٹھنے کے اپنی ہی شرارت سے محظوظ ہوتی۔ دونوں کہنیاں اس کے سینے پر ٹکا کر کچھ کہنے لگی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے سمیع نے اسے پرے دھکیلا اور اٹھ کر کپڑے جھاڑنے لگا۔ خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس خفت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب اس نے انوشہ کو دیکھا جو شاید کپڑے پھیلانے اوپر آئی تھی اور سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ رجا کو وہیں بسورتا چھوڑ کر تیزی سے نیچے اتر گیا۔

انوشہ خاموشی سے کپڑے پھیلانے لگی۔

جمال کے لبوں پر زہر خندسی مسکراہٹ بکھر گئی۔ دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ باہر آیا اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے انوشہ کے قریب آ گیا۔

"بد سے بدنام برا۔"

انوشہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دھوئیں کے مرغولے کے عقب سے وہ گہری اور جانچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جمال بھائی۔" اس نے بے حد سنجیدگی اور رسانیت سے پوچھا۔

"مجھے کیا کہنا ہے انوشہ بی بی! جب آپ کی آنکھوں پر پیار کی اندھی پٹی۔"

"جمال بھائی پلیز......" وہ دبے دبے لہجے میں چیخ اٹھی اس کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ جمال کے لبوں کی مسکراہٹ کچھ اور زہریلی ہوئی۔ وہ بنا کپڑے پھیلائے نیچے چلی گئی۔ جمال نے سگریٹ نیچے پھینک کر پورے زور سے قدموں تلے مسلا تھا۔

* * *

وہ ایک عام سا دن تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں کے لئے نکل چکے تھے۔ بس قدسیہ اور رجا ہی گھر پر تھیں۔ عموماً انوشہ ناشتہ بنا کر کچن صاف کر کے جاتی تھی۔ مگر آج وہ کچھ لیٹ ہو رہی تھی۔ اس لئے افراتفری میں نکل گئی تھی۔ قدسیہ نے برتن دھو کر کچن صاف کیا۔ باقی کام سمیٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل کچھ بے چین تھا اور بیزاری سی ہو رہی تھی۔ وہ کچن سے باہر نکل آئیں۔ رجا برآمدے میں اپنا باکس کھولے بیٹھی تھی۔ جس میں اس کی انواع و اقسام کی

چیزیں جمع تھیں۔ وہ ان میں پوری طرح منہمک تھی۔ وہ کمرے میں چلی آئیں۔ ذہن پریشان تھا۔ جمال کی روش وہ دیکھ ہی رہی تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ شادی کر لے۔ مگر اس معاملے میں وہ کوئی بات سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ انوشہ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ وہ سمجھتی، پالنے کا خرچ وصول کر رہی ہیں۔ پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ رات بھی ٹھیک طرح سے نیند نہ آئی تھی۔ سر بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا تھا۔ پریشان کن سوچوں میں الجھتے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ جب ان کی ہمسائی کا بچہ بھاگا آیا۔ اس کی بڑی بہن کو دورے پڑتے تھے اور اس وقت گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف دونوں بہن بھائی ہی گھر میں تھے۔ پاؤں میں چپل اڑس، دوپٹہ اوڑھتی وہ بھاگیں۔ رجا بس دیکھتی رہی۔ لڑکی کی حالت بری تھی۔ انہوں نے بچے کو ٹیکسی لینے دوڑایا خود گھر آ کر انوشہ کو فون کیا۔ فون مسلسل مصروف جا رہا تھا۔ پھر جمال کو فون کر کے کہا کہ وہ گھر آ جائے۔ وہ رجا کو اس طرح اکیلے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ جمال نے کہا تھا کہ وہ آ جائے گا۔

"ضرور آ جانا۔ میں مریم کو لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔ گھر اکیلا ہے اور رجا......" انہوں نے تاکید کرنا چاہی۔

"کہہ دیا نا امی! میں آ رہا ہوں؟" وہ جھنجلا گیا۔ "اب اس کی چوکیداری بھی۔"

وہ نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ انہوں نے مزید کچھ بھی سننے سے پہلے ریسیور رکھ دیا۔

"رجا! بیٹا اٹھو دروازہ بند کر لو۔"

رجا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ پھر ماتھے پر بکھرے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کدھر جا رہی ہو؟"

"میں بس ابھی آتی ہوں۔ مریم ہے نا، اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔" باہر ٹیکسی رکی تھی۔ وہ بعجلت باہر کی طرف بڑھیں۔

"دروازہ اچھی طرح سے بند کر لینا۔ ابھی جمال آئے گا۔ بس اسی کی آواز پر دروازہ کھولنا۔ سن رہی ہونا۔"

رجا نے اچھے بچوں کی طرح سر ہلا دیا۔ انہوں نے باہر نکل کر دوبارہ یہ سب دہرایا۔

رجا نے ان کے کھڑے کھڑے ہی اندر سے کنڈی لگائی تھی۔ پھر وہ اپنی بکھری چیزیں سمیٹ کر ڈبے میں بند کرنے لگی۔ گھر میں ایک دم سے شدید خاموشی چھا گئی تھی۔ چیزیں سمیٹتے سمیٹتے اسے احساس ہوا تو سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ صحن کی دیوار پر ننھی سی چڑیا پھدک

پھدک کر شور مچانے لگی۔ رجا نے اشتیاق سے اسے دیکھا۔

"شی......شی......" اس نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ چڑیا پھر سے اُڑ گئی۔

وہ اپنی چیزیں ڈبے میں سمیٹ کر ڈبہ سنبھال کر الماری میں رکھ آئی۔ پھر بچوں کی طرح اچھلتی، دوپٹے کو مفلر کی طرح جھلاتی اوپر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی مگر درمیان میں ہی رک گئی۔

"امی تو گھر پہ نہیں ہیں۔"

پلٹ کر اتری اور کچن میں گھس گئی۔ الماری کھول کر سرخ ڈھکن والا چینی کا ڈبہ اٹھا لیا۔ اس نے کھولنا چاہا۔ مگر ڈھکن سختی سے بند تھا۔ وہ زور زور سے ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈھکن نہیں کھل رہا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔

تب ہی کال بیل کی تیز آواز پورے گھر میں گونج اٹھی۔

ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ ڈھکن کھل گیا اور ساری چینی کچن کے فرش پر بکھر گئی۔

بیل دوبارہ ہوئی۔

وہ جلدی سے نیچے بیٹھی اور مٹھیاں بھر بھر واپس ڈبے میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر گھبراہٹ میں وہ جتنی ڈال رہی تھی، اس سے زیادہ گر رہی تھی۔

بیل اب مسلسل چیخنے لگی تھی۔

رجا نے ڈبہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ غصے میں کھڑے ہو کر اسے ٹھوکر ماری۔ ڈبہ لڑھکتا ہوا کچن کے دروازے سے باہر جا پڑا تھا۔ خود وہ باہر کا دروازہ کھولنے بھاگ گئی۔

"کون ہے......؟"

دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز سن کر اس نے جھٹ سے کنڈی کھول دی تھی۔

* * *

سمیع انٹرویو دے کر باہر نکلا تو دھوپ خاصی تیز تھی۔ پیاس شدید تھی اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔

"گھر چلا جائے۔"

اس نے سوچا۔ پھر سامنے "برگر الیون" پر نظر پڑی تو اندر چلا گیا۔ برگر اور کولڈ ڈرنک لے کر کونے والی میز کی طرف بڑھ گیا۔

کولڈ ڈرنک کے دو ٹھنڈے گھونٹ اندر گئے تو جہاں پیاس کو تسکین ملی۔ وہیں بھوک بھی چمک اٹھی۔ برگر کا پہلا نوالا لیتے ہی اسے عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا اور یہ بے چینی اتنی شدید

تھی کہ وہ ایک کے بعد دوسرا نوالہ نہ لے سکا۔ برگر رکھتے ہوئے اس نے اپنی اس عجیب سی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بس اچانک۔ اس نے سب کچھ چھوڑا اور باہر نکل آیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا۔ اس کا رخ گھر کی سمت تھا۔

"سب خیریت ہو......" گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ گھر کے در و دیوار سے عجیب پُراسرار سی خاموشی لپٹی ہوئی تھی۔

"امی......!" اس کی ہلکی سی آواز اس خاموشی میں بہت زیادہ گونجی تھی۔

وہ ذرا آگے آیا تو نظر برآمدے اور کچن کے فرش تک گئی۔ یہاں سے وہاں تک چینی بکھری تھی۔

"رجا......" اس کی بلند آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

گھر میں کوئی نہ تھا۔ اس نے سب جگہ دیکھ لیا۔ کمرے، کچن، باتھ روم۔

"کہاں چلے گئے سب......" سمیع نے گویا خود سے سوال کیا۔ "امی اس طرح گھر کھلا چھوڑ کر اور رجا کو لے کر کہاں جا سکتی ہیں۔"

اسے گھبراہٹ سی ہونے لگی تو تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔

خالی صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس نے کمرے کے کھلے دروازے سے جھانکا۔ کوئی چیز اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ پھر جھک کر اٹھایا۔ وہ رجا کا دوپٹہ تھا۔

وہ پلٹا۔ درخت خالی تھا۔ وہ ذرا سا آگے ہوا۔

دوسرے پل زمین اس کے قدموں سے نکلتی چلی گئی۔ اس نے رجا کو درخت کے نیچے گرا دیکھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔

"رجا......" ایک پاؤں درخت کے ٹہنے پر ٹکا کر اس نے تیزی سے نیچے چھلانگ لگائی۔ اک نوکیلی شاخ اس کی گردن پر خراش ڈال گئی تھی۔

"رجا......" اس نے دیوانہ وار اس کی گردن اٹھا کر گھٹنے پر رکھی اور اس کے بے ہوش وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مگر دوسرے پل وہ گویا کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹا، اور خوفزدہ نظروں سے اس کے ساکت وجود کو دیکھنے لگا۔ رجا کا چہرہ اس کی سمت گھوم گیا تھا۔ معصوم بند آنکھیں اور روشن پیشانی پر بکھرے سلکی بال، خاموش گلابی لب، اور...... اور بند دل کی دھڑکن، منجمد سانسیں، زخم خوردہ وجود...... جو اپنی کہانی آپ بیان کرتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سمیع کے وجود میں اتنی جان بھی نہ رہی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔

وقت گویا ایک ہی نقطے میں سمٹ کر ساکن ہوا تھا۔

''کون تھا وہ ظالم...... شقی القلب......؟''

''رجا، میری گڑیا...... میری جان...... مجھے بتاؤ، اپنے سامی کو بتاؤ۔ کون تھا وہ۔''

دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر جھنجوڑتے ہوئے وہ گویا اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کہاں سے کوئی بچی کھچی سانس رجا کے مردہ تن میں واپس لوٹ آئے۔ اور وہ ایک بار...... صرف ایک بار اس شخص کا نام اسے بتا دے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اسے پکار رہا تھا۔ تب ہی کسی نے اسے پکارا۔ سمیع نے سر اٹھایا۔

جمال اوپر منڈھیر پر کھڑا تھا۔

''جمال بھائی! یہ...... یہ رجا......''

جمال بالکل خاموش تھا اور اس کی نظروں میں اک عجیب سا تاثر تھا۔

اتنا عجیب کہ سمیع سر تا پا ہل کر رہ گیا۔

''جمال بھائی......!''

جمال وہیں سے نیچے اترا تھا۔ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ کر اس نے رجا کی گردن پر ہاتھ کی پشت رکھ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش سی تھی۔ رجا کا جسم گرم تھا مگر زندگی سرد ہو چکی تھی۔

''یہ مر گئی ہے۔'' جمال کا لہجہ سپاٹ نہیں تھا۔ بہت کچھ تھا۔ مگر سمیع کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہ تھا۔

''نہیں یہ مر نہیں سکتی۔ ہم اسے ہسپتال۔''

''اور تماشا مت بناؤ۔'' جمال غرایا۔ سمیع پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''جمال! یہ سب کس نے......'' جواباً جمال کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ اس نے سمیع کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا اور پیچھے کو دھکیلا۔

''اتنے معصوم مت بنو۔''

سمیع عقب میں گرا تھا۔ مگر کچھ بھی بول نہیں پایا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا جمال اس پر اتنا گھناؤنا الزام کیوں لگا رہا ہے۔

جمال نے جھک کر رجا کے مردہ وجود کو بازوؤں میں اٹھایا۔ رجا کے چہرے، گردن اور گردن سے ذرا نیچے نیل کے نشان تھے۔

باقی آثار بتاتے تھے کہ وہ کسی کی ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ جمال عقبی گلی

سے اسے گھر کے اندر لے آیا تھا۔ گھر کے سامنے سڑک سنسان تھی۔ کسی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کیا قیامت گزر گئی ہے۔

پلنگ پر لٹا کر جمال نے چادر اس کے مردہ تن پر سر تا پا تان دی اور باہر آ گیا۔ سمیع معمول کی طرح اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ اب برآمدے میں سہما کھڑا تھا۔ اس میں اندر جانے کی ہمت ہی نہ تھی۔ وہ رجا کا خاموش چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر جمال کے انداز نے اسے کھل کر رونے بھی نہ دیا تھا۔ ابھی تک اک بے یقینی کا حصار تھا جو اس کے گرد تن کر تمام حسیات کو منجمد کر گیا تھا۔

بھلا رجا کیسے مر سکتی ہے۔ ابھی صبح ہی تو اپنے ماتھے پر بکھرے بال انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔

''کیا کہہ رہی تھی؟'' سمیع نے سوچنا چاہا۔ مگر ذہن پر دبیز دھند چھا گئی تھی۔

جمال نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنے اندر اٹھتے ہیجان و اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب انہیں کرنا کیا ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا۔

قدسیہ اندر آئیں۔ ''تم دونوں ہی گھر پر موجود ہو۔ چلو اچھا ہوا۔ مجھے تو رجا کی اتنی فکر تھی۔ اسے تنہا گھر جو چھوڑ گئی تھی۔ جمال کو فون کیا تھا کہ پہنچ جائے۔''

انہوں نے چادر اتار کر ہاتھ میں لے لی تھی۔

''مجھ سے پہلے سمیع جو پہنچ گیا تھا۔'' جمال کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

سمیع ساکت کھڑا ماں کو دیکھ رہا تھا۔

''انوشہ ابھی تک آئی نہیں، اس کی چھٹی کا وقت تو ہو گیا ہے۔ مریم کی حالت بہت خراب تھی۔ خیر اس کے ابو ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ میں فوراً گھر بھاگی۔ ارے یہ چینی......'' ان کی نظر یہاں سے وہاں تک بکھری چینی پر پڑی تو سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

''یہ رجا تو چینی کی دشمن ہے۔ اور تم لوگ کیوں بت بنے کھڑے ہو۔ رجا کہاں ہے؟''

جمال نے خاموشی سے اندر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

انہوں نے جھک کر چینی کا ڈبہ اٹھایا اور رجا کو پکارتی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ چند سیکنڈ گزرے تھے۔ مگر انہیں یہ لمحہ بہت طویل لگا۔ تب ہی قدسیہ کی تیز چیخ نے سمیع کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ جمال نے سگریٹ پھینک کر اسے بری طرح جوتے سے مسلا تھا۔

* * *

گھر کے در و دیوار، مکینوں کے چہروں، سوچوں اور باتوں پر موت کا سناٹا تھا۔ اتنا گہرا اور مہیب سناٹا کہ سانس گھٹتا تھا۔ رجا کو درخت کی گھنی پرسکون چھایا میں سپرد خاک کرتے ہوئے بھی یہ سناٹا نہیں ٹوٹا تھا۔ ان کی آہیں، کراہیں، آنسو سسکیاں سب کسی سرد گلیشیر تلے دب گئی تھیں۔ بس اک خوفزدہ سی خاموشی تھی جو ان کی آنکھوں میں کنڈلی مارے ہولے ہولے پھنکار رہی تھی۔ یہ شوکتی ہوئی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ رجا کی موت سر کے پچھلے حصے پر چوٹ لگنے سے ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ کسی کا نام لئے بغیر ہی مر گئی تھی اور اپنے پیچھے شک کے پھنکارتے ہوئے زہریلے سانپ چھوڑ گئی تھی۔ جمال کی آنکھوں میں حقارت اور طنز تھا۔ وہ جب بھی سمیع کی طرف دیکھتا، یہ تاثرات کچھ اور واضح ہو جاتے۔ سمیع کا جی چاہتا، وہ اس کی غلیظ آنکھیں پھوڑ کر رکھ دے۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ مگر سمیع اس سے چھپتا پھر رہا تھا۔

''مگر کیوں......؟''

رجا کو مرے بیس دن ہو گئے تھے۔ جب سڑکیں ناپتے ناپتے ایک گھنے درخت کی چھایا میں اس نے سوچا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتے گرد آلود تھے اور ان میں جکڑے پاؤں جھلس رہے تھے اور ان کی انگلیاں اکڑی ہوئی تھیں۔

''میں کیوں بھاگ رہا ہوں۔'' درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے سمیع نے خود سے سوال کیا۔ اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے ریڑھ کی ہڈی میں درد کی لہر سی اٹھی۔ اس نے ٹیک لگا کر کمر کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میں مجرم نہیں ہوں۔ مگر یوں سب سے چھپ رہا ہوں۔ جیسے میں ہی مجرم ہوں اور وہ شخص۔ وہ جمال۔'' اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ''میں جانتا ہوں۔ وہ جمال کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ وہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے دیکھی ہے جمال کی آنکھوں میں غلاظت اور وہ کمینہ خود کو چھپانے کے لئے مجھے صرف اس لئے کہ میں وہاں موجود تھا اور میں وہاں کیوں موجود تھا۔ میں جانتا ہوں۔''

اس کی آنکھیں...... یک بیک پانیوں میں ڈوب گئیں۔ اس نے دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''اس نے مجھے پکارا ہوگا۔''

''جس پل میری گڑیا نے اس درندے کا ہاتھ جھٹکا ہوگا جس لمحے وہ نیچے گری ہوگی۔

جب اس کا سر اینٹ سے ٹکرایا ہوگا۔ جس پل موت کا اذیت ناک لمحہ اس پر جھپٹا ہوگا تو......تو اس نے مجھے آواز دی ہوگی۔ مجھے پتا ہے جو آخری لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا ہوگا۔ وہ صرف میرا نام ہوگا۔ میری رجا نے مجھے پکارا تھا۔ میں یونہی تو نہیں بھاگا تھا۔

اس کے اردگرد سامی......سامی...... کی تکرار ہونے لگی تھی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اردگرد چلتے لوگوں نے توجہ نہیں کی اور اگر کی بھی تو ذرا سا ٹھٹک کر آگے بڑھ گئے۔

''کیوں...... کیوں ہوا اس کے ساتھ یہ سب......؟'' وہ ایک دم مٹھیاں بھینچ کر چیخ اٹھا۔

وہ تو کسی فرشتے کی طرح معصوم تھی۔ پھر کیوں یہ اذیت ناک موت اس کے حصے میں آئی۔

نہ جانے کب تک وہ وہیں روتا، کڑھتا اور لڑتا رہا۔ جب گھر میں داخل ہوا تو اس کے پورے وجود میں تھکن سرایت کر چکی تھی۔ کرب و اذیت سے ادھ موا ہو رہا تھا۔ سامنے صحن میں جمال، امی کے پاس بیٹھا تھا۔ سمیع کے تھکے ماندے اعصاب تن گئے۔ نس نس میں خون زہر بن کر ابلنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ جمال کے گھناؤنے چہرے پر تھوک دے۔ جبکہ اسے دیکھ کر جمال کی آنکھوں میں پُر اسرار چمک گہری ہوئی تھی۔ وہ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں آمنے سامنے کھڑے تھے گویا ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔

''سمیع......؟'' امی نے گھبرا کر اسے پکارا۔

سمیع خاموشی سے ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

انوشہ کچن سے نکلی۔ سمیع کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر ذرا آگے آئی۔ میز اٹھا کر درمیان میں رکھی اور اس پر سمیع کے لئے کھانا چن دیا۔ سمیع خاموشی سے لقمے لینے لگا۔ اسے بے حد بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر ہر لقمہ زہر بن گیا تھا۔

جمال نے تیسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے انوشہ کو دیکھا۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی سمیع کو دیکھ رہی تھی۔ جمال کے اندر جلن کا احساس بڑھنے لگا۔ سگریٹ کی راکھ انگلی کی جنبش سے جھٹکتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔''

سمیع کے اعصاب تن گئے۔ نوالہ پلیٹ میں پٹخ کر اس نے شرربار نگاہوں سے جمال کو دیکھا اور غرایا۔

''مطلب کیا ہے؟''

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔" جمال کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ سمیع نے ہاتھ مارا اور ٹرے اڑتی ہوئی برآمدے میں جا گری۔

"بکواس کرتے ہو تم۔ اپنی ذلالت چھپانے کے لئے مجھ پر الزام لگاتے ہو۔ تم کمینے...... ذلیل...... سور......"

"فرشتہ بن کر دوسروں کو دھوکا تم دیتے ہو اور گالیاں مجھے دے رہے ہو۔" سگریٹ پھینک کر جمال جھٹکے سے کھڑا ہوا۔

"میں نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے...... تم تھے رجا کے پاس۔ تم نے اس کے ساتھ......"

"بکواس کرتے ہو۔" سمیع اس پر جھپٹا۔ جمال کا گریبان اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ مار رہے تھے۔ ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔ انوشہ اور قدسیہ جہاں تھیں وہیں مجسموں کی طرح ساکت پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"تم ڈالتے رہے ہو اس پر بری نظر۔ اس دن مجھے دیکھ کر بھاگ گئے۔" سمیع کی شرٹ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔

"میں بھاگ گیا تھا تو تم اسے گود میں لئے کیا کر......"

سمیع کا گھونسہ جمال کی گردن پر پڑا تھا۔ جمال الٹ گیا۔ مگر دوسرے پل اس نے پلٹ کر سمیع کی شرٹ کا کالر پکڑ کر کھینچا۔

"یہ کیا ہے۔ کیا یہ رجا کے ناخن کی کھرونچ نہیں ہے۔"

سمیع نے لاشعوری طو پر گردن پر ہاتھ رکھا۔ اسے تو خبر بھی نہ تھی کب یہ کھرونچ لگی تھی اور کب اس کی گردن پر یہ نشان بن گیا تھا۔

وہ بس ایک لمحے کو تھما۔ دوسرے لمحے دوبارہ الٹ پڑا۔ "بھونکتے ہو تم...... تم نے......"

"خدا کے لئے...... خدا کے لئے بس......" روتی ہوئی قدسیہ نے دونوں کے درمیان آ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ "بس کرو تم دونوں۔ وہ مر گئی ہے۔ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ہے۔ نہیں آئے گی کسی کی گواہی دینے۔ اس کے مردہ تن کو تماشا مت بناؤ۔ جو بات دبی ہے، دبی رہنے دو۔ میں نے اللہ کے سپرد کیا۔ میں نے انصاف اللہ کے سپرد کیا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئیں۔ یہ تصور ہی سوہان روح تھا کہ جنہیں اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا، وہ ذلالت کی اس انتہا پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس دن جمال کو آنا تھا اور جمال کہتا تھا کہ سمیع اس سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ ان کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی ایک مجرم تھا۔ وہ تو گویا جیتے

جی مر گئی تھیں۔

دونوں نے ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"دیکھ لوں گا تمہیں۔" سمیع نے زمین پر تھوک دیا۔

"تم کیا دیکھو گے۔ تمہاری پارسائی کا ڈھونگ اب نہیں چلے گا۔ آنکھوں دیکھی کیسے جھٹلاؤ گے۔" قدسیہ ڈھے سی گئیں۔

ساکت کھڑی انوشہ نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا اور چیخ اٹھی۔

"تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ اسے تو مار ہی ڈالا ہے۔ اب کیا ماں کو بھی جیتے جی مارو گے۔" اس کے یوں چیخ اٹھنے پر وہ دونوں ایک پل کو خاموش ہوئے۔ پھر سمیع ایک جھٹکے سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

"بھاگ گیا تھا...... اب منہ چھپاتا پھرے گا۔" جمال سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

"انوشہ! میرا دل گیا۔"

"سنبھالیں بڑی امی خود کو۔" انوشہ نے انہیں سنبھالا۔ قدسیہ کا رنگ پیلا پڑ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

"اندر چلیں۔" وہ بمشکل انہیں سہارا دے کر اندر لے گئی۔ بستر پر لٹا کر کچن میں آئی۔ ٹھنڈے پانی میں گلوکوز ملا کر لائی تو وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔ اس نے بمشکل انہیں پانی پلایا۔ خاموش کروایا۔ پھر دھیرے دھیرے سر دبانے لگی۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے دوپٹے کا پلو منہ پر ڈال لیا۔

"بس اب تم جاؤ......" وہ آہستگی سے اٹھ کر باہر چلی آئی مگر دروازے میں رک گئی۔ قدسیہ ایک بار پھر روتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

"میں کیسے مان لوں کہ میرے بیٹوں میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا اور سمیع، نہیں ناممکن ہے۔"

وہ بوجھل دل لئے باہر چلی آئی اور یونہی صحن میں آ کھڑی ہوئی۔

"کیسی ہنستی کھیلتی رجا کو چھوڑ کر گئی تھی اس دن۔ کون جانتا تھا یہ سب ہو جائے گا۔ دل تو واقعی نہیں مانتا۔ مگر اخبار میں آنے والی نت نئی خبریں۔ سگے رشتوں کے تقدس کو پامال کرنے والے بھی تو اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ مگر سمیع یوں نفس کا غلام نہیں بن سکتا کہ یوں رشتوں کے تقدس کی دھجیاں اڑا دے۔

اس کا دل زور و شور سے جمال کی ہر بات کو جھٹلا رہا تھا۔

* * *

کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ بس دل پر بوجھ سا محسوس ہوتا۔ یوں لگتا سانس نہیں آ رہی۔ دم گھٹ رہا ہے۔ فضا میں شدید حبس ہے۔ اندر کا حبس باہر کے حبس سے بھی بڑھ گیا تھا۔ قدسیہ تو روپیٹ کر اندر کی بھڑاس نکال لیتی تھیں۔

انوشہ کیا کرتی؟

کسی روبوٹ کی طرح سکول جاتی اور معمول کی طرح گھر کے کام نبٹاتی۔ قدسیہ کی طبیعت مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔

انوشہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے اصرار کرتی تو وہ سوجی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتیں۔

"تم نہیں جانتیں کیا روگ لگا ہے؟ کیا میرا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس ہے؟" انوشہ خاموش ہو جاتی اور انگلیوں پر گننے لگتی کہ سمیع کو گئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟

اس دن جو وہ نکلا تو پھر لوٹ کر نہ آیا تھا اور یہاں کون تھا جو اسے ڈھونڈنے جاتا۔

بس اک انتظار مسلسل تھا جو دہلیز پر پڑا اس کی راہ دیکھتا تھا۔ انوشہ کے جی میں آتا وہ قدسیہ سے پوچھے۔

"کیا نہیں لگتا ہے کہ سمیع؟" مگر لب بھینچ لیتی خاموش ہو جاتی۔

امی! اٹھیں، ناشتہ کر لیں۔"

اسے سکول جانا تھا۔ لیکن اگر وہ قدسیہ کو یونہی چھوڑ جاتی تو وہ سارا دن کچھ نہیں کھاتی تھیں۔

"انوشہ! میرا جی نہیں چاہ رہا۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

اخبار پڑھتے ہوئے جمال نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ پھر اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دفتر جانے کے لئے بالکل تیار ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔

"دو لقمے ہی لے لیں۔" انوشہ اصرار کر رہی تھی۔

قدسیہ محض اس خیال سے کہ وہ لیٹ ہو رہی ہے، اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ تینوں کا ناشتہ سامنے ٹیبل پر رکھا تھا۔

قدسیہ نے پہلا لقمہ توڑا پھر زیر لب بڑبڑائیں۔ "نہ جانے سمیع نے ناشتہ بھی کیا ہو گا یا نہیں۔"

جمال کے ماتھے پر شکن سی نمودار ہوئی مگر وہ خاموش ہی رہا۔

"جمال! تم پتا تو کرو۔" قدسیہ نے نوالہ رکھ کر کہا تھا۔

"کیا پتا کروں؟" جمال کا موڈ بگڑ گیا۔

"سمیع کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ نہ جانے کہاں بھٹکتا پھر رہا ہو گا۔"

جمال نے گلاس ٹیبل پر تقریباً پٹخ دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا امی! آپ اس کے لئے اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔"

"وہ میرا بیٹا ہے جمال! میں جانتی ہوں، وہ ایسا نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"آپ نے ہمیشہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ہے۔ یہی حرکت اگر میں نے کی ہوتی تو آپ اب تک مجھے گھر سے نکال چکی ہوتیں۔ وہ ایسا نہیں ہے تو کیا میں نے ایسا کیا ہے؟"

قدسیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو انوشہ سے رہا نہ گیا۔

"جمال بھائی! آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہے ہیں۔ امی کا مطلب یہ نہیں ہے۔"

"امی کا تو یہ مطلب نہیں تھا۔ مگر میں تمہارا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ اس کے کرتوتوں پر تم پردے نہیں ڈالو گی تو اور کون ڈالے گا۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

"تم بتاؤ گی میری حد۔" جمال نے سرخ آنکھوں سے گھورا۔

انوشہ جواب دیئے بغیر اٹھی اور اندر چلی گئی۔ اسے ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا اور وہ قدسیہ کے سامنے بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

"بہر حال امی! آپ مجھ سے یہ امید مت رکھیں کہ میں اسے ڈھونڈنے جاؤں گا۔" وہ بھی چلا گیا تھا۔

انوشہ پرس لے کر باہر نکلی تو قدسیہ رو رہی تھیں۔

"بڑی امی! آپ بالکل فکر مت کریں۔ میں خود پتا کروں گی۔"

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگیں۔ انوشہ اٹھی تسلی دے کر گال پر پیار کر کے چلی گئی۔ اس نے سوچا تھا وہ واپسی پر نبیل کی طرف جائے گی اور اس سے کہے گی کہ وہ سمیع کو ڈھونڈے۔ اسے یقین تھا کہ نبیل کو سمیع کی خبر ضرور ہو گی۔

* * *

رکشا پھٹپھٹاتا ہوا اک چھوٹے سے پرانے مگر خوبصورت بنگلے کے سامنے آن رکا تھا۔ رکشے والے کو پیسے دے کر فارغ کیا۔ پھر گیٹ کھلا دیکھ کر اندر چلی آئی۔ چھوٹے سے لان

میں دھوپ ہی دھوپ تھی۔ ایک طرف بیڈمنٹن نیٹ لگا تھا۔ برآمدے میں بید کی چار کرسیاں اور میز تھی۔ ایک کرسی پر اک گوری چٹی فربہی مائل خوش شکل خاتون نظر کی عینک لگائے کسی میگزین کے مطالعے میں گم تھیں۔

"السلام علیکم آنٹی......!"

"ارے انوشہ......!" وہ اسے دیکھ کر چونکیں پھر خوش دلی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ "تم کیسے رستہ بھول گئیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ تم آخری بار کب ہمارے گھر آئی تھیں۔"

"آپ تو روز ہی آتی ہیں۔"

"ایں...... یہ تو شکوہ برائے شکوہ ہو گیا۔" وہ کھل کر ہنسیں پھر اسے پرس ٹیبل پر رکھتے دیکھ کر فوراً بول اٹھیں۔

"یہاں کہاں گرمی میں بیٹھیں گے۔ اندر چلو۔ میں تو نہا کر آئی تھی۔ تم لگتا ہے سیدھی سکول سے آ رہی ہو۔" وہ اس کے چہرے پر موجود تھکن پا گئی تھیں۔

"جی......!"

"خیریت ہے نا......؟"

"جی۔ بس نبیل بھائی سے کچھ کام تھا۔"

ڈرائنگ روم کے اندر کی فضاء پرسکون اور ٹھنڈی تھی۔ ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی۔ ٹھنڈا مشروب پی کر اس کے حواس بحال ہوئے۔

"نبیل بھائی گھر پر نہیں ہیں؟"

"بس آتے ہی ہوں گے دونوں۔ تم ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔"

وہ جو لفظ دونوں کی وضاحت پوچھنے جا رہی تھی۔ کھانے کا سن کر تکلفاً منع کرنے لگی تو آنٹی خفا ہوتے ہوئے اسے ہلکی پھلکی ڈانٹ کھلا کر کچن میں چلی گئیں۔ ساتھ ہی اٹیچ باتھ تھا۔

وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلی تو باہر سے نبیل کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ کوئی اجنبی مہمان نہ ہو، وہ جھک کر پرس اٹھا کر اندر جانے کو تھی۔ جب وہ اندر چلے آئے اور ساتھ ہی لفظ دونوں کی وضاحت ہو گئی۔ سمیع اسے دیکھ کر چونکا اور دوسرے پل نارمل ہو گیا۔

"خیریت تو ہے؟"

انوشہ کا جی چاہا۔ وہ کوئی چبھتا ہوا جملہ کہے۔ لیکن وہ کچھ بھی کہے بغیر اسے دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے زیادہ دبلا ہو گیا تھا۔ رنگ بھی ماند پڑ گیا ہے۔ اس کے وجود پر لان کا سفید کرتہ تھا

جس کے گلے پر ہلکی سی سفید کڑھائی ہوئی تھی وہ بھی اس کا نہیں تھا۔ یقیناً نبیل کا ہو گا۔

وہ نبیل کی طرف متوجہ ہو گئی جو اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

"چلو کسی بھی بہانے مگر انوشہ بی بی ہمارے گھر تو آ گئیں۔"

وہ قصداً ہلکا سا مسکرائی۔

"آپ بھی تو گھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔"

"ہاں۔" وہ ہنسا۔ "جس کے لئے آیا کرتا تھا، وہ خود جو یہاں آ گیا تھا۔"

اندر سے نبیل کی امی اسے آواز دے رہی تھیں۔ وہ معذرت کرتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

تب خاموش کھڑے سمیع نے پوچھا۔ "یہاں کیسے آئیں؟"

"تمہیں ڈھونڈنے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ پھر طنز بھرے انداز میں مزید اضافہ کیا۔

"تم تو شاید بھول ہی گئے ہو کہ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف تمہارے انتظار میں دن سے رات کرتے ہیں۔ پوری پوری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔"

"امی کیسی ہیں......؟" سمیع نے اسی انداز میں پوچھا۔

"تمہیں پروا ہے اس کی......؟" وہ غصے میں الٹ پڑی۔ سمیع خاموشی سے نچلا لب چبانے لگا۔

"چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟" انوشہ نے اچانک پوچھا۔

"میں مجرم نہیں ہوں۔" وہ تڑخ گیا۔

"تو پھر بھاگتے کیوں ہو؟" انوشہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر یوں جمی تھیں، جیسے اسے اندر تک پڑھ ڈالیں گی۔

سمیع نظریں چرا گیا۔ انوشہ ہار سی گئی۔

"سمیع! گھر کیوں نہیں آ رہے؟"

"مجھے وحشت ہوتی ہے اس گھر سے۔ کتنی آسانی سے مجھے مجرم بنا دیا گیا۔ میں...... میں ایسا کر سکتا ہوں انوشہ؟" وہ اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔

"سچائی کی تو اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ یوں بھاگ کر تصدیق کی مہر تو مت لگاؤ۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"میں بھاگ نہیں رہا ہوں۔ مگر رجا کے حوالے سے۔"

"مرد بنو...... مجرم نہیں ہو تو فیس کرو سب کو۔ یوں کئی کئی دن گھر سے غائب رہ کر ماں کو

تکلیف مت دو۔" انوشہ نے پرس اٹھالیا۔

نبیل کی امی اندر آئیں۔ اسے تیار دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"تم کھانا کھائے بغیر جارہی ہو؟"

"آنٹی! دیر ہورہی ہے۔ بڑی امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ میرا انتظار کررہی ہوں گی۔ ہوسکے تو گھر کا چکر لگا لینا۔" آخری جملہ سمیع کے لئے تھا۔

ایک بار پھر معذرت کرکے وہ چلی آئی۔ یہ بھی شکر تھا کہ سمیع اسے یہیں مل گیا تھا۔ ورنہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑتا۔ قدسیہ اس کی منتظر تھیں۔ اس نے مختصراً بتایا۔

"وہ ٹھیک تو تھا؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ ان شاء اللہ جلد یہی آئے گا۔"

انوشہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

* * *

سبزی بناتے بناتے چھری رک سی گئی تھی۔ نہ جانے کس سوچ نے ہاتھ تھام لیا تھا۔ نگاہیں ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں۔ بالوں کی پتلی سی لٹ ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔

ہلکی سی آہٹ پر انوشہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تو ایک ناگوار سی لہر آنکھوں میں ابھر آئی۔

جمال نہ جانے کب سے کھڑا اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ انوشہ کے چہرے کی ناگواری جمال سے چھپی نہ رہی تھی۔

دل میں چبھن سی ہوئی۔ "اب بھی۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں......" وہ جلد جلد بھنڈیاں کاٹنے لگی۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"کس لئے؟" انوشہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ جمال کی سمجھ میں نہ آیا آگے کیا کہے۔ انوشہ کے انداز میں صرف اجنبیت و بیگانگی تھی۔

"تم نے اب کیا سوچا ہے؟" اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

"کس بارے میں؟" انوشہ محتاط سی ہوگئی۔ چھری تیزی سے چلنے لگی۔

"سمیع تمہارے قابل نہیں ہے۔"

"یہ فیصلہ آپ کو نہیں کرنا۔"

انوشہ نے سوچا، وہ یہاں سے اٹھ جائے۔

"سمیع کی ذلالت تم نے دیکھی ہے نا۔ کوئی بھی نہیں سوچ سکتا کہ وہ۔"

"پلیز! میں اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔"

انوشہ کے لہجے کی تیزی جمال کو مضطرب کرگئی۔

"انوشہ! میں اتنا برا نہیں ہوں۔ جتنا تم تصور کرتی ہو۔ ہوسکتا ہے مجھ میں کچھ برائیاں ہوں۔ کچھ ایسی عادتیں ہوں جو تمہیں ناپسند ہیں۔ لیکن کیا اب بھی تم سمیع کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہو۔ وہ تو اس قابل ہے کہ اسے چوک میں درے لگنے چاہئیں۔ میں صرف امی کی وجہ سے مجبور ہوں کہ......"

انوشہ نے ٹوکری اٹھائی اور بنا جواب دیئے کچن میں چلی گئی۔ جمال کے سامنے گلی سڑی بھنڈیاں اور پیاز کے چھلکے رہ گئے۔

مارے غصے کے وہ ہتھیلی پر مکا مار کر رہ گیا۔ "تم پچھتاؤ گی انوشہ بیگم......"

بیرونی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ جمال گویا باہر چلا گیا تھا۔

انوشہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے سبزی چڑھائی۔ اس کے دل و دماغ کھول رہے تھے۔

"کہیں یہ سب جمال کی سازش تو نہیں؟" اک عجیب سا خیال جمپ لگا کر ذہن کی سطح پر آیا۔

"بڑی امی کہتی ہیں۔ انہوں نے جمال کو فون کیا تھا۔ سمیع کہتا ہے جب وہ گھر آیا تو دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ کہیں یہ سب جمال......"

اسے بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ اپنے باپ اور جمال کی غلیظ و ننگی باتیں۔ جنہیں سن کر ہی گھن آتی تھی۔ عورت، مرد کی آنکھ پہچانتی ہے اور جمال کی آنکھ میں پاکیزگی نہیں تھی۔ وہ آدھی رات کو بھی سمیع کے سامنے جانے اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے سے اتنا نہیں گھبراتی تھی، جتنا جمال کے پاس بیٹھنے سے۔

انوشہ کو بہت کچھ یاد آنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، حرکتیں، جنہیں وہ ہمیشہ نظرانداز کردیتی تھی۔ جمال کا دیکھنا، بہانے بہانے سے چھونے کی کوشش کرنا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جمال نے بازارِ حسن کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ ہوس جمال کی آنکھوں میں مکار لومڑی کی طرح گھات لگائے بیٹھی تھی۔ سمیع کی آنکھوں میں نہیں۔ وہاں تو صرف رشتوں کا احترام نظر آتا تھا۔ "کہیں یہ جمال دانستہ......" آگ تیز تھی۔ کڑھائی جلنے لگی تھی۔ مگر وہ ششدر سی کھڑی ایک ہی نقطے پر غور کررہی تھی۔

* * *

قدسیہ بند کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ پانچ دن مزید گزر گئے تھے۔ سمیع نہیں آیا تھا۔ ایک دن نبیل آیا تو قدسیہ نے اس سے کہا۔

”اس سے کہو۔ ایک بار ماں کو شکل دکھا جائے۔“

وہ جی بھر کر حیران ہوا۔ آپ کا مطلب ہے وہ گھر آیا ہی نہیں۔ مجھے تو بتایا بھی نہیں کہ وہ ناراض کس بات پر ہے۔ میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ ہم میں کتنی گہری دوستی ہے۔“ وہ بس جلدی جلدی بولتا چلا گیا۔

قدسیہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ بتاتیں بھی کیا۔ جس بات پر پردہ پڑا تھا اسے کیسے کھولتیں انوشہ نے آہستگی سے کہا۔

”کچھ نہیں بس جمال بھائی سے جھگڑا ہوا تھا۔“

”کس بات پر؟“ جوتے کی ٹوہ سے فرش کھرچتے ہوئے نبیل نے بنا دیکھے پوچھا۔

”آپ کو تو پتا ہے جمال بھائی کی عادت کا۔“ انوشہ نے اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہا، چائے بنانے کے بہانے اٹھ گئی۔

نبیل نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔ بس قدسیہ کو تسلی دینے لگا۔ ”میں اسے سمجھاؤں گا آنٹی! آپ بالکل فکر مت کریں۔ وہ آئے گا۔ دراصل وہ کراچی گیا ہوا ہے۔ وہاں ایک دو انٹرویوز تھے۔“

”مجھ سے ملے بنا ہی چلا گیا۔“ قدسیہ رونے لگی تھیں۔ آج کل وہ بات بے بات رو دیتی تھیں۔

”آپ اس کے لئے دعا کریں۔ اسے جاب مل جائے پھر یہ جمال بھائی کے رعب بھی تھوڑے کم ہوں گے۔“ نبیل نے انہیں ڈھیروں تسلی دلاسے دیئے تھے۔ پھر جلد ہی چلا گیا اور آج چھٹا دن تھا وہ اب تک نہیں آیا تھا۔ اور قدسیہ صبح سے کمرے میں پڑی ہوئی تھیں۔ انوشہ اندر آئی۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ باہر چلی گئی۔ تو ان کے لبوں پر اک آہ آ کر ٹوٹ گئی اور گرم سیال آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھسل گیا۔

آج انہیں رجا بہت یاد آ رہی تھی۔ ان حالات نے تو انہیں کھل کر رجا کا سوگ بھی نہ منانے دیا تھا۔

کتنی چھوٹی سی تھی۔ جب ان کی گود میں آئی تھی۔ اک ایب نارمل بچی۔ نہ کوئی سمجھ نہ بوجھ، کن جتنوں سے پروان چڑھایا تھا۔ ایسے وقت میں جب سگا باپ بھی اجنبی بن گیا تھا۔

انہوں نے اسے سینے سے لگایا تھا۔ کئی بار حالات ایسے بھی ہوئے کہ سب نے کہا۔ اسے واپس کر دو۔ دماغ تو ٹھیک ہے نہیں۔ ایک تو لڑکی پھر ایب نارمل۔ بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ مگر ان کا دل نہیں مانتا تھا۔ سوتیلی ماں تو ایک دن بھی برداشت نہ کرتی۔ اسے خود سے جدا کرنے کا حوصلہ ہی نہ تھا۔ مرغی کی طرح پروں میں چھپائے بیٹھی تھیں۔ کون جانتا تھا کہ وہ ان ہی کے گھر میں اس طرح موت کا شکار ہوگی۔

”کاش میں تجھے اس دن یوں تنہا چھوڑ کر نہ جاتی۔ میری ننھی گڑیا برآمدے میں بیٹھی کھیل رہی تھی۔ کاش میں نہ جاتی۔“

بس یہی پچھتاوا تھا۔ جو انہیں اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔

”یا اللہ! وہ کون ہوگا اتنا شقی القلب، اتنا ظالم اور وہ بھی ان کی اپنی اولاد میں سے۔ لیکن میرا سمیع ایسا نہیں ہے۔ وہ تو اتنا نیک طینت، اتنا شرم و حیا والا ہے۔ کبھی کسی پرائی عورت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اس نے۔“

ان کا دل کچلا جاتا تھا۔ سوچیں ان کی روح پر کوڑے برساتی تھیں۔

”وہ کوئی اور ہوگا۔ میں نے اپنی کوکھ سے ایسے سانپ نہیں جنے۔ جمال یقیناً جھوٹ بولتا ہے۔ وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ انوشہ کا غصہ نکال رہا ہے۔ اسے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

دن رات اذیت کا سلسلہ تھا! وہ کہاں جائیں؟ کس سے اپنا دکھ کہیں؟

دکھ بھی ایسا کہ شرمندگی سے منہ چھپائے بیٹھ رہنے کو جی چاہے۔ اب آیا تھا رجا کا۔ جنازے میں شرکت کی اور چلا گیا۔ دنیا دکھاوے کو بھی چار آنسو نہ بہائے۔

”اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں ہیں۔ بھلا ایک ذہنی طور پر معذور لڑکی کا مستقبل بھی کیا ہوتا۔ آج تو تم سنبھالے بیٹھی تھیں۔ کل کو کون دیکھتا۔“ وہ بھائی کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ جو انہیں تسلی دے رہا تھا۔

”اے خدا! یہ کیسا باپ ہے۔ اتنا سرسری لہجہ۔ اتنا معمول کا انداز گویا اپنی بیٹی کی نہیں کسی غیر کی تعزیت کر رہا ہو۔“

وہ اس کے گلے لگ کر بین بھی نہ کر سکیں اور وہ چلا بھی گیا۔

دوپہر سے شام ڈھلی تھی۔ پھر شام بھی گہری ہونے لگی۔ اس کا سرمئی پن رات کی تاریکی میں گھلنے لگا۔ وہ باہر نہیں نکلیں۔

انوشہ نے برآمدے کا بلب جلا دیا تھا۔ جس کی روشنی کمرے کے اندر کی تاریکی ختم کر رہی تھی۔ کوئی چپکے سے در آنے والی رات کی تاریکی کی طرح آہستگی و خاموشی سے اندر آیا

تھا۔ پھر انہیں اپنے پیروں پر کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ وہ جانتی تھیں یہ لمس کس کا ہے۔

انہوں نے چہرے سے دوپٹہ ہٹایا اور بے تابی سے اٹھ بیٹھیں۔

سمیع نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ قدسیہ کا گویا دل جکڑ گیا۔

رتجگوں کی غماز سرخ انگارہ سی آنکھیں۔

چہرے کے خال وخد میں رچا کرب۔

سیاہ حلقے، بڑھی ہوئی شیو۔

"کہاں تھے اتنے دنوں سے؟"

اس نے آہستگی سے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ "آپ تو جانتی ہیں۔ وہ میں نہیں ہوں۔ آپ کو تو یقین ہے نا۔ میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے، وہ میرے لئے کیا تھی۔ جمال جھوٹ بول رہا ہے اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے کون سی دشمنی نکال رہا ہے۔ میں رجا کے ساتھ۔ اس کے ساتھ جسے میں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ پہلا لفظ بولنا سکھایا۔ وہ جسے میں ساری ساری دوپہر کندھے سے لگائے تھپکا کرتا تھا کہ کہیں رو نہ دے۔ کیا بتاؤں۔ کون کون سے رشتے ہیں میرے رجا کے ساتھ۔ آپ ہی تو کہتی تھیں سمیع تو رجا کی ماں ہے۔ پھر میں۔ آپ کو یقین ہے نا! آپ تو اپنے بیٹے کو سمجھتی ہیں۔"

وہ ننھے بچے کی طرح بلک رہا تھا اور انہوں نے کبھی سمیع کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ قدسیہ کا ہاتھ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپکنے لگا۔

"میں جانتی ہوں۔ مگر تم گھر کیوں چھوڑ گئے تھے۔ ماں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا۔" سمیع نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

"جو کچھ جمال نے میرے سامنے کیا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا، میں اسے قتل کر دوں۔ اگر یہاں رہتا تو نہ اس کے لئے اچھا ہوتا اور نہ میرے لئے۔"

قدسیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سمیع کا یہ لہجہ ان کے لئے نیا اور انوکھا تھا۔

"سمیع! ایسی باتیں مت کرو۔ تم تو میرے سب سے پیارے بیٹے ہو۔" قدسیہ نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

سمیع نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا۔ پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"انوشہ بتا رہی تھی کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم آ گئے ہو، اب ٹھیک ہو جائے گی۔" قدسیہ نے کہا پھر پلنگ سے نیچے اترنے لگیں۔

"تم جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لو۔ میں خود تمہارے لئے کچھ بناتی ہوں۔"

"رہنے دیں امی! انوشہ نے کچھ نہ کچھ بنا لیا ہوگا۔"

وہ انہیں منع کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر اور صاف ستھری تھی۔ اس کے سارے کپڑے استری شدہ الماری میں موجود تھے۔ اخروٹی رنگ کا کرتہ شلوار نکال کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ برآمدے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ کچن میں باتوں اور برتن رکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انوشہ نے اسے دیکھا تھا اور ہلکا سا مسکرائی تھی۔ سب کچھ وہی تھا مگر رجا نہیں تھی۔ سمیع نے واش بیسن کے پاس رک کر خالی چارپائی کو دیکھا۔ وہ گرمیوں میں اسی چارپائی پر دو تکیوں پر کہنیاں ٹکائے اوندھی لیٹی پاؤں جھلاتے ہوئے ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔ ایسے میں کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ چینل بدل سکے اور کوئی بدلتا بھی نہ تھا۔ جمال اگر ایسا کرتا تو وہ کتنا لڑتی اور روتی تھی۔ جمال اسے کبھی سختی سے ڈانٹ دیتا، کبھی دانستہ ستانے لگتا۔ وہ سامی۔ سامی چلاتی اس کے پاس شکایت لگانے چلی آتی۔

"سامی...... سامی......!" اس کے اردگرد اس آواز سے سارا صحن بھر گیا تھا۔ یہاں تک کہ ٹی وی کی آواز بھی غائب ہو گئی۔

دروازہ زور سے کھلا تھا اور جمال اندر آیا۔ سمیع کو کھڑا دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹکا۔

"تو تم آ گئے؟" اس نے طنزاً ہنکارا بھرا۔

"ہاں......" سمیع نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اگر وہ قصوروار نہیں ہے تو پھر کترائے کیوں۔

دونوں آمنے سامنے بپھرے ہوئے سانڈوں کی طرح کھڑے تھے کہ موقع ملے تو ایک دوسروں کو روند کر رکھ دیں۔ یہ جارحانہ انداز اور خاص طور پر سمیع کا، جمال کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ امی گھبرا کر باہر نکل آئیں۔

"جمال بیٹا! تم آ گئے۔ کھانا بالکل تیار ہے۔ ہاتھ منہ دھولو تو کھاتے ہیں۔ سمیع! تم یہ میز تو اٹھا کر درمیان میں رکھ دو۔" وہ گھبرا کر بولے گئیں۔

"میں اس کے ساتھ نہیں کھاؤں گا۔" جمال نے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں۔" سمیع نے بے نیازی سے کہا اور آگے بڑھ کر میز اٹھانے لگا۔

"کھاتے تو میرا ہی ہو۔" جمال نے تاک کر وار کیا۔

قدسیہ سہم گئیں۔

سمیع نے میز اٹھا کر دونوں چارپائیوں کے درمیان رکھی پھر سیدھے ہوتے ہوئے جمال کو دیکھا۔

"ان شاء اللہ! کچھ دنوں کے بعد یہ طعنہ بھی دینے کے قابل نہیں رہو گے تم۔ بل بنا کر رکھو۔ سارے واجبات ادا کر دوں گا۔"

تحقیر بھرا، سلگتا ہوا لہجہ، جمال سرتاپا راکھ ہوا تھا۔

"احسان فراموش، نمک حرام...... دیکھ رہی ہیں امی آپ......"

"دونوں کو دیکھ رہی ہوں۔"

وہ آہستگی سے کہتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ جسم میں جان کہاں رہی تھی۔

"جب تک یہ یہاں رہے گا۔ میں اس گھر میں نہیں آؤں گا۔" اس نے گویا دھمکی دی تھی۔

ایک بیٹا آیا تھا، دوسرا جانے کی دھمکی دے رہا تھا۔

"جمال! تم اوپر چلو۔ میں تمہارے لئے کھانا اوپر لاتی ہوں۔" قدسیہ نے آہستگی سے جمال کا بازو پکڑا۔ جمال نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

"بیوہ ماں کو اتنے دکھ مت دو کہ وہ جی نہ سکے۔" قدسیہ دبے دبے لہجے میں چیخ اٹھیں۔

جمال لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر چلا گیا۔ سمیع مڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتے تھے؟" انوشہ نے کھانے کی ٹرے میز پر پٹخی۔

"نہیں......" سمیع کا لہجہ صاف اور پختہ تھا۔

قدسیہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر جمال کے لئے کھانا نکالنے کچن میں چلی گئیں۔

* * *

سمیع صبح کو گھر سے نکلتا تھا اور رات گئے ہی آتا تھا۔ قدسیہ کو یہی اطمینان تھا کہ وہ آ تو جاتا ہے۔ جمال کی بھی یہی روٹین تھی۔ دونوں کا آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ اگر ہو جاتا تو یوں لگتا تھا، دو دشمن مدمقابل آ گئے ہوں۔ انوشہ اور قدسیہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ دونوں کا سامنا نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔

"مگر بڑی امی! یہ سب کچھ کب تک چلے گا۔" کبھی انوشہ اس صورتِ حال سے جھنجلا جاتی تھی۔

"کیا معلوم؟" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔

اس دن انوشہ کو بچوں کے ٹیسٹ چیک کرنے تھے۔ وہ صحن میں ہی بیٹھی تھی۔ دن کی نسبت رات ٹھنڈی تھی۔ صحن میں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ خبرنامے کے بعد ڈرامہ شروع ہو گیا تھا۔ قدسیہ اس سے باتیں کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ انوشہ نے آواز ذرا ہلکی کر دی۔

دونوں میں سے ابھی تک کوئی بھی گھر نہ آیا تھا۔

پھر ساڑھے گیارہ کے قریب بیل ہوئی۔ مبادا قدسیہ کی آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے پوچھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا جمال تھا۔

"وہ ابھی آیا نہیں؟" جمال نے پوچھا۔

انوشہ نے قدرے حیرت سے جمال کو دیکھا۔ اس نے پہلے تو کبھی آنے والے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

"نہیں......"

"اسی لئے جاگ رہی ہو۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں طنز کیا تھا۔

"کھانا کھائیں گے۔" وہ بھی اس کا طنز ٹھنڈے انداز میں پی گئی تھی۔

"نہیں۔ چائے بنا دو۔"

ایسی بے وقت فرمائش جمال نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ گرمی میں چائے کم ہی پیتا تھا۔ وہ چائے بنا کر لائی تو جمال اوپر جا چکا تھا۔ انوشہ سیڑھیوں کے پاس متذبذب سی کھڑی ہو گئی۔ وہ اوپر جانا نہیں چاہتی تھی اور نہ آدھی رات کو آواز دینا اچھا لگتا تھا۔ تب ہی جمال کپڑے بدل کر نیچے چلا آیا۔ تو انوشہ نے اطمینان کی سانس لی۔

"میں جانتا تھا۔ تم اوپر نہیں آؤ گی۔" جمال نے اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔

وہ بنا کچھ کہے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ جمال چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چائے کے سپ لیتے ہوئے گاہے بہ گاہے نگاہ انوشہ پر بھی ڈال لیتا تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ ڈرامے میں کوئی دلچسپ سین شروع ہوتا تو ادھر متوجہ ہو جاتی۔ کپ خالی کر کے میز پر رکھ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ پھر اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ انوشہ نے سرہانے کی طرف رکھی کاپیاں اٹھانی چاہیں۔ مگر اس نے ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر دوسرے سے کاپیوں کی ورق گردانی کرنا شروع کر دی تھی۔ کرسی چارپائی کے بہت قریب تھی۔ مگر وہ کھسکا نہیں سکتی تھی کہ عقب میں قدسیہ کی چارپائی تھی اس نے جلدی جلدی کاپی پر ایک دو ٹک لگائے۔ وہ فوراً کام ختم کر کے وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے انوشہ! جب میں سکول جاتا تھا تو کبھی ہوم ورک پورا نہیں کرتا تھا۔" وہ

انوشہ کے ملبوس سے اٹھتی خوشبو چرا رہا تھا۔

"میری کاپی کے ہر صفحے پر مختلف تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ تتلی، پھول، درخت۔ ان دنوں شاید میں بڑا ہو کر مصور بننا چاہتا تھا۔"

انوشہ کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت و دلچسپی تھی۔ حیرت اس لئے کہ جمال کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتا تھا اور دلچسپی اس لئے کہ اس کی نگاہوں سے جمال کا یہ روپ ہمیشہ مخفی رہا تھا۔ بھلا جمال جیسا سنگ دل اور جارحانہ عزائم کا مالک کبھی تتلیوں کے وجود کچلنے اور خوبصورت پھولوں کو مسلنے والا بچہ تھا۔ کم از کم انوشہ کو تو یہی یاد تھا۔

انوشہ کی دلچسپی دیکھ کر جمال دانستہ گفتگو کو طول دیتا گیا۔ قدسیہ نے کروٹ بدلی اور دوبارہ سو گئیں۔ وہ دوا کے زیر اثر تھیں۔

جمال کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ اس کا لفظ لفظ سن رہی تھی۔

"سکول میں جب کوئی لڑکا سمیع سے جھگڑتا تو میں اس کا سر پھاڑ دیا کرتا تھا۔" اس بات کی گواہ انوشہ بھی تھی۔

"میں سمیع سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر یونہی کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا، امی سمیع کو مجھ پر ترجیح دیتی ہیں۔ اس سے مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ تو میں کسی نہ کسی بہانے سمیع کو بھی پیٹ ڈالتا۔"

چھوٹی چھوٹی باتیں، خواہشیں، احساسات، شرارتیں۔ وہ ایک کے بعد دوسری بات نکالتا چلا گیا اور شاید زندگی میں پہلی بار انوشہ نے اس کی باتیں غور سے سنی تھیں۔ مگر اک مسلسل سوچ بھی ساتھ تھی۔

"آخر وہ یہ سب اس سے کیوں کہہ رہا ہے۔ کیا وہ انوشہ پر اپنے اندر کی سچائی ثابت کرنا چاہتا تھا مگر سوچنا تو یہی تھا کہ کیا یہ سچائی اور معصومیت واقعی اس کے اندر موجود تھی؟"

دروازہ کھلا اور سمیع اندر آیا۔ ان دونوں کو یوں بیٹھا دیکھا تو بس ایک ثانیے کو ٹھٹکا تھا۔

"بھلا ان میں اتنی بے تکلفی کب ہو گئی۔"

دوسرے پل نارمل ہو چکا تھا۔ انوشہ کے دل میں تو کوئی چور نہ تھا، سو وہیں بیٹھے بیٹھے کھانے کے متعلق پوچھا۔ سمیع نے نفی میں جواب دیا۔

"تمہارے ہاتھ میں چوڑیاں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔" وہ اس کی کلائی میں پہنی چوڑیوں پر انگلی مار کر عجیب بے تکلفانہ انداز میں گویا ہوا۔

"اتنی بے تکلفی اور وہ بھی سمیع کے سامنے! وہ کیا ثابت کرنا چاہتا تھا۔" انوشہ ٹھٹک سی

گئی۔

"اچھا بھئی، تمہارے ساتھ تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ رات کافی گہری ہو گئی ہے۔"

جمال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز کافی بلند تھی۔ باتھ روم میں جاتے جاتے سمیع نے اچھی طرح سنا۔ انوشہ بری طرح جھنجھلا گئی۔

"ذلیل انسان ذلیل ہی رہتا ہے۔"

جمال چلا گیا تھا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتی کاپیاں سمیٹنے لگی۔

* * *

انوشہ پر جمال کا التفات دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور سمیع کے سامنے بطور خاص انوشہ کے ساتھ بے تکلفی برتتا۔ انوشہ کی ناگواری گویا اسے نظر ہی نہ آتی تھی۔ انوشہ کے دل میں جمال کے خلاف جو شک تھا، وہ نکلا نہیں تھا۔ مگر ثبوت ہی کیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ گھر کا ماحول پہلے ہی اتنا خراب تھا۔ قدسیہ کی صحت بھی مسلسل خراب تھی۔ اس لئے اپنی فطرت کے خلاف خاموش رہنے اور نظر انداز کرنے پر مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جتنی بار جمال کو دھتکارے گی۔ وہ اتنی بار کسی نہ کسی بہانے ہنگامہ کرے گا اور سمیع کو تنگ کرے گا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی جمال کی اس سے یہ بے تکلفی اور التفات سمیع کو بھی پسند نہیں۔ جمال کا عمل دخل گھر میں خاصا بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے سی لاتعلقی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ گھر کا سودا سلف، سبزی، پھل وہ ہر چیز خود خرید لاتا تھا۔ صبح امی کے پاس ایک بار رک کر ضرور پوچھتا کہ آج کیا چیز لانی ہے؟

"مجھے کیا پتا بیٹا! انوشہ جانتی ہو گی۔"

وہ کچن میں چلا آتا۔ کاغذ پنسل سنبھال کر چھوٹی چھوٹی چیزیں لکھنے لگتا۔ انوشہ ناشتا بنانے کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے سامان لکھواتی۔

"چینی، الائچی، انڈے۔"

"انڈے؟" وہ حیرت سے پنسل روکتا۔ "اتنی گرمی میں اتنے انڈے کیا کرنے ہیں۔"

انوشہ سنجیدگی سے اسے دیکھ کر اگلی چیز لکھوانے لگتی۔

باہر سننے والوں کو یوں لگتا، اندر وہ دونوں مل جل کر فہرست بنا رہے ہیں تھوڑی دیر میں وہ گنگناتا ہوا باہر آتا تھا۔ اچٹتی سی نظر سمیع پر ڈالتا۔ دونوں ایک دوسرے کو یوں نظر انداز کرتے تھے گویا وہ ہیں ہی نہیں۔

یہ عارضی فائر بندی قدسیہ کے لئے غنیمت ہی تھی۔ ایسے ہی ایک تماشے کے بعد جب

جمال جا چکا تو انوشہ باہر آئی۔

سمیع کے سامنے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ابھی تھوڑی پہلے ہی وہ دے کر گئی تھی۔ خود وہ بظاہر اخبار کھولے کھڑا تھا۔

"تم ناشتہ کیوں نہیں کر رہے؟"

سمیع نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور ایک نظر اس پر ڈالی۔ سفید اور فیروزی کنٹراسٹ کے لان کے سوٹ میں وہ سکول جانے کے لئے تیار تھی۔

"کیا اس کے دل میں میری طرف سے کوئی شک ہے جو یہ یوں جمال کی طرف۔"

اک ادھوری سی سوچ جسے مکمل کئے بغیر وہ خاموشی سے مڑا اور باہر چلا گیا۔ انوشہ بھونچکا رہ گئی۔

"سمیع کو کیا ہوا ہے۔ وہ اس کے ساتھ اس طرح کیوں کر رہا ہے۔" چپ کر جاتا یا یکسر نظر انداز کر دیتا۔

"پہلے کی طرح۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں رہا۔"

"تم ابھی تک گئیں نہیں۔" جمال سودا سلف لے کر آیا تب وہ چونکی اور گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"بس تو جا چکی ہو گی۔" جمال نے کہا۔

"جی......" وہ الجھی الجھی سی تھی۔

"چلو، میں چھوڑ آتا ہوں۔"

"میں چلی جاؤں گی۔"

"دیر ہو جائے گی۔ بائیک ہے نا میرے پاس۔ تمہیں چھوڑ کر آفس چلا جاؤں گا۔" وہ انکار کرنا چاہتی تھی جب قدسیہ باہر نکلیں۔

"چلی جاؤ انوشہ......! اب کہاں بسوں میں دھکے کھاؤ گی۔"

وہ خاموشی سے ساتھ ہو لی۔ اس نے سوچا۔ وہ رات کو سمیع سے بات ضرور کرے گی۔

گلی کی نکڑ پر دکان سے سگریٹ خریدتے ہوئے سمیع نے انہیں بائیک پر ایک ساتھ جاتے دیکھا اور زندگی میں پہلی بار سگریٹ سلگایا تھا۔

* * *

"مجھے اس شخص سے اتنی نفرت ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اسے قتل کر دوں۔" دونوں ہاتھ سے اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے وہ کرب و اذیت کی کس انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ نبیل نے حیرت و تشویش سے سامنے بیٹھے سمیع کو دیکھا۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں اس کے اندر سلگتی آگ کو

پوری طرح مترشح کر رہی تھیں۔ "میں پاگل ہو جاؤں گا نبیل!"

دونوں مٹھیاں ماتھے پر مارتے ہوئے وہ پاگل ہی لگ رہا تھا۔ نبیل صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے۔

"ٹیک اٹ ایزی یار......! مت خود کو اتنی اذیت دو۔"

"کیسے......؟" سمیع نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ کتنی بے بسی تھی ان آنکھوں میں۔ نبیل نظریں چرا گیا۔

"وہ شخص مجرم ہے، گنہگار ہونے کے باوجود سب کی نظروں میں معصوم ہے۔ کتنی آسانی سے وہ مجھے مجرم بنا گیا اور اب وہ انوشہ کو مجھ سے چھین رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر مجھے شکست دیتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے ہرا کر دوسروں کی نظروں میں گرا کر خوش ہوتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی!"

"جمال کے یہ سب کہنے یا کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی نے اس کی بات پر یقین کیا؟ اس کے الزام پر کان دھرے۔ نہیں نا۔ ہم سب تمہیں جانتے ہیں سمیع اور جمال کی فطرت کو بھی ہم جانتے ہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی تمہیں مجرم نہیں سمجھتا پھر تم خود کو کیوں ختم کر رہے ہو۔"

اس کی تکلیف دیکھ کر نبیل کو دکھ ہو رہا تھا۔

"مگر انوشہ......!"

"انوشہ بے وقوف لڑکی نہیں ہے۔ وہ بہت پریکٹیکل اور حقیقت پسندانہ سوچ رکھتی ہے۔ وہ جمال کی باتوں پر کبھی کان نہیں دھرے گی۔"

"یہ تو تم کہتے ہو۔ دیکھ تو میں رہا ہوں۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی شک تو اس کے دل میں رہا ہی ہو گا جب ہی تو وہ جمال کی طرف ملتفت ہو رہی ہے۔"

شک کا کانٹا اس کے دل میں گڑ ہی چکا تھا۔

"کاش میں اس دن تھوڑی دیر پہلے وہاں پہنچ جاتا تو۔" وہ کرب سے لب کاٹنے لگا۔

"جو ہو گیا، اسے بھولنے کی کوشش کرو۔" سمیع نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"رجا اتنی آسانی سے بھلائی جا سکتی ہے نبیل! تمہیں نہیں پتا۔ وہ اب بھی راتوں میں مجھے پکارتی ہے۔ "سامی، سامی!" اس کی آواز مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ میں آدھی رات کو اٹھ کر اس کی قبر پر چلا جاتا ہوں۔ اس نے مجھے پکارا ہو گا۔ مجھے یقین ہے۔ آخری بار اس نے صرف مجھے پکارا ہو گا۔ مجھے پہنچنے میں دیر کیوں ہو گئی۔"

اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

نبیل نے سر جھکا لیا۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا تو آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"تم نے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں ابھی کچھ بھی نہیں سوچ پا رہا۔"

"میرا ایک مشورہ مانو سمیع!" سمیع نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھا۔

"کیسا مشورہ؟"

"تم باہر چلے جاؤ۔"

"باہر......" سمیع نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں......امریکہ، کینیڈا، کوریا کہیں بھی۔"

"باہر جانے کے لئے پیسہ چاہئے۔"

"کچھ تم کرنا۔ کچھ میں بندوبست کروں گا۔ مگر تمہیں یہاں سے، اس ماحول سے فوراً نکل جانا چاہئے۔ ورنہ تم ذہنی طور پر خود کو تباہ کر لو گے۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے فیصلہ کر لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ رجا کی موت نے جس طرح تمہارے اعصاب کو متاثر کیا ہے، یہاں رہے تو کبھی نارمل نہیں ہو سکو گے۔"

وہ اسے بہت دیر تک سمجھاتا رہا تھا۔

جی تو سمیع کا بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔

"مگر انوشہ......"

"بھیک مانگوں اس سے، منت کروں کہ وہ میری بات پر اعتبار کرے۔ نبیل! میرا نہیں خیال کہ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت تھی۔" سمیع کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"اظہار کی ضرورت تو ہمیشہ ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ جن جذبوں کے اظہار سے تم ہمیشہ کتراتے رہے ہو وہ جمال نے کر دیا ہو۔" سمیع نبیل کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"انوشہ سے بات کرو اور میری تجویز پر غور بھی۔ دونوں معاملوں میں وقت ضائع مت کرو۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نبیل نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

سمیع نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"چائے پیو گے؟"

ابھی کچھ دیر قبل ہی انہوں نے رات کا کھانا کھایا تھا۔

"نہیں۔ گھر چلوں گا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

سمیع اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا تھا۔ اور جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔

"میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گا سمیع! کسی اور کی غلطی۔ غلطی نہیں جرم کی سزا تم کیوں بھگتو۔"

* * *

سارا راستہ سمیع کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔

اس نے سوچا نبیل ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے انوشہ سے بات کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے جو کچھ نظر آ رہا ہے، وہ سچ نہ ہو۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ گویا جمال گھر آ چکا تھا۔ اک وہی تھا جو اتنی رات گئے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ صحن میں امی سو رہی تھیں۔ انوشہ کا بستر خالی تھا اور اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ یقیناً سکول کا کوئی کام کر رہی ہوگی۔ وہ واش بیسن کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے برش اٹھا کر ٹوتھ پیسٹ کا ڈھکن کھولا۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا۔ سمیع کی نگاہ آئینے کی طرف اٹھی۔ دوسرے لمحے اسے جھٹکا لگا تھا۔ انوشہ کے کمرے سے نکلتے جمال کو دیکھ کر وہ ساکت رہ گیا۔

جمال نے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور زیر لب کچھ گنگناتا، خوشگوار سے موڈ میں اوپر چڑھ گیا۔ اتنی رات گئے جمال کا انوشہ کے کمرے سے نکلنا کیا معنی رکھتا تھا۔

سمیع نے تھکے تھکے انداز میں برش اور پیسٹ واپس رکھا اور آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے کروٹ بدلی اور ہڑبڑا کر جاگ گئیں۔

"سمیع! تم آ گئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" سمیع نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تب ہی انوشہ باہر آئی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر قریب آ کر پوچھنے لگی۔

"کھانا لاؤں سمیع!" اس کا لہجہ نرم تھا اور سینے پر جھولتی چوٹی کے کئی بل کھلے ہوئے تھے۔ سمیع نے ایک سلگتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"کھا چکا ہوں۔" بستر پر لیٹ کر اس نے دونوں بازو آنکھوں پر رکھ لئے۔

انوشہ اس کی نگاہ کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی۔ الجھ سی گئی۔ کچھ لمحے کھڑی دیکھتی رہی۔

تب ہی قدسیہ نے ایک تھکی تھکی سی سانس کھینچی اور ہمدردی سی نگاہ اس پر ڈال کر آہستگی

سے بولیں۔

''سو جاؤ انوشہ! رات بہت ہوگئی ہے۔''

انوشہ پلٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھی۔

''وہ مجھ سے اتنی رکھائی سے پیش کیوں آتا ہے۔ ٹھیک ہے احتیاط تو پہلے بھی اس کے انداز میں ہوتی تھی۔ مگر بے رخی۔'' سمیع نے کروٹ بدل لی تھی۔

وہ اس کی پشت پر نظریں جمائے سوچتی رہی۔ انا گوارا نہ کرتی تھی کہ اس سے اپنا قصور ہی پوچھ لے۔

''یا اللہ! یہ شخص کہیں سے پکڑائی نہیں دیتا اور وہ جمال۔'' اسے جمال کے التفات سے کوفت ہونے کے ساتھ ساتھ خوف بھی آنے لگا تھا۔ کس بے تکلفی سے اس وقت اس کے کمرے میں آ کر پڑھنے کے لئے کتاب مانگ رہا تھا۔

سمیع نے پھر کروٹ بدلی تھی۔

انوشہ نے لیٹ کر چادر اپنے اوپر ڈال لی۔

* * *

قدسیہ، سمیع کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو سمیع؟''

''مجھے جاب مل گئی ہے۔ میں کراچی جا رہا ہوں۔ آج ہی۔'' اس نے اچٹتی سی نظر ماں پر ڈالی پھر سر جھکا کر چائے پینے لگا۔

''تم اب بتا رہے ہو۔'' انہوں نے شاکی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

''اپائنٹمنٹ لیٹر دیر سے ملا۔ مجھے صبح ہی جوائن کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا بیگ تیار کرتی ہوں۔''

سمیع نے ان کا بجھا بجھا لہجہ پوری طرح محسوس کیا۔ پیالی فرش پر رکھ دی۔ ''امی آپ خوش نہیں ہوئیں؟''

''میں خوش ہوں بیٹا...... لیکن اتنی اچانک خبر ملی ہے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ خوشی کا اظہار کس طرح کروں۔ پھر دور جا رہے ہو۔'' ان کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔

''امی! لوگ تو سات سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ میں تو صرف کراچی تک جا رہا ہوں۔''

''ہاں......'' انہوں نے پیار سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''میرا بیٹا برسرروزگار ہوگیا ہے، میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کیا ہوگی۔ بلکہ میں تو محلے میں مٹھائی بانٹوں گی۔''

اس کا بیگ تیار ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی تھی۔

''انوشہ کو خوشخبری نہ سناؤ گے؟''

بیگ اٹھا کر ان سے اجازت لینے آیا تو انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ بتا دیجئے گا۔ میں جلد ہی آؤں گا۔''

قدسیہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ''اللہ کے سپرد کیا۔''

سمیع خود پر ضبط کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''اسے نوکری ملی ہے۔ مگر وہ خوش نہیں ہے۔''

قدسیہ نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر سوچا پھر مڑ کر برآمدے میں آ بیٹھیں۔ پورے گھر میں خاموشی چھا گئی تھی۔ موسم پھر بدلنے کو تھا۔ فضا میں نئے موسم کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں۔

انوشہ کو کھلا دروازہ اور برآمدے میں بیٹھی قدسیہ کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ ''اس طرح کیوں بیٹھی ہیں بڑی امی؟''

اس نے بیگ وغیرہ کرسی پر رکھے اور پھیلا ہوا دوپٹہ سمیٹ کر کندھے پر ڈال لیا۔

''سمیع کو رخصت کر کے بیٹھی ہوں۔ اس لئے دل اداس سا ہو رہا تھا۔'' ہلکی سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا۔

''وہ کبھی مجھ سے دور نہیں گیا نا اس لئے۔''

''سمیع کہاں گیا ہے؟'' انوشہ نے حیرت سے پوچھا۔

قدسیہ نے مختصراً بتایا۔

''اور وہ مل کر بھی نہیں گیا؟''

''اسے جلدی تھی۔''

''یہ بات نہیں ہے۔ وہ بدل گیا ہے۔ ہے نا بڑی امی؟ وہ بالکل بدل چکا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنی خوشی ہم سے شیئر کئے بغیر ہی چلا جاتا۔'' انوشہ کا لہجہ تلخ سا تھا۔

''وہ بھٹک گیا ہے۔ بے اعتبار ہوگیا ہے۔ خود کو ڈھونڈ رہا ہے۔ تھوڑا وقت تو لگے گا۔'' انہوں نے رسانیت سے کہا۔

مگر انوشہ کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ بنا کچھ بولے بیگ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

بہت سارے دن یونہی جلتے سلگتے گزرے۔ انوشہ کا خیال تھا سمیع کا فون آئے گا تو وہ اس سے بہت لڑے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ سمیع کا فون آیا تو اس کا سنجیدہ و بیگانہ سا لہجہ سن کر اس نے خاموشی سے ریسیور قدسیہ کو تھما دیا۔

"کیا میرا اس شخص پر کوئی حق نہیں رہا؟"

"حق...... اس نے کبھی کوئی حق تمہیں دیا ہی کب تھا۔ تم خود ہی اپنے دل کی گواہی پر اعتبار کیے بیٹھی تھیں۔"

اندر کوئی زخم سا لگا تھا۔ وہ حیران سی سوچتی رہ گئی۔

* * *

وہ نہیں ہے
تو اس کی چاہت میں
کس لئے
دن رات سنورتے ہو
خود سے بے ربط باتیں کرتے ہو
اپنا ہی عکس نوچنے کے لئے
خود الجھتے ہو، خود سے ڈرتے ہو
ہم نہ کہتے تھے
ہجر والوں سے، آئینہ گفتگو نہیں کرتا۔

سمیع آیا تھا۔ اور جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ بس یونہی سنجیدہ لہجے میں اس کا حال پوچھا۔ اور ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ انوشہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کیا اس کے پاس میرے لئے بس یہی بچا ہے۔ سرسری لہجہ، بے معنی گفتگو۔" وہ تو منتظر تھی۔ سمیع کی احتیاط پسند طبیعت کے باوجود کوئی ایک جملہ، کوئی ایک نگاہ جو ہمیشہ اس کے دل کو یقین کی ڈور سے باندھ رکھتی تھی۔ مگر اب یہ خالی پن کیوں ہے؟ انوشہ نے سوچا تھا، وہ سمیع سے بات کرے گی۔ مگر اسے اعتراف کرنا پڑا۔ وہ کبھی بھی اس معاملے میں سمیع سے بات نہیں کر سکے گی۔ ایسا کوئی مان اس کے پاس تھا ہی کہاں کہ وہ سمیع سے یہی پوچھ لیتی۔

"تم بدل کیوں گئے ہو؟"

"محبت بھیک تھوڑی ہوتی ہے کہ مانگ مانگ کر لی جائے۔ محبت کا گداگر کبھی صدا نہیں لگاتا۔ بھلے کاسہ خالی ہی کیوں نہ رہے۔"

جب سمیع دو دن کے بعد واپس جا رہا تھا تو وہ سکول جانے سے ذرا پہلے اس کے پاس رکی تھی۔

"تمہیں کراچی سے کچھ منگوانا تو نہیں؟" سمیع نے بنا اس کی طرف دیکھے پوچھا۔

(خود کو ڈھونڈ کر لا سکتے ہو تو میرے لئے لے آنا)

انوشہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور دروازے سے نکلتے ہوئے سوچا۔

"محبت بھیک تھوڑی ہوتی ہے کہ......"

"تم اداس ہو؟" جمال نے نہ جانے کہاں سے اس کے چہرے پر اداسی ڈھونڈ لی تھی۔

"سمیع کے جانے سے......" اس نے وجہ بھی بتا دی۔

انوشہ کے چہرے پر ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔

"میں تو جانتا تھا انوشہ بی بی۔"

"آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟" انوشہ کے لہجے میں کوئی لحاظ نہ تھا۔

جمال نے ہلکی سی سانس کھینچی اور آہستگی سے گویا ہوا۔ "مجبور ہوں انوشہ بی بی اپنے دل کے ہاتھوں۔"

"اپنے دل کو سنبھال کر رکھیں۔"

"وہ تو تم سنبھالو گی۔ تمہیں جو دے رکھا ہے۔" وہ آہستگی سے کہہ کر چلا گیا۔

انوشہ ہل نہ سکی۔ وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

* * *

پھر یوں ہوا کہ راستے یکجا نہیں رہے
میں بھی انا پرست تھا، وہ بھی انا پرست

"سمیع باہر جا رہا ہے۔"

سب ہی سن کر ششدر سے رہ گئے۔

قدسیہ نے ہمیشہ چاہا تھا کہ ان کی اولاد بہت آگے جائے۔ بہت ترقی کرے۔ مگر سن کر دل لرز سا گیا، ان کی شاکی نظریں سمیع کے چہرے پر تھیں اور سمیع نظریں زمین پر گاڑے چائے کے گھونٹ بھرتا رہا۔ وہ لوگ صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں پورا صحن روشن تھا اور واش بیسن کے پاس کھڑی انوشہ کا ہاتھ برش پر پیسٹ لگانا بھول گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے برش اور ٹیوب واپس رکھ دی اور پلٹ کر سمیع کو دیکھا۔ قدسیہ بہت دیر کے بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

"جانا بہت ضروری ہے؟" انہوں نے بروقت اور بڑی آس سے پوچھا۔

"جی......" اس چھوٹے سے لفظ کے بعد مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی کہاں رہی تھی۔

انہوں نے آنکھوں میں در آئی نمی کو پیچھے دھکیلا۔

”شادی تو کر کے جاؤ گے۔“

”ابھی یہ ممکن نہیں۔“ اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

”مگر انوشہ کب تک تمہارا انتظار کرے گی؟“

”وہ کیوں میرا انتظار کرے گی؟“ سمیع نے آہستگی سے بغیر نظریں ملائے پوچھا۔ قدسیہ دھک سے رہ گئیں۔

انوشہ اپنی جگہ ساکت سی تھی۔

”سمیع! تم......“

”امی! میں نہیں جانتا کہ میں کب واپس آؤں گا اور آؤں گا بھی یا نہیں۔ انوشہ کی شادی آپ گھر میں کرنا چاہتی ہیں تو جمال سے کر دیں۔“

”تم......تم ہوتے کون ہو میرے بارے میں یہ فیصلہ کرنے والے۔“ وہ تیر کی طرح سامنے آئی۔ ”کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔ یتیم ہوں، لاوارث ہوں تو تم جو چاہو گے، میرے بارے میں فیصلہ کر دو گے۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی میرے بارے میں یہ فیصلہ کرنے کی۔ میں فیصلہ کر سکتی ہوں اور میں جانتی ہوں۔ مجھے کس سے شادی کرنا ہے اور کس سے نہیں۔ تمہیں میرے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ سر تا پا بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔ اس کی شرربار نگاہوں نے سمیع کو جلا کر راکھ کر دیا۔ وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ بہت تیزی سے اوپر چڑھ گئی تھی۔

”اس نے مجھے کیا سمجھا تھا۔ محض اک نشے باز، طبلچی کی بیٹی۔“

وہ پوری رات انگاروں پر لوٹی تھی۔ اور صبح وقت سے بہت پہلے سکول چلی گئی تھی۔

* * *

محبتوں کی سزا بے مثال دی اس نے
اداس رہنے کی عادت سی ڈال دی اس نے
جب وہ میرے بدن پر اپنے زخم دیکھ چکا
تو جان بوجھ کر کانٹوں کی شال دی اس نے

انوشہ کو سمجھ میں نہ آیا تھا۔ سمیع اسے کیوں چھوڑ گیا۔

نہ شکوہ، نہ شکایت، نہ کوئی گلہ...... اتنا سب کچھ ہوا۔ اس کے دل نے ایک پل کو بھی جمال کی باتوں پر کان نہ دھرا تھا۔

”وہ بے قصور ہے۔“ یہ اس کے دل کی گواہی تھی۔

”سمیع اس سے محبت کرتا ہے۔“ یہ اس کے دل کا یقین تھا۔

مگر سارے یقین دھرے کے دھرے رہ گئے۔

”ہائے، اب کون کس پہ اعتبار کرے۔“

”انوشہ......“ جمال کے سگریٹ کا دھواں اس کی آواز سے پہلے پہنچا تھا۔ وہ جو دونوں ہاتھ دیوار پر دھرے قطار در قطار مکانوں کی دیواریں گن رہی تھی۔ چونک کر پلٹی، وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

سمیع کے جانے کی سب سے زیادہ خوشی جمال کو ہی ہوئی تھی۔ اس کے راستے کا کانٹا خود بخود ہٹ گیا۔ اس نے جو چاہا تھا، وہ آرام سے ہو گیا۔ اس نے سمیع کو بے حد خوش دلی سے رخصت کیا تھا۔

”انوشہ! اب تو مان جاؤ۔“

”اب کیا ہو گیا ہے؟“ ارے۔ وہ اندر باہر سے جل جل کر راکھ ہوئی جاتی تھی اور یہ شخص تھا کہ باز ہی نہ آتا تھا۔

”ہم بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

”مجھے معاف کر دو۔ مجھے اچھی زندگی نہیں گزارنا۔ اور جو تمہارے ساتھ گزرے وہ اچھی زندگی تو کیا میرے لئے صرف اک سزا ہو گی۔“

وہ تلخ ہوتے ہوئے اس سطح پر آ گئی تھی کہ جمال سے اپنی نفرت اور بیزاری چھپا ہی نہ سکتی تھی۔ جمال بھونچکا رہ گیا۔

اسے تو لگا تھا کامیابی محض دو قدم کے فاصلے پر ہے۔

”تم مجھ سے ایسا سلوک کیوں کرتی ہو؟“

”بتاؤں۔“ وہ پوری کی پوری اس کی طرف مڑی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ جمال اس کے انداز پر خائف سا ہو گیا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، تم بہت معصوم ہو۔ ہم تمہیں جانتے نہیں کیا۔ تم نے سمیع کے خلاف جو ڈرامہ کیا، اسے سمجھتے نہیں ہیں۔ تمہارے چہرے پر اگر نقاب ہے تو کیا تمہارا گھناؤنا چہرہ پہچانتے نہیں ہیں۔ رجا کو برباد کر کے موت کے حوالے کر کے بھی تمہیں چین نہیں آیا کہ تم میرے پیچھے پڑ گئے۔ میں رجا نہیں تھی کہ یوں تمہارے ہاتھ آتی۔ سمیع کو مجھ سے دور کرنے کے لئے سازشیں کرنے لگے۔ تم کیا جانو۔ کتنے مکروہ اور بدکردار شخص ہو تم۔ اور میں نے زندگی میں اتنے گناہ نہیں کئے کہ تم جیسے غلیظ شخص کی رفاقت میرا نصیب ہو۔ سمیع مجھے نہیں ملتا نہ سہی۔

مگر تم سے شادی میری موت ہے۔" جمال کو لگا وہ چوراہے پر کھڑا ہے جہاں وہ اسے سنگسار کر رہی تھی۔ اس کی زبان گنگ تھی اور چہرہ تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اب خاموش کھڑے ہو۔ کوئی جواب نہیں تمہارے پاس۔ ہونا بھی نہیں چاہئے۔ آئینے میں اصلی چہرہ دکھائی دے تو انسان یونہی لاجواب ہو جاتا ہے۔ اب اگر ذرا بھی غیرت ہے تو کہیں جا کر ڈوب مرو۔"

وہ پتھر پر پتھر برساتی چلی گئی۔

جمال بولنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکتا تھا۔ حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ انوشہ اس سے کبھی یہ سب کہے گی۔

* * *

"امی! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" قدسیہ نے چونک کر جمال پر اور ایک نظر انوشہ پر ڈالی۔

انوشہ بدستور اپنے کام میں مگن رہی۔ گویا سنا ہی نہیں۔

قدسیہ نے دوبارہ جمال کی طرف دیکھا۔ سگریٹ سے اٹھتے دھوئیں پر نظریں جمائے وہ حد درجہ سنجیدہ نظر آیا۔ اب یہ سگریٹ پچھلے کچھ دنوں سے ایک پل کے لئے بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔ قدسیہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے بے حد چپ ہو گیا تھا۔ نہ لہجے میں تلخی تھی نہ مزاج میں طنطنہ، کسی بات پر کوئی تبصرہ بھی نہیں۔ بس اک سوچ تھی جو اس کی آنکھوں میں ڈیرا جمائے بیٹھی تھی۔

"کیا انوشہ اب جمال کے لئے راضی ہو جائے گی۔" قدسیہ نے سوچا۔ مگر جمال کے اگلے جملے نے انہیں چونکا کر رکھ دیا۔

"وہ مریم ہے نا...... ریاض صاحب کی بیٹی۔ بی اے کر لیا ہے اس نے۔ آپ نے دیکھا تو ہوگا۔ اس کے لئے بات کریں۔"

اس نے اک سرسری سی نگاہ انوشہ پر ڈالی۔ جو ایک پل کو تو اس کی بات پر ضرور چونکی تھی اور دوسرے پل اس کے چہرے پر اطمینان سا چھا گیا۔

ایک تلخ سی مسکراہٹ نے جمال کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

"بہت خوار ہو گیا میں اس لڑکی کے لئے مگر اب نہیں۔" سگریٹ کی راکھ جھٹکتے ہوئے جمال نے سوچا۔

"ایسی کوئی انوکھی لڑکی نہیں کہ جمال اس کے سامنے ناک رگڑے۔ یہ مجھے جو بھی سمجھتی

ہے، شوق سے سمجھتی رہے۔"

"ہاں مریم بہت اچھی اور پیاری لڑکی ہے۔ میں نے تو بہت بار اس کے بارے میں سوچا تھا۔" قدسیہ کہہ رہی تھیں۔ "اور میرے خیال میں وہ لوگ انکار بھی نہیں کریں گے۔ مریم کی امی آج کل اس کے لئے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ میں کل ہی بلکہ آج شام ہی جاتی ہوں۔"

قدسیہ کے لئے تو یہی بہت تھا کہ وہ مان تو گیا۔

"انوشہ کے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ آخر کب تک یوں بٹھائے رکھیں گی۔ جس کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ وہ تو نہ جانے لوٹتا بھی ہے یا نہیں۔ لوگ باتیں کرتے ہیں۔"

"یہ شخص...... یہ مجھے کبھی چین نہیں لینے دے گا۔" انوشہ نے بلبلا کر سوچا۔

"ہاں...... لیکن اب پہلے تمہارا تو کچھ کروں۔ شام کو مجھے تھوڑی مٹھائی اور پھل لا دینا۔" قدسیہ نے بات کو ہنس کر ٹال دیا۔

* * *

جتنا کم عرصہ مریم کو جمال کی زندگی میں شامل ہونے میں لگا۔ اس سے بھی کم عرصہ اس گھر کے معاملات پر قابض ہونے میں لگا تھا۔ وہ جمال کی من چاہی بیوی تھی۔ بلکہ بیوی سے زیادہ محبوبہ بن کر رہتی تھی۔ جمال نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ مریم کے منہ سے کچھ نکلے اور جمال پورا نہ کرے۔ مریم کو گھر کے کاموں سے نفرت تھی۔ جمال نے ملازمہ رکھ دی۔

"میں خود بھی نہیں چاہتا کہ تم اپنا روپ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگ کر کھو دو۔ تمہیں ایسے ہی رہنا ہے۔ خوبصورت اور فریش۔"

انوشہ کے سامنے مریم سے اظہار محبت میں وہ کبھی بخل سے کام نہ لیتا۔ مریم ناز سے مسکراتی۔

قدسیہ تو خاموشی سے ایک طرف ہو گئیں۔ اتنی بے ضرر سی ساس کو سنبھالنا مریم کے لئے مشکل نہ تھا۔ انوشہ کے ساتھ اس نے زیادہ تعلق بڑھایا ہی نہ تھا۔ خود انوشہ نے بھی اپنے معاملات کو اپنے اور قدسیہ تک محدود کر لیا تھا۔

وہ دونوں جیسی چاہتے زندگی گزارتے تھے۔ شاپنگ، آؤٹنگ، خوبصورت رومانٹک شامیں، جمال اب انوشہ کو بالکل ہی نظرانداز کر دیتا تھا۔ بلکہ اب اسے انوشہ کو مخاطب کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دونوں خود میں مگن تھے۔

سمیع کو جمال کی شادی کا بتایا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ مگر اسے دھچکا سا لگا تھا۔

"آپ نے انوشہ اور جمال کی شادی کیوں نہ کی؟" وہ فون پر الجھ سا گیا۔

"تم جانتے ہو......" قدسیہ نے کہا۔ اور وہ جانتا ہی تو نہ تھا اور اگر جانتا تھا تو سمجھتا نہیں تھا۔

"تم واپس کب آؤ گے؟" قدسیہ نے پوچھا۔

"ابھی تو آیا ہوں امی! اتنی جلدی واپس کیسے آ سکتا ہوں۔ ابھی تو مستقبل بنانا ہے۔"

"پھر بھی جلدی آنے کی کوشش کرنا ہے۔"

"انوشہ سے بات کروائیں۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہ تو گھر پہ نہیں ہے۔"

"اچھا۔ چلیں ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھیئے گا۔"

اس کے بعد سمیع کے ڈرافٹ پر ڈرافٹ ہی آئے تھے۔ کبھی کبھار فون کر لیتا۔ قدسیہ کے لئے اس نے موٹے سے سونے کے کنگن بنوائے تھے۔

* * *

"خالہ! ادھر بیٹھیں ذرا میرے پاس۔"

ادھر ادھر غیر ضروری کاموں میں مصروف قدسیہ کو مریم نے پکڑ کر بٹھا لیا۔ آج کل وہ ماں بننے والی تھی۔ اس لئے اس کے نخروں اور جمال کی ناز برداری میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

انوشہ آج پھر سکول کا ڈھیر سارا کام لئے بیٹھی تھی۔ انوشہ نے ایک نظر ساس بہو کو دیکھا اور دوبارہ سے کام میں مصروف ہو گئی۔

"میری ایک خالہ ہیں۔ ساہیوال میں رہتی ہیں۔ ان کا بیٹا سکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔ شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ زمین جائیداد بھی ہے۔"

"تو یہ سب مجھے کیوں بتایا جا رہا ہے۔" وہ مسکرائیں۔

"انوشہ کے لئے...... انوشہ کی شادی نہیں کرنا؟"

انوشہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"ہو جائے گی انوشہ کی شادی بھی۔ جلدی کیا ہے؟" انہوں نے ٹالنا چاہا۔

"جلدی!" مریم چیخ اٹھی۔ "انوشہ مجھ سے کہیں بڑی ہے۔ میں نے ابھی ایف اے کے پیپر دیئے تھے جب انوشہ نے جاب کی تھی۔ اس کی عمر کی لڑکیاں تو...... بہرحال آپ خالہ کے پرپوزل پر غور کریں۔ اب لوگوں کا کیا ہے لوگ تو باتیں کرتے ہی ہیں۔ انہیں تو بس اک

موضوع مل جائے۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یوں ہمارے گھر کا کوئی فرد موضوع گفتگو بنے۔ لیکن لوگوں کی زبانیں بھی تو نہیں پکڑی جا سکتیں۔"

"کیا مطلب؟ کیسی باتیں۔" قدسیہ دھک سے رہ گئیں۔

"آپ خود ہی بتائیں۔ انوشہ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔"

"نہیں کی تو نہیں کی۔ کسی کو کیا تکلیف ہے۔" انوشہ تڑخ گئی۔

"غصے میں آنے کی بات نہیں ہے۔" مریم نے رسانیت سے کہا۔ "لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں۔ اب تم ہی کان بند کئے بیٹھی ہو تو...... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ گھر میں دو دو جوان لڑکوں کے ہوتے ہوئے تمہیں گھر میں کیوں نہ بیاہ دیا۔ بلکہ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تم جمال سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن جمال نے مجھ سے شادی کر لی تو تم نے یہ جوگ......"

"شٹ اپ مریم......! بند کرو اپنی زبان۔" انوشہ پھٹ پڑی۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کون یہ سب بکواس کرتا ہے۔ اور تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"حد ہوئی۔ میں تمہارے بھلے کی بات کر رہی ہوں اور تم ہو کہ...... دیکھ رہی ہیں خالہ آپ۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ تم ہی بتا دو کیوں جوگ لئے بیٹھی ہو۔ اگر جمال نہیں تو پھر کون ہے؟"

"تم اپنی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ نہ ہی کرتیں تو اچھا تھا۔ لیکن جمال کی بیوی کی سوچ ایسی ہی ہو سکتی تھی۔" وہ غصے میں وہاں سے اٹھ گئی۔

قدسیہ بالکل گم صم ہی ہو گئی تھیں۔ رات کو مریم نے جمال کے سینے پر سر رکھتے ہوئے شاکی لہجے میں یہ سب بتایا تھا۔

"بے وقوف لڑکی ہے۔ چھوڑ دو اس کو۔"

"بے وقوف نہیں ہے وہ۔" مریم نے احتجاج کیا۔

"ہے...... تو گھر میں فالتو سامان کی طرح پڑی ہے۔ ورنہ اس کی جگہ وہاں نہیں تھی۔"

"تو اس کی جگہ کہاں تھی؟" اس کے کرتے کے بٹن سے کھیلتے ہوئے مریم نے خفا سے لہجے میں پوچھا۔

جمال نے اپنے سینے پر رکھے مریم کے سر کو دیکھا اور مبہم سا مسکرایا مگر جواب نہیں دیا تھا۔

* * *

وہ دونوں ہنستے کھلکھلاتے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ چاول چنتی انوشہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سے مگن ہو گئی۔

"اب گرما گرم چائے کا کپ ہو جائے۔" جمال کی آواز آئی۔

"جمال! میں تھک گئی ہوں۔"

"پوری جیب خالی کروا دی۔ اب بے چارے شوہر کو ایک کپ چائے بھی نصیب نہیں ہو گی۔"

"چلیں، اسی بات پر بے چارے شوہر کو چائے پلا ہی دیتے ہیں۔" وہ مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

جمال نے ایک نظر کام میں مصروف انوشہ کو دیکھا۔ پھر اس کے قریب آ کر رک گیا۔ انوشہ کو معلوم تھا۔ مگر اس نے سر نہیں اٹھایا چاولوں سے کنکر چنتی رہی۔

"کچھ لوگ اپنے ساتھ کتنا برا کر لیتے ہیں۔" نہ جانے کتنے عرصے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

انوشہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو جمال کی نگاہیں اس کے سراپے سے الجھ رہی تھیں۔ شاید مریم کی باتوں یا مریم کے پھیلتے ہوئے وجود کی وجہ سے۔ جمال کو پھر سے اس کے وجود کی دلکشی کھینچنے لگی تھی۔

انوشہ تلملا کر رہ گئی۔ "آپ کو دوسروں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چہ...... چہ...... کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتی ہو۔" جمال نے تاسف سے اس کے پورے وجود کو دیکھا۔

"آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

"یہ سارے عیش تمہارا مقدر بھی بن سکتے تھے۔"

"مجھے وہ عیش چاہیے ہی نہیں تھے جو تمہارے توسط سے ملتے......"

"اب بھی وہی نفرت، وہی رعونت کس لئے؟ اور کس بل بوتے پر؟ کس کے لئے اتنا اکڑتی ہو تم انوشہ بی بی؟ اس سمیع کی وجہ سے جو تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ گیا۔"

"میں اپنے لئے خود ہی کافی ہوں جمال صاحب۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"اس طرح زندگی گزار لو گی؟"

"تم......" وہ مزید کچھ سخت کہنے والی تھی۔ جب مریم کچن سے باہر نکلی۔ ان دونوں کو یوں قریب کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اپنی شادی کے بعد سے اب تک اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ان دونوں نے آپس میں بات کی ہو۔

"کیا بات ہے؟" وہ دونوں کے بیچ آن کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں۔" جمال کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ انوشہ کو بے چین کر گئی۔

"یہ شخص کبھی مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا۔" اس نے ایک بار پھر سوچا تھا۔

جمال اوپر چلا گیا۔

مریم ایک الجھی سی نگاہ اس پر ڈال کر کچن میں چلی گئی۔ مگر اس کی نگاہ میں عجیب سی کاٹ تھی۔ انوشہ نے واپس بیٹھتے ہوئے پرات گھٹنوں پر رکھ لی۔ مگر اب اس کا دھیان چاولوں کی طرف بالکل نہ تھا۔

* * *

"انوشہ بیٹی! اب شادی کر لو۔"

ان گزرتے ماہ و سال نے قدسیہ کی آس توڑ دی تھی۔ پیسہ کمانے کی دھن میں سمیع بس آگے ہی آگے جا رہا تھا۔ پیچھے دیکھنا ہی بھول گیا تھا۔ اور اب قدسیہ بھی ہار سی گئی تھیں۔ مریم کی گود میں بیٹا تھا اور وہ دوسرے بچے کی تیاریوں میں تھی۔ جمال اور انوشہ کے حوالے سے جو شک مریم کے دل میں بیٹھ چکا تھا۔ اس نے اس کی زبان پر کانٹے اگا دیئے تھے۔ انوشہ کے صبر و تحمل پر قدسیہ کو حیرت سی ہوتی۔ اس کے شادی سے انکار کو مریم اپنی ہی نظر سے دیکھتی تھی۔

کچھ جمال نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بیوی کے ساتھ ساتھ محبوبہ بھی رکھتے ہیں۔

انوشہ نے محبوبہ بننے سے انکار کیا تھا بلکہ بیوی بننا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ اسے زچ کر کے مزا لیتا اور دوسری طرف مریم کے سر پر بھی یہ تلوار لٹکتی رہتی کہ نہ جانے کب وہ انوشہ کی طرف پلٹ جائے۔

"بڑی امی! آج آپ بھی......" انوشہ نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا کروں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے، زندگی کا کیا بھروسہ۔ تمہیں کس کے حوالے کر کے جاؤں گی انوشہ!"

"ایسی باتیں مت کریں۔"

"حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے بیٹا! ہم دونوں جس کے انتظار میں ہیں نہ جانے وہ لوٹے یا نہ لوٹے۔ اک امید کے سہارے اپنی جوانی مت کاٹو۔ یہ بہت اچھا رشتہ ہے۔ تم خوش رہو گی۔ اور جب تم خوش ہو گی تو میں بھی سکون سے مر سکوں گی۔ اس طرح کب تک مریم کے طعنے سنو گی۔ وہ میرے سامنے نہیں چوکتی۔ میرے بعد کیا کرے گی تمہارے ساتھ، کہاں جاؤ گی انوشہ، میری جان۔" وہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر سسک اٹھیں۔

انوشہ بھی آبدیدہ ہوگئی۔

اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"بڑی امی! میں نہیں جانتی، وہ کبھی لوٹے گا یا نہیں۔ اور اگر آیا تو میری خاطر آئے گا یا نہیں۔ لیکن اسے ایک بار آنا ہوگا۔ ایک بار اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ اس نے ایسا کیوں کیا پہلے میرا قصور تو بتائے پھر چاہے جہاں مرضی چلا جائے۔"

گزرتے وقت نے اس کی انا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

کاش وہ یہ سوال اس سے تب ہی کر لیتی۔

* * *

مریم اور جمال کا زوردار جھگڑا ہوا تھا۔

کس بات پر ہوا یہ تو معلوم نہ تھا مگر آواز باہر تک آرہی تھی۔ اخبار پڑھتی انوشہ نے گویا کان بند ہی کر لئے تھے۔ قدسیہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔

گھر ہر وقت مچھلی بازار بنا رہتا تھا۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تھا مگر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ مریم سنتی ہی کہاں تھی۔ پھر سارا قصور مریم کا بھی نہیں تھا۔ جہاں بچے کی ماں بن کر وہ خود کو مضبوط اور محفوظ تصور کر رہی تھی۔ وہیں جمال اس کی طرف سے بے پروائی برت رہا تھا۔ وہی پرانی روش تھی۔ راتوں کو دیر سے گھر آنا، انوشہ پر ذومعنی فقرے کسنا، پھر دونوں میں ایک زوردار جھگڑا۔

"پتا نہیں اس گھر کا کیا بنے گا؟" قدسیہ زیرلب بڑبڑائیں۔

"یہ تو روز کا معمول ہے۔ آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں۔" انوشہ نے اخبار پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"مریم دوسرے جی سے ہے۔ جمال کو کچھ تو خیال کرنا چاہئے۔ کہاں تو دن رات آگے پیچھے پھرتا تھا۔ ہر خواہش، ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ کہاں اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو کہتا ہے فارغ نہیں۔"

انوشہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"سمیع کا فون آئے تو کہتی ہوں کہ واپس آئے۔"

انوشہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ "بھلا اس قصے میں سمیع کا کیا تذکرہ؟"

"اب یہ فیصلہ بھی ہو ہی جائے۔" وہ گھر کے حالات سے ڈری ہوئی تھیں۔

"امی پلیز آپ میرے حوالے سے سمیع سے کوئی بات نہیں کریں گی۔"

"بس کرو تم۔" قدسیہ کو غصہ آگیا۔ "تم کون ہوتی ہو فیصلہ کرنے والی۔ زندہ ہوں ابھی میں۔ بہت مان لی تمہاری۔ اب نہیں مانوں گی۔ زندگی کو تماشا بنا رکھا ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے تمہیں خود کو یوں ذلیل کروا کے۔"

اندر مریم نے جمال کو انوشہ کے نام کا طعنہ مارا تھا۔ انوشہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"اور اگر آپ کے بیٹے نے انکار کر دیا تو......؟"

"تو اچھا ہے۔ کوئی فیصلہ کرنے والی تو بنو گی۔ اس طرح نہیں گزرتی ہے بی بی۔ لوگوں کی باتیں میں سنتی ہوں۔ اولاد کی طرح پالا ہے تمہیں۔ حق رکھتی ہوں تم پر......" آج قدسیہ کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔

"امی! اتنے سالوں میں اسے ایک بار بھی تو میرا خیال نہیں آیا۔"

"نہیں آیا تو کیا ہوا، ہر معاملے میں انا نہیں چلا کرتی۔ اگر اسے کوئی غلط فہمی ہے تو دور کیوں نہیں کر دیتیں۔ کوئی جھگڑا ہوا تھا تم لوگوں کے درمیان؟" آج وہ مکمل کرید میں تھیں۔

"کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ مجھے تو خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ اچانک کیوں بدل گیا۔" انوشہ اور قدسیہ کے مابین پہلی بار اس معاملے پر کھل کر بات ہوئی تھی۔

"نہیں خبر ہوئی تو نہ سہی۔ میں خود معلوم کر لوں گی۔" وہ چڑ کر گویا ہوئیں۔

"امی! پلیز...... مجھے اس کے سامنے اتنا تو مت گرائیں۔"

"تم بھی بے وقوف ہو اور وہ بھی پاگل ہے۔ اری احمق...... اسے تمہارا خیال نہ ہوتا تو اب تک شادی کر چکا ہوتا۔ حالات کو سمجھو۔ نہیں سمجھ سکتیں تو سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو...... ان شاءاللہ......"

"یہی ہے نا، وہ جس کی وجہ سے تم یہ سب کر رہے ہو۔" مریم بپھری ہوئی باہر آئی۔

"یہی چڑیل ہے جو میرا گھر برباد کرنا چاہتی ہے۔"

وہ انوشہ پر چڑھ دوڑی۔

"مریم......؟" قدسیہ نے سختی سے پکارا۔ جمال بھی باہر نکلا تھا۔

"جمال! اپنی بیوی کو لے کر اندر جاؤ۔" قدسیہ نے اس سے کہا۔

"دفعان کریں اسے یہاں سے۔ میں نہیں رکھنے والا اس جاہل عورت کو۔"

"جاہل تو لگوں گی اب میں۔ یہ استانی جو آگئی ہے پٹیاں پڑھانے کو۔ اسی چھنال کی وجہ سے یہ سب کر رہے ہو۔ جو نہ خود کسی کے گھر بسی اور نہ کسی کو بسنے دے گی۔ آوارہ باپ کی آوارہ بیٹی۔ وہی کرتوت......"

"مریم......!" انوشہ دم بخود تھی جبکہ قدسیہ...... کا تھپڑ مریم کے چہرے پر پڑا۔ وہ ایک پل کو ششدر سی ہوئی۔ دوسرے پل چیخ اٹھی۔

"ہاں۔ مجھے تو ماروگی۔ خود تمہاری شہ پر ہی تو یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔"

"تو دفع ہو یہاں سے۔" جمال اسے کھینچ کر اندر لے گیا۔ جہاں وہ چیخ چیخ کر پورے گھر کو گالیاں دیتی رہی۔

اچانک قدسیہ کا چہرہ پیلا پڑا اور دوسرے پل وہ دل پر ہاتھ رکھ کر جھکتی چلی گئیں۔

"امی...... امی...... سنبھالیں خود کو......" انوشہ نے لپک کر انہیں پکڑا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ خود بھاگ کر پانی لے آئی۔ انہوں نے دو گھونٹ پیا۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"نہیں۔ ٹھیک ہوں۔ یونہی دل ڈوب سا گیا تھا۔" وہ گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔

"انوشہ! تو اب بھی کہتی ہے، میں کوئی فیصلہ نہ کروں۔"

انوشہ نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

* * *

نبیل کی شادی تھی۔ وہ کارڈ دینے آیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح گھر میں نہیں آتا تھا۔ وہ ہلا گلا، ہنگامہ گویا رجا کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ سمیع کے جانے کے بعد وہ آتا ہی نہ تھا۔ اگر کبھی آتا بھی تو یونہی کھڑے کھڑے قدسیہ کی خیریت پوچھ کر چلا جاتا۔

"بہت بہت مبارک ہو نبیل بھائی۔" انوشہ نے کارڈ پڑھتے ہوئے کہا۔

"بھائی کہتی ہو...... مگر بات تو تب ہے، جب بہن بن کر دکھاؤ۔"

"مطلب......"

"شادی کے انتظام اپنے ہاتھ میں لو تو بات بنے۔ ابھی سے چل کر ڈیرے ڈالو تو مانوں......"

نبیل کو انوشہ سے ہمدردی تھی۔ اس پورے عرصے میں اگر کوئی زیادہ نقصان اٹھا رہا تھا تو نبیل کے خیال میں وہ انوشہ ہی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی کامیابیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ اپنی عمر کے قیمتی اور خوبصورت سال یونہی ضائع کرتی جا رہی تھی۔

"آؤں گی۔" مختصر سا جملہ کہہ کر وہ پھر سے کارڈ دیکھنے لگی۔

نبیل نے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ، کمزور اور دبلی ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد

حلقے بہت گہرے ہو گئے تھے۔

"انوشہ! اپنا خیال رکھا کرو......" انوشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر نظریں چرا گئی۔

"رکھتی تو ہوں۔"

"سمیع کا کوئی فون وغیرہ آیا؟"

"آتا ہے۔ لیکن بہت وقفوں کے بعد...... شاید مصروف زیادہ ہو گیا ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ "آپ کو تو فون کرتا ہوگا؟"

"بہت کم۔"

"نبیل! تمہارا تو وہ بہت گہرا دوست تھا۔" بہت سوچ کر انوشہ نے بات شروع کی تھی۔

"کبھی اس نے تم سے میرے بارے میں بات کی؟"

"وہ اکثر مجھ سے تمہارے بارے میں بات کیا کرتا تھا۔" نبیل کے چہرے پر سنجیدگی در آئی۔

"جانے سے پہلے اس نے کوئی بات کی تھی؟"

"ہاں......" نبیل نے ذرا پیچھے ہو کر کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"کیا...... کیا کہا تھا اس نے......؟" انوشہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس نے کہا تھا۔ انوشہ بدل گئی ہے۔"

"اس نے یہ کہا۔" اس کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری۔

"ہاں، وہ کہتا تھا شاید انوشہ بھی یہ سمجھتی ہے کہ وہی مجرم ہے اور اسی لئے جمال کی طرف......"

نبیل اسے بتاتا رہا۔ سمیع کی ساری باتیں، اس کے خدشات، وہ خاموشی سے سنتی رہی اور چہرے کا رنگ پل پل بدلتا رہا۔ نبیل چپ ہو گیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔

نبیل چلا گیا اور جانے سے پہلے اس نے کچھ کہا تھا۔ انوشہ تب بھی کچھ نہیں بولی۔ گھر کے در و دیوار پر خاموشی چھا گئی۔

بے خیالی میں کارڈ پھسل کر نیچے جا گرا۔ قدسیہ گھر میں داخل ہوئیں تب وہ چونکی اور کارڈ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے سوچا۔

"تو یہ تھی تمہاری محبت۔ بدگمانی کی ذرا سی گرد برداشت نہ کر سکی۔ اور دعویٰ تھا تمہیں مجھ سے محبت کا۔ اور یہ جمال۔ میں جانتی تھی یہ شخص کبھی نہ کبھی میرے راستے میں کانٹے ضرور بوئے گا۔"

"نبیل ملا تھا راستے میں مجھے۔ کہہ رہا تھا سمیع کا دو سال کا کنٹریکٹ باقی ہے اس کے بعد ہی واپس آئے گا۔ سمیع کا فون آئے تو پوچھوں، واقعی ایسا ہی ہے۔" قدسیہ کہہ رہی تھیں۔

* * *

سرد ہواؤں کی شوریدہ سری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ خشک پتے ٹہنیوں سے ہاتھ چھڑاتے تو اس کے قدموں سے لپٹنے لگتے تھے۔ فضاء میں اداسی گھلی ملی سی تھی۔ اس کے عقب میں بند دروازوں سے لپٹی تنہائی سر اٹھا کر اسے دیکھتی اور پھر سے منہ چھپانے لگتی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں سلائیاں بالکل بے حرکت تھیں اور ان کی نوک اگلا خانہ اٹھانے سے قاصر، مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز اٹھی۔

اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے اپنا سر ڈھانپ لیا لیکن اس کا ذہن اب بھی پرندوں سے خالی آسمان کی طرح ویران اور سونا تھا۔

"کہتے ہیں مغرب کا وقت قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے دعا قطرہ قطرہ بہنے لگی۔

مگر کون سی دعا......؟

اون کا گولہ گود سے لڑھکا اور دور تک اُدھڑتا چلا گیا۔ وہ بے بسی سے دیکھتی رہی۔

ایسا نہیں تھا کہ اٹھ نہیں سکتی تھی۔ مگر اٹھنے کی خواہش بھی تو ہو۔

وہ تو خالی گھونسلہ ہو گئی تھی۔ خواہش کے پرندے، نہ جانے کب کے اُڑ گئے۔ اب تو دن رات کا چکر پورا کرنا تھا۔ خالی گھونسلے کو تنکا تنکا بکھرنا تھا، پھر بھی آس کے دھاگے سے انہیں جوڑتی تھی۔

"ہیں...... میں رو رہی ہوں۔" اس نے بے یقینی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

نہ جانے شام ان آنکھوں میں آنسو کیوں بو گئی تھی۔

ہوا کیاری میں موجود خشک پتوں کے ڈھیر میں گھس کر ننھے بچے کی طرح مٹھیاں بھر بھر پتے اچھالنے لگی۔

"مجھے اٹھنا چاہئے۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ اور سردی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔" اس کے جواں سال وجود میں بڑھاپا پھسکڑا مارے بیٹھا تھا۔ ایسی تھکن تھی کہ اٹھنے سے پہلے سوچنا پڑتا تھا۔

"ہاں مجھے اٹھنا چاہئے۔"

اس نے اپنے اندر سوئی ہمت کو بیدار کرنے کی سعی کی۔

"یا اللہ! یہ شام جلدی گزر جائے۔"

نارنجی شام اب اندھیرے کی گود میں اونگھنے کو تیار تھی اور سرد فضا دھواں دھواں سی ہو رہی تھی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے حسب عادت سارے کمروں کی روشنیاں جلانی شروع کر دی تھیں۔

"آج کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا۔" وہ کچن کا دروازہ یونہی بند کر کے کمرے میں آ گئی۔ نسخہ ہائے وفا ہاتھ میں لے کر اس نے ٹانگوں پر لحاف پھیلا لیا۔ لیکن بہت جلد اسے ہاتھ میں پکڑی کتاب اور کمرے میں پھیلی خاموشی سے وحشت ہونے لگی۔ تو اس نے ٹی وی آن کر دیا۔

اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے
دور ہوں تجھ سے پاس آنے دے

وہ مضمحل سا مسکرائی۔

دلبرائی کا ساز تنہائی
سو اکیلے میں گنگنانے دے

"محبت کا نصیب تنہائی......" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

پہلی خواہش ہے آخری خواہش
کوئی جینے کی راہ پانے دے

دروازہ چرچرایا۔ انوشہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ "کون تھا جو اس کی تنہائی میں مخل ہونے چلا آیا تھا۔ مگر نگاہ ٹھٹک گئی۔

آنے والا کمرے کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ سے بھاری بیگ چھوڑ دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا اس کی آنکھوں میں وحشت، اچھے دنوں کو کھو دینے کا ملال، پشیمانی اور بہت سی تھکن نظر آتی تھی۔

وہ ششدر سی اسے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو، آنے والے کا سواگت کس طرح کرے۔

محبوبہ کی طرح اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر بہت سا رو دے یا بچے کی طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر دیر سے آنے کا شکوہ کرتے ہوئے پوچھے۔

"میرے لئے کیا لائے ہو؟" اس شخص کے ساتھ وہ اپنے رشتے کا کبھی بھی تعین نہیں کر پائی تھی۔ مگر سچ تو یہی تھا کہ انوشہ نے اس شخص کو چاہا بہت تھا۔

اپنے جذبوں کے چرخے پر اک عمر سمیع کی محبت کی پونیاں کاتی تھیں۔

اب تو انگلیاں بھی شل ہو گئی تھیں۔ مگر جذبے تو اپنا کام کرتے ہی ہیں۔ اس نے کل بھی سمیع سے محبت کی تھی۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ چلا گیا۔ انوشہ کو لگا وہ مر گئی ہے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ انوشہ کو لگا۔ منجمد زندگی سانس لینے لگی ہے۔ وہ اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کیسے کرے۔

ناچے، گائے، جھوم اٹھے...... ہر کسی کو بتائے۔ خواہ لوگ اسے پاگل ہی کیوں نہ کہیں۔

مگر جب بولی تو بس یہی۔

"بہت اچانک آئے؟"

"ہاں......" وہ آہستگی سے پلنگ کے کونے پر ٹک گیا۔

"ٹھیک تو رہے؟" اس کی بے تاب نگاہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو چھو رہی تھی۔ پھر وہ چونک گئی۔ بے اختیار اس کی آنکھ کے کنارے کو چھو کر پوچھنے لگی۔

"تمہارے چہرے پر یہ لکیریں کیوں پڑنے لگیں۔"

"یہ لکیریں نہیں وہ سال ہیں جو تم سے دور رہ کر گزارے۔" سمیع بولا۔ پھر اس کی سمت دیکھ کر بولا۔

"تمہارے بالوں پر بھی تو راکھ اڑنے لگی ہے۔"

"پتا نہیں۔ آئینہ حساب کتاب کرنے لگتا ہے اور......"

"تم محبتوں میں حساب کتاب کی قائل نہیں۔"

"ہاں......" انوشہ نے اسے قدرے غور سے دیکھا۔ اس شخص کی طرف اس کے بہت حساب نکلتے تھے۔ مگر وہ سامنے تھا تو جی چاہا۔ سارے حساب لپیٹ کر ایک طرف رکھ دے۔

اس نے ہڑبڑا کر اپنی ٹانگوں سے کمبل نوچا۔

"دیکھو! تم کب سے آئے بیٹھے ہو۔ اور میں نے تم سے کھانے کا بھی نہیں پوچھا۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی اور میں نے آج کچھ پکایا ہی نہیں۔ ڈبل روٹی اور آملیٹ چلے گا؟"

"ہاں......" سمیع نے کہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اس کے قدم عجیب سی سرخوشی میں اٹھ رہے تھے۔

جب تک اس نے سینڈوچ بنائے۔ سمیع ہاتھ منہ دھو کر اور کپڑے بدل کر آ گیا۔ وہی کچن، وہی ٹیبل، وہی ناشتہ بناتی انوشہ، بس آج احساسات میں بہت گہرائی اور شدت تھی۔

"تم کچھ نہیں لوگی؟" اس نے صرف ایک ہی پلیٹ رکھی تھی۔ انوشہ نے نفی میں سر ہلا

دیا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔" کئی سالوں کا فاصلہ تھا ان کے بیچ، مگر ہلکی سی جھجک، ذرا سی بیگانگی تک نہ تھی۔ انوشہ کی آنکھوں کی سطح بھیگنے لگی۔ وہ خاموشی سے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟"

"ولیمہ تھا محلے میں، ذرا دیر سے آئیں گے۔ تم کھا لو تو میں تمہارا کمرہ کھول دوں۔"

"میرا کمرہ کھلا ہے اور اس میں روشنی بھی ہے۔" انوشہ خاموش رہی تھی۔ وہ کھانے سے فارغ ہوا تو انوشہ اس کا سامان کمرے میں لے گئی۔

"سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔" سمیع کو اپنا کمرہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔

"ہاں۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے۔" وہ بلا وجہ ہنس دی۔ "دیکھو، تمہارا پلنگ، جہاں تم خواب اوڑھ کر سو جاتے تھے۔ تمہاری الماری، اس میں رکھی ڈائریاں، ڈائریوں کے صفحوں میں بند تمہاری خواہشیں، انہیں کھول کر دیکھو۔ کہیں ان کا دم تو نہیں گھٹ گیا۔ کہیں انہیں دیمک نہ کھا گئی ہو۔ میں تو ڈر کے مارے اسے کھولتی ہی نہ تھی۔ کہیں یہ مجھے بھی اپنے رنگ میں نہ رنگ لیں۔ اس کے علاوہ میں نے سب صاف ستھرا کر رکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ تم واپس آؤ تو تمہاری انگلیوں سے وقت کی گرد لپٹ جائے۔ اسے جھاڑنے میں محنت لگتی نا اور ہاں...... یہاں کچھ وعدے بھی ہیں۔ جو تم نے کبھی کیے نہیں مگر میں نے سنبھال کر رکھ لئے۔ شاید تمہیں کبھی ان کی ضرورت پڑ جائے۔" وہ اپنی اس چوری پر پشیمان سی تھی۔

سمیع نے دیکھا۔ وہ سرتاپا بدل گئی تھی۔ وہ طنطنہ، نخوت، تیکھا پن، کچھ بھی تو باقی نہ تھا۔

"اور انتظار کا وہ دیا جو تم اب تک جلائے بیٹھی تھیں۔" وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

وہ خاموش رہی کیا کہتی۔ "تمہیں دیکھتے ہی بجھ گیا۔" اس کی محبت اتنی ہی قناعت پسند اور بے غرض تھی۔

"انوشہ!" سمیع نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "میں تمہارے بیتے ہوئے ماہ و سال کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ نہ جانے کس زعم، کس بدگمانی کے زیر اثر تم سے دور بھاگتا رہا۔ اور یہ بھول گیا کہ تم سے دور بھاگنا تو خود کو کھونے کے مترادف ہے۔ اتنا عرصہ شاید خود کو ہی ڈھونڈتا رہا۔ یہ خیال نہیں آیا کہ میں خود کو، اپنا آپ یہاں تمہارے پاس رکھ کر بھولا ہوں۔ عجیب محبت تھی ہماری، اظہار کو ترستی رہی۔ لیکن خسارہ تو میں نے بھی اٹھایا ہے۔ بے سکونی، بے اطمینانی، بس یہی کما لایا ہوں۔ کہو اب کیا کرو گی میرے ساتھ؟ بدلہ لو گی؟ معاف کر دو گی یا دھتکار دو گی!"

انوشہ نے اس کے ہاتھوں پر اپنا چہرہ جھکایا اور رو دی۔
محبت دھتکارتی کہاں ہے۔

* * *

دلہن بن کر وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا، درمیان کے ماہ و سال بھاپ بن کر غائب ہو گئے ہوں۔ الوہی چمک ان کے چہروں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اور دائمی خوشیاں متانت و وقار کے ساتھ ان کی آنکھوں سے چھلکتی تھیں۔

قدسیہ کا اک برسوں پرانا خواب تکمیل پایا تھا اور ان کا روم روم سراپا دعا تھا۔ آج وہ سرخرو ہوئی تھیں۔ اس یتیم بچی کی خوشیاں اور حق واپس ملا تھا۔ جمال نے خاموشی سے ہر کام میں شرکت کی تھی اور اسی خاموشی سے انہیں رخصت کیا تھا۔ ان تینوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو دبی نفرت و بیزاری تھی وہ کبھی کم نہ ہوئی۔ انوشہ کو سمیع کے ساتھ جانا تھا۔ دونوں نے بہت کوشش کی کہ قدسیہ ان کے ساتھ چلی چلیں۔ لیکن وہ علی اور شہریار کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں۔

رجا! وہ ننھا فرشتہ، قصہ پارینہ بن کر ان کے دلوں میں دفن ہو گئی تھی۔ خزاں آتی تو اس کی قبر خشک پتوں سے اٹ جاتی۔ بہار آتی تو وہاں ننھے ننھے خودرو پھول اُگ آتے۔ چہار سو سبزہ اُگتا۔ آم کے درخت پر بور آتا۔ برسات...... کے دنوں میں کوئل کوکتی۔

سبز طوطے کچے پکے آم کتر کتر کر نیچے پھینکتے۔

اور کہیں سے بہت سی تتلیاں بھی آ جاتیں۔

بہت سالوں تک وہ لوٹ کر وطن نہ آئے۔

خط......فون......آنے کے وعدے۔

پھر قدسیہ نے فون پر کہا۔ ”عمر کی نقدی ختم ہونے کو ہے۔ کیا اب بھی صورت نہ دکھاؤ گے؟“

تب وہ لوگ واپس لوٹے۔

اور یہاں آتے ہی وہی خلش، کاش رجا کے قاتل کے خلاف کوئی ثبوت مل جاتا تو یہ خلش بھی نکل جاتی۔

کسی کے قدموں کی چاپ نے سمیع کو چونکا سا دیا۔ گلہری جمپ لگا کر درخت پر چڑھ گئی۔ ”ارے ماضی کا سفر اتنی جلدی تمام ہو گیا۔“ وہ گویا اپنے ماحول سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”سمیع......“

سمیع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نبیل! میرے یار......“ دونوں بے اختیار بغلگیر ہوئے۔

”تم تو پہلے سے زیادہ موٹے ہو گئے ہو۔“

”اور تم پہلے سے زیادہ سمارٹ۔“ نبیل مسکرایا۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ ”تم کب پہنچے؟“

”بس ابھی۔ ابھی تو میں گھر بھی نہیں گیا۔ سیدھا رجا سے ملنے چلا آیا۔“

”ہاں......رجا......“ نبیل نے اک سرد سی آہ بھر کر قبر کی طرف دیکھا۔

”تم بہت بدل گئے ہو نبیل!“

”انوشہ اور بچے؟“ نبیل نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

”آئے ہیں؟“

سمیع نے جواب دیا اور پھر اس کی توجہ نبیل کے عقب میں کھڑی ننھی سی بچی نے کھینچ لی۔ خوبصورت سے فراک میں دو پونیاں باندھے دونوں ہاتھوں میں پھولوں کی ٹوکری تھامے کھڑی گردن اوپر اٹھائے درخت کی شاخوں میں نہ جانے کی تلاش کر رہی تھی۔ وہ ہو بہو نبیل کی کاپی تھی۔

”یہ تمہاری بیٹی ہے؟“

”ہاں۔“

”ہیلو بے بی......“ سمیع نے دھیرے سے اس کا گلابی گال تھپتھپایا۔ مگر بچی نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور یونہی گردن گھما گھما کر درخت کی شاخوں کو اپنی متلاشی نگاہوں سے ٹٹولتی رہی۔ سمیع کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

”نبیل یہ......“ نبیل کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔

”شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور ذہنی طور پر......“ نبیل نے اذیت سے نچلا لب کاٹ لیا۔

”آؤ......عینا......پھول ڈالیں۔“

نبیل نے کہا تو وہ پنجوں کے بل قبر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اور ننھے منے ہاتھوں سے قبر پر پھول بکھیرتی رہی۔ پھر اس نے ٹوکری سے کئی طرح کی، ”کی چین“ نکال کر قبر پر اک ترتیب سے رکھنا شروع کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟"

"یونہی۔ رجا کو پسند تھیں۔ یاد ہے کتنی ضد کیا کرتی تھیں۔" آہستگی سے کہہ کر نبیل نے آنکھیں بند کیں اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگا۔

سمیع اس کی بچی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر نبیل کو دیکھا تو حیرت کا اک جھٹکا سا لگا۔ آنسو اک تواتر سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

وہ اتنے سالوں کے بعد بھی رجا کے لئے رو رہا تھا۔

سمیع نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔

"ٹیک اٹ ایزی یار۔"

"وہ مجھے جینے نہیں دیتی۔" نبیل ایک دم سسک اٹھا۔ "وہ مجھے سکون سے نہیں رہنے دیتی۔ وہ مجھے معاف بھی نہیں کرتی۔ اس سے کہو۔ مجھے معاف کردے کہ قدرت نے جو سزا میرے لئے منتخب کی ہے، وہ کم نہیں ہے۔ تمہاری تو بہت مانتی تھی۔ اس سے کہو مجھے معاف کردے۔"

"نبیل! کیا ہو گیا۔" سمیع کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔

"پاپا......" ننھی بچی آگے بڑھی اور نبیل کا دامن کھینچنے لگی۔ نبیل نے جھک کر اسے اٹھایا تو وہ ننھے منے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ نبیل بنا کچھ بولے یونہی بچی کو کندھے سے لگائے خاموشی سے چلا گیا۔ سمیع کا ذہن الجھ گیا تھا اور دل غم سے بوجھل ہو گیا تھا۔ ایک بوجھل سی سانس سینے سے آزاد کرتے ہوئے اس نے پھولوں سے ڈھکی قبر کو دیکھا۔

خالی الذہنی کی کیفیت میں کی چین کو...... انگوروں کا گچھا، ریڈ شوز اور جوکر......"

"ریڈ شوز اور جوکر......" اس کے دماغ میں ایک دم جھماکا سا ہوا تھا۔

جب رجا مری تھی تب اس کے ہاتھ میں اک ایسی ہی کی چین تھی۔ بالکل نئی۔ جس پر سے ابھی ریپر بھی نہ اترا تھا۔

"یا اللہ!" وہ دم بخود سا رہ گیا۔

"وہ مجھے جینے نہیں دیتی۔ وہ مجھے معاف بھی نہیں کرتی۔ قدرت نے جو سزا میرے لئے منتخب کی ہے وہ کم نہیں ہے۔ میں سخت اذیت میں ہوں۔"

سمیع سرتاپا ہل کر رہ گیا۔

"شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور ذہنی طور پر......"

"قدرت نے جو سزا میرے لئے منتخب کی ہے۔"

"وہ مجھے جینے نہیں......"

"یا خدا...... یا خدا......" وہ بے دم سا ہو کر گرا تھا۔

زندگی کے کتنے برس اس نے اور جمال نے ایک دوسرے سے نفرت میں گزار دیئے۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل ایک دوسرے کو الزام دیتے اور کوستے گزرا۔ یہ حادثہ قدسیہ کے دل کا ناسور بن گیا تھا کہ ان کے بیٹوں میں سے کوئی ایک تو مجرم تھا ہی۔ کون جانتا تھا کہ نبیل۔

قاتل! اب سامنے تھا اور سزا...... ہاں سزا...... اور ہم ہوتے ہی کون ہیں کسی کے لئے سزا کا تعین کرنے والے۔

سمیع نے سر جھکا کر دل گرفتہ ہو کر سوچا۔

"کہ اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔"

جو سزا اس نے نبیل کے لئے منتخب کی ہے وہ واقعی کم نہیں ہے۔ پل پل کرب و اذیت کا سفر۔ زندگی کی آخری سانس تک بار بار مرنے کا عمل۔ وہ جتنی بار اپنی بچی کو دیکھے گا۔ اتنی بار اذیت کے کوڑے اس کی روح پر برسیں گے۔ ہاں اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔"

اس نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ خشک پتے اس کے قدموں تلے چرچرائے۔

شاخوں میں اونگھتی ہوا ہڑبڑا کر جاگی اور شاخیں...... شائیں کرنے لگی۔

چڑیاں ایک دم چہچہائیں اور پھر سے اڑنے لگیں۔

طوطوں کی ٹیں...... ٹیں نے منظر کو پھر سے جگا کر رکھ دیا تھا۔

گلہری درخت سے کودی اور بے حد حیرت سے اسے واپس جاتا دیکھنے لگی۔

سفید تتلی اب کہیں نہیں تھی۔

* * *

او بے پروا سجن

شاداب سارے لان میں اِدھر سے اُدھر چکراتے ہوئے رٹے مارنے میں مصروف تھی۔ صبح ہی صبح اسے خاصی ڈانٹ پڑی تھی کہ حسب معمول اس نے ناشتہ کیا اور چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر ٹی وی کے سامنے براجمان ہوگئی۔ خیال یہی تھا کہ جب چائے ختم ہوگی تب تک دیکھوں گی‘ مگر وہ چائے کا کپ پورا دو گھنٹے پر محیط ہوگیا۔ فضہ اور مریم کالج سدھار گئیں۔ ممی بھی اسے پڑھنے کی تلقین کر کے سکول چلی گئیں۔ جنید بھی آفس چلا گیا‘ مگر یہ چائے کا کپ ختم نہیں ہوا۔

سائرہ جو کہ اس کی تائی ہوتی تھیں۔ پہلی بار سبزی کی خالی ٹوکری لے کر لاؤنج کے سامنے سے گزریں تو نظرانداز کر گئیں۔ دوسری بار سبزی لے کر واپس آئیں تو گھور کر دیکھا۔ وہ فاخر کے ”سو لینے“ میں گم تھی۔ خالی کپ ہاتھ میں پاؤں سامنے میز پر ٹکے مسلسل حرکت میں تھے۔ فیوژن شروع ہوا تو آنٹی کی آواز ان سے زیادہ تیز تھی۔ اس نے خالی کپ بوکھلا کر ٹیبل پر پٹخا۔ ننگے پاؤں اوپر کمرے کی طرف بھاگی۔

”کتابیں لے کر دو منٹ میں نیچے آؤ۔“

اور انہیں غصہ آتا تھا تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ کچھ کہہ سکے۔ سو اسے کتابوں سمیت یہاں لان میں لا پھینکا تھا کہ دو گھنٹے مسلسل پڑھو اور یہاں سے ہلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ کمرے میں اس لئے نہیں کہا کہ وہاں نصابی کے بجائے غیر نصابی سرگرمیوں کی زیادہ گنجائش تھی۔ ٹیرس پر اردگرد کے نظارے زیادہ دلفریب تھے اور سائرہ اس کی رگ رگ سے واقف‘ سو اب وہ کچھ غصے اور کچھ جھنجلاہٹ میں رٹے مار رہی تھی۔ آنٹی سائرہ پہلے لاؤنج میں بیٹھی سبزی بناتی رہیں۔ پھر اسٹور میں گھس گئیں۔

”مریم کی بچی نے بتایا نہیں کہ وہ جنید بھائی کو کیا گفٹ کر رہی ہے۔“

پڑھتے پڑھتے اسے اچانک جنید کا برتھ ڈے یاد آ گیا تھا۔ آنٹی کمرے سے نکلیں تو وہ پھر سے اپنے ٹاپک کی طرف متوجہ ہوگئی۔

سائرہ آنٹی کچن میں گھس گئی تھیں۔

”اسکن کتنی رف ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے آنٹی کے گھریلو نسخے آزما ہی لینے چاہئیں۔“

دو چار صفحے پلٹے‘ نئے ٹاپک کی تین چار سرخیاں دیکھیں۔

”مائرہ نے تو بہت پڑھ لیا ہوگا۔ شام کو فون کروں گی۔“

متفکر انداز میں سوچا گیا۔ پھر چند لائنیں اور پڑھیں ٹاپک مشکل لگا۔

”پہلے آسان سے شروع کرتی ہوں۔“ اگلا اور سب سے چھوٹا چیپٹر کھل گیا تھا۔

”رات جو جیکی چن کی مووی آئی ہے۔ اللہ کرے جنید کو کوئی کام پڑ جائے‘ بارہ بجے سے قبل واپس نہ آئے مگر اسے بھی ہم سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ جس دن کوئی ڈھنگ کی مووی آنی ہو نو بجے ہی گھر پہنچ جاتا ہے۔“

اگلے چند منٹ نہایت انہماک اور خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھا گیا۔

تب ہی ایک دم بھوک ستانے لگی۔ شاید کچن کی طرف سے اٹھتی خوشبوؤں کا کمال تھا۔

ذرا سی دیر میں وہ کچن کے دروازے پر موجود تھی۔

”کیا بات ہے ابھی دو گھنٹے تو نہیں ہوئے۔“

”پانی پینا تھا۔“ نہایت معصومیت سے فرمایا۔

انہوں نے مشکوک نظروں سے گھورا پھر اجازت دے دی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے آنٹی کو دیکھا۔ وہ زور و شور سے ایک دیگچی میں چمچہ ہلا رہی تھیں۔ پھر ذرا کی ذرا ہاتھ روک کر ٹماٹر کاٹنے لگیں۔

”آج کھانے میں کیا ہے۔“

”آلو قیمہ اور کھیر......“

”کھیر تو جنید بھائی کو بہت پسند ہے۔ میں کچھ مدد کرواؤں؟“

”کیوں؟“ ماتھے پر شکن ابھری۔

”یونہی آپ اکیلی پکا رہی ہیں۔“ کچھ ہکلا کر لہجے میں خلوص پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”میں روز اکیلی ہی پکاتی ہوں۔“

”ہاں مگر وہ......“

"پانی پی لیا ہے تم نے ......" ان کا ضبط جواب دے گیا۔

"جی ہاں۔"

"ہاتھ میں پکڑی ناشپاتیاں واپس رکھو اور جا کر پڑھو۔ جو سات منٹ یہاں ضائع کئے ہیں ان سمیت۔"

"اف کتنے آرام سے بے عزتی کر کے رکھ دی ہے۔" عقب سے ہاتھ سامنے لا کر دونوں ناشپاتیاں فریج میں رکھیں اور پاؤں پٹخ کر دوبارہ باہر آ گئی۔

"میں بھی نہیں پڑھ رہی نہ جانے تعلیم کے معاملے میں آنٹی اتنی خوف ناک بلکہ خونخوار کیوں ہو جاتی ہیں۔ غضب خدا کا میری بھوک پیاس کا بھی کوئی احساس نہیں۔" پھر کتابوں کو گھور کر دیکھا۔ "کس قدر نامعقول کام ہے یہ ماسٹرز کرنا۔ نہ جانے کس احمق نے مشورہ دیا تھا۔ اچھی بھلی گریجویشن کر کے بیٹھی تھی۔ آرام سے شادی کر کے عیش کرتی۔"

تب ہی یاد آیا کہ یہ کسی دوسرے کا نہیں خاص الخاص اس کا اپنا فیصلہ تھا۔

"خیر اتنا نامعقول کام بھی نہیں۔ بس پڑھنا بہت زیادہ پڑتا ہے' لیکن یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں میں اچھی خاصی ذہین ہوں۔ ذہین بھی اور خوبصورت بھی۔"

گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر لان میں کھلے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ پھر بے زاری سے سیدھی ہوئی۔

"ایک تو آنٹی بھی آج فارغ نہیں ہو رہیں۔ تھوڑی دیر کو سو جائیں تو آرام کر لوں۔" گویا پکا ارادہ تھا کہ پڑھنا بالکل نہیں ہے۔ دھیان کچن ہی کی طرف تھا۔ آنٹی سائرہ کچن سے نکلیں اور اسٹور میں دوبارہ گھس گئیں۔

"اسٹور میں نہ جانے کون سے پہاڑ کھودنے ہیں۔"

تھک ہار کے اسے کتاب کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔ ذرا سی دیر میں وہ پھر سے لان میں چکراتی پوری محویت کے ساتھ پاکستان کے معاشی نظام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب عین گیٹ کے پاس پہنچی تو کسی نے گیٹ دھڑ دھڑایا۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔

"اف" کتاب ہاتھ میں لیتے ہوئے گیٹ پھاڑ نظروں سے گیٹ کو دیکھا۔

آنے والا بھی خاصا بے صبرا تھا۔ وہ تن فن کرتی گیٹ کے نزدیک آئی۔

"کیا مصیبت ہے آپ کو۔ لگتا ہے کبھی دستک دینے کے آداب نہیں سیکھے۔ یہ گیٹ کے ساتھ ایک عدد بیل بھی ہے اور یہ بجانے کے لیے ہوتی ہے اور اصولاً تین بار دستک کے جواب میں اگر کوئی نہیں آ رہا تو آپ کو واپس چلے جانا چاہئے تھا۔"

"واپس ...... امریکہ ......"

"ہیں۔" وہ ٹھٹکی پھر ڈھٹائی سے گویا ہوئی۔

"بالکل کیونکہ یہی دستک دینے کے آداب ہیں۔"

کچھ تجسس میں چھوٹے گیٹ کی کھڑکی کھولی۔

"یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہیں۔"

جو چہرہ سامنے آیا تھا۔ اس نے شاداب بی بی کے چہرے کا رنگ اور ہاتھوں کے طوطے سب اُڑا دیئے۔ دوسرے پل اس نے کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔ اندر کی طرف دوڑ لگا دیتی مگر دستک دوبارہ ہوئی تھی۔

"اور اگر آنٹی باہر آ گئیں تو ...."

"ک ...... کس سے ملنا ہے؟" آواز میں واضح لرزش تھی۔

"یہ آنٹی نجمہ کا گھر ہے؟" آواز بھاری اور بارعب تھی۔ شاداب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

"جی ہاں ...... جی نہیں ......"

"جی ہاں یا جی نہیں ......"

"یا اللہ میاں جی! آج بچا لیں۔ اس کے بعد میری پکی پکی توبہ ...... میں کبھی گاڑی لے کر نہیں نکلوں گی۔ مجھے کیا پتا تھا یہ شکایت لگانے گھر تک چلا آئے گا۔ حالانکہ اتنا نقصان بھی نہیں ہوا تھا اور میں نے کتنی شرافت سے اس کا نقصان پورا بھی کر دیا تھا۔ مگر یہ بندہ شریف نہیں نکلا بلکہ انتہائی خبیث ......"

"محترمہ! کیا بڑبڑا رہی ہیں۔" آواز میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔ "کیا یہ آنٹی نجمہ کا گھر نہیں ہے۔"

"جی نہیں۔" اس نے جھٹ سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف ایک پل کو خاموشی چھا گئی۔

پھر اک کارڈ درواز میں سے اندر آیا۔

"کیا ایڈریس یہ نہیں ہے؟"

"اف جنید بھائی کا کارڈ ...... اللہ وہ اسے کہاں مل گئے۔"

"یہ آپ ...... بار بار سو کیوں جاتی ہیں۔"

"ایک تو آپ بے صبرے بہت ہیں۔ یہی ایڈریس ہے۔" جنید کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ انکار شامت بلانے کے مترادف ہوتا۔

"تو یہ آنٹی نجمہ کا گھر ہوا نا۔"

"نہیں ان کا گھر تو نہیں ہے۔"

"اگر ایڈریس یہی ہے تو آنٹی نجمہ یہاں کیوں نہیں رہتیں۔"

"میں نے کب کہا وہ یہاں نہیں رہتیں۔" وہ گڑبڑا گئی۔ ذہن اسے بھگانے کے طریقے سوچ رہا تھا۔

"گویا یہاں رہتی ہیں۔"

"جی......"

"تو ان کا گھر ہوا؟"

"خیر' گھر تو ان کا نہیں ہے۔"

"کیا آپ پاگل ہیں' اندر جا کر بتائیں کہ زریاب مرتضیٰ ہمدانی آیا ہے۔"

"میں خواہ مخواہ......"

"ارے زریاب تم......" جنید کی آواز ابھری۔

"مارے گئے۔ شابی بھاگ......"

وہ بگٹٹ وہاں سے بھاگی۔ مگر گھبراہٹ میں پہلی ہی رو میں رکھے بڑے سے گملے کے ساتھ الجھ کر گر پڑی۔

"ہائے......" وہیں گھٹنا پکڑ کر ڈھیر ہوگئی۔ جنید کے پاس گیٹ کی چابی تو ہوتی ہی تھی۔ گیٹ کھلا اور جنید زریاب سمیت اندر تھا۔ وہ بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر کے ہائے ہائے کرتی گھٹنوں میں چہرہ چھپا گئی۔ جنید نے حیرت' غصے اور خجالت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا۔

"کیا ہوا......؟"

"کچھ نہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ چہرہ اٹھانے کی غلطی نہیں کی۔ زریاب کا دل چاہا۔ وہ جنید کو اپنے استقبال کے بارے میں بتائے مگر اس کی حالت دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ مگر سوالیہ نظروں سے جنید کو دیکھا۔

"شاداب ہے آنٹی نجمہ کی بیٹی۔" اس نے دانت پیس کر تعارف کروایا۔ "تم آؤ اندر" وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

"ہونہہ آئے بڑے کہیں سے۔ اتنا تو ہو نہیں سکا کہ......" وہ غصے میں ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی پھر اسی جھٹکے سے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ سر پر کھڑا سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"کیا بہت چوٹ لگی ہے۔" الفاظ ہمدردانہ سہی مگر لہجے میں نرمی کا تاثر نہیں تھا۔

"جی ہاں...... جی نہیں۔"

"جی ہاں...... یا جی نہیں۔"

"جی ہاں...... جی نہیں...... پتا نہیں......" وہ جھنجھلا گئی۔ زریاب ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اچھا ہے......" اک گہری سی نظر اس پر ڈال کر چلا گیا۔

"کیا اچھا ہے۔ ہائے اللہ! کہیں دھمکی تو نہیں دے گیا۔"

"ہیں...... یہ آپ کو کیا ہوا محترمہ؟" عظیم نے اندر آتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ وہ کالج سے لوٹا تھا۔

"میرے چوٹ لگ گئی ہے۔" لہجہ گلوگیر تھا۔

"یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔"

"مجھے سخت رونا آرہا ہے۔"

"یہ بھی نئی بات نہیں۔"

"عظیم پلیز۔"

"فرمایئے۔"

"ذرا سا سہارا دو۔" شاداب نے ہاتھ بڑھایا تو وہ اسے سہارا دیتے ہوئے لاؤنج میں لے آیا۔

"تمہیں کیا ہوا شاداب......!" سائرہ اسے لنگڑاتے دیکھ کر لپکیں۔

"امی! کم از کم آپ تو یہ سوال مت کیا کریں۔"

"مجھے کمرے تک چھوڑ آؤ۔" وہ جلد از جلد منظر سے غائب ہونا چاہتی تھی۔

"یہاں بیٹھو میں......"

"میں آیوڈیکس لگا لوں گی۔" اس نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔ عظیم اسے بے حد شرافت سے کمرے تک چھوڑ گیا تھا۔

"کچھ دن تو سکون سے گزریں گے۔"

مگر سکون کہاں رہا تھا۔ یہ اتنا بڑا چھ فٹا خطرے کا نشان جو گھر میں داخل ہوگیا تھا۔ وہ اپنا گھٹنے کا درد بھول کر ہولتی رہی۔ نہ جانے کس انداز سے۔ بات کرے اور جنید کیا سمجھے۔ تب ہی فضہ آگئی۔ ہولتی کانپتی اِدھر سے اُدھر کتابیں گراتی دھپ سے اس کے بیڈ پر اوندھے منہ گری تھی۔

"کچھ نہ پوچھو کیا ہوا۔" کچھ نہ پوچھو کی گردان جاری تھی۔

"تو میں کب کچھ پوچھ رہی ہوں۔"

"اف اللہ مر گئی آج تو...... ہائے میرے پاؤں...... روتی۔ ہائے...... ارے کوئی پانی پلائے کہیں میری جان نکل نہ جائے۔"

"اللہ کرے نکل جائے۔" اس نے سائیڈ ٹیبل سے پانی کا جگ اٹھایا اور پورے کا پورا اس پر الٹ دیا۔ اس کی چیخ و پکار آہ و بکاہ کے جواب میں نیچے سے سائرہ نے تندو تیز اور دھواں دھار جواب دیا تھا۔

"یہ گھر یا مچھلی بازار۔" نہ جانے کس کونے سے جنید کی گرج سنائی دی۔ فضہ ساکت ہو کر اسے گھورتی رہی۔ بالوں کا خوبصورت ہیر اسٹائل برباد ہو گیا تھا۔

"تم اس وقت دادی کی گنجی ککڑی لگ رہی ہو جو دادی پچھلے سال گاؤں سے لائی تھیں۔" بے حد آرام و سکون سے مطلع کیا گیا تھا۔ اس نے نہ جانے کس طرح یہ بے عزتی برداشت کی تھی۔ بے حد سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"تمہیں پتا ہے میں آج مر گئی تھی۔"

"کس پر؟"

"میں مزید چند منٹ تک نہ آتی تو تمہیں اس پوری گلی میں میرے چیتھڑے ملتے' اکٹھے کرتی تو بھی فضہ نہ بنتی۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں جھاڑو اٹھاتی۔ سب گند بلا اکٹھا کر کے گلی کے کونے میں رکھے ڈرم میں ڈال آتی۔ خس کم جہاں پاک۔"

"تم بکواس ہی کرتی رہنا۔ یہ مت پوچھنا کہ ہوا کیا۔ میں نہ جانے کس طرح بچ کر گھر تک پہنچی ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا۔ آج وہ میرے پیچھے آ گیا تھا۔"

"ک...... کون......؟"

"وہی جو نفیس صاحب کی گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا۔"

شابی کے ذہن نے قلا بازیاں کھائیں۔ نفیس صاحب کا ایک ہی بیٹا تھا۔ دماغی طور پر ذرا سا معذور......

"لمبا چوڑا' سفید رنگ' ماتھے پر سیاہ داغ' یہ بڑی بڑی آنکھیں اور دانت۔" اس نے

جھرجھری لی۔

"یہ حلیہ نفیس صاحب کے بیٹے کا تو نہیں۔ درمیانہ قد' سانولی رنگت' چھوٹی سی آنکھیں' نہیں وہ نہیں...... کوئی مہمان آ گیا ہوگا۔

"مگر تمہیں کہاں مل گیا؟"

"بتایا تو ہے کہ روز وہیں کھڑا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتا رہتا تھا۔ کالج سے واپسی پر گزرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کب تک برداشت کرتی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

شابی ہکا بکا رہ گئی پھر برس پڑی۔ بے بھاؤ یک سنائیں آخر برداشت کیوں کرتی رہی۔ بتایا کیوں نہیں۔ ایسی کی تیسی کر دیتے' اٹھا کر بلاک سے ہی باہر پھینک دیتے۔ جنید کو پتا چلتا تو سرمہ بنا کر رکھ دیتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

"میں نے سوچا خود ہی کہیں دفعان ہو جائے گا۔ لیکن آج تو میری برداشت ہی جواب دے گئی۔ بس سڑک کے کنارے پتھر اٹھایا اور دے مارا ماتھے پر۔"

"زبردست......"

"پھر کیا ہوا اس کے تیور بدل گئے...... خونخوار نظروں سے مجھے گھورا اور......"

"اور......" شابی کی سانس بند ہونے لگی۔

"وہ میرے پیچھے بھاگا' میں نے بھی دوڑ لگا دی۔ اف...... تپتی...... سڑک' جلتا سورج اور میں تنہا اکیلی لڑکی......"

"میرا دل......" شابی کا ہاتھ سینے پر چلا گیا۔ سانس بند' آنکھیں پھٹی ہوئی رنگ بالکل فق۔

"میں بھاگتی رہی...... بھاگتی رہی...... وہ بھی بھاگتا رہا۔ کوئی گیٹ بھی نہیں کھلا تھا کہ میں اندر گھس جاتی اور پھر......"

"اور پھر......" پھنسی پھنسی آواز عجیب و غریب سی تھی۔

"پھر میرا دوپٹہ......" شابی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ عظیم سرخ چہرے کے ساتھ اندر تھا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے آنکھوں سے گویا لہو ٹپک رہا تھا۔

"کون تھا وہ......؟" سنگین لہجے میں ڈپٹ کر پوچھا۔

وہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہی۔

"کون تھا وہ......"

"ک......کون......" وہ ہکلا گئی۔

"میں پوچھتا ہوں کون تھا وہ...... کس کی اتنی جرأت ہوئی کہ ہمارے محلے میں میری بہن کے ساتھ...... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ بتاؤ کون تھا۔ وہ جس نے تمہارا دوپٹہ......" وہ دھاڑ رہا تھا۔

"ک......کتا......"

"کون......؟"

"نفیس صاحب کا نیا کتا...... ہر روز گیٹ سے تھوتھنی نکالے بھونکا کرتا تھا۔ آج تو پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ حالانکہ میں نے تو صرف پتھر مگر تم اسے بالکل مت چھوڑنا' بے شک ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کیونکہ اس نے میرا نیا کالج کا دوپٹہ......"

"شٹ اپ......" بات سمجھ میں آتے ہی وہ حلق کے بل چیخا تھا۔

"تم......تم......" وہ ادھر ادھر نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا...... وہ ڈر کر شابی کے پیچھے جا چھپی۔

"اللہ کی قسم! میں تو کتے کی ہی بات کر رہی تھی۔ تم نہ جانے کیا سمجھ رہے تھے؟" شابی ہنسنے لگی۔

"بھاڑ میں جاؤ......" عظیم تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

"کیا ہو گیا بیٹا! یہ پنجابی فلم کے ڈائیلاگ اردو میں کیوں بول رہے تھے۔" سائرہ بے حد تفکر سے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ پاؤں پٹختا باہر نکل گیا کچھ سکون ہوا تو شابی کو اپنا گھٹنے کا درد اور اس سے وابستہ ہستی بھی یاد آ گئی۔

"فضہ!" اس کا لہجہ دہلا دینے والا تھا۔

"جب تم اس طرح بولتی ہو تو لگتا ہے یا تو تمہارا ہارٹ فیل ہونے والا ہے یا میرا۔"

"وہ......وہ آیا ہے۔"

فضہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

"پہلے بتا دو وہ کون آیا ہے ورنہ ابھی عظیم آ جائے گا۔"

"وہی جس کی گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی ٹکرائی تھی۔ اور اکیلا ہی نہیں مرتضیٰ اور ہمدانی بھی اس کے ساتھ ہیں۔" پرسوں ڈرائیونگ کے شوق میں وہ جنید کی گاڑی لے کر نکلی تھیں۔

"وہ کون ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"ارے اتنی ہمت کہ منہ اٹھا کر ہمارے گھر پہنچ گئے۔" اسے تاؤ آ گیا۔

"اس دن تو بچت ہو گئی تھی۔ جنید شہر سے باہر تھا۔ آرام سے گاڑی کی مرمت بھی ہو گئی مگر یہ لوگ نہ جانے کیا کہہ دیں۔ جنید کے غصہ کا تو پتا ہے نا......"

سائرہ آواز دے رہی تھیں۔ مریم کی آواز بھی آ رہی تھی۔ گویا ابھی آفس سے واپس آئی تھی۔

"دیکھو ہم صاف مکر جائیں گے۔ اس کے پاس کوئی ثبوت تو ہے نہیں کہ ایکسیڈنٹ ہماری گاڑی کے ساتھ ہوا تھا۔"

فضہ نے کہا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"تمہارے لئے کھانا یہیں لے آؤں۔ اگر گھٹنے میں زیادہ درد ہے تو......" فضہ شرارت سے مسکرائی۔

"جی نہیں۔ چل رہی ہوں میں۔"

مگر سیڑھیوں کے درمیان میں ہی قدموں میں زنجیر پڑ گئی۔ حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ گھٹنے کا درد کچھ زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر بڑی شان سے موجود تھا اور نجمہ سے بڑی اپنائیت سے بات چیت جاری تھی۔ کھانا لگ چکا تھا اور سائرہ آنٹی وقفے وقفے سے ایک ایک کو پکار رہی تھیں۔ وہ دونوں دبے قدموں واپس مڑنے لگیں۔ تب ہی ان کی نظر اوپر اٹھی دوسرے پل نجمہ نے بھی انہیں پکار لیا تھا۔ مرے مرے قدموں سے وہ ٹیبل کی طرف چلی آئیں۔

"یہ شاداب ہے میری بیٹی اور یہ فضہ...... مریم کی بہن اور بیٹا یہ تمہاری نائلہ خالہ کے بیٹے زریاب ہیں......"

"جی......" وہ دونوں چیخ اٹھیں۔

"میں مل چکا ہوں......" کہنی کرسی کی پشت پر ٹکاتے ہوئے اس کی گہری سنجیدہ نگاہیں براہ راست شابی پر جمی تھیں۔

"کب......؟" نجمہ نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"ابھی پرسوں......"

"والسلام علیکم...... زریاب بھائی......" دونوں ایک زبان ہو کر بولی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور پھر سے نجمہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"دراصل پرسوں مجھے......"

"نائلہ خالہ کیسی ہیں؟" شابی نے فوراً دخل دیا۔

"ٹھیک تھیں ......" مختصر جواب اور رُوئے سخن پھر سے نجمہ کی طرف۔

"سپر مارکیٹ میں۔"

"انہیں ساتھ لے آتے۔"

زریاب نے رخ موڑا اور سنجیدہ نگاہیں پورے طور پر اس کے چہرے پر جما دیں۔ وہ گڑ بڑا کر خالی پلیٹ کو گھورنے لگی۔ زریاب نے باقی بات اسی طرح پوری کی۔ وہ صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کا ایڈریس بھول گیا تھا۔ اس لئے ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا۔ پرسوں سپر مارکیٹ میں اسے جنید کا دوست نعمان ملا تھا اسی نے انہیں جنید کا نیا ایڈریس دیا تھا۔ نعمان ایک دوبار امریکہ گیا تو نجمہ نے اس کے ہاتھ کچھ چیزیں نائلہ خالہ کے لیے بھجوائی تھیں۔

اپنی بات مکمل کر کے وہ اندر آتی مریم کو دیکھنے لگا۔ جو پانی کا جگ لیے آرہی تھی۔ شابی نے میز کے نیچے سے فضہ کا ہاتھ دبایا۔

"ڈر گئے مجھ سے ......" فضہ نے سرگوشی کی تھی۔

"آپ لوگ یہاں کب شفٹ ہوئے تھے؟" زریاب پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے انکل کی ڈیتھ کے بعد پانچ سال میں نے اسی گھر میں گزارے تھے مگر اب مشکل لگنے لگا۔ بچیوں کا ساتھ تھا۔ بھائی صاحب اگرچہ شارجہ میں ہیں مگر جنید ہے' عظیم ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اکٹھے ہی رہا جائے۔" نجمہ نے بتایا۔

"اور رباب خوش تو ہے اپنے گھر میں۔"

"اللہ کا شکر ہے بہت خوش ہے۔"

باتوں کا رخ بدل گیا تھا۔ شابی بھی اطمینان سے کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جب کہ فضہ اس کے کان میں پوچھ رہی تھی۔

"وہ باقی دونوں کہاں ہیں۔"

"کون ......؟"

"مرتضٰی اور ہمدانی۔"

شابی مسکراہٹ دباتے ہوئے پوری کی پوری پلیٹ پر جھک گئی تھی۔

* * *

26 اگست 2002ء

گاؤں کی خشک گرم شامیں بہت سنسان اور اداس ہوتی ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے گاؤں

کی گلیوں پر چھایا یہ خاموش غبار مجھے کھینچ رہا ہے۔ اپنے اندر جذب کر رہا ہے۔ زبیر جب یہاں ہوتے ہیں تو مجھے یہ اداسی' یہ خاموشی بہت اچھی لگتی ہے اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو بہت ویران۔

"میرا دل چاہتا ہے اس شام کو بہت قریب سے دیکھوں' بہت پاس سے چھو کر محسوس کروں۔" نہ جانے کس لمحے میں نے زبیر سے یہ کہہ دیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر اوپر لے گئے۔

"اب دیکھو۔"

میں نے دیکھا چھوٹی چھوٹی دیواروں کے اس پار کچے پکے مکان' آموں اور سنگترے کے باغوں کے سلسلے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کے پار غروب ہوتا سورج ...... جس کی زرد نارنجی روشنی کا غبار سارے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہی تھی اور زبیر مجھ کو ......

"یہاں نہیں وہاں جہاں اس کے اور میرے بیچ کوئی نہ ہو۔ نہ درخت' نہ کھیت' نہ مکان' نہ دیواریں۔" شاید میں ان کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر بول اٹھی تھی۔ وہ ذرا سا جھکے اور ان کی گرم سانسیں میرے گالوں سے ٹکرانے لگیں۔

"سورج طلوع ہوتا ہو یا غروب ہوتا ہو ایک سا جلاتا ہے۔ زیادہ قریب جانے کی خواہش مت کرو۔ پگھلا کر رکھ دے گا۔"

ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ میرا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ ان کی گرفت میرے کندھے پر مضبوط ہوئی۔

"چلو وہاں چلتے ہیں جہاں کوئی نہ ہو' نہ کھیت' نہ باغ' نہ یہ دیواریں اور نہ میرا رقیب یہ غروب ہوتا سورج ......"

اس سے آگے ڈائری کا صفحہ ادھورا اور خالی تھا۔ یوں لگتا تھا وہ کسی خاص لمحے کی زد میں آکر ان ہی اوراق کو اوڑھ کر سو گئی تھی۔

* * *

چند دنوں میں انہیں اطمینان ہوگیا۔ زریاب ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا تو پھر شام ڈھلے ہی گھر لوٹتا تھا۔ وہ گھر کا نقشہ بنوا رہا تھا۔ خالہ' خالو کا ارادہ اب مستقل پاکستان شفٹ ہونے کا تھا۔ اسی لئے زریاب پہلے ہی یہاں آگیا تھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ آنٹی نے انہیں یہاں لڑکی پسند کرنے کو بھیجا ہو۔" فضہ نے ناک

پر عینک جما کر اشتیاق سے پوچھا۔ ''آخر لڑکیوں والا گھر ہے۔''

''لڑکیاں نہ ہوئیں' ڈیکوریشن پیس ہو گئے۔ جو پسند آیا اٹھا کر اپنے گھر میں سجا لے گا۔ مجھے تو اس دوڑ سے دور ہی رکھو۔'' مریم نے انگور کھاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ اس نے بی ایس سی کے بعد کمپیوٹر سینٹر جوائن کر لیا تھا۔

''نہیں کرنا تو خیر مجھے سائیکالوجی میں پی ایچ ڈی ہے۔ اس لئے شادی کا دور دور تک ارادہ نہیں' باقی تو بس یہ شابی بچتی ہے۔''

اس نے شابی کو دیکھا مگر وہ پوری طرح فلم میں منہمک تھی۔ کیبل کا تار جنید کے کمرے میں تھا اور کبھی کبھار اچھی صاف ستھری مووی آ رہی ہوتی تو وہ خود ہی انہیں بلا لیتا اور خود اپنے کسی کام سے نکل جاتا۔ مگر بقول شابی ''اب اس عمر میں کم از کم یہ فیصلہ تو ہمیں خود ہی کرنا چاہئے کہ کون سی فلم اچھی ہے اور کون سی بری۔ کون سی مووی دیکھنی ہے اور کون سی چھوڑنی ہے۔'' اس لئے جب بھی فضہ کالج اور مریم کمپیوٹر سینٹر سے واپس آ کر کھانا کھانے کے بعد فارغ ہوتیں اور امیاں قیلولہ فرماتی تھیں۔ شابی تو خیر گھر میں ہی رہتی تھی کہ پرائیویٹ ایم اے کر رہی تھی۔

تو تینوں جنید کے کمرے میں گھس جاتیں۔ اطمینان سے فلم دیکھی جاتی۔ اُدھر گیٹ پر بیل سنائی دی۔ اِدھر تینوں اپنے کمرے میں۔ اس کوشش میں کبھی فلم کا پہلا حصہ دیکھا جاتا تو کبھی آخری۔ مگر فلم کبھی نہ کبھی تو پوری ہو ہی جاتی تھی۔ تایا ابو شارجہ میں ملازمت کرتے تھے۔ سال دو سال کے بعد ہی چکر لگاتے۔ جنید ان کا بڑا بیٹا تھا۔ حال ہی میں اس کی جاب ہوئی تھی۔ اب تو تایا بھی سوچنے لگے تھے کہ مستقل واپس آ جائیں۔ جنید کے بعد مریم اور فضہ تھیں پھر عظیم۔ سب سے چھوٹا ہونے کی بنا پر کسی گنتی میں نہ آتا تھا جبکہ جنید کو ہمیشہ بڑے بیٹے کی بنا پر خاصی توجہ اور اہمیت ملی تھی۔ سو اس کے مزاج میں تحکمانہ اور بڑا پن کچھ زیادہ ہی تھا۔

گیٹ پر بیل ہوئی۔ کمرے میں ہبڑ دبڑ مچ گئی۔ فضہ سب سے پہلے کمرے سے بھاگی تھی۔ شابی نے اپنے جوتے اٹھائے۔ مریم نے سب کچھ آف کیا اور بھاگتی ہوئی لان میں آ بیٹھیں مگر آنے والا عظیم تھا۔ کالج سے آیا تھا۔ مریم اسے کھانا دینے اٹھ گئی۔ واپس آئی تو انگوروں سے بھری ٹوکری ساتھ تھی۔

''عیش کرو۔ آئس کریم بھی ہے ذرا ٹھہر کر کھائیں گے۔''

''آج تمہیں پے ملی ہو گی۔''

''بالکل!''

دانہ دانہ انگور ٹونگتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ تب ہی ہارن کی آواز پر چوکیدار نے گیٹ کھولا تھا اور آنے والی ہستی کو دیکھ کر وہ تینوں ہی متحیر رہ گئی تھیں۔ سفید پینٹ' انگوری شرٹ اور گلے میں اسکارف' اپنے گھنگھریالے بالوں کو اونچی سی پونی میں قید کئے۔ وہ بڑی سی گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

''ہائے!'' کندھے پر بیگ اور دوسرے ہاتھ میں موبائل لے کر گاڑی کا دروازہ بند کر کے وہ وہیں سے پکاری تھی۔

''یہ رومیہ بی بی کو آج ہماری یاد کیسے آ گئی۔''

رومیہ' نجمہ کی کزن کی بیٹی تھی بلکہ اکلوتی لاڈلی اور نک چڑھی بیٹی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ سو ناز و نعم میں پلی۔ نخرہ بلا کا تھا۔ خاندان کی لڑکیوں میں اس کے متعلق کبھی بھی اچھی رائے نہیں پائی گئی۔ کچھ اس کی بے تحاشا دولت اور خوبصورتی سے حسد کرتی تھیں تو کچھ اس کی آزادروی سے خائف۔ کچھ مریم' فضہ اور شابی جیسی بھی تھیں جنہیں اس کا نخرہ اور غرور برا لگتا تھا۔ البتہ خاندان کے لڑکوں سے اس کی ہیلو ہائے ضرور ہو جاتی تھی اور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کو دوستی کا شرف بھی بخش دیا جاتا مگر اس کی یہاں موجودگی......

''ہائے...... میں یہاں سے گزر رہی تھی' سوچا تم سے ملتی جاؤں۔''

''مقام حیرت......'' مریم بڑبڑائی پھر اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ کرسی پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ تو گئی مگر فوراً ہی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔

''تم لوگ اتنی گرمی میں کیوں بیٹھی ہو۔''

''گرمی تو نہیں' اچھی بھلی ہوا چل رہی ہے۔'' شابی نے آرام سے کہا اور انگور کھانے لگی۔ اسے بھی دعوت دی مگر اس نے انکار کر دیا۔ مریم اس کے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی۔

''شاید اے سی سے نکل کر زیادہ فیل ہو رہا ہے۔''

''ڈرائنگ روم میں چلیں۔''

''نہیں' میں بس کچھ وقت ہی ٹھہروں گی۔'' وہ کولڈ ڈرنک کے سپ لینے لگی۔

''رومیہ آپی! آپ نے گاڑی بدل لی ہے۔'' فضہ نے اس کی شاندار گاڑی کو للچائی نظروں سے دیکھا۔

''اب تو پرانی ہو گئی ہے۔ پاپا نے میڈیکل میں ایڈمیشن کی خوشی میں لے کر دی تھی۔'' وہ لاپروائی سے گویا ہوئی۔ ''آنٹی لوگ کہاں ہیں؟''

''آنٹی لوگ اس وقت قیلولہ فرماتی ہیں۔'' شابی نے جواب دیا۔

"کیا کرتی ہیں؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"آرام......آرام کرتی ہیں اس وقت۔"

"آئی سی' زریاب کب تک واپس آجاتے ہیں۔" لہجہ سرسری سا تھا۔ وہ تینوں چونکیں پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر مبہم سا مسکرائیں۔ تو یہ وجہ تھی رومیہ کی موجودگی کی۔

"کوئی ٹائم فکس نہیں ہے' کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے' دیر سے آئیں۔" جواب مریم نے دیا تھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا' زریاب بھائی آئے ہوئے ہیں۔" فضہ سے رہا نہیں گیا۔

"پرسوں آئے تھے نا ہماری طرف۔" اس نے بتایا۔ "تم لوگوں کے ساتھ گپ شپ رہتی ہوگی زریاب کی۔"

"ارے نہیں۔"

"ہاں تم لوگوں کا ماحول بھی تو خاصا دقیانوسی سا ہے۔" وہ گلاس رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ سب ہی کو اس کی یہ بات بری لگی تھی۔ شابی کوئی کرارا سا جواب دینا چاہ رہی تھی۔ مگر مریم متانت سے بول اٹھی۔

"یہ بات نہیں ہے لیکن ہم لوگ ایک حد میں رہنے کے قائل ہیں۔"

"وہی نا' میں چلتی ہوں۔ زریاب آئے تو اسے میرے بارے میں بتا دینا۔"

"کیا چیز ہے یہ؟" اس کے جانے کے بعد شابی نے پوچھا۔

"جو بھی ہے مگر اس کی گاڑی شاندار تھی اور وہ بھی ذاتی۔" فضہ نے اس کی لمبی گاڑی کو تب تک دیکھا تھا جب تک گیٹ سے غائب نہ ہوگئی۔

"ہم نے تو جیسے کبھی گاڑی دیکھی ہی نہیں۔" شابی کو برا لگا۔

"گاڑی جنید بھائی کی ہے۔ ان سے چوری چھپے ڈرائیو کر لینے سے اپنی نہیں ہو جائے گی۔"

"تم فکر نہیں کرو۔ کبھی میرے پاس اپنی گاڑی بھی ہوگی۔"

"یہ تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ تم جنید بھائی سے شادی کرلو۔" فضہ نے مشورہ دیا۔ "وہ تمہیں فوراً گاڑی لے دیں گے۔"

"وہ مجھے چلتی گاڑی کے نیچے دے دیں گے اور مجھے کوئی شوق نہیں ساری عمر تمہارے بھائی کے ماتھے کے بل گنتی رہوں۔"

"بچو! اگر جنید بھائی نے اشارہ بھی کر دیا تو سب کے ووٹ ان ہی کی طرف ہوں گے۔

کچھ بھی نہیں کر سکو گی تم۔"

"فکر نہیں کرو' ان کی نظر میں' میں خاصی بے وقوف لڑکی ہوں۔ ظاہر ہے وہ بے وقوف سی لڑکی سے شادی تو ہرگز نہیں کریں گے۔" اس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے۔ یہ واحد معاملہ تھا جس میں وہ خود کو بے وقوف بلکہ احمق تک ثابت کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھی۔

"اور اگر امی نے انہیں اموشنلی بلیک میل کرلیا تو......"

"تو......تو میں سچ مچ کسی چلتی گاڑی کے نیچے آجاؤں گی۔ مگر تمہارے بھائی سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔"

"افوہ! کتنا نخرہ ہے محترمہ میں۔ جنید بھائی کوئی تم سے شادی کو مرے نہیں جا رہے۔ بہت لڑکیاں ہیں ہمارے بھائی کیلئے۔"

"تو بیا دو ان ہی سے۔ میرے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہو۔" شابی نے مکھی اڑائی۔

"وہ تو مجھے ہی تم جیسی پھینی ناک اور پھیکے شلجم جیسی لڑکی کو بھابی بنانے کا شوق چرایا تھا۔"

"کیا اور تم کیا ہو......؟"

مریم نے سر پکڑ لیا۔ وہ شروع سے جانتی تھی دونوں کی بحث یہی رخ اختیار کرے گی۔

رات کو کھانے پر شابی کو اچانک یاد آیا۔

"زریاب بھائی! آج رومیہ آئی تھی۔"

"تو پھر......؟" اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے نکالتے زریاب نے رک کر قدرے حیرت سے پوچھا تھا بلکہ سب ہی نے حیرت سے دیکھا تھا کہ آخر یہ اطلاع صرف اسی کو کیوں دی گئی تھی۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ وہ آج' آپ سے ملنے آئی تھی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد چلی گئی۔" سب کے ایکدم متوجہ ہونے پر وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

"تم احسن بھائی کی طرف گئے تھے بیٹا!" سائرہ نے پوچھا۔

"جی پرسوں گیا تھا۔"

"بہت اچھا کیا۔" سائرہ اور نجمہ کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں جبکہ وہ اس اطلاع کو بغیر کوئی اہمیت دیے دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

* * *

15 ستمبر 2002ء

زبیر چلے جاتے ہیں تو میرے پاس سوائے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لینے کے اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی اور کاموں کی یہاں کمی نہیں۔ کپاس کی چنائی کا موسم ہے۔ چھت کپاس کی چھڑیوں سے بھر گئی ہے اور صحن کپاس کے سوکھے ٹینڈوں سے۔ جن سے کپاس کی بچی پھٹیاں چننے کے لئے مزارعین اور کمی عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ کپاس چن چن کر ڈھیریاں بنائی جاتی ہیں اور شام ڈھلے اجرت لے کر چلی جاتی ہیں۔ ان میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی ہیں۔ بوڑھی' جوان' ادھیڑ عمر اور کم سن بچیاں۔ وہ عورتیں بھی جن کے سینے سے چمٹے بچے اپنے حصے کا رزق وصولتے رہتے ہیں اور وہ چپڑ چپڑ باتیں کرتی جاتی ہیں۔ صحن میں بچے کھیلنے لگتے ہیں اور میں کام چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگتی ہوں۔

رضیہ کا بچہ تو بہت ہی پیارا ہے۔ گلابی گلابی پگلو سا۔ میرا دل چاہتا ہے میرا بچہ بھی ایسا ہو ...... خواہ بیٹی ہو یا بیٹا ...... حالانکہ میری خواہش ہے کہ وہ بیٹی ہو ...... بیٹیاں ماؤں کا دکھ بانٹ لیتی ہیں نا۔ حالانکہ سب چاہتے ہیں کہ پہلی اولاد بیٹا ہو۔ خیر زبیر نے مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں جو بھی ہو بس تمہارے جیسا ہو۔"

اس سے آگے قلم ذرا دیر کو رک سا گیا تھا۔ نہ جانے وہ کس خیال میں کھوئی تھی۔

"میں یہاں ڈائری روزانہ نہیں لکھ پاتی ہوں۔ کبھی کبھی کام بہت زیادہ ہوتا ہے میں تھک کر بستر پر لیٹتی ہوں تب بھی نیند نہیں آتی پھر گھر والے یاد آتے ہیں۔ تو نیند بالکل ہی اُڑ جاتی ہے پھر نہ جانے کب آنکھ لگتی ہے۔ حالانکہ مجھے صبح پہلی اذان کے ساتھ اٹھنا ہوتا ہے۔ مدھانی ڈالنا ہوتی ہے۔ (صد شکر ممی نے جہیز میں بجلی کی مدھانی دے دی تھی) آٹا گوندھتی ہوں۔ تب تک دودھ کی بالٹیاں آ جاتی ہیں۔ اسے ابلنے اور کاڑھنے کے لیے رکھتی ہوں پھر توے پر روٹیاں پکاتی ہوں۔ شروع شروع میں سب گڑ بڑ ہو جاتا تھا۔ کبھی چولہے میں بالن لگانا بھول جاتی تو کبھی روٹیاں پلٹنا۔ اتنے بڑے توے پر بس ایک ہی روٹی ڈالا کرتی تھی۔ لیکن اب یکے بعد دیگر چار روٹیاں ڈال بھی لیتی ہوں اور سینک بھی لیتی ہوں۔ اور یوں بیس پچیس روٹیاں آسانی سے بنا لیتی ہوں۔

شروع شروع میں تو رونا ہی آ جاتا تھا۔ کمر الگ اکڑ جاتی۔ گھر میں افراد تو ہم دو ہی ہیں مگر زمینوں پر چھ نوکر ہیں۔ کھانا تینوں وقت گھر سے جانا ہوتا ہے۔ بہت سوچتی تھی۔ پھپھو ہاتھ بٹا دیں تو یہ کام کتنا آسان ہو جائے ایک بار ڈرتے ڈرتے کہا بھی۔ پھپھو نے گھور کر دیکھا۔

"ساری عمر یہ کام اکیلے ہی کیے ہیں ہم نے۔"

چلیں چھٹی ہوئی۔ آخر روتے دھوتے ہاتھ جلاتے یہ کام بھی سیکھ ہی لیا۔ پھر صفائی ستھرائی اور واشنگ مشین کے مرحلے سے فارغ ہوں تو پھر سے دوپہر کے کھانے کا وقت' جلتا سورج' تپتی آگ اور میں۔

"مفت کی نوکرانی مل گئی تائی کو۔" رفعت ہنستی ہے۔ "وہ بھی بے زبان قسم کی۔ کبھی تائی نے صحن میں جھاڑو تک نہ دی۔ کبھی عورتیں آتی تھیں۔ کسی نے جھاڑو سنبھال لی۔ کوئی آٹا گوندھنے لگی۔ آناً فاناً سب کام ہو جاتے ہیں۔ تائی تو چودھرائن تھیں۔ چودھرائن۔ اب بھی ہیں اور آپ۔"

وہ ہنستی چلی جاتی ہے۔ میں لب بھینچ کر رہ جاتی ہوں۔

"ممی کہتی تھیں۔ تمہیں وہاں بہت مختلف ماحول ملے گا لیکن اس ماحول کو اپنانے کی کوشش کرنا۔ شادی کے ابتدائی چند سال بہت مشکل مگر بے حد اہم ہوتے ہیں۔ یہ عرصہ حوصلے سے گزار دو گی تو باقی وقت تمہارا ہوگا۔"

اور میں شاید اپنا حوصلہ آزما رہی ہوں۔ اکثر سوچا زبیر سے اس سلسلے میں بات کروں پھر سوچتی ہوں یہ تو بہت غیر اہم سی باتیں ہیں۔ گھر کے کام ہی تو ہیں۔ ختم ہو ہی جاتے ہیں لیکن آج اک بہت ہی عجیب سی بات ہوگئی۔

کل سارا کام سمیٹ کر میں برآمدے میں آ بیٹھی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ عورتیں ڈیڑھ دو گھنٹے کی چھٹی کرتی ہیں۔ بس اماں نذیراں رہ جاتی۔ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں سے پھٹیاں چنتی رہتی۔ اور یوں ہی دوپہر ڈھل جاتی۔ میں اس کے چہرے کی لاتعداد جھریوں میں برسوں کا سفر کرتی تھی۔ جب پھپھو باہر جا رہی تھیں اور وہ جاتے ہوئے کبھی نہیں بتاتی تھیں کہ کہاں جا رہی ہیں مگر اس دن پلٹ آئیں۔

"میں ذرا فاطمہ کی طرف جا رہی ہوں۔"

"جی!" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ نذیراں روٹی مانگے گی۔ مت دینا۔ عادت پڑ گئی ہے ان کمیوں کو یہیں سے کھانے کی۔" پھپھو کہہ کر چلی گئی تھیں۔ اب میری جرأت نہیں تھی کہ اماں نذیراں کو روٹی دے دیتی مگر انکار...... انکار کیسے کرتی ...... میں بیٹھی جلتی کڑھتی رہی۔

تب ہی اماں نذیراں کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئی۔ میں بھی کھڑی ہوگئی۔ میں نے سوچا کمرے میں چلی جاؤں۔ انکار کی اذیت سے تو بچ جاؤں گی مگر اس نے پکار لیا اور وہ وہی سوال کر رہی تھی۔

"روٹی ہوگی۔"

میں شش و پنج میں کھڑی تھی۔ میرے عقب میں باورچی خانہ تھا جس میں سے تازہ روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی۔

"اماں! روٹیاں تو ختم ہوگئیں۔ کہو تو بنا دوں" میں نے بے وقت کہا تھا۔

"نہ دھیے! اب کہاں چولہا گرم کرو گی۔" وہ جھکی جھکی کمر کے ساتھ چلی گئی۔

میں ندامت میں گھری رہی۔ اپنی بزدلی پر غصہ بھی آیا۔ ایک روٹی لپیٹ کر دے دیتی کہ اماں گھر جا کر کھالو مگر پھر پھپھو کا کیا ہوتا۔ انہیں پتا چلتا تو صاف کہہ دیتیں

"تمہارے باپ کا مال ہے جو یوں لٹا رہی ہو۔"

مگر مجھے سارا دن بے چینی سی لگی رہی تھی لیکن اگلے دن میرے وجود نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب پھپھو نے تازہ پراٹھا بنایا اور چائے کا پیالہ بھر کر اماں نذیراں کو دیا تھا۔ اماں نذیراں اک تواتر سے انہیں دعائیں دیتی رہی تھی۔

* * *

شاداب کے پیپر کیا شروع ہوئے۔ گویا بھونچال آ گیا۔ کھانا پینا سب بھول گیا۔ بہت سا پڑھنے والا باقی تھا۔ سو اب ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ نہیں یاد ہوتا تو سائرہ کی گود میں سر رکھ کر رو پڑتی۔ وہ دودھ میں بادام گھول گھول کر پلاتیں۔ زریاب کو کوفت ہونے لگی۔ اس کا غیر سنجیدہ ولا ابالی انداز' بات بے بات رو دینا' چڑ ہونے لگی تھی۔

"لڑکیوں کو ذمہ دار' سنجیدہ اور بولڈ ہونا چاہئے۔"

شابی کو بسورتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ آج اس کا پیپر تھا۔ ناشتے کی میز پر بھی وہ کتاب سمیت موجود تھی۔

"رومیہ کی طرح۔" اسے اچانک خیال آیا تو وہ چونک سا گیا۔

"ہاں رومیہ کی طرح خوبصورت' بولڈ اور شوخ۔"

"آنٹی! بہت بہت دعا کیجئے گا۔" شابی کہہ رہی تھی۔ نجمہ اسکول کی پرنسپل تھیں۔ اسے ڈھیروں ہدایات دے کر اسکول چلی گئی تھیں۔ مریم نے اس کے کپڑے استری کئے تھے۔ فضہ نے رول نمبر سلپ' پین اور دیگر چیزیں پوری کر کے دی تھیں۔

"زریاب بیٹا! شابی کو چھوڑ آؤ۔" سائرہ نے کہا۔

"میں۔" وہ کچھ متذبذب ہوا۔

"ہاں جنید تو صبح ہی نکل گیا۔ واپسی پر وہ لے لے گا۔"

"ویسے میں خود بھی جا سکتی ہوں۔ ڈرائیونگ آتی ہے مجھے۔" اسے متذبذب دیکھ کر شابی نے جتایا۔

"یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہوگا۔" زریاب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"افوہ...... میری سلپ......"

"یہ رہی۔" فضہ جھنجلا کر بولی۔

زریاب نے چابیاں اٹھالیں۔

"ذرا جلدی نکلو۔"

"ایک تو یہ بھی جنید بھائی کی دوسری شکل ہیں۔"

سب چیزیں سنبھالتی ہوئی پیچھے بھاگی۔

ہائے کی آواز پر زریاب پلٹے بغیر بتا سکتا تھا کہ کہیں ٹھوکر لگی ہے۔ ایک طویل سانس لے کر پلٹا۔ سفید چوڑی دار پائجامہ' اورنج شرٹ' دوپٹہ جس پر سفید پھول کڑھے تھے۔ سفید نازک سی چپل' شاداب چہرے پر گھبراہٹ کے رنگ اور سب کچھ سمیٹتی گاڑی میں آ سمائی۔

جب تک گاڑی روڈ پر آئی وہ کندھوں تک چند نوٹس پھیلائے منہمک تھی۔ ہلکی سی بڑبڑاہٹ گاڑی کی خاموش فضا میں ننھے شگاف ڈالنے لگی۔

"ماہر معاشیات باؤلے ...... آزمائش کی معقولیت ...... Reliability ...... پاکستان میں......"

زریاب کے اعصاب پر جھنجلاہٹ سوار ہوگئی۔ وہی کوفت اور بے زاری جو پچھلے کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔

"1947ء میں......" وہ ہر صفحے پر سرسری سی نگاہ دوڑا رہی تھی...... تب ہی زریاب نے اس کے ہاتھوں سے نوٹس کھینچے اور عقب میں اچھال دیئے۔ شابی نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔

"پیپر سے چند منٹ پہلے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ تم پڑھ رہی ہو کیا سمجھ میں آ رہا ہے۔" اس کا لہجہ مدھم اور سنجیدہ تھا۔

"ہاں مگر مجھے دو سوال دیکھنے ہیں۔"

زریاب نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دل ہی دل میں اسے کوستی سیدھی ہو بیٹھی۔ گاڑی کالج کے سامنے رکی تو وہ اترتے اترتے رک گئی۔

"اب تو لے لوں۔"

زریاب باہر نکلا۔ پچھلا دروازہ کھول کر بکھرے نوٹس سمیٹ کر اس کے ہاتھ میں دیئے۔

ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ بڑا سا دوپٹہ سنبھالتی۔ دوسرے ہاتھ میں نوٹس پکڑ کر بھاگی پھر رک گئی۔

''موسم خراب ہو رہا ہے۔ جنید بھائی سے کہیے گا مجھے واپسی پر ضرور پک کر لیں۔''

زریاب نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

گیٹ پر ہی فوزیہ مل گئی۔

''پیپر کی تیاری......''

''پہلے یہ بتاؤ آئی کس کے ساتھ ہو؟'' فوزیہ کے لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔

''کزن ہیں میرے۔'' اسے پیپر کی پڑی تھی۔ افراتفری میں جواب دیا۔

''کیا شاندار بندہ ہے۔''

فوزیہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے پہلے فوزیہ کو اور پھر پلٹ کر زریاب کو دیکھا۔ سیاہ بادلوں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک پل کو اسے لگا اردگرد ہر چیز غائب ہو گئی ہے۔ بس سر پر جھکا سیاہ بادلوں سے ڈھکا آسمان تھا۔ بلند و بالا جھومتے درخت اور اس تمام منظر پر چھاتا زریاب مرتضٰی ہمدانی۔ سیاہ پینٹ اور سیاہ ہاف سلیوز کی شرٹ میں اس کا دراز قد کچھ اور نمایاں ہو رہا تھا۔ شابی کے یوں دیکھنے پر وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ سر کے ہلکے سے اشارے سے اس سے مسئلہ بھی پوچھا۔ شابی نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا اور پلٹ کر بے حد تحیر سے فوزیہ سے کہنے لگی۔

''کمال ہے' مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ میرے کزن اتنے ہینڈسم ہیں۔''

''تمہاری نزدیک کی نظر خاصی کمزور واقع ہوئی ہے۔''

دونوں ہنستے ہوئے اندر چلی گئیں۔ واپسی پر بھی زریاب ہی کو آنا پڑا۔ جنید مصروف تھا۔ شابی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ زریاب کو لگا اگر اس نے پیپر کے بارے میں پوچھ لیا تو وہ ابھی رو دے گی اور پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رزلٹ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ سارا رستہ بے حد خاموشی میں کٹا۔ گاڑی رکتے ہی وہ اندر بھاگی۔ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے سیدھے اپنے کمرے میں۔

''ارے کیا ہوا؟'' سائرہ نے زریاب سے پوچھا۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' عظیم سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''یقیناً پیپر اچھا نہیں ہوا۔'' وہ بڑبڑائیں۔

وہ کارپٹ پر بیٹھی بیڈ پر دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپائے زار و قطار رو رہی تھی۔ عظیم بیڈ

پر بیٹھ گیا۔

''اچھا' اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔'' تسلی دینے کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ آہستگی سے اس کے بال سہلانے لگا۔

''اور یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا' تقریباً ہر سال یہی تو ہوتا ہے۔ اب تو سب عادی ہو گئے ہیں۔ تمہیں بھی ہو جانا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' سپلی آ جائے گی۔ کوئی بات نہیں دوبارہ دے دینا...... آخر بی اے میں بھی تو......''

''یہ...... یہ سب اس پنجابی فلم کے ولن کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ سر اٹھا کر پھٹ پڑی۔

''کل تم لوگوں نے پنجابی فلم دیکھی تھی۔'' عظیم نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''چہ...... چہ...... یہ تو پھر ہونا ہی تھا۔''

''تمہارے اس زریاب بھائی کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہیں...... اس کا کیا قصور...... اور کچھ تو خدا کا خوف کرو' ہالی ووڈ کا ہیرو قرار دو تو بندہ تسلیم بھی کرے۔ پنجابی فلم...... اور وہ بھی ولن۔''

''تمہیں پتا ہے عظیم! وہی سوال آ گیا' اگر وہ مجھے پڑھ لینے دیتے تو......''

''باقی چار سوالوں کا کیا ہوا؟'' ہمدرد لہجہ' متبسم نگاہیں۔

''تین تو میں نے لکھ دیئے اور چوتھا......'' اس نے فائل سے پیپر کھینچا۔ ''یہ سوال مجھے آتا تھا مگر یہ وہاں نہیں تھا اور اب یہ پیپر میں ہے جبکہ یہ کمرہ امتحان میں مجھے نظر ہی نہیں آیا۔ حالانکہ یہ مجھے آتا تھا۔''

وہی پیپر کو پورا نہ پڑھنے کی بیماری۔ عظیم اسے دیکھتا رہا جو پھر سے رو رہی تھی اور بار بار سوال پڑھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ پھیلے' اس نے ضبط کی کوشش بھی کی مگر دوسرے پل منہ پر ہاتھ رکھتا پیچھے کو الٹ گیا۔ اس کے قہقہوں سے کمرہ گونجنے لگا تھا۔

* * *

17 ستمبر 2002ء

آج زبیر نے ایک بہت ہی عجیب بات کہی اور میں ہکا بکا سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ آج وہ لان کے سوٹ پیس لے کر آئے تھے دو میرے لئے اور دو پھپھو کے لئے۔ بہت خوبصورت کلر اور بہت خوبصورت ڈیزائن۔ زبیر کی چوائس واقعی بہت اعلیٰ تھی۔

مجھے پتا تھا' آج زبیر کو آنا ہے اس لئے میں نے سارا کام پہلے ہی سمیٹ لیا تھا۔ کچھ اچھی اچھی ڈشز بنا کر فریز کر دی تھیں۔ پھپھو کے سر میں شاید درد تھا۔ وہ سارا دن کمرے میں

ہی بند رہیں۔ میں نے ایک دو بار پوچھا کہ کھانا لا دوں یا کچھ اور بنا دوں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ منہ سے بھی کچھ نہیں بولیں۔

کبھی کبھی ان کا رویہ واقعی بہت عجیب سا ہو جاتا ہے۔ وہ اتنی اجنبی بن جاتی ہیں کہ مزید بات کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ شام ڈھلنے لگی تو میں نے ایک بار پھر سرخ فرش پر گیلا کپڑا پھیر دیا۔ فرش مزید سرخ ہو گیا تھا۔ ستون سے لپٹی بیلیں بھی دھو ڈالیں۔ سرخ فرش کے پس منظر کے ساتھ ان کا سبز رنگ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ یہ بیل میری فرمائش پر زبیر نے لگائی تھی بلکہ جب شادی کے بعد مجھے پتا چلا کہ زبیر مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا رہے اور مجھے یہیں گاؤں میں پھپھو کے ساتھ رہنا ہوگا تو میں فطری طور پر پریشان اور ہراساں ہو گئی تھی۔

گاؤں کا ماحول اور پھپھو کا مزاج ......مگر میں زبیر کی مجبوریاں بھی سمجھتی تھی۔ وہ پھپھو کے اکلوتے بیٹے تھے۔ پھپھو ان کے جانے کے بعد بالکل تنہا ہو جاتی ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کی تنہائی بانٹوں اور ان کا خیال رکھوں اور اب تک میں یہی سوچتی ہوں کہ میں یہ سارے کام کس طرح کروں۔ وہ تو گھر میں ہوتی ہی نہیں اور جب ہوتی ہیں تو اپنے کمرے میں بند۔ کبھی دل کڑا کر کے پاس جا بیٹھوں تو یوں لگتا ہے میں دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں۔ ان کے چہرے کے تاثرات اتنے برفیلے ہوتے ہیں کہ پھر مجھے اٹھنا ہی پڑتا ہے اور اب میں سوچتی ہوں کہ میرا خیال کون رکھے گا۔ میری تنہائی کون بانٹے گا۔ بات نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں تو اس دن کا ذکر کر رہی تھی جب زبیر کو آنا تھا اور وہ بیل ......

ہاں تب وہ بیل زبیر نے وہاں لگائی تھی کہ میں کئی بار ان سے کہہ چکی تھی کہ گھر میں کچھ پھول پودے تو ہونے ہی چاہئیں۔

”جب میں بہت یاد آؤں تو اسے پانی دینا اور اس سے میری باتیں کرنا۔“

ان کے شریر لہجے پر میں چڑ سی گئی۔ بھلا یہ بیل ان کی نعم البدل ہو سکتی ہے۔ یہ بیل ان کی نعم البدل نہیں تھی۔ مگر ان کے جانے کے بعد میں واقعی اس سے باتیں کرنے لگی تھی ...... زبیر کی باتیں اور بہت سی ایسی باتیں جو میں زبیر سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چند مہینوں میں یہ بیل بہت پھیل گئی تھی اور اب تو اس پر سفید پھول بھی آنے لگے ہیں۔' خیر اس سے فارغ ہو کر میں نے نہا کر وہ پنک سوٹ پہنا جس پر ریشم کے پھول بنے تھے اور ممی نے مجھے لے کر دیا تھا۔ ہلکی لپ اسٹک' ہلکی سی ہم رنگ جیولری پہن کر میں تیار ہو گئی تھی۔

بہت دیر' ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد مجھے احساس ہوا۔ پھپھو جالی کے دروازے کے عقب سے بار بار جھانک رہی ہیں مجھے شرم سی آ گئی۔ ایسی بھی کیا بے تابی میں کمرے میں آ کر

میگزین کھول کر بیٹھ گئی اور انتظار کرتے کرتے نہ جانے کب مجھے اونگھ سی آ گئی۔ شاید سارے دن کی تھکاوٹ کا اثر تھا اور جب ...... آنکھ کھلی تو باہر سے زبیر کی آواز آ رہی تھی۔

”ارے ...... یہ کب آئے۔“ میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ بال الجھ سے گئے تھے۔ جلدی جلدی برش کر کے چہرے پر مسکراہٹ سجاتی باہر آ گئی۔ زبیر سکنجبین پی چکے تھے جو کہ میں بنا کر فریج میں پہلے ہی رکھ گئی تھی۔ خالی جگ سامنے پڑا تھا۔

”السلام علیکم!“ میں نے آہستگی مگر خوش دلی سے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ زبیر نے نظر بھر کر میری تیاری کو دیکھا مگر چہرہ سنجیدہ ہی تھا۔

”کھانا لگاؤں؟“

”نہا کر کھاؤں گا۔“

میں پھپھو کے پاس بیٹھ گئی۔ چار پائی پر کچھ سوٹ پڑے تھے۔

”یہ......“

”دو تمہارے ہیں' دو امی کے۔“ زبیر نے آہستگی سے بتایا۔

”بہت خوبصورت ہیں' ہے نا پھپھو!“

میں نے خوش ہو کر تائید چاہی۔ پھپھو نے ہلکی سی ہوں پر اکتفا کیا تھا۔ تب ہی مجھے احساس ہوا ماحول میں کچھ کشیدگی سی ہے۔ پھپھو کھل کر بات نہیں کر رہی تھیں بلکہ وہ زبیر سے کوئی بات کرتی بھی تھیں تو اتنی آہستہ کہ اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ زبیر کی نگاہیں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ مگر ان نگاہوں میں میرے لئے نہ کوئی پیغام تھا اور نہ وارفتگی۔ میں نے کچھ الجھ کر پھپھو کی طرح دیکھا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوبی تھیں۔ میں بے اختیار کہہ اٹھی۔

”ارے پھپھو! آپ نے کپڑے نہیں بدلے۔“

حالانکہ میں نے دوپہر ہی میں کپڑے استری کر کے باتھ روم میں لٹکا دیئے تھے۔

”اب بدلوں گی۔“

انہوں نے اب پر زور دیا تو زبیر نے ان کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر بوسہ دیا۔

”امی! جائیں پہلے نہا لیں۔“

پھپھو نے بے حد پیار سے زبیر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور نہانے چلی گئیں۔ میں دانستہ سوٹوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جب زبیر نے وہی بات کہی۔

”امی کا خیال رکھا کرو نایاب!“

”رکھی تو ہوں۔“

”کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا کرو۔ پاس بیٹھا کرو۔ باتیں کیا کرو۔“ زبیر کہہ رہے تھے اور میں ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔

”پھپھو نے آپ سے کچھ کہا۔“

”نہیں، لیکن کیا مجھے خود احساس نہیں ہوسکتا۔“ وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔

”کیسا احساس؟“ میں نے پریشان ہو کر سوچا اور وہیں بیٹھ کر اپنا محاسبہ کرنے لگی۔

کہاں کوتاہی ہوئی؟

کہاں کمی رہ گئی؟

ایسا کیا ہوا کہ زبیر نے یہ سب کہا؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر...... مگر بہت سی ایسی باتیں ضرور گرفت میں آنے لگیں جو اس سے پہلے میں نظر انداز کر دیتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز کر دینا ہی اچھا ہے مگر اب اس لمحے بہت کچھ سمجھ میں آیا تھا۔

”ارے...... میں احمق ہی رہی۔ اتنا عرصہ، یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ جب مردوں کے گھر واپس آنے کا وقت ہو تو چہرے پر تھکن اور ملگجے لباس میں خود کو بے حد مصروف ثابت کرنا چاہیئے اور سمجھ بھی کیسے سکتی کہ میں نے تو ممی کو ہمیشہ سج سنور کر پاپا کا استقبال کرتے دیکھا تھا اور پاپا کا وہ شریر سا انداز۔“

”ساری تھکن اتر گئی۔“

جس دن زبیر کے آنے کا وقت ہوتا میں صاف ستھرے لباس میں، خوشبو میں بسی ان کی منتظر ہوتی اور اتنا غور بھی نہ کیا کہ سارا دن فارغ رہنے کے بعد پھپھو کو عین اس وقت کوئی نہ کوئی کام کیوں سوجھ جاتا ہے مگر زبیر تو دیکھتے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے ماں تھکن زدہ چہرہ لئے مصروف نظر آتیں۔ کبھی سیڑھیاں دھوتی، کبھی برتن تو کبھی کوئی نہ کوئی کپڑا سرف میں بھگوئے اور یقیناً وہ دل ہی دل میں ممنون ہو جاتے ہوں گے کہ ان کی بیوی شہر کی ہے اور ایسے کاموں کی عادی نہیں اور ماں نے اپنی بہو کا بہت خیال رکھا ہے۔ اگر کبھی دبے لفظوں میں مجھ سے کہہ دیتے ہیں اور اگر اب میں ان سے یہ سب کہوں تو کیا وہ میری بات کا یقین کریں گے۔“

اس سے آگے بس کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچی گئی تھیں۔

* * *

شابی کے پیپر ختم ہوئے تو جہاں اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہیں باقی سب گھر والوں نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا۔ شابی اس بات پر اُڑی پھر رہی تھی کہ باقی کے سارے پیپر خلاف توقع اچھے ہو گئے تھے۔ صبح جلدی اٹھنے کی عادت تو تھی ہی، عظمیٰ کو لے کر ٹہلنے کے لیے نکل جاتی۔ واپسی پر ناشتے کی ذمہ داری نجمہ نے اسی کے سپرد کر دی تھی کہ بیٹوں کے سارے لاڈ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بہت شروع سے انہیں گھریلو کاموں میں بھی لگائے رکھتی تھیں۔ ناشتہ بنا کر سب کو دینے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے براجمان ہو جاتی۔ ناشتہ کرتی، اخبار چاٹتی، موڈ ہوتا تو ملازمہ کے سر پر کھڑی ہو کر صفائی کرواتی ورنہ چینل بدلتی رہتی۔ ملازمہ کے عیش ہوتے۔ سائرہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتیں تو سبزی بھی یہیں کاٹی جاتی۔ باتیں بھی باتیں اور ٹی وی بھی دیکھا جاتا۔ اس کی باتوں میں سادگی اور بے ساختگی ہوتی۔ سائرہ تو مسکراتی رہتیں اور دل ہی دل میں سوچتیں۔

”کاش! جنید مان جاتا تو یہ چہکتی بلبل اسی آنگن کی رونق بڑھاتی رہتی۔“

مگر جنید کو وہ بے وقوف لگتی تھی۔ حالانکہ وہ ذرا لاابالی تھی۔ کچھ عمر کا تقاضا، کچھ لاڈ پیار کی وجہ۔ چند سال گزرتے، ذمہ داری پڑتی تو مزاج میں خود بخود تبدیلی آ جاتی۔

”مگر ان لڑکوں کو کون سمجھائے، دلوں میں چھپے خلوص اور محبت نہیں جانچتے۔ انہیں تو بس چٹر پٹر باتیں کرتی لڑکیاں چاہئیں۔ چاہے آتے ہی گھر والوں کو کونے میں لگا دیں۔“ وہ دل مسوس کر رہ جاتیں۔

زریاب کو وہ صبح جاگنگ سے واپسی پر نظر آتی تھی۔ پسینہ پسینہ چہرہ، عظیم سے کسی بات سے جھگڑتی ہوئی پھر ٹی وی کے سامنے چائے کا کپ ہاتھ میں لئے سائرہ کو ڈرامے کی پچھلی قسط کا خلاصہ با آواز بلند سنائی۔“

دوپہر کو لوٹتا تو رسالہ ہاتھ میں ہوتا، وہیں لاؤنج میں براجمان سیب کھا رہی ہوتی۔ سائرہ کچن میں ہوتیں۔

زریاب کے اوپر بھی خاصا برا امپریشن پڑا تھا۔

نالائق، کھانے اور ٹی وی کی شوقین، باتیں بنانے میں ماہر۔

اب اگر لنچ پر سائرہ سب کو بتا رہی تھیں کہ یہ دم کے کباب اور سالن شابی نے بنائے ہیں تو زریاب کچھ طنزاً ہی مسکرایا تھا۔ اسی وقت رومیہ کا فون آ گیا۔ وہ معذرت کر کے اٹھ گیا۔ سائرہ نے خاصی تشویش سے اسے دیکھا تھا، پھر نجمہ سے بھی ذکر کیا تھا۔ پریشان تو وہ بھی ہوئی تھیں۔ رومیہ اور زریاب میں جتنی تیزی سے دوستی پروان چڑھی تھی سارے خاندان میں چہ

گوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔

* * *

22 ستمبر 2002ء

"تم کچھ پریشان ہو رباب!"

میں یہ جملہ سن کر ذرا سا رک گئی۔ آج بہت دنوں کے بعد زبیر کو میرا چہرہ پڑھنے کی فرصت ملی تھی۔

"نہیں تو۔"

"تو پھر چپ کیوں ہو' امی نے کچھ کہا؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں وارڈ روب سے کپڑے نکال کر بیگ میں بھرتی رہی۔

"شاید تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔"

نہ جانے زبیر کو یہ خیال کیوں آیا تھا۔ میں ٹھٹک سی گئی اور بے اختیار پوچھنے لگی۔

"یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"تمہارے رویے نے۔" انہوں نے عقب سے آ کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔

"میرے رویے کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پلٹ کر قدرے حیرت سے پوچھا تو وہ بے اختیار مجھ پر جھک گئے۔

"اتنی نازک سی ہو۔ پر دل گویا پتھر کا پایا ہے۔"

"آپ تو بس یونہی۔"

"کبھی تو اپنے دل کی بات بتا دیا کرو۔"

"اب تو آپ جا رہے ہیں۔" وہ بھی میرے لہجے کی اداسی محسوس کر گئے تھے۔

"اس لئے اداس ہو؟"

میں خاموش ہی رہی تو وہ جھنجلا سے گئے۔

"ایک تو میں تمہیں سمجھ نہیں پاتا کہ مامی نے تمہاری تربیت کس طرح کی ہے۔ مجال ہے کہ کبھی کوئی بات کھل کر بتاؤ۔ اداسی ہے تو تمہارے اندر بستی ہے۔ پریشان ہو تو گم صم ہو جاتی ہو۔ خوشی کا اندازہ محض تمہاری ایک مدھم مسکان سے ہوتا ہے۔ یار! کھل کر کہا کرو' کھل کر ہنسا کرو۔ سردیوں کی بارش کی طرح بس کن من کن من ہوتی ہے۔ کبھی تو ساون کا بادل ہو جاؤ۔ کبھی تو کھل کر سیراب کرو۔"

وہ جھنجلا کر کہتے کہتے شوخ ہوئے۔

"میرا مزاج ہی ایسا ہے۔" میرے لہجے میں بے بسی تھی۔

"تو بدلو اس مزاج کو' اداس ہو تو کہو کہ تم اداس ہو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"شاید تمہیں ساتھ ہی لے جاؤں۔"

"تو پھر مجھے ساتھ ہی لے جائیں۔"

وہ بہت ہی لائٹ سے موڈ میں تھے۔ میرے مدھم مگر سنجیدہ لہجے پر ٹھٹک کر دیکھنے لگے۔

"تمہیں یہاں کوئی پرابلم ہے؟"

میں نے بڑی مایوسی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اب انہیں اور کیا بتاتی کہ اس بار ان کا جانا میرے اندر کتنی گہری اداسی بو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں اندر سے خالی ہو رہی ہوں اور وہ کہہ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں رباب! امی کی نیچر ذرا اور طرح کی ہے۔ ان کا رویہ تمہارے ساتھ روایتی ساس والا ہے لیکن خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچو' میں ان کی عمر بھر کی کمائی ہوں۔ بیوگی کے بعد جس طرح انہوں نے زمینوں کا انتظام سنبھالا اور جس طرح میری تعلیم و تربیت کی مامی نے تمہیں بتایا ہی ہوگا۔"

"ہاں' ممی نے کچھ بتایا تو تھا۔"

"بہت قربانیاں دی ہیں۔ انہوں نے میرے لئے' اب وہ مجھ سے اگر کچھ امید کرتی ہیں تو کیا میں ان کی امید توڑ دوں۔ رباب! انہیں ہمارے بچے کی ہم سے زیادہ خوشی ہے۔ میں نے ان سے دبے لفظوں میں کہا تھا مگر......"

وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گئے۔

"ان کے خیال میں اب تمہیں لمبا سفر نہیں کرنا چاہئے۔"

"ابھی بہت وقت ہے زبیر۔"

"ہاں مگر امی......"

پتا نہیں زبیر اس مقام پر آ کر اتنے کمزور کیوں ہو جاتے ہیں۔ میں اس کو سمجھ نہیں پاتی اور زبیر کہتے ہیں۔ جب تمہارا بچہ تمہاری گود میں آئے گا تب تم اس جذبے کو سمجھ سکو گی۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ جانے سے قبل انہوں نے وعدہ کیا تھا وہ ہر ہفتے فون کریں گے۔ ایک تو تایا جمیل کے گھر فون سننے جانا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں نے فون لگوانے کی بات کی تو

پھوپھو نے ترخ کر کہا تھا۔

"کم از کم تم اس گھر کو بدلنے کی کوشش مت کرو۔"

زبیر نے میرا ہاتھ دبا کر چپ رہنے کو کہا۔ وہ چلے گئے ہیں اور میرا کمرہ کتنا ویران اور سونا لگ رہا ہے۔ بالکل میرے دل کی طرح اور مجھے ابھی سے ان کے فون کا انتظار رہنے لگا ہے' پاگل ہوں نا...... ابھی تو وہ راستے میں ہوں گے۔

* * *

سائرہ بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھیں۔ نجمہ کچھ چپ چپ سی ہیں۔ اس وقت بھی مٹر چھیلتے چھیلتے نہ جانے کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اتوار کا دن تھا۔ اس لئے لاؤنج آباد تھا۔ لڑکیاں ٹی وی لگائے اپنی سرگرمیوں میں مگن تھیں باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ رسالے بھی کھنگالے جا رہے تھے۔ سائرہ بھی سبزی وہیں لے آئی تھیں۔

"کچھ پریشان سی لگتی ہو' خیریت۔"

"ہاں' خیریت ہی ہے۔"

"اسکول تو ٹھیک جا رہا ہے۔"

"ہاں' بس یونہی' لگتا ہے تھکنے لگی ہوں۔"

"تھکن کیسی؟" سائرہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"بہت بھاگوان ہے وہ عورت جسے اپنے شوہر کے ہاتھوں قبر کی مٹی نصیب ہو۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

"نجمہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" فطری طور پر سائرہ پریشان ہو گئیں۔ نجمہ جیسی مضبوط اعصاب کی عورت کے منہ سے یہ الفاظ سن کر انہیں دھچکا سا لگا تھا۔ دو بچیوں کے ساتھ بیوگی کا یہ طویل عرصہ جس ہمت اور حوصلے سے انہوں نے گزارا تھا وہ قابل تحسین تھا۔

"ارے تم تو یونہی گھبرا گئیں۔ سائرہ! میں تو یونہی کہہ گئی۔"

"رباب یاد آ رہی ہے؟"

"ہاں' دھیان تو سارا اسی کی طرف لگا رہتا ہے۔"

"اس کی حالت جو ایسی ہے۔"

"سوچتی ہوں اسے جا کر لے آؤں۔" کل زبیر کا فون آیا تھا۔ رباب اس کے ساتھ نہیں جا رہی تھی اور وہ اپنی نند کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں اسی لئے پریشان سی ہو گئی تھیں۔

"سوچنا نہیں ہے ممی! بس لے آیئے گا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ انہیں یہاں آئے ہوئے۔ لگتا ہے بھول ہی گئی ہے۔" شاداب کے کانوں میں آواز چلی گئی تھی۔

"ابھی تین ماہ پہلے ہی تو آئی تھی۔" سائرہ نے کہا۔

"تین ماہ کم ہوتے ہیں آنٹی! اور صرف دو دن کیلئے۔"

"اللہ کرے اسے وہاں اتنی محبت ملے کہ وہ سچ مچ ہمیں بھول جائے۔" سائرہ مسکرائیں۔

"خوامخواہ ہی' اگر ایسا ہوا تو میں ان سے خوب لڑوں گی۔" فضہ اچھل پڑی۔

"مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ چند ماہ کے بعد ہم خالہ بن جائیں گے۔ کتنا مزا آئے گا۔" مریم کی انگلیوں میں ننھے منے وجود کو گدگدی کرنے کی خواہش جاگی۔ وہ تو بچوں کی دیوانی تھی۔

"اور ممی! نانی بن جائیں گی...... اتنی ینگ سی نانی کیسی لگیں گی۔" شاداب نے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"فضول مت بولو۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"ممی! اگر پھپھو نے رباب کو نہ آنے دیا تو۔" شابی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"تو ایسی صورت میں' میں کیا کر پاؤں گی۔"

"زبردستی لے آیئے گا۔" فضہ کی سوچ اسی کی طرح لا ابالی تھی۔

"ہو سکتا ہے' وہ چاہیں کہ پہلا بچہ وہیں پیدا ہو۔" ممی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔

"خوامخواہ ہی۔" سائرہ نے دخل دیا۔ "پہلا بچہ ہمیشہ ماں کے گھر میں ہوتا ہے۔ یہی رسم ہے۔"

"پتا نہیں وہاں رباب کا کوئی خیال بھی رکھتا ہو گا یا نہیں۔"

"ایسا کیوں سوچتی ہو شابی! وہ کوئی غیر تو نہیں' تمہاری پھپھو کا گھر ہے۔"

"اتنی پراؤڈ سی تو ہیں پھپھو۔" شابی نے منہ بنایا۔

"تو اور کیا' بری دکھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کس طرح ایک ایک چیز کی قیمت بڑھا بڑھا کر بیان کر رہی تھیں۔ حالانکہ...... رباب نے اپنے کپڑے کتنے نفیس اور خوبصورت بنوائے تھے......"

"تم لوگ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" ممی بے چین سی ہو گئیں۔

"چیزوں سے کیا ہوتا ہے۔ برتنا اور سہنا تو لوگوں کا ہوتا ہے اور شابی بیٹا! یہ تو ہم سب مانتے اور جانتے ہیں کہ زبیر بہت اچھا اور سوفٹ نیچر کا ہے اور ہم نے یہ رشتہ زبیر کو دیکھ کر کیا تھا۔ رباب کو اگر کوئی تکلیف ہوتی تو کیا ہمیں نہیں بتاتی۔"

"بعض معاملات میں رباب بہت گہری ہیں۔ وہ اپنا دکھ کسی سے نہیں کہتیں۔ پاپا کی ڈیتھ کا سب سے زیادہ اثر انہوں نے ہی لیا تھا۔ پاپا ان سے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے بغیر ایک پل نہیں رہتی تھیں مگر مجال ہے انہوں نے پاپا کے متعلق کوئی بات بھی ہم سے کی ہو۔ سب دل میں چھپا لیا۔" شابی سنجیدہ سی ہو گئی۔

"اور وہ زیادہ آئی بھی تو نہیں ہیں۔ میری فرینڈ کی بہن کی شادی ہوئی ہے وہ تو ہر ہفتے میکے میں موجود ہوتی ہیں اور رباب تو صرف چند دفعہ ہی آئی ہیں اور وہ بھی زبیر بھائی کے ساتھ۔ رہنے تو ایک دفعہ بھی نہیں آئیں۔" فضہ نے کہا تھا۔

"وہ دور بھی تو ہے۔" نجمہ نے کمزور سا دفاع کیا۔

"ویزہ تو نہیں لگتا۔" شابی نے جرح کی۔

"ختم کرو بس...... خوامخواہ بات کو طول دے رہی ہو۔ اتنا نہیں کہ آج چھٹی کا دن ہے تو کچن میں ماؤں کا ہاتھ بٹا دیں۔ بیٹیاں جوان ہوتی ہیں تو مائیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہاں ابھی تک نوالے منہ میں دینے پڑتے ہیں۔" سائرہ نے موضوع بدلنے کے لیے انہیں لتاڑ کر رکھ دیا۔

"یہ بات ہے۔" مریم کو جوش آ گیا۔ "اب آپ لوگ یہیں بیٹھیں، آج کھانا ہم لوگ بنائیں گے۔"

اس نے ٹوکری اٹھائی اور شابی، فضہ کے ساتھ کچن میں چلی گئی۔ سائرہ نے مسکرا کر نجمہ کو دیکھا۔

"اچھا خوامخواہ ایسی شکل بنا کر مجھے بھی پریشان مت کرو۔ کسی دن چکر لگا آنا بلکہ فون پر بات کر لو، تمہیں بھی تسلی ہو جائے گی۔"

* * *

26 ستمبر 2002ء

آج ممی کا فون آیا تھا۔ کیا چیز ہوتی ہیں یہ مائیں بھی...... اتنا دور بیٹھ کر بھی پتا چل گیا کہ میں اداس ہوں۔ بار بار پوچھ رہی تھیں تم خوش ہونا...... میں کہہ ہی نہ سکی...... ماں! زندگی کچھ مشکل سی لگنے لگی ہے۔ بس کہہ دیا بہت خوش ہوں۔ آہ...... کیسی شفاف آئینے جیسی زندگی

تھی۔ مروت اور حسن اخلاق یہی سیکھا تھا ماں سے اور یہاں ہر روز ایک نیا سبق سیکھتی ہوں۔ روز ایک نیا چرکا لگتا ہے۔

کیسے کہہ دیتی ماں! تم سے غلطی ہو گئی۔ روایتی ماؤں کی طرح بس یہی دیکھا کہ لڑکا اپنا ہے اچھی جاب پر ہے۔ بس نہیں دیکھا تو یہ کہ ماحول کتنا مختلف ہے۔ میں یہاں ایڈجسٹ کر پاؤں گی یا نہیں۔ زبیر بہت اچھے ہیں مگر میرے پاس نہیں ہیں۔ تب تو پھپھو ایک ہی بات کہتی تھیں۔ جہاں زبیر جائے گا۔ رباب بھی وہیں جائے گی اور ماں! تم بھی ان کی باتوں میں آ گئیں۔ کس ساس کے دل میں اتنی گنجائش ہو گی کہ اپنی بہو کو اتنے عیش کروائے۔ مجھے یہاں رہنا برا نہیں لگتا یہ میرے زبیر کا گھر ہے مگر مجھے پاؤں بھر زمین بھی تو ملتی۔ میں تو اس گھر میں اجنبی کی طرح رہتی ہوں وہ اس گھر کو میرا گھر نہیں بنا سکیں تا کہ مجھے اس گھر کا ایک فرد ہی تسلیم کر لیں۔ مجھے تو یہاں اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ اگر میرا انڈا کھانے کو جی چاہتا ہے تو میں اپنے لئے انڈا ہی بنا لوں۔

یہ گاؤں ہے اور حیران ہو ہو کر گاؤں کے لوگوں کے وہی مخصوص سادہ فطرت اور معصومیت ڈھونڈتی ہوں۔ جس کے بارے میں بہت سنا اور پڑھا تھا۔ یہاں کے لوگ بہت فارغ ہیں اور ہر کوئی طنز کے تیر چلانے کا عادی۔ میرے ہر عمل کو اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق پرکھا جاتا ہے۔ میری ہر حرکت پر نظر رکھی جاتی ہے اور پھر آپس میں تذکرے، کھسر پھسر۔

"جھاڑو دیکھی ہے، کس طرح پکڑی ہے۔"

"نمبرداروں کی بہو تو سوئی رہتی ہے۔"

گھڑی بھر کا آرام بھی جرم ہو گیا ہے۔ ایک تپتی دوپہر میں میرا دل پیپسی پینے کو چاہا اور میں نے ایک بچے کے ہاتھ منگوا بھی لی۔ گھڑی بھر میں دس عورتوں نے آ کر پوچھا۔

"کوئی مہمان آیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"ابھی ابھی سوڈے کی بوتل......"

"وہ تو خالہ میں نے پی تھی۔"

اپنے گھر میں دس دس بوتلیں پی جانے والی رباب جب انہیں حیرت سے بتاتی تو ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ذرا سی دیر میں یہ بوتل پورے گاؤں میں نشر ہو جاتی۔

"نمبرداروں کی بہو...... سوڈے کی بوتل۔"

"ہاں بھئی! شہر کی جو ہوئی اور شہر والیوں کے چسکے...... ورنہ ہوتا کیا ہے ان بوتلوں میں

سوائے نری گیس کے' معدے کا بگاڑ"

یہ دس روپے کی بوتل تو میرے لئے الزام ہی بن گئی ہے۔ کوئی اور ہوتی تو شاید ایسی باتوں کی خاطر میں بھی نہ لاتی مگر میں! میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ وہ بات ہی چھوڑ دیتی ہوں پھر بھی پتا ہی نہیں چلتا کب' کہاں' کیا ہو رہا ہے۔ میں کسی سے ہنس کر بات کر لیتی ہوں تو پھپھو کو اعتراض ہوتا ہے۔

"ان کمیوں کو منہ نہیں لگاتے۔ سر پر چڑھ آتے ہیں۔"

نظر انداز کروں تو لوگ مغرور کہتے ہیں۔

میں ابھی تک پھپھو کی ڈبل کراس والی عادات کو نہیں سمجھ پائی اور وہ رفعت ہے نا' وہ سلیم چچا کی بیٹی' کس مزے سے کہتی ہے۔

"اس لئے تو میں کہتی ہوں صرف تعلیم ہی کافی نہیں ہوتی۔ تربیت بھی ضروری ہے اور وہ بھی وہ جو ہماری مائیں کرتی ہیں۔ شوہر کو قابو' نندوں کو ٹھکانے لگانے اور ساس کو ناکوں چنے چبوانے کی اور آپ سدا کی بزدل فوراً ڈر جانے والی' اسی لئے تو یہ حشر ہو گیا ہے آپ۔ جس دن لاہور سے آئی تھیں تو چودھویں کے چاند کی طرح چمکتی تھیں اور اب......"

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ مایوسی سے سر ہلانے لگتی ہے۔

میں نے آپ کی تربیت کی لاج رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ماحول کو اپنانا چاہا ہے۔ مجھے توے پر روٹیاں پکانی نہیں آتی تھیں مگر میں نے گندم کی کٹائی اور کپاس کی چنائی کے موسم میں بلا مبالغہ سو سو روٹیاں پکائی ہیں۔ ماں! تم میرے ہاتھ دیکھو تو کبھی یقین نہیں کرو کہ یہ تمہاری رباب کے ہاتھ ہیں...... ماں میرے کمر میں بہت درد ہوتا ہے...... اور...... اور کوئی نہیں کہتا۔

"رباب ذرا دیر آرام کر لو۔"

* * *

صبح ہی صبح نائلہ خالہ کا فون آیا تھا لیکن سب ہی نکل چکے تھے۔ عظیم کو سائرہ بار بار بازار دوڑا رہی تھیں۔ اسے آج بطور خاص کالج سے چھٹی کروائی گئی تھی۔ مریم صبح سے کمرے میں بند اپنا چہرہ مختلف کریموں' لوشنوں اور گھریلو ٹوٹکوں سے رگڑ رہی تھی۔ شابی کی دوڑ پورے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ فضہ نے اس موقع پر بہت ضروری ٹیسٹ کا بہانہ بنا کر اپنا کالج جانا ناگزیر ثابت کر دیا تھا۔ جانتی تھی گھر میں رہی تو گھن چکر بن جائے گی۔ کم از کم شابی کا تو یہی خیال تھا۔

نجمہ' زریاب اور جنید نے لنچ تک آ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ وجہ مریم کے رشتے کے لیے آنے والے لوگ تھے۔ پسند تو وہ اسے پہلے ہی ایک تقریب میں کر چکے تھے۔ اب تو باقاعدہ پیام لے کر آ رہے تھے۔ سائرہ بولائی ہوئی تھیں۔ تایا جان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہیں لڑکے' اور خاندان کے جملہ کوائف کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ بظاہر سب تسلی بخش ہی لگتا تھا۔ باقی انہوں نے جنید سے بہت تفصیلی بات کی تھی اور دیگر معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا اور جنید کے اوکے کرنے کے بعد ہی انہیں گھر آنے کی اجازت ملی تھی اس لئے سائرہ چاہتی تھیں کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اور صبح جب وہ منگوائے جانے والے سامان کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ نائلہ کا فون آ گیا۔ ریسیو بھی سائرہ نے ہی کیا تھا۔ حال چال کے بعد انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"یہ رومیہ کیسی لڑکی ہے؟"

سائرہ ٹھٹک سی گئیں۔ پھر سنبھل کر کہا۔

"اچھی لڑکی ہے۔"

"اچھا۔" نائلہ کچھ چپ سی ہو گئیں۔

"کیا بہت زیادہ خوبصورت ہے؟"

"خوبصورت بھی ہے اور خوبصورتی کو اجاگر کرنے کے تمام گروں سے اچھی طرح آگاہ بھی۔"

"کیا مطلب؟"

"نہیں مطلب کچھ نہیں......" سائرہ پھر سے سنبھلیں۔ کچھ اندازہ بھی ہو رہا تھا وہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کچھ کہنے کے بارے میں سوچا مگر وہ کوئی برائی کرتیں تو ہو سکتا ہے اسے ان کی جیلسی سمجھا جاتا اور بہر حال انہیں اس گھر کی لڑکیوں کی عزت زیادہ عزیز تھی۔

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس یونہی زریاب نے ایک دو بار ذکر کیا تھا۔" صاف ٹالنے والا انداز تھا۔ "میں کچھ دنوں تک پاکستان آنے کا سوچ رہی ہوں۔"

سائرہ مزید کھٹک گئیں۔ پہلے زریاب کا آنا اور اب اچانک نائلہ خالہ کا پروگرام۔

"بہت خوشی کی بات ہے۔"

انہوں نے چند لمحے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون رکھ دیا۔ عظیم نہ جانے کس بات پر جھگڑ رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

"میرے اچھے سے چھوٹے اور پیارے سے بھائی نہیں ہو۔ سچی تمہاری باری آئی تو اس
سے ڈبل وقت کچن میں لگاؤں گی۔ بس یہ دو چیزیں' سائرہ آنٹی وہ لسٹ کہاں ہے؟"
تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے لسٹ پکڑی۔ اس میں دو چار چیزوں کا اضافہ کیا۔ اپنے
نام کی طرح شاداب شگفتہ' سادہ و بے ریا چہرہ۔
"میں پہلے بھی چار چکر لگا چکا ہوں۔"
"بس چار اور...... میرا مطلب ہے بس ایک بار" پیار سے اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی۔
"نجمہ کو بہت دکھ ہوگا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھیں۔ پھر بوجھل دل لئے کچن میں
آ گئیں۔ دوپہر تک سبھی آ گئے تھے۔ تیاری بھی مکمل تھی۔
"خدا کے لیے اب بس کرو۔ پسند کر چکے ہیں وہ تمہیں۔" کمرے میں آ کر اس نے
دہائی دی اور وارڈ روب سے بنا دیکھے اک سوٹ گھسیٹ کر باتھ روم میں گھس گئی۔
"پاگل کو کیا پتا ایک تقریب میں پسند کیا تھا۔ اب اگر میک اپ کے بغیر دیکھا تو کہیں
انکار ہی نہ کر دیں۔"
مریم نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے لپ اسٹک اٹھائی وہ کپڑے بدل کر آئی اس کے
عقب میں کھڑے ہو کر بالوں سے بینڈ کھینچا اور سلجھانے لگی۔ بالوں کو اونچی سی پونی کی شکل
دے کر اطراف میں ایک دو لٹیں نکال کر اس نے بھی لپ اسٹک اٹھائی چاہی مگر اس کا ہاتھ
مریم نے جکڑ لیا اور لگی گھورنے۔
"کیا ہوا؟" وہ حیران پریشان۔
"یا تو تم یہ کپڑے بدلو' یا مہمانوں کے سامنے مت آنا۔"
"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ برا مان گئی۔
"تمہارا نام آنٹی نے بالکل ٹھیک رکھا ہے شاداب...... کھلا ہوا گلاب لگ رہی ہو اس
سوٹ میں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کپڑا کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور تمہاری جلد کہاں پہ ختم
اور تمہیں اس پنک لپ اسٹک کی ضرورت کہاں ہے۔ تمہارے چہرے پر تو اللہ تعالیٰ نے قدرتی
رنگ بھرے ہیں۔ آنکھیں شرابی' چہرہ گلابی' ہونٹ' سرخ اس پر لباس بھی گلابی۔"
شابی نے ہنستے ہوئے اسے عقب سے جکڑ لیا۔
"اب جو تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اسے میں تو نہیں چھین سکتی ورنہ جس تقریب میں
انہوں نے تمہیں دیکھا تھا وہاں میں بھی موجود تھی۔"
"اس کے باوجود میں نہیں چاہتی ان کا ارادہ بدل جائے۔" مریم نے اسے بازو سے پکڑ

کر باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا۔
"توبہ ہے آج تو تمہارے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ میں دیکھ لوں گی تمہیں مریم۔"
وہ چیخی اور تیز تیز سیڑھیاں اترنے لگی۔ مگر آخری سیڑھی پر اس نے بروقت بریک لگائی۔
زریاب اچانک ہی سامنے آیا تھا۔
"گڈ! زندگی میں پہلی بار تم نے عین وقت پر بریک لگائی ہے۔" فضہ نے داد دی۔
زریاب نے شاید پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ لبوں پر جمی مخروطی گلابی انگلیاں بڑی
بڑی آنکھوں پر لرزاں لمبی گھنی پلکیں' شفاف چہرے کا سرخ ہوتا رنگ ہلکی سی گھبراہٹ و
سراسیمگی۔
زریاب نے پیچھے ہٹ کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے نکلی اور وہ لاؤنج کے
صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ پسینہ آیا تھا یا نہیں۔ وہ خوامخواہ ہی نیٹ کے دوپٹے
سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ سی تھی۔ فضہ نے نہ جانے کیا پوچھا تھا۔
اسے سنبھلنے میں تھوڑا وقت لگا۔
"نہ جانے یہ مہمان کہاں رہ گئے۔ لنچ کے بجائے ڈنر کا ارادہ لگتا ہے۔" سائرہ بڑبڑانے
لگیں۔
"آ جائیں گے' ابھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔" نجمہ مسکرائیں۔ دونوں باہر نکل گئی تھیں۔
تب ہی زریاب آیا اور ساتھ والے صوفے پر بیٹھ کر فون پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شاداب
کو پھر سے وہی گھبراہٹ گھیرنے لگی۔ وہ وہاں سے اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی
جب عظیم بھاگا آیا۔
"وہ لوگ آ گئے ہیں۔"
زریاب نے ریسیور رکھ دیا۔
شابی تیزی سے اٹھ کر لپکی' اس کا نیٹ کا دوپٹہ سائیڈ پر پڑے مصنوعی ادھ کھلے گلابوں
میں پھنس گیا۔ گلدان تو وہیں لڑھکا۔ لیکن اس کا آنچل سارے گلاب سمیٹ لے گیا۔ جو سیدھا
اٹھتے ہوئے زریاب کے کندھے سے ٹکرائے۔ زریاب نے جھنجھلا کر اسے پکڑا' دوپٹہ کھینچا تو
اسے احساس ہوا' دوپٹہ پھسلنے کے خیال سے وہ ایک دم سے اس کے پاس بیٹھی تھی۔
"تمہارا سب سے پہلے جانا بہت ضروری ہے۔" وہ بگڑ کر بولا۔
"آپ کو کیا ہے؟"
"یہ کس کے لئے لے جا رہی ہو۔" اس نے گلدستہ اس کی گود میں پھینکا' وہ خجل سی ہو کر

آنچل چھڑانے لگی۔ زریاب باہر نکل گیا تو عظیم نے فوراً اپنا رکا ہوا قہقہہ آزاد کیا۔

"واہ' کیا انداز تھا پھول پیش کرنے کا۔ بس زمانے کا فرق ہے۔ پہلے تازہ گلاب دیئے جاتے تھے اب ......" شابی نے جھنجھلا کر سارے گلاب اسے دے مارے۔ اور خود پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔

"کوئی پھولوں سے نہ مارے میرے دیوانے کو" گنگناتا ہوا وہ پھول گلدان میں لگانے لگا۔

"عظیم! کون کون آیا ہے" فضہ نے آکر اشتیاق سے پوچھا۔

"اپنے نعمان بھائی کے والدین' ان کی بھابی بہن۔"

"بہن بھی ہے۔" فضہ کو ہم عمر لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے کا کریز تھا۔

"بیٹھ جاؤ" عظیم نے اسے روکا۔ "وہ تمہاری ایج کی نہیں ہے۔"

"تو پھر......" وہ چڑ گئی۔

"پھر یہ کہ وہ میری ایج کی ہیں۔" اس نے کالر کھڑا کیا اور یہ جا وہ جا۔

* * *

صبح سے اس کی حرکتیں مشکوک سی ہوگئی تھیں۔ اپنا سوٹ استری کرنے کے بجائے اس نے فضہ کا سوٹ استری کر دیا تھا اور جب مارے حیرت کے فضہ نے ہکلاتے ہوئے اس کی غلطی کی نشاندہی کی تو وہ بجائے اس بات پر بحث کرنے کے کہ اب فضہ اس کا سوٹ استری کرے۔ مسکرا کر سوٹ فضہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ سائرہ کی چائے میں چار چمچے چینی ملا دی اور نجمہ کو پھیکی چائے دے دی۔ ابلے ہوئے انڈوں کے بجائے ناشتے پر کچے انڈے رکھ کر لے آئی۔ زریاب کے ساتھ باتوں میں مگن جنید نے انڈا ہاتھ میں لے کر چھری سے ضرب لگائی تو انڈا اس کے ہاتھوں کو بھگو کر پلیٹ میں بکھر گیا اس کی ڈانٹ بھی سر جھکا کر خاموشی سے سن لی اور اب رومیہ کی پارٹی میں جانے کے لیے بھی وہ خوشی خوشی راضی ہوگئی۔

وہ دونوں سر جوڑے اسی مسئلے پر غور کر رہی تھیں۔ مریم کے ہاتھ میں لپ اسٹک تھی۔ وہ اپنے سوٹ کے ہم رنگ شیڈ چیک کر رہی تھی۔ فضہ نیل پالش نکال رہی تھی۔ جب وہ کپڑے بدل کر آئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے بال سلجھانے لگی۔

فضہ نے مریم کو کہنی ماری۔

"اس سے پوچھو۔"

مریم نے اس کے قریب آکر پیار سے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"شابی! کیا ہوا؟"

"کسے......؟" وہ چونکی۔

"تمہیں' طبیعت تو ٹھیک ہے۔" بے حد تشویش سے دریافت کیا گیا۔

"میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو پھر صبح سے اتنی مشکوک حرکتیں کیوں کر رہی ہو۔" فضہ نے لقمہ دیا۔

"کیسی حرکتیں......؟" اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دیکھو...... دیکھو ذرا اس کو پہلے یہ اتنی متانت سے مسکرائی تھی۔ اس کا قہقہہ تو چھت پھاڑتا تھا۔"

"لڑکیوں کو اسی طرح مسکرانا چاہیے۔"

"کچھ یاد تو پڑتا ہے یہ مقولہ کس کا تھا۔" فضہ نے دماغ پر زور دیا۔

"فضہ! مریم! دراصل مجھے' مجھے محبت ہوگئی ہے۔" اس نے ایک دم انکشاف کیا۔ وہ دونوں اسے گھورتی رہ گئیں۔ پھر مریم نے ناامیدی سے سر ہلایا۔

"تمہیں نزلہ' زکام' کھانسی کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر محبت تو وے۔"

"مگر مجھے محبت ہوئی ہے۔"

"اچھا کب ہوا یہ حادثہ؟"

"کل گیارہ بج کر دس منٹ پر۔"

"کیا صبح گیارہ بجے تو تم مہمانوں کے پاس تھیں اور رات کو گیارہ بجے ہم جنید کے کمرے میں فلم دیکھ رہے تھے۔ کہیں سلوسٹر اسٹالون سے تو نہیں ہوگئی۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا؟"

"تو پھر......" فضہ نے کنپٹی بجائی پھر پرجوش ہو کر چلائی۔

"کہیں تمہیں جنید بھائی سے تو محبت نہیں ہوگئی۔ وہاں کارنس پر ان کی اتنی بڑی اور اتنی خوبصورت تصویر سجی تھی۔ اور تم بار بار تصویر دیکھ بھی رہی تھیں۔"

"وہ تصویر......" جیسے منہ میں کونین ہو اور اتنی ہی شکنیں ماتھے پر۔

"تم پانچ منٹ میں نیچے آسکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔"

نیچے سے جنید کی تنبیہہ سنائی دی۔

"دیکھا......" اس نے منہ بنایا تو مریم چڑ گئی۔

"تو جلدی بکو' کس سے محبت ہوگئی ہے تمہیں۔"

"زریاب مرتضٰی ہمدانی۔"

مریم کا لپ اسٹک لگاتا ہاتھ بھٹکا۔ اور ہونٹوں سے ہو کر گال پر پہنچ گیا۔ فضہ کے ہاتھ سے نیل پالش چھوٹی اور قالین پر جا پڑی۔ وہ دونوں ساکت کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟"

مریم کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔"

"ہو تو گئی ہوں۔"

"لگ بھی رہا ہے یقیناً تم ہوش میں نہیں ورنہ یہ کبھی نہ کہتیں۔"

"میں پورے ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں۔" وہ ڈٹی ہوئی تھی۔

"فضہ! چلو دعائے مغفرت کریں۔"

"کیا بکواس ہے۔"

"نہ یہ بتاؤ۔" اس کے کندھے میں انگلیاں چبھوتے ہوئے فضہ نے غصے سے کہا۔ "آخر جنید میں کیا کمی تھی اور زریاب میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایک سے ہیں دونوں۔ جنید کی اگر تیوریاں چڑھتی رہتی ہیں تو زریاب کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ مسکرانا دونوں کے لیے گناہ ہے اور لڑکیوں کو دونوں ہی بے وقوف مخلوق تصور کرتے ہیں تو پھر جنید کیوں نہیں اور یہ زریاب کیوں بولو۔ زریاب کیوں؟"

سب ہی کی خواہش تھی کہ جنید اور شابی کی شادی ہو جائے مگر نہ جنید راضی ہوتا اور نہ شابی۔

"یہ تو دل کا معاملہ ہے فضی بی بی۔"

"جو بندہ پورے پندرہ منٹ میں ناشتہ کرتا ہو۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ کم جس کے اٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے کا وقت مقرر ہو اس سے محبت کرنے چلی ہو۔ لمحہ لمحہ کیلکولیٹ کرنے والا بندہ ہے گھڑی سامنے رکھ کر کہے گا۔

"میرے پاس صرف پانچ منٹ ہیں۔ کوئی پیار کی بات کرنی ہے تو کر لو۔" فضہ کو غصہ ہی آ گیا تھا۔

"میرے لئے وہ پانچ منٹ ہی بہت ہیں۔" بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی اس کے لبوں پر۔

"منٹ سے یاد آیا۔ یہ گیارہ بج کر پندرہ منٹ کا کیا چکر ہے۔" مریم نے پوچھا۔

"شاید اس وقت میں نے انہیں غور سے دیکھ لیا تھا بس پتھر کی ہو گئی۔" اس سے قبل کہ انہیں تفصیل سناتی۔ پورچ سے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

"مارے گئے۔" مریم نے گال رگڑا' فضہ نے اپنے سر پر اُگے گھونسلے کو دو چار ہاتھ مارے۔ شابی نے سینڈل ہاتھ میں لے کر نیچے دوڑ لگا دی۔ جنید کی گاڑی سائرہ اور نجمہ کو لے کر نکل گئی تھیں۔ زریاب اور عظیم کھڑے گاڑی کے پاس باتیں کر رہے تھے۔

"لگتا ہے جنید پر بھی زریاب کا اثر ہو گیا ہے۔ دو منٹ بھی دینے کو تیار نہ ہوا۔"

مریم نے چڑ کر کہا۔ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر سما گئیں۔ زریاب ڈرائیونگ سیٹ پر اور عظیم اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے باقی میک اپ ایک دوسرے کے عقب میں ہو کر پورا کیا۔ گاڑی تیزی سے سڑک پر بھاگنے لگی۔ رات ڈھل گئی تھی اور سڑکوں کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گویا پورا لاہور سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ جلتے بجھتے نیون سائن' سڑکوں پر لگی روشنیاں انہیں دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر زریاب کو دیکھا۔ اسٹیئرنگ پر جمے ہاتھوں' کلائی پر بندھی ریسٹ واچ سے ہو کر نگاہ اس کے چہرے پر جم گئی۔ چہرے پر چھائی سنجیدگی آمیز متانت' لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ نہ جانے وہ ہمیشہ تنہا کیوں مسکراتا تھا۔ شابی کو اس ہوا سے حسد سا محسوس ہوا جو بار بار اس کے جمے جمائے بالوں کو پیشانی پر بکھیر کر رکھ دیتی تھی۔

"بدتمیز۔"

"ہیں...... میں نے کیا کہا ہے۔" فضہ برا مان گئی۔

"سارے ہیر اسٹائل کا ستیاناس مار دیا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ نظروں کا زاویہ اب بھی نہ بدلا تھا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" فضہ اس کے لیے پریشان ہو گئی۔ تب ہی زریاب نے بیک مرر عین اسی پر سیٹ کیا۔ (غالباً گھورنے کے لیے)

شابی نے جو گھبرا کر سر جھکایا تو پھر سارا رستہ نہ اٹھایا تھا۔

احسن انکل کے ہاں تمام مہمان آ گئے تھے۔ رومیہ سیاہ بارڈر والی خوبصورت ساڑھی پہنے سج سج قدم اٹھاتی ایک ایک مہمان سے مل رہی تھی۔ آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ یہ پارٹی اس کے ڈاکٹر بننے کی خوشی میں دی گئی تھی۔

"ماسیوں والے حلیے میں اٹھ کر آ گئی ہو۔ کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہ ملا تھا تمہیں۔" فضہ کو رومیہ کے مقابلے میں شابی ذرا مدھم لگی تھی۔

"ٹھیک ہوں میں۔"

"ہائے زریاب۔"

"اللہ کرے جوتے کی ہیل نکل جائے' نہ جانے دماغ کمزور ہے یا نظر اتنے سارے لوگوں میں زریاب ہی نظر آئے ہیں۔" شابی کلس کر رہ گئی۔

رومیہ لپک کر زریاب کے قریب آئی۔ کس قدر وارفتگی تھی اس کے انداز میں۔ شابی ٹھٹک گئی۔ پھر زریاب کے ہونٹوں پر اک بھرپور اور جاندار مسکراہٹ دیکھی۔

"اسٹوپڈ' لپکی تو یوں ہے جیسے گلے ہی آ لگے گی۔"

دوسرے پل زریاب کے مضبوط ہاتھ میں اس کا نازک سا ہاتھ تھا۔ اس پر قیامت یہ کہ زریاب نے مبارکباد دیتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑا بھی نہ تھا۔ مارے غصے کے وہ فضہ کا ہاتھ مروڑ گئی۔ ہائے ...... اوئی کی آواز پر ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ہاتھوں پر گویا گوند لگی تھی۔

مریم جلدی سے آگے بڑھ کر مبارکباد دینے لگی۔

"تھینکس ......" اک ادا' اک ناز سے مسکرائی تھی وہ۔

شابی کو اس کے بناوٹ بھرے انداز پر غصہ سا آ گیا۔ اس سے قبل کہ وہ ان کے قریب سے گزر کر ممی کی طرف چلی جاتی۔ اچانک زریاب کی گرفت میں اس کی کلائی آ گئی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے سے لڑکھڑا کر واپس اپنی جگہ پر آئی۔ تحیر سے سر اٹھا کر زریاب کو دیکھا۔

"تم نے رومیہ کو مبارکباد نہیں دی شابی!" اس کے لہجے میں غیر محسوس سی اپنائیت در آئی تھی۔ جو شابی محسوس نہ کر پائی۔ ایک جھٹکے سے کلائی چھڑائی۔

"آپ کو کیا ہے؟" لہجہ سخت بگڑا ہوا تھا۔ "اور مجھے رومیہ سمجھنے کی غلطی مت کیجئے۔"

اتنے لوگوں میں زریاب کی یہ حرکت سخت بری لگی تھی۔ مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اپنے ایک ہی جملے سے اس نے زریاب کی کتنی انسلٹ کی تھی۔ پتا ہوتا تو بھنگڑا ڈال رہی ہوتی کہ وہ ادھار رکھنے کی قائل نہ تھی اور اس کے تئیں زریاب کی طرف اس کے بہت سے حساب نکلتے تھے۔ جنہیں بے باک کرنے کی خواہش بہت عرصے سے اس کے دل میں تھی۔ مریم اور فضہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ جب کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ دونوں بھی پیچھے لپکیں۔

"عجیب سے انداز ہیں اس کے بہت روڈ اور ......" رومیہ نے نخوت سے کہتے ہوئے زریاب کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے کے کسی تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔

"ہاں مگر ...... یہ خفا ہونے والی بات تو نہ تھی۔"

زریاب محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"شاید تم دونوں میں کچھ زیادہ انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے۔" رومیہ کے لہجے میں ہلکی سی جلن اور حسد محسوس ہو رہا تھا۔

"نہیں ہے تو ہو جائے گی۔"

وہ کہہ کر معذرت کرتا آگے بڑھ گیا۔ رومیہ لب بھینچے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ کھانا لگ گیا تھا۔ سب ہی مہمان ڈائننگ ہال کی طرف جانے لگے تھے۔ شابی کا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے چکن کا ایک پیس اور ذرا سا سلاد لے کر کونے میں آ گئی۔

"خوامخواہ میں زریاب کو خفا کر دیا۔ وہ تو پہلے ہی مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے تھانیدار کسی چور کو یا قصائی چھرا پھیرنے سے قبل گائے کو دیکھتا ہے لیکن نہیں' یہ گائے اور چور کی تشبیہات مجھ جیسی خوبصورت لڑکی کے لئے تو ہرگز مناسب نہیں۔" کھیرے کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر سوچا۔

"بہت خوشی ہو رہی ہے رومیہ کے سامنے میری بے عزتی کر کے۔"

شابی نے کھیرے سے نظر اٹھا کر زریاب کو دیکھا۔

"آپ کو اپنی بے عزتی پر افسوس ہے یا رومیہ کے سامنے ہونے پر۔"

وہ خاموشی سے اس پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

شابی کو الجھن سی ہونے لگی۔

"جو تمہارے دل میں ہے' اگر چھپا نہیں پا رہی ہو تو ......"

"جو میرے دل میں ہے۔" شابی کی آواز ایک پل کو بلند ہوئی پھر ایک دم مدھم ہو گئی تھی۔ "جو میرے دل میں ہے' اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے بھی میرے اندر رومیہ کی طرح دوغلا پن نہیں ہے۔"

"رومیہ کے ساتھ اپنا مقابلہ کیوں کرتی ہو' اس کا اور تمہارا کیا مقابلہ۔" اس کی جانچتی ٹٹولتی نظریں اب بھی شابی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں اس کا اور میرا کیا مقابلہ' مجھے اس کی طرح گیم کھیلنا نہیں آتا۔"

"گویا تم خود کو بہت سادہ اور معصوم تصور کرتی ہو۔"

"آپ بے وقوف بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ نہ تو کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ تکلیف دے سکتے ہیں۔ ایکسکیوز می! مجھے مریم بلا رہی ہے۔"

وہ کترا کر نکل گئی۔ زریاب کو کسی اور نے متوجہ کر لیا تھا۔ سارے فنکشن میں وہ چپ

چپ ہی رہی تھی۔ پارٹی کے اختتام پر جب سب لوگ رخصت ہو رہے تھے اور رخصت ہونے والوں میں آخری مہمان بھی وہی تھے۔ رومیہ نے شکوہ کیا۔

"تم نے مجھے گفٹ ہی نہیں دیا۔"

"گفٹ تو تمہاری پسند اور مرضی کا ہونا چاہیے' یونہی کیسے لے آتا۔" زریاب نے جواب دیا۔

"دیکھ لو رومیہ کوئی ایسی ویسی چیز پسند نہیں کرتی۔" اس کی مما نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اسے کرنی بھی نہیں چاہیے۔" زریاب نے ایک بھرپور نگاہ رومیہ پر ڈالی۔ وہ ناز سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی بڑی عجیب سی ہوتی۔ سرگوشی کرتی' اپنی طرف کھینچتی' کچھ دعوت دیتی ہوئی۔

"اور مجھے کیا آپ نے اتنا ہی کنگال سمجھ رکھا ہے کہ رومیہ کو اس کی پسند کا گفٹ بھی نہ دلا سکوں۔"

"تو پھر کسی دن مجھے ڈنر پر لے چلو۔"

"بس۔" نہ جانے زریاب کیوں اتنا فری ہو رہا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی نہ عادات۔ نجمہ اور سائرہ ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"فی الحال بس۔" رومیہ کھلکھلائی۔

گاڑی کا دروازہ دھاڑ سے بند ہوا تھا۔ سب کے ساتھ ساتھ زریاب نے بھی پلٹ کر دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ منہ پھلائے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

* * *

"تم نے اتنے سارے لوگوں کے سامنے زریاب بھائی کی بے عزتی کر دی۔" فضہ کو اب تک اس کی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اپنی ناک سے پھسلتی عینک کو واپس جماتے ہوئے وہ بار بار یہ جملہ دہرا رہی تھی۔

"بہت اچھا کیا' وہ ڈیزرو کرتا ہے۔ کس نے کہا تھا اتنے سارے لوگوں کے سامنے میرا بازو کھینچیں۔"

"اور وہ تمہاری محبت۔" مریم نے انڈے پھینٹتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ چھٹی کا دن تھا سو ناشتہ وہی بنا رہی تھی۔

"محبت کا مطلب یہ تو نہیں کہ عزت نفس بھی داؤ پر لگا دی جائے۔"

"ویری گڈ۔" مریم نے سراہا

"مگر تم اتنی نیرو مائنڈڈ لگتی تو نہیں ہو اور اپنی فلموں میں بھی ایسا نہیں ہوتا۔ ہیرو نے ذرا سا جھٹکا دیا نہیں اور ہیروئن صاحبہ لڑکھڑا کر سینے سے لگیں نہیں۔ اب دکھایا یہ جاتا ہے کہ اتفاقی حرکت ہے مگر لگتا یوں ہے کہ برسوں کی حسرت تھی کہ کئی لمحوں تک محترمہ کو پیچھے ہٹنے کا خیال بھی نہیں آتا اور اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اندر کو بھاگتی ہے اور تم ......" فضہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"محبت ایک بے اختیار جذبہ سہی' کہیں بھی ہو سکتی ہے اور کسی سے بھی مگر اس کے بعد کے مرحلوں پر اور اپنے جذبوں پر بند تو باندھا جا سکتا ہے نہ کہ اسے حاصل کرنے کے لیے شتر بے مہار ہو جائیں۔ گھٹیا ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھو' مرد کتنا بھی ایڈوانس ہو جائے۔ اشارے کنائے میں دعوت دینے والی اور اپنی طرف بڑھنے والی عورت کو نچلے درجے کی عورت ہی سمجھتا ہے۔"

"رومیہ کی طرح۔" فضہ نے کہا۔

"ہمیں رومیہ کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں وہ صرف بولڈ ہے۔" شابی نے احتجاج کیا۔

"لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس کی اس بولڈنیس کو پورے خاندان میں کہیں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہ پہلے جنید کی طرف مائل تھی۔ بھلے وہ صرف دوستی ہو مگر ہم جن حدود و قیود میں پرورش پاتے ہیں۔ وہاں اس دوستی کی بھی کوئی گنجائش نہیں اور تم نے دیکھا نہیں جنید نے کبھی اسے لفٹ نہیں کروائی اور نہ وہ رومیہ کے ہمارے ساتھ تعلقات کو کبھی پسند کرتا ہے۔"

"اس مغرور حسینہ کے ساتھ دوستی کرنے کا ہمیں بھی کوئی شوق نہیں لیکن الزام صرف رومیہ کو نہیں دیا جا سکتا اور دیکھا تھا پورے دو منٹ دس سیکنڈ تک زریاب نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔" شابی جل کر بولی۔

"اچھا تو تمہارے غصے کی وجہ یہ تھی۔" مریم مسکرائی۔

"تو نہیں آنا چاہیے تھا۔ رومیہ کو مبارکباد نہیں دی۔" اس نے نقل اتاری۔ "وہ محترمہ بھی یوں اٹھلا اٹھلا کر باتیں کر رہی تھیں جیسے دنیا کی واحد ڈاکٹر ہیں حالانکہ سب جانتے ہیں۔ اسے میڈیکل میں ایڈمیشن اس کے پاپا کی سفارش سے ملا تھا۔"

وہ جھنجلا کر ماچس اٹھا کر پلٹی۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ماچس زمین پر جا پڑی تھی۔ ساری اکڑفوں رخصت ہو گئی۔ شرمندگی کے گہرے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے اسی میں ڈوب مرنے کو دل بھی چاہا۔

"کیا آج ناشتہ نہیں ملے گا۔" زریاب واحد بندہ تھا جو چھٹی کے دن بھی ناشتہ وقت پر کرتا تھا۔اس کی آواز پر باقی دونوں بھی پلٹیں۔

"ناشتہ۔"

"بس ابھی تیار ہو جائے گا۔" مریم نے تیزی سے ہاتھ چلائے۔ فضہ فریج سے جیم وغیرہ نکالنے لگی۔ وہ ابھی تک گری ہوئی ماچس پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

"اٹھالیں اب" زریاب نے کہا۔

وہ بت بنی یہی سوچتی رہی کہ کس جملے پر زریاب کی آمد ہوئی اور اس جملے سے پہلے کتنے جملے گزر چکے تھے۔

"پارٹی میں تمہارا ہاتھ پکڑنا ایک بالکل غیر ارادی حرکت تھی۔ ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہارا ہاتھ تھامنے کا۔"

بے عزتی ہوئی تھی یا دکھ' آنکھیں لبالب بھر آئی تھیں۔

"یہ سمجھتے کیا ہیں خود کو۔" زریاب کے جانے کے بعد وہ چیخی۔

"آہستہ بولو۔" مریم نے فضہ کو ناشتے کی ٹرے دے کر دوڑایا۔

"میرا ہاتھ تھامنے کا کوئی شوق نہیں' میں بھی مری نہیں جا رہی۔ جائیں تھام لیں اس رومیہ کا ہاتھ۔" وہ تن فن کرتی کچن سے غائب ہوگئی۔ مریم سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"تم کیوں سر پکڑے بیٹھی ہو۔" فضہ نے حیرت سے پوچھا۔ "اور یہ محترمہ کہاں ہیں؟"

"رو رہی ہوگی اپنے کمرے میں۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے مریم! زریاب اور شابی کی انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔" فضہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کون جانے۔ ایک مشرق ہے' دوسرا مغرب اور درمیان میں رومیہ۔" وہ خود پریشان ہوگئی تھی۔

* * *

2 اکتوبر 2002ء

آج مریم کی منگنی ہے۔ مریم کی منگنی ...... میری بہنوں جیسی دوست اور کزن جس کی خوشی میں شرکت کے بجائے میں یہاں بیٹھی ہوں۔ پھپھو کی شوگر ہائی ہوگئی تھی۔ اس لئے میں جا ہی نہ سکی لیکن لمحہ لمحہ دھیان بھٹک بھٹک کر ادھر ہی جاتا رہا۔ اب مہمان آئے ہوں گے۔ اب انگوٹھی پہنائی گئی ہوگی ...... مریم کے چہرے کا رنگ کیسا ہوگا ...... شابی اور فضہ نے مل کر

ادھم مچا رکھا ہوگا۔ شام کو پھپھو کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ چچا سلیم کے ہاں چلی گئیں۔ میں خاموشی سے صحن میں بیٹھی اور چپ چاپ بیل پر کھلے پھولوں کو دیکھتی اور اس آنگن کی رونق کا تصور کر کے دل بہلاتی رہی تب ہی رفعت آ گئی۔

"سارا دن گھر بیٹھی بیٹھی بور نہیں ہوتیں آپ! کبھی ہماری طرف ہی چکر لگا لیا کیجئے۔" وہ پاس آ بیٹھی۔

"آتی تو ہوں۔"

"مہینہ مہینہ گزر جاتا ہے۔"

"روز روز آنا اچھا بھی تو نہیں لگتا۔"

"اچھا" وہ زور سے ہنسی پھر غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ فرمان ہماری تائی جان کا ہوگا۔"

میں خاموش رہی۔ تردید کا فائدہ بھی کیا ہوتا۔ وہ اپنی تائی کو مجھ سے بہتر جانتی تھی۔

"بہت اداس اور چپ چپ ہیں۔"

"نہیں تو۔"

"زبیر بھائی نے بہت دن لگا دیئے اس دفعہ۔"

"ہاں بہت دن ہوئے فون بھی تو نہیں کیا۔"

"فون ...... فون تو دو بار آیا تھا۔ تائی جان سے بات بھی ہوئی تھی۔"

"زبیر کا ......؟" میں پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

"زبیر بھائی کا ہی آیا تھا۔ تائی جان نے دونوں بار کہہ دیا۔ آپ سوئی ہوئی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"سوئی تھی مر تو نہ گئی تھی جو اٹھ نہ سکتی۔" پہلی بار مجھے اس شدت کا غصہ آیا۔ اس گھر میں ایسا کوئی وقت مجھے نصیب ہی کہاں ہوا تھا کہ میں ڈھنگ سے سو سکتی۔

میں پھپھو سے پوچھے بنا رہ ہی نہ سکی وہ بھڑک اٹھیں۔

"میرے بیٹے کا فون تھا میں نے سن لیا تو کیا قیامت آ گئی۔"

"آپ مجھ سے بھی تو بات کروا سکتی تھیں۔"

"میں تمہاری نوکر نہیں لگی ہوں کہ بلانے بھاگوں مہارانی کو۔"

"آپ کو بھی تو کوئی بلانے آیا ہوگا۔"

"زیادہ زبان نہ چلا میرے سامنے ...... منہ توڑ کر رکھ دوں گی ...... ایسی بے دید' بے لحاظ

ہے تو...... کوئی تمیز نہ سکھائی ماں نے ...... بس یہ بال کٹوانا اور چنک منک کر باتیں کرنا سکھایا ہے۔ یہ میرا گھر ہے اور ادھر وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔''

''یا اللہ! اس سے بہتر تو ان کی چپ تھی۔'' میں نے کمرے کی چٹخنی چڑھالی۔

جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں اسے سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔

* * *

نائلہ خالہ بالکل بغیر اطلاع کے پاکستان پہنچی تھیں۔ سب ہی حیران تھے حتیٰ کہ زریاب بھی۔

''تو آپ کو واقعی یہ لگا کہ میں بے وقوف ہوں۔'' زریاب کے لہجے میں ہلکی سی خفگی در آئی تھی اس کی آواز بے حد مدہم تھی۔ نائلہ خالہ نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔

''کبھی کبھی بہت عقل والے بھی ٹھوکر کھا سکتے ہیں۔''

''مجھے اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار اور حق حاصل ہے۔''

''سارے اختیار' سارے حق تمہارے ہی ہیں مگر رہنمائی کی ضرورت تو پڑ سکتی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر کولڈ ڈرنکس لے کر آتی شاداب کو دیکھا۔

''بچہ نہیں ہوں میں۔'' زریاب کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہوئیں۔

''ڈونٹ وری۔ تم پر اپنا فیصلہ مسلط کرنے نہیں آئی ہوں ...... ہاں ایک اچھا فیصلہ کرنے میں مدد ضرور کروں گی۔''

زریاب اٹھ گیا۔

''اور شابی بیٹا! آپ کیا کر رہی ہو آج کل۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''آج کل تو سائرہ آنٹی کے زیر عتاب ہوں۔ یہ مجھے مکمل باورچن بنانے کے لئے ہر حربہ آزما رہی ہیں۔''

''اچھا تو ان کے حربے کہاں تک کامیاب ہوئے۔'' انہوں نے بے حد دلچسپی سے اس کے بے ساختہ انداز کو دیکھا۔

''یہ تو آپ کو ڈنر پر پتا چلے گا۔''

''گویا ہماری بیٹی نے کھانا پکایا ہے۔''

''نہیں' ہم تینوں نے مل کر۔'' شابی نے صاف گوئی سے اعتراف کیا پھر سائرہ کے پکارنے پر اٹھ گئی تو وہ نجمہ کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔

''اس عمر میں تم بھی بالکل ایسی ہی ہوتی تھیں ...... مگر یہ تم نے حال کیا کیا ہے اپنا۔''

نجمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انہوں نے غور سے دیکھا۔ وہ چھوٹی تھیں نائلہ سے مگر کئی برس بڑی لگ رہی تھیں۔

''بس وقت گزر گیا ہے۔''

اور وقت دونوں کی آنکھوں میں نمی بن کر پھیل گیا۔ وہ دونوں بہنیں ہی تو تھیں' بھائی کوئی تھا نہیں پھر والدین بھی نہ رہے۔ نائلہ بیاہ کر سات سمندر پار جا بسیں۔

''شابی اور رباب کو دیکھتی تھی تو ہمیشہ وہ وقت آنکھوں میں گھوم جاتا تھا جو ہم دونوں نے مل کر گزارا۔''

''ہاں کتنا کچھ بدل جاتا ہے۔''

دونوں بند کمرے میں نہ جانے کون کون سی باتیں کر کے' کبھی ہنستی تھیں تو کبھی روتیں۔

''آخر یہ کون سی باتیں ہیں جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں۔'' شابی دو دن میں ہی اکتا گئی تھی۔ ''ممی سے بات کرنے کو ترس گئی ہوں میں۔'' ناشپاتی کھاتے کھاتے وہ اکتا کر بولی تھی۔

''اتنے عرصے کے بعد دونوں بہنیں ملی ہیں۔ اتنی جلدی باتیں کیسے ختم ہوں۔'' مریم نے کہا۔

''یار سننا چاہئے۔'' فضہ نے مشورہ دیا۔ اسے یوں بھی شک تھا کہ نائلہ خالہ زریاب کی شادی کے لیے آئی ہیں۔ ہوسکتا ہے بند کمرے میں ایسا ہی کوئی مشورہ ہو رہا ہو۔ مریم نے تو فوراً اس تجویز کو نامعقول قرار دے دیا تھا مگر وہ شابی کو اشارہ کر کے نکل گئی۔

''اگر تو یہ کھڑکی کھلی ہے تو آج کوئی نہ کوئی انکشاف ہو کر رہے گا۔''

کھڑکی اونچی تھی اور شابی لمبی۔ نیچے دیوار کے ساتھ چند فالتو اینٹیں پڑی تھیں۔

''شابی! اس پر چڑھ کر دیکھو۔'' فضہ نے کہا۔ اس نے دو چار اینٹیں جوڑیں اور چڑھ گئی۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے نظر تو کوئی نہ آیا تھا مگر آواز آرہی تھی۔ ہلکی ...... مدھم ...... الفاظ پلے نہ پڑے۔

''توبہ ہے' اتنی آہستہ بول رہی ہیں کہ کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔''

''شش۔'' فضہ نے خاموش کروایا۔

اس نے کان جالی سے چپکا دیا۔

''ہاں کوئی شادی بیاہ کی بات ہو رہی ہے۔''

''شش۔''

"نہیں ......شاید سیاسی صورت حال پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ پرویز مشرف کا نام سنائی دیا ہے۔"

"ش ......ششش۔"

"لیکن پرویز مشرف کے ساتھ خالہ کا کیا تعلق۔"

خاموشی۔

"ہاں اب آئی ہیں پوائنٹ پر۔" شابی جوش میں پنجوں کے بل اونچی ہوئی۔

خاموشی۔

"تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔"

جواب میں صرف خاموشی ہی تھی۔

"تم......" آ......آ......دھڑام۔

کاش زمین کھود کر اسی میں جا گھستی۔ گرنے اور چوٹ لگنے سے زیادہ سامنے والے بندے کو دیکھ کر رونا آیا تھا جس نے بچانے یا سنبھالنے کے بجائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور لگا گھورنے۔ شابی کو احساس ہوا وہ اب بھی نہ تو سہارے کے لئے ہاتھ بڑھائے گا۔ نہ خیریت پوچھے گا تو کہنی کا درد سہتی اٹھی۔ خاموشی سے اس کے قریب سے گزری اور موڑ مڑتے ہی سرپٹ بھاگی تھی جبکہ نائلہ اور نجمہ کھڑکی کھولے تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا زریاب......گرا کون اور چیخ کس نے ماری؟"

کیونکہ وہاں کھڑا زریاب تھا اور چیخ خالصتاً نسوانی تھی۔

* * *

4 اکتوبر 2004ء

گوشت بھونتے بھونتے نہ جانے دل میں کیا آئی کہ میں نے ایک بوٹی نکال لی۔ پھپھو نے منگوایا بھی تو اتنے دنوں کے بعد تھا بلکہ وہ تو سبزی بھی نہیں منگواتی تھیں۔ اتنے دنوں سے دالیں کھا کھا کر یوں بھی پیٹ میں درد مستقل رہنے لگا تھا۔ پھپھو سے کہا تو کہنے لگیں۔

"اس حالت میں ڈاکٹری دوائیاں نہیں کھانی چاہئیں' یہ پھکی کھالو۔"

"ہاں اس حالت میں تو شاید اچھی خوراک کھانا بھی منع ہو جاتا ہے۔"

"تم آٹا گوندھ لو' میں ہنڈیا بھون لیتی ہوں۔"

"میں کر لیتی ہوں پھپھو!"

"اٹھو۔" بعض اوقات ان کا لہجہ اتنا تحقیر آمیز ہو جاتا ہے' گویا بہو سے نہیں کسی ملازمہ

سے بات کر رہی ہیں۔

میں اٹھ گئی۔

"یونہی منہ چلتا رہا تو ہانڈی میں خاک کچھ بچے گا۔" پھپھو بڑبڑائیں۔

اف! انہوں نے مجھے بوٹی کھاتے دیکھ لیا تھا۔

"پھپھو! میں نے تو بس ایک......نمک چکھنے......"

"ہاں بی بی! اپنا کام کرو۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔ میں اٹھ کر آٹا گوندھنے لگی۔

یہ دل بھی بس یونہی خوار کرواتا ہے۔ ایک بوٹی ہی تو تھی۔ نہ کھاتی تو کیا ہو جاتا۔ اب پھپھو نہ جانے کس کس کو بتائیں گی۔

آٹا بھی گندھ گیا۔ روٹیاں بھی پک گئیں۔ نوکروں کو کھانا بھجوا دیا۔ پھپھو نے بھی کھا لیا۔ مجھے آواز نہ دی۔ بے شرم بن کر خود ہی چلی گئی۔ چنگیر سے روٹی نکال کر ہنڈیا کا ڈھکن اٹھایا تو ششدر سی رہ گئی۔ خالی ہنڈی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

"پھپھو سالن۔"

"ختم ہو گیا......تم نے تو خیر کھا ہی لیا تھا۔"

گیٹ سے نکلتے نکلتے جواب دیا۔ یہ ایک بوٹی کھانے کی سزا تھی۔ روٹی چنگیر میں رکھ کر اندر آئی تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور بہت رو چکنے کے بعد احساس ہوا کہ بھوک صرف مجھے نہیں لگی وہ جو میرے وجود میں پل رہا ہے۔ اسے بھی اپنا حصہ چاہئے۔ لسی میں ہری مرچ ملا کر اس میں ڈبو ڈبو کر روٹی کھاتے ہوئے میرا دل چاہا۔ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔

* * *

"بھئی! ڈرائیونگ کون کرے گا۔" نائلہ خالہ نے پوچھا۔ ان کے آنے سے گھر بھر کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔ بہت خوش مزاج اور زندہ دل خاتون تھیں۔ لڑکیوں کے وارے نیارے ہو گئے تھے......کہیں بھی جانا ہو' نائلہ خالہ فٹ سے تیار پھر مریم کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔

"خالہ! آپ نے ڈرائیونگ کیوں نہیں سیکھی۔" فضہ نے پوچھا۔

"ڈرائیونگ سیکھنے کا مطلب ہے گھر کے مردوں کو ہر قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دینا' تو وہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو صرف مردوں کے ذمے ہوتے ہیں۔"

"مگر مزا بھی آتا ہے۔ جب دل چاہا گاڑی لے کر اپنے کام نمٹا آئے۔ یہ نہیں کہ انتظار میں بیٹھے رہو' کب کوئی فارغ ہو اور لے کر جائے۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" نائلہ خالہ نے تائید کی۔ "مگر آج ٹیکسی نہیں لینی اسی لئے کسی ڈرائیور کو پکڑو۔"

"ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے میں بھی ذرا......"

زریاب کو دیکھ کر اس نے ایک دم منہ بند کیا تھا۔ وہ مسکراہٹ دباتا نائلہ خالہ کی طرف مڑا۔

"جی مما!"

"بیٹا! آج ذرا مارکیٹ تک لے جاؤ۔"

وہ بھی فارغ تھا' مان گیا۔

"کب تک فارغ ہوں گے آپ لوگ۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں...... تین لڑکیاں اور ایک تمہاری ماں...... وقت تو لگے گا ہی۔" نائلہ خالہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے' فارغ ہو کر مجھے موبائل پر رنگ کر لیجئے گا۔ میں تب تک ایک دو کام سمیٹ لوں گا۔"

"آنٹی! میرا نہیں خیال تھا کہ زریاب بھائی اتنے کیئرنگ ہوں گے۔ جنید بھائی کی طرح یہ بھی تو کہہ سکتے تھے ٹیکسی لے کر آ جانا۔"

زریاب کے جانے کے بعد شابی نے حیران ہو کر کہا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔

"اتنے دنوں سے وہ یہاں ہے۔ ہم لوگ اسے اتنا بھی نہ جان سکے۔"

"جاننے کے لئے وہ رومیہ کافی نہیں ہے۔" مریم بڑبڑائی مگر نائلہ کی سماعتیں خاصی تیز تھیں۔

"رومیہ کا کیا ذکر۔"

"نہیں' میں تو پوچھ رہی تھی آپ گئی تھیں اس کے گھر۔" اس نے گڑبڑا کر بات سنبھالی۔

"ہاں گئی تھی۔"

"آپ کو رومیہ کیسی لگی؟" فضہ نے بے اختیار پوچھا۔

"اچھی ہے۔" انہوں نے مختصراً کہا اور ایک دکان میں گھس گئیں۔ تینوں کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ شاپنگ کے بعد جب زریاب لینے آیا تو نائلہ آنٹی نے چائنیز کی فرمائش کر دی۔ واپسی پر آئسکریم پیک کروا کر ہی گھر لوٹے تھے۔

* * *

17 اکتوبر 2002ء

"میں اپنے گھر میں ہوں۔"

یہ جملہ میں نے کتنی بار زیر لب دہرایا ہے مگر اندر کوئی ایسا احساس ابھرتا ہی نہیں کہ یہ گھر میرا ہے۔ یوں لگتا ہے اجنبی سرزمین ہے اجنبی لوگ...... کوئی میرا اپنا نہیں۔ پھپھو مجھ سے کس جنم کا بدلہ لے رہی ہیں' میں نہیں جانتی۔ ساس اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے گھر سے ہر چیز غائب ہوتی جا رہی ہے۔ گھی' مکھن' الماری میں بند ہیں اور اس پر لگا تالا میرا منہ چڑا رہا ہے۔ گھر میں ڈھنگ کا سالن نہیں بنتا۔ اگر بنے تو میرے لئے نہیں بچتا۔ کون یقین کرے گا کہ میں نے اس موسم کے کسی پھل کا ذائقہ تک نہ چکھا تھا۔ تین دن ہو گئے ہیں مجھے اس کمرے میں تڑپتے روتے ہوئے...... بخار میں کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ روٹی کے چند نوالے بمشکل حلق سے اترتے ہیں...... ابھی ابھی رفعت آئی تھی۔

"مر جائیں گی اس طرح آپ! کوئی ظلم کرے تو کیا ظلم سہتے چلے جاتے ہیں...... اپنا نہیں تو اپنے بچے کا ہی خیال کریں...... اس گاؤں میں ہر دوسری تیسری عورت کو ایسے ہی حالات کا سامنا ہے لیکن آپ کی طرح مرنے کو تیار نہیں ہو جاتی ہیں۔ دودھ بلوتی ہیں تو مکھن کی ڈلی اپنے منہ میں ڈال لیتی ہیں۔ ادھر ساس باتھ روم میں گھسی ادھر دودھ کا گلاس اپنے پیٹ میں...... محلے کے بچے کو دو روپے رشوت تھمائے اپنے لیے سیب منگوا لیا۔ پتا چل گیا تو کوئی بات نہیں ساس کے ساتھ ایک معرکہ' چار دن سکون...... پھر وہی سب شروع...... مگر آپ...... آپ کی سمجھ میں نہ کبھی میری بات آئی ہے' نہ آئے گی......"

"اپنے ہی گھر میں چوری کروں۔"

"جب گھر والے غاصب بن جائیں تو چوری بھی جائز ہو جاتی ہے۔" اس کے اپنے ہی فلسفے تھے۔

"اتنا ڈر کر رہیں گی تو آملیٹ بنا کر کھا جائیں گی آپ کو۔"

انہوں نے دلیہ بنا کر دیا تھا مگر میں کیا کروں' میری ہمت ہی نہیں پڑتی کہ......

قلم' ڈائری چھوڑ کر وہ وہیں ٹھنڈے فرش پر چت لیٹ گئی۔ کمر کے نچلے حصے میں درد کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے لبوں سے ہلکی ہلکی کراہیں نکلنے لگیں۔ بخار سے سارا بدن یوں بھی ٹوٹ رہا تھا۔

"توبہ ہے' کتنے نخرے ہو جاتے ہیں بخار میں اس لڑکی کے...... مگر دیکھو' یہ سوپ تو تمہیں ختم کرنا ہی پڑے گا۔" کتنے نخرے اٹھاتی تھیں ممی اس کے۔

"لاؤ تھوڑا سر دبا دوں ...... بخار میں تو جسم یوں بھی ٹوٹنے لگتا ہے۔"

"اچھا شام میں تمہارے لئے کیا بناؤں ...... کھچڑی ...... دلیہ ...... یخنی یا ......"

گرم سیال آنکھوں کے کناروں سے نکل کر کنپٹی پر بہنے لگا۔ اس نے دونوں بازو آنکھوں پر رکھ لئے مگر آنسو بہتے رہے وہ روتی رہی پھر کروٹ بدل لی۔ بہت دیر کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ روشنی کی لکیر اندر آئی اس نے بازو ہٹا کر دیکھا۔ زبیر کو دیکھ کر بمشکل اٹھ سکی تھی۔

"آپ ...... آپ کب آئے؟"

"کافی دیر ہو گئی۔" ان کا لہجہ سپاٹ سا تھا۔

"اچھا ...... مجھے پتا ہی نہیں چلا ......"

"تم اپنی ذات سے باہر نکل کر دیکھو تو تمہیں کچھ پتا چلے۔"

"مطلب؟" وہ کھٹک سی گئی۔

"بچی تو نہیں ہو کہ ہر بات کا مطلب بھی سمجھاؤں۔" وہ بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟" صاحب کا موڈ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ اس نے سوچا بات بدل دے۔

"اس گھر میں میری ماں رہتی ہے۔ میرے کھانے پینے اور آرام کا خیال رکھنے والی۔ اگرچہ خود اس کے اپنے آرام کے دن ہیں۔" وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئے۔

بس بیٹھ گئے ماں کے پاس دو گھڑی اور بولنے لگی اسی کی زبان۔ حال سے بے حال بیوی تو نظر ہی نہیں آتی۔

"یہ حلیہ کیا بنایا ہے تم نے' فقیروں کی طرح زمین پر پڑی ہو۔ کوئی آ جائے دیکھ لے تو کیا سوچے' کیا سلوک کرتے ہیں ہم تمہارے ساتھ۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں دکھ کیا ہے' تکلیف کیا ہے تمہیں یہاں۔"

(ہائے یہ بے عقل مرد ...... ساری عقل تو عورت کی ذرا سی سیاست پر دھری کی دھری رہ جاتی ہے جو کہہ دیا' اسی پر اعتبار کیا۔ وہی زبان بولنے لگے۔)

"میں بتاؤں' مجھے یہاں کیا دکھ ہے' کیا تکلیف ہے' اعتبار کریں گے میرے کہے کا۔" وہ بڑے ضبط سے گویا ہوئی۔

"کیا تکلیف ہے۔" زبیر نے کروٹ بدلی اور کہنی کے بل اونچا ہوئے۔ وہ ذرا کھسک کر قریب ہوئی ایک ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔

"پھپھو! مجھے یہاں بیٹی بنا کر لائی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ مجھے اس گھر میں کوئی ایک مقام بھی نہیں دے سکیں۔ نہ بیٹی کا' نہ بھتیجی کا اور نہ بہو کا ......"

وہ رہ نہ سکی۔ مدھم لہجے میں بتاتی چلی گئی۔ آنسو تواتر سے بہتے رہے۔ وہ لب بھینچے سنتے رہے۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھے۔

"بس کرو رباب! حد ہوتی ہے مبالغہ آرائی کی۔ اتنی سفاکی سے جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہی سوچ لیتیں کہ وہ صرف تمہاری ساس ہی نہیں' پھپھی بھی ہیں۔"

وہ ایک پل کو ششدر رہ گئی پھر پھٹ پڑی۔

"میں نے نہ تو جھوٹ بولا ہے اور نہ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے زبیر صاحب! کہ اس گھر میں میرے ساتھ یہ سلوک ہوتا رہا ہے کرنے والی کوئی اور نہیں میری پھپھو ہی تھیں۔"

"شٹ اپ' اپنی حد میں رہو۔"

"میں تو حد میں ہی تھی' مجھے حد سے باہر کس نے کیا ہے۔ ایک سال بیت گیا مجھے یہ سب سہتے ہوئے' کبھی کوئی شکوہ' کوئی شکایت کی آپ سے۔ سب کچھ سہتی رہی صرف آپ کے لیے اور ...... اور آج آپ ہی مجھ سے حساب مانگنے چلے ہیں۔"

"تو کیا کروں' جا کر ماں کے سامنے کھڑا ہو جاؤں بتایا تھا میں نے تمہیں کہ بہت مشکلوں اور تکلیفوں سے گزر کر ......"

"تو ...... ان کی تکلیفوں میں زندگی گزری ہے تو کیا مجھے بھی اسی طرح گزارنی ہوگی۔ ان پر ظلم ہوا ہے تو کیا میرے لئے فرض ہو گیا ہے میں بھی ہر ظلم سہوں۔ کہاں کا انصاف ہے یہ ایک ایک عورت کو گھر کا سکھ نہیں ملا تو دوسری کو بھی نہ ملے۔ میں یہاں بیاہ کر آئی تھی زبیر صاحب! بھاگ کر نہیں۔ میرا نہیں تو اپنے ہونے والے بچے کا ہی خیال کر لیں یا میرے ساتھ اسے بھی مارنا چاہتے ہیں آپ لوگ ......"

"بس ......"

اس گھر کے در و دیوار نے آج پہلی بار اتنی اونچی آوازیں سنی تھیں۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو چپ زبیر بھی نہ ہوئے تھے اور دونوں کو چپ کروانے والا کوئی بھی نہ تھا بات تو بڑھنی تھی۔

* * *

"مجھے لاہور چھوڑ آئیں۔"

صوفے پر بیٹھی وہ حتمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ کل شام کے جھگڑے کے بعد یہ پہلی بات تھی جو اس نے آج صبح کی تھی۔ زبیر نے ہیئر برش رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ بے خواب سرخ آنکھیں رت جگے کی غماز تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے بے حد نمایاں' زرد' بے رونق چہرہ' وہ نظریں چرا گئے۔

''کیوں؟''

''اب بھی یہ سوال باقی ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ تھا۔

''رباب تم......''

''پلیز زبیر! میں اس وقت کچھ اور نہیں سننا چاہتی کہ آپ مجھے لاہور لے جا رہے ہیں۔''

''بہت بولنا آ گیا ہے تمہیں۔'' اس کے انداز زبیر کو حیران کر رہے تھے۔

''جانور کو بھی تکلیف پہنچے تو وہ چیختا ہے۔ میرا بولنا کچھ ایسا بے جواز بھی نہیں۔ بہت چپ رہی ہوں میں۔''

''دیکھو رباب! اگر تم اس طرح جاؤ گی تو معاملات بگڑ بھی سکتے ہیں۔''

وہ اٹھ کر ان کے سامنے آ گئی۔

''میں ناراض ہو کر نہیں جا رہی ہوں۔ مگر میں یہ چند مہینے سکون کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ پڑھے لکھے ہیں آپ۔ اتنا تو سمجھتے ہوں گے کہ یہ حالات اور پریشانیاں آپ کے بچے پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ مجھ میں اب طاقت نہیں رہی' چھ ماہ ہو گئے ایک بار بھی میرا چیک اپ نہیں ہوا۔ کیا آپ کو واقعی میری حالت نظر نہیں آتی۔ میں یہاں کسی دائی کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتی ہوں۔''

''کیا' یہاں کی عورتیں بچے پیدا نہیں کرتیں۔'' وہ جھنجلا گیا۔

''وہی بات ہو گئی' ایک بادشاہ شکار کھیلنے گیا' سڑک کے کنارے جمگھٹا دیکھا۔ پتا چلا ایک عورت کے بچہ پیدا ہوا ہے۔ ذرا سی دیر میں عورت نے بچہ کندھے سے لگایا اور قافلے کے ساتھ یہ جا وہ جا۔ دیہاتی عورت تھی' وہ واپس جا کر رانی پر خفا ہوا۔ ہر وقت کھانا پینا...... چونچلے...... یہ...... وہ...... رانی عقل مند تھی۔ مالی سے کہا۔ باغ کو پانی مت دینا...... تھوڑے دنوں میں سارا باغ مرجھا گیا...... بس یہی فرق ہے ایک جنگلی پھول جو موسموں کی شدت سہنے کا عادی ہو جاتا ہے ایک باغ میں کھلا پھول جس کی دھوپ چھاؤں کا خود خیال رکھنا پڑتا ہے' اگر......''

''مجھے کہانیاں مت سناؤ۔'' بے خیالی میں سنتے سنتے وہ ناگواری سے گویا ہوئے۔ وہ افسردگی سے مسکرا دی۔

''بادشاہ کی سمجھ میں تو یہ بات آ گئی تھی' آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اپنے آنگن میں لگی بیل کی دیکھ بھال کرنا چھوڑ دیجئے' پھر دیکھیے کتنے پھول دیتی ہے وہ۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''مجھے لاہور چھوڑ آئیں۔''

وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔

''ٹھیک ہے۔''

زبیر باہر نکل گئے تو وہ تیزی سے بڑے بیگ میں ضرورت کی چیزیں ٹھونسنے لگی۔ وجود میں زندگی سی دوڑ گئی تھی۔ اپنوں سے ملنے کا خیال سرخوشی بن کر خون میں گردش کرنے لگا تھا۔ آناً فاناً تیاری ہو گئی۔

زبیر نے پھپھو سے نہ جانے کیا کہا تھا۔ جب وہ ان کے سامنے دعا لینے کو جھکی تو انہوں نے منہ پھیر لیا۔

* * *

شابی کی لمبی چیخ نے بادلوں بھری شام کی چپ میں دراڑیں ڈال دیں۔ کوئی کہیں سے برآمد ہوا کوئی کہیں سے۔

''رباب آ گئی...... رباب آ گئی۔'' کی آوازوں سے ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کو خبر ہو گئی۔ آناً فاناً سب ہی اکٹھے ہو گئے۔ کوئی ادھر سے لپٹ گئی۔ کوئی ادھر سے' لڑکے زبیر سے ملنے لگے۔ سائرہ نے ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو الگ کیا۔ وہ اسے اپنے جلو میں لئے اندر آ گئیں۔ نجمہ سامنے سے آ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹکیں وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

''رباب! میری بیٹی!'' وہ بار بار اسے پیار کر رہی تھیں پھر اسے خود سے الگ کر کے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

''تمہارا جسم تپ رہا ہے' تمہیں بخار ہے رباب!'' یہ ماں تھیں' بنا کہے دکھ درد سمجھ جانے والی۔

''تمہیں ضرورت کیا تھی یوں بخار کی حالت میں نکلنے کی۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر زبیر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں نے تو منع کیا تھا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"میرا دل بہت اداس تھا امی!" وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اتنے طویل سفر نے یوں بھی اس کی حالت خستہ کر دی تھی۔

"پھر بھی جانو! اس حالت میں' میں چند دنوں تک تمہیں لینے آنے والی تھی۔"

وہ اس کا حال دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔ پیلی رنگت' دھنسی ہوئی آنکھیں' کمزور چہرہ یہ وہ رباب تو نہ تھی ان کا دل ہول رہا تھا۔

"اسے کمرے میں لے جاؤ' میں سیب کا جوس نکال کر لاتی ہوں۔" سائرہ نے فوراً اپنی جاب سنبھالی۔

"زبیر بیٹا! آپ بھی فریش ہو جاؤ۔" وہ جنید کو اشارا کر کے کچن میں گھس گئیں۔

شام تک گویا گھر میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی تھی۔ زبیر کو خاطر خواہ توجہ نہیں ملی تھی مگر رباب کی حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا تھا۔ بخار مزید تیز ہو گیا تو سائرہ اور نجمہ اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے ڈرپ لگا دی۔

غذا کی کمی' خون کی کمی' ٹینشن' ماں اور بچہ دونوں بے حد کمزور' نجمہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شام کو اسے لے کر گھر آئیں تو سائرہ نے زبیر کو گھیر لیا۔ ڈاکٹر کے مشورے اس کے خدشے۔

"کچھ کھاتی پیتی ہی نہیں۔" وہ جز بز ہوتا رہا۔

انہوں نے عظیم کو بھجوا کر بادام اور ڈھیروں ڈھیر پھل منگوایا۔ کام کرنے والی کو پیسے تھمائے' اپنے گاؤں سے خالص دیسی گھی لے کر آئے۔ دودھ' یخنی' پھل' جوس' سوپ دنیا جہاں کی نعمتیں اس کے سرہانے ڈھیر ہو گئیں۔ پیار کرنے والے' خیال کرنے والے' ڈانٹ کر اصرار سے کھلانے والے اور ہاتھ پاؤں دبانے والے بھی بہت۔ وہ مسلسل غنودگی میں تھی۔ اسی غنودگی میں بھی کبھی بڑبڑانے لگتی۔

"لسی میں مرچ ڈالی' پھر روٹی کھائی۔"

پھپھو نے کہا۔ "تمہارے باپ کا گھر۔"

نجمہ منہ چھپا کر رونے لگتیں۔ سائرہ' زبیر کو گھورتیں۔ لڑکیاں الگ سنجیدہ رنجیدہ چہرہ بنائے کھڑی تھیں۔

زبیر اتنا شرمندہ ہوئے کہ شام ہی کو واپس چلے گئے۔ نائلہ خالہ زریاب کے ساتھ اپنی سسرال حیدر آباد گئی ہوئی تھیں۔

* * *

"ہیلو شاداب!"

کاریڈور کی سیڑھیوں پر نہ جانے کس سوچ میں گم شاداب چونکی پھر اپنے سامنے رومیہ کو دیکھ کر کچھ بیزار سی ہو گئی۔

"ہیلو۔"

"یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

"یونہی موسم انجوائے کر رہی تھی۔"

رومیہ نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ چلچلاتی دھوپ' ہوا بند اور حبس' وہ بس کندھے اچکا کر رہ گئی۔

"زریاب گھر پر ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں گئے ہیں۔"

"حیدر آباد۔" پھر بظاہر سادہ سے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "تمہیں بتا کر نہیں گئے؟"

"ہاں۔ شاید ذکر تو کیا تھا۔" رومیہ کا لہجہ اس سے زیادہ سرسری تھا۔

"بیٹھو گی نہیں۔"

"نہیں چلتی ہوں۔ اسپتال سے آ رہی تھی۔ سوچا تھا زریاب واپس آ گئے ہوں تو لنچ ان ہی کے ساتھ کر لوں۔ جب سے ہاؤس جاب شروع ہوا ہے انہیں شکوہ ہی رہتا ہے کہ میں انہیں ٹائم نہیں دیتی۔" وہ دھیمے سے ہنسی پھر اس کے سامنے ہاتھ کی پشت کی۔

"کیسی ہے؟" انگلی میں بیش قیمت ڈائمنڈ رنگ جگمگا رہی تھی۔

"اچھی ہے۔"

"زریاب نے لے کر دی ہے۔" اس کے لبوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ آ ٹھہری۔

شاداب سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"یقین نہیں آیا۔ حالانکہ اس دن سب کے سامنے تو اس نے مجھے میری پسند کا گفٹ دلانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں......" وہ چپ سی ہو گئی تھی۔

"زریاب کی چوائس بہت اچھی ہے۔" اس نے ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا پھر نظر اٹھا کر شاداب کو دیکھا۔ "معمولی چیزیں پسند نہیں کرتا۔"

شاداب گم صم سی بیٹھی تھی۔

"ایک بات پوچھوں' زریاب تمہیں کیسا لگتا ہے؟"

"جیسا ہے' ویسا ہی لگتا ہے۔"

"پھر بھی ...... کزن ہے تمہارا' تمہارے گھر میں رہتا ہے۔ باتیں بھی ہوتی ہوں گی اور تفریح بھی۔" وہ نہ جانے کیا اگلوانا چاہ رہی تھی۔ شاداب کی آنکھوں میں غصہ سا اُمڈ آیا۔

"اچھا بابا! مائنڈ کیوں کرتی ہو' یونہی پوچھ لیا ہے۔ تمہارے دل میں نہیں تو تمہاری ممی کے دل میں تو خیال آیا ہی ہوگا۔"

"رومیہ!" شابی کا لہجہ سنجیدہ سا ہوگیا۔ "ہم قسمت پر یقین کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہ کوئی اور نہیں چھین سکتا۔ اس لئے ہمیں دوسروں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

رومیہ کا چہرہ ایک پل کو سرخ ہوا لیکن دوسرے پل وہ سنبھل گئی۔

"قسمت دھوکا بھی دے جاتی ہے۔"

"قسمت دھوکا نہیں دیتی۔ انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

"زریاب بھائی آئے تو میں بتا دوں گی کہ تم آئی تھیں۔"

"وہ آئے گا تو مجھے خود ہی رنگ کرے گا۔ تم فکر مت کرو۔" وہ چلی گئی مگر شاداب بری طرح ڈسٹرب ہوگئی تھی۔

* * *

"چلچلاتی ہوئی دھوپ تھی' بے حد گرمی' حبس' یہی کوئی جون یا جولائی کا مہینہ ہوگا۔ جب میں اس گھر میں داخل ہوئی۔ سارے کمروں اور کچن میں تالے پڑے تھے اور تسنیم وہیں اک گرم دیوار کے گرم سائے میں ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے ہمیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ اس کی ساس باہر جاتے ہوئے سارے کمرے بند کر جاتی تھیں کہ کہیں وہ پنکھا نہ لگالے۔ اس کے پاؤں میں چپل نہیں ہوتی تھی اگر کبھی پوچھیں تو کہتی تھی انگوٹھا درد کرتا ہے۔ گرمی کے مہینوں میں بدن کاٹنے والے اپنے جہیز کے ریشمی سوٹ ہی پہنتی تھی۔ اس کی ساس' شوہر جب دل چاہتا دھنک کر رکھ دیتے۔"

ممی کی انگلیاں رباب کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔ اس کا بخار اتر گیا تھا۔ بس کچھ کمزوری باقی تھی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر اپنے سارے دکھ کہے تھے۔ نجمہ سن کر روتی جاتی تھیں اور اس کے آنسو پونچھتی تھیں۔

"نمبردار کی بہو تھی تسنیم مگر حالت ...... ظلم اور اذیت کیا ہیں۔ یہ تپتی دیوار کے ساتھ لگ کر گرم دوپہر گزارنے والی تسنیم سے پوچھو۔"

"لسی میں مرچ گھول کر روٹی کھاتی رباب سے کیوں نہ پوچھو۔"

"ردعمل ہے یہ۔" نجمہ مضمحل سی مسکرائیں۔

"تو میں کیا کروں' چپ چاپ سہتی رہوں۔" وہ تلخ ہوگئی۔

"زبیر سے بات کی تھی تم نے؟"

"ہوں......" وہ نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی۔

"تمہارے ساتھ کیسا ہے؟"

"اچھے ہیں مگر پاس تو نہیں ہیں۔ کہیں مہینے بعد چکر لگتا ہے۔"

"بہت پریشان ہو کر گیا ہے ...... لیکن سمجھ دار بچہ ہے' کوئی نہ کوئی حل تو نکالے گا۔" وہ زیرلب بڑبڑائیں پھر پوچھنے لگیں۔

"کبھی تم نے اپنی پھپھو کے ساتھ محبت بھرے اور دوستانہ مراسم قائم کرنے کی کوشش بھی کی۔"

"کیا بات کر رہی ہیں ممی! میں نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

"فرائض ...... تم نے پوچھا ...... پھپھو! کھانا لاؤں۔ انہوں نے منہ لپیٹ کر کہہ دیا نہیں۔ تمہارا فرض پورا ہوگیا تم چلی آئیں۔ کبھی آگے بڑھ کر بہت محبت سے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی پوچھا کہ وہ اس طرح کیوں لیٹی ہیں۔ طبیعت خراب ہے اداس ہیں۔ کبھی بغیر کسی وجہ کے ان کے پاس بیٹھی ہو۔ ان سے باتیں کی ہیں' کبھی ان کا دکھ درد پوچھا ہے؟"

"ممی! وہ مجھ سے بات نہیں کرتیں۔"

"کب تک نہیں کریں گی انسان ہیں۔ اور انسان ہمیشہ محبت بھرے سہارے ڈھونڈتا ہے۔ بیٹا! شادی شدہ زندگی اور سسرالی تعلقات فرائض سے کچھ آگے کی چیز ہیں۔ بہت سا صبر' محبت' مروت' خوش اخلاقی' خود آگے بڑھ کر تھامنے کی خو' دل میں گنجائش۔ جانتی ہو۔ بہت سپنے' بہت خواب ہوتے ہیں لڑکیوں کی آنکھوں میں جب سسرال میں یہ سب نہیں ملتا تو کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی وہاں کا ماحول بدلنے کی کوشش مت کرو۔ چپ چاپ اس ماحول کو اوڑھ لو' کچھ ناگوار بھی گزرے گا۔ مگر ضمیر سے کام لو۔ پھر ایک وقت آئے گا جب تمہارے قدم مضبوطی سے اپنی زمین میں گڑ جائیں گے۔ یہ وقت ہوگا جب تم تبدیلی لاؤ گی تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ اس بات پر پریشان مت رہا کرو کہ تمہاری ساس لوگوں سے

تمہارے بارے میں کیا کیا کہتی ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو۔ کب تک کہیں گی۔ تمہارے اچھے سلوک کو دیکھ کر خود بخود تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی بلکہ تم اپنے فرائض صرف تعریف کے لئے نہیں بلکہ اللہ کی خوشنودی کے تابع کر دو۔ دیکھنا بہت سکون سے نیند آئے گی۔ باقی میں زبیر سے بھی بات کروں گی۔ سمجھاؤں گی اسے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان مت ہوا کرو۔"

انہوں نے جھک کر پیشانی پر پیار کیا۔ رباب کے شکوے شکایتیں ایک طرف پڑی رہ گئیں وہ بھی نجمہ کی بیٹی تھی۔ فوراً اپنی کوتاہیاں ڈھونڈنے لگی۔ لگا کہیں نہ کہیں غلطی اس سے بھی ہوئی ہے۔ کوئی کمی رہ گئی ہے۔ نجمہ کی باتوں نے اک نئی راہ سمجھائی تھی۔ وہ قدرے ہلکی پھلکی ہوگئی۔

"حالات اب بھی ٹھیک ہو تو سکتے ہیں۔"

ذہن پر سے بوجھ کسی قدر سرکا تو وہ شابی کو چھیڑ بیٹھی۔

"زریاب تمہیں کیسے لگے؟"

وہ سٹپٹا کر رباب کو دیکھنے لگی۔ شوخ لہجہ' شرارتی و متبسم آنکھیں۔

"اب تک انڈر اسٹینڈنگ تو ہو ہی گئی ہوگی؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

وہ بہانے سے اٹھی اور فضہ اور مریم پر برس پڑی۔ وہ قسمیں کھاتی رہی گئیں کہ انہوں نے رباب سے ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

"تو وہ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہی تھیں؟" اسے اعتبار نہیں آیا تھا۔

"ذرا سی بات نہیں چھپا سکیں اور میں احمق' بے وقوف ہر بار کوئی نہ کوئی بات شیئر کرنے آ جاتی ہوں۔"

وہ تن فن کرتی چلی گئی تو دونوں کو یہ تشویش لاحق ہوگئی کہ وہ اب کون سی بات شیئر کرنے آئی تھی۔

* * *

زریاب سے مل کر رباب بہت خوش ہوئی تھی۔ شکل و صورت' قد کاٹھ' عادت' مزاج اسے کہیں کوئی کمی نظر نہیں آئی تھی۔ تب ہی ممی سے پوچھ بیٹھی۔

"آنٹی زریاب کی شادی کرنے آئی ہیں۔"

"پتا نہیں۔" انہوں نے اختصار سے کام لیا۔ نائلہ خالہ نہا رہی تھیں۔ سائرہ کریلے چھیل

رہی تھیں۔

"آپ سے کوئی بات نہیں کی؟"

"نہیں......" وہ اس موضوع سے اجتناب برت رہی تھیں۔ مگر وہ بڑی بیٹی ہونے کے ناتے عام طور پر گھر کے ہر معاملے میں شریک رہی تھی۔

"پھر بھی' ہمیں تو اپنی تیاری پوری رکھنی چاہئے کچھ بنانا شروع کیا آپ نے شابی کیلئے؟"

"وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا......" انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"وقت کب آئے گا ممی! شابی ایم اے کر چکی ہے۔ چند دنوں میں رزلٹ بھی آ جائے گا۔ اب اور کتنا انتظار کرنا ہے۔"

نجمہ نے مدد طلب نگاہوں سے سائرہ کی طرف دیکھا۔ جواب تک خاموشی سے کریلوں ہی کے ساتھ مصروف تھیں۔ چھری رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"وہ تو بچپن کی بات تھی اب کون جانے کیا ارادہ ہے۔"

"کیسی بات کر رہی ہیں آنٹی آپ۔" وہ اچھل ہی پڑی۔ "چھ سالہ شابی کی کلائی میں کنگن ڈال کر پورے خاندان میں اعلان کیا تھا انہوں نے کہ شابی میری بہو ہے کوئی سرسری بات نہیں تھی۔ باقاعدہ منگنی کی تھی انہوں نے۔ اب کیسے مکر سکتی ہیں۔ آخر ہم نے شابی کو اتنے سالوں سے زریاب کے نام پر بٹھا رکھا ہے۔"

"اے بیٹی! آیا تھا زریاب شادی کرنے ہی۔ گھر بھی بنوا رہا ہے۔ کہتے ہیں امریکہ کے حالات مسلمانوں کے لئے ٹھیک نہیں اب یہیں رہیں گے مگر وہ چمٹ گئی جان کو رومیہ' ماں باپ نے شتر بے مہار چھوڑا ہوا ہے۔ اب اس جیسی چٹک مٹک کرتی لڑکی کے آگے ہماری بچی کیا خاک نظر آئے گی۔ اوپر سے یہ تمہاری ماں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہیں۔" سائرہ بہت دنوں سے بھری ہوئی تھیں۔

"اب کیا اپنے منہ سے کہوں؟"

"یہ بھی خوب رہی۔ منگنی ہوئی تھی یوں کیسے ختم ہو سکتی ہے۔"

"نائلہ نے ابھی کوئی بات نہیں کی۔ میں خود سے چھیڑنا نہیں چاہتی۔ جب تک بات واضح نہ ہو آپ لوگ بھی خاموش رہیں۔" نجمہ نے تقریباً بات ختم ہی کر دی۔

"عجیب پریشانی ڈال دی ہے۔ شابی کو پتا ہے کہ......"

"نہیں...... میں نے اسے کبھی نہیں بتایا۔ شاید اچھا ہی ہوا......"

"اچھا کہاں ہوا ہے ممی!" باہر کھڑی شابی نے ادھ کھلے دروازے پر پیشانی ٹکاتے ہوئے سوچا۔ "بالکل بھی اچھا نہیں ہوا...... جس بات سے آپ ڈرتی تھیں وہ تو ہو گئی اب...... اب آپ کی شابی کیا کرے گی۔"

ڈائمنڈ رنگ سے پھوٹتی روشنیاں اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔

* * *

مریم کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ تایا ابو نے بھاری چیک بجھوایا تھا۔ ہر کوئی مصروف تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں وہ سب ایک دوسرے سے الگ ہو کر سوچنے لگتے اپنے اپنے مسئلے' اپنی اپنی سوچیں۔ رباب سوچتی زبیر کا فون بہت دنوں سے نہیں آیا۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی۔ اس نے کئی بار فون کر کے اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

سائرہ کے دماغ میں ہمہ وقت حساب کتاب ہوتا رہتا۔

اتنے کپڑے' اتنا زیور' کراکری۔

نجمہ زریاب کے ساتھ ساتھ شابی کو دیکھتیں تو گم سی ہو جاتیں اور شابی سوچتی۔

"کاش ہمارے درمیان رومیہ نہ آتی۔"

زریاب اور نائلہ کیا سوچتے تھے۔ یہ ان دونوں کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ انہی بیزار بیزار سے دنوں میں شابی کا رزلٹ آ گیا۔ خلاف توقع وہ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی تھی۔ عظیم' فضہ اور مریم نے تو اس کی کامیابی پر بھنگڑے ڈالے تھے وہ ہنستی رہی۔ یقین تو خود کو بھی نہ آتا تھا۔ مگر وہ زیادہ خوش نہ ہو سکی۔ فضہ نے پوچھ ہی لیا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"مجھے کیا ہونا ہے۔"

"پہلے جیسی نہیں رہی۔"

"پہلے جیسی نہیں رہی۔" وہ ہنس دی۔ "میں پہلے جیسی ہی ہوں۔ بس تم لوگوں کو شک ہو گیا ہے۔"

"تم اب زریاب بھائی کا ذکر بھی نہیں کرتیں۔"

"فائدہ ہی کوئی نہیں۔ جو اپنا نہیں' اس کے لیے دل کیا جلانا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

مریم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"بہت زیادہ دن نہیں گزرے بی بی! جب تم اس کے ساتھ محبت کی دعوے دار تھیں۔"

"پتا نہیں محبت تھی بھی یا نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے' ہر بات کا اظہار میں جلدی کر دیتی ہوں۔ وہ اچھا ہے اس لئے سب کو اچھا لگتا ہے۔ پتا نہیں ہم لڑکیاں اتنی جذباتی کیوں ہوتی ہیں۔ ذرا سی پسندیدگی کو فوراً محبت کا نام دے دیتی ہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"دیکھوں' رابی کیا کر رہی ہے۔"

"یہ واقعی پہلے جیسی نہیں رہی۔" مریم نے اس کے جانے کے بعد کہا تھا۔ وہ کاریڈور کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

محبت' کہاں ہے محبت......؟ اب تو صرف ایک ہی دکھ ہے ٹھکرائے جانے کا' کاش مجھے یہ ہی پتا نہ چلتا کہ میں کبھی اس کے ساتھ منسوب تھی۔

"یقیناً تم موسم انجوائے کر رہی ہو۔" کیمل کلر کے کاٹن کے شلوار قمیص میں وہ سامنے کھڑا تھا۔ جسے دیکھ کر اس کے دل میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ ورنہ خود کو سمجھانا مشکل ہو جائے گا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"رومیہ بتا رہی تھی۔ تم چلچلاتے موسم کو بھی اچھا خاصا انجوائے کر لیتی ہو۔"

"اسے کیا ضرورت ہے میرے بارے میں یہ فضول بکواس کرنے کی۔"

"اتنا غصہ......" ایک پاؤں سیڑھی پر ٹکا کر اس نے بے حد دلچسپی سے اس کے چہرے پر بکھرے غصے کو دیکھا۔ گلابی چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔

"اچھا...... میرے ساتھ تھوڑی دیر مارکیٹ چلو گی۔"

"نہیں۔" دوٹوک لہجے میں انکار ہوا۔

"کیوں......؟" وہ کچھ حیران ہوا تھا۔

"گھر والوں کو اچھا نہیں لگے گا۔" سادہ سے لہجے میں توجیہہ پیش کی۔

"کمال ہے جب تمہیں اچھا لگے تو......"

"آپ سے کس نے کہہ دیا مجھے اچھا لگے گا۔" وہ تنک کر بولی۔

"ڈرائیونگ تم کرنا......" زریاب اس کی بات یکسر نظر انداز کر کے بولا۔ گویا لالچ دیا' وہ الجھ گئی۔

"آج اتنی لفٹ کیوں کروا رہے ہیں۔" مشکوک نظروں سے اسے دیکھا پھر رکھائی سے بولی۔

"مجھے اب ڈرائیونگ کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"شاداب! میں صرف تمہیں تمہاری پسند کا گفٹ دلانا چاہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں بلکہ گفٹ کی ہی ضرورت نہیں۔ (اپنی رومیہ کو دلائیں) میری کامیابی کچھ اتنی بڑی بھی نہیں۔"

"چھوٹی ہو یا بڑی' کامیابی تو کامیابی ہوتی ہے۔"

"مجھے گفٹ کی ضرورت نہیں۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔

"لگتا ہے تم پر بھی شاداب کا اثر ہو گیا ہے۔ اس گرمی میں کھڑے ہو۔"

وہ پلٹا' تب احساس ہوا شابی اندر کیوں چلی گئی تھی۔ اس نے رومیہ کو دیکھ لیا تھا۔

"خاصی ال مینرڈ ہیں تمہاری کزن' ملنا بھی گوارا نہیں کیا۔"

"کیسی ہو؟" وہ اس کے تبصروں کو نظر انداز کر گیا۔

"ٹھیک ہوں' تم نے واپس آ کر فون بھی نہیں کیا۔"

"بس مصروفیت۔"

"اچھا میرے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔ لنچ کے لئے' پھر ہسپتال جانا ہے چل رہے ہو۔" اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ "ٹھیک ہے چلو۔"

"شابی سے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔" رومیہ کا لہجہ سرسری سا تھا۔

"دوستوں سے کیا باتیں ہوتی ہیں۔"

"اوہ تو دوستی ہو ہی گئی۔" اس نے ہونٹ سکوڑے۔ وہ صرف مسکرایا تھا۔

"خیال رہے' دوستی میں بہت آگے مت نکل جانا۔" وہ اس کی معنی خیز مسکراہٹ پر تڑخ کر بولی تھی۔

"مجھے اپنی حد کا اندازہ ہے۔" زریاب کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔

* * *

"موسم کو بدلنا تھا سو بدلا...... وقت کو گزرنا تھا سو گزرا۔ دن رات آگے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔ یہ تین ماہ کچھ الجھتے سلجھتے' جلتے کڑھتے امید و ناامیدی کے مابین' سوچ اور فیصلہ کے درمیان کی منزلوں کو عبور کرتے گزر گئے۔ زبیر ایک بار بھی نہیں آئے۔ سرحدوں کی صورتحال خراب تھی۔ انہیں چھٹی ہی نہیں ملی مگر فون ضرور کرتے تھے۔ نائلہ خالہ کبھی سسرال کے چکر لگاتیں تو کبھی یہیں ہوتیں۔ ان کا بنگلہ کافی حد تک تعمیر ہو گیا تھا۔ بس چھوٹا موٹا کام باقی تھا۔

زریاب کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے جاب آفر ہوئی جو اس نے قبول کر لی۔ یوں

رومیہ کے گھر کے چکر لگنے بند ہو گئے۔ شاید اب وہ دونوں باہر ہی مل لیتے تھے۔ خاندان بھر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ مریم کی شادی اگلے ماہ ٹھہری تھی اور شاداب کے لئے وقت گویا رک سا گیا تھا۔ مگر وقت رکتا کہاں ہے؟

ان ہی سرگرمیوں میں سردی کا موسم شروع ہوا۔ درختوں کے پتے جھڑنے لگے اور خزاں کی چادر پوری کائنات پر تن گئی۔

اور اسی خزاں زدہ موسم میں رباب کا دامن پھولوں سے بھر گیا۔ اک ننھا منا وجود اسے ماں کے عہدے پر فائز کر گیا۔ گھر کے سوئے جاگے لوگوں میں ہلچل سی مچل گئی۔

خاندان کا پہلا بچہ تھا۔ سب نے جی بھر کے خوشی منائی۔ زبیر کو فوراً ہی اطلاع کروا دی تھی۔

* * *

"میرا دل چاہتا ہے میں اس شام کو بہت قریب سے دیکھوں بہت پاس سے چھو کر محسوس کروں۔"

"کیسی انہونی خواہشیں ابھرتی تھیں اس کے اندر' زبیر نے ایک بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"

زرد شام در و دیوار سے لپٹی تھی۔ آنگن میں لگی بیل کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔

یہ اس کا خیال تھا مگر پھپھو ہر روز اس کو پانی بھی دیتیں اور کیاری میں بکھرے خشک پتے بھی اکٹھے کرتی تھیں۔

وہ کل ہی آئے تھے ماں نہال ہو گئیں۔ کھانا' پانی آرام کا خیال رکھا مگر زبیر نے دیکھا اور کمزور ہو گئیں تھیں۔ آرام کی عادت جو پڑ گئی تھی۔

کبھی کبھی زیر لب بڑبڑاتیں۔

"خوامخواہ میری عادت خراب کر گئی۔"

زبیر کو گھر بہت سونا سونا لگا تھا۔ وہ نہیں تھی مگر اب تنہا صحن میں لیٹتے تھے تو لگتا تھا وہ یہیں کہیں پاس ہی ہے۔ آہٹیں...... سرگوشیاں' اس کے ملبوس کی مانوس خوشبو' اس کے ہاتھوں کا لمس' کبھی اس کمرے سے جھانکتی' شرارت سے مسکراتی اور اس کی مسکراہٹ' مدہم خوبصورت

"تین ماہ ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔" وہ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھے۔

سرسراہٹیں' سرگوشیاں' اس کے قدموں کی چاپ' سب خاموشی اوڑھ کر سو گئے۔ وہ کمرے کے سامنے آ گئے۔ دروازے پر ہاتھ رکھا تو اندر چوڑیاں چھنک اٹھیں جیسے وہ ڈریسنگ

ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہو۔

دروازہ کھلا تو چوڑیوں کی چھنک الماری کے نہ جانے کون سے کونے میں جا چھپی وہ مسکرا دیے۔

شاید اپنے الوژن پر، بیڈ پر بیٹھ کر سوچ لیا تھا کہ واپسی پر لاہور کا چکر لگانا ہے۔

پھر گردن گھما کر الماری میں ترتیب سے رکھی کتابوں کا جائزہ لینے لگے اور اسی جائزے میں نگاہوں کی گرفت میں وہ سرخ جلد والی ڈائری بھی آ گئی۔ انہوں نے ڈائری نکال لی۔ روزانہ تو نہیں مگر ڈائری لکھی ہوئی تھی۔

رباب ڈائری بھی لکھتی تھی۔

شاید جلدی میں وہ لے جانا بھول گئی تھی۔ انہوں نے صفحے پلٹے اور یونہی وقت گزاری کے لئے پڑھتے چلے گئے۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا جب چچی فاطمہ کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی۔

''بہن تسنیم...... مبارکاں...... مبارکاں...... خیر سے تمہارے ہاں پوترا (پوتا) ہوا ہے۔''

* * *

ڈھیر سارے کپڑے کھلونے اور رباب کے لیے لاکٹ سیٹ لے کر وہ اور پھپھو پہنچے تھے۔ پھپھو خود بے حد خوش تھیں۔ رباب کو پیار کیا۔ بچے کو بہت دیر تک گود میں لئے بیٹھی رہیں۔ سائرہ حسب معمول کچن میں جا گھسیں۔ اہتمام جو کرنا تھا۔ لڑکیاں چیزیں دیکھنے لگیں۔

''ہر چیز بہت خوبصورت اور قیمتی ہے۔ لگتا ہے اس بار پھپھو نے نہیں خریدیں۔'' شابی نے سرگوشی کی تھی۔

''جی! اس بار چوائس میری ہے۔'' عقب سے زبیر نے کہا وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

''کیا ضرورت تھی اتنا اونچا تبصرہ کرنے کی۔'' مریم لتاڑ رہی تھی۔

زبیر رباب سے اکیلے میں ملنا چاہتے تھے۔ موقع شام کو ملا۔ کمرے میں آئے تو وہ اکیلی تھی۔ ننھا شہزادہ سو رہا تھا۔ زبیر نے اسے گود میں لے لیا۔

وہ بازو آنکھوں پر رکھے چپ چاپ لیٹی تھی۔ مگر محسوس کر سکتی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے بیٹے کو پیار کر رہے تھے بلکہ کن اکھیوں سے اس کی جانب بھی دیکھ رہے تھے۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو اس نے پکار لیا۔

''رباب......''

''ہوں......''

''خفا ہو......''

''نہیں تو......''

زبیر نے بازو اس کی آنکھوں سے ہٹایا۔

''میرے ساتھ چلو گی۔''

''جانا تو پڑے گا......''

''اتنی ہمت تو آ ہی گئی ہو گی کہ میری ماں کے مزید ستم سہہ سکو۔'' شاید طنز کیا تھا۔ ''خوب شکایتیں لگائی ہیں گھر والوں سے میری۔ کئی گھنٹوں سے گھیر کر بیٹھی ہیں جیسے میں کوئی مجرم ہوں۔''

''دکھ اپنوں سے ہی کہے جاتے ہیں۔'' وہ تکیے کے سہارے ذرا سا اٹھی اور بچہ لینے کو ہاتھ پھیلا دیئے۔

''میں بھی تو تمہارا اپنا ہوں۔'' انہوں نے بچہ گود میں دے دیا۔ اک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

''اپنے مداوا بھی کرتے ہیں۔'' ننھا سا بیٹا گود میں تھا۔ وہ خود کو خاصا مضبوط تصور کر رہی تھی۔

''وہی تو کرنے آیا ہوں۔''

''مطلب......؟'' تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''مطلب اب اتنا رو دھو کر آئی تھیں تو کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''ڈرامہ نہیں کر رہی تھی۔'' وہ چڑ گئی۔

''کیا پتا......'' کیا بے نیازی تھی۔ ''ڈرامہ کر رہا ہے۔''

''آپ......''

''آپ......''

اس نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بچے کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''نام کیا رکھو گی اس کا۔''

''پتا نہیں۔'' وہ الجھ سی گئی تھی۔

''اسامہ کیسا ہے؟''

''اچھا ہے...... مگر ابھی کیا کہہ رہے تھے۔''

''کس بارے میں؟'' وہ کروٹ کے بل لیٹے بچے کے پاؤں چھو رہے تھے۔ بے حد مگن،

جیسے کوئی بات ہی نہیں کی۔

"آپ کے ساتھ جانے کے بارے میں۔"

زبیر نے سر اٹھا کر اس کے جھجکتے چہرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"زمین میں نے ٹھیکے پر دے دی ہے۔ چچا سلیم گھر کی دیکھ بھال کر لیں گے۔ آپ دونوں میرے ساتھ جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تو کچھ مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔ کچھ تم اپنی ذہانت اور محبت سے حل کر لینا اور کچھ......" وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"کچھ برداشت بھی کیئے جا سکتے ہیں۔" رباب آہستگی سے گویا ہوئی۔

"ہاں......" زبیر ہنس دیئے۔

"لیکن پھپھو کیسے مان گئیں۔"

"وہ میری ماں ہیں رباب...... اور ماں اپنے بچوں کی بات کبھی نہیں ٹال سکتی۔ اور یہ صاحب سوئے ہی رہیں گے یا جاگیں گے بھی۔" انہوں نے جھک کر بیٹے کو پیار کیا۔

"لگتا ہے باپ پر گیا ہے' ذرا دیر سے ہی جاگے گا۔" رباب نے سادگی سے کہتے ہوئے بچے کو اس کے پاس لٹایا تھا۔

"ہاں......" وہ پہلے بچے پر جھکے پھر ایک دم سیدھے ہوئے۔ "کیا کہا تم نے......"

"کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

* * *

دونوں ماں بیٹا شاپنگ کے لیے نکلے تھے۔ نائلہ خالہ نے آج لڑکیوں کو لفٹ بھی نہیں کروائی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خفا ہوئیں پھر سوچا شاید کچھ ذاتی چیزیں خریدنی ہوں۔ بہر حال دونوں واپس آئے تو خاصے لدے پھندے تھے اور بہت خوش بھی۔

"اب بولو بیٹا! ماں کی رہنمائی کام آئی۔"

"مت بھولیں فیصلہ میرا اپنا ہے۔" زریاب نے گاڑی لاک کرتے ہوئے ماں کو دیکھا جو آج بہت خوش تھیں۔ دونوں اندر آئے تو سب لاؤنج میں ہی موجود تھے۔

پھپھو نے بھی ابھی آ کر پانی کا گلاس ہی پیا تھا۔ وہ پورے خاندان کے دورے پر صبح سے ہی نکلی تھیں۔ وہیں کچھ سن گن ملی تھی۔ آتے ہی نجمہ سے بولیں۔

"شاداب کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔"

نجمہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ شاداب اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ زبیر' عظیم' جنید سب وہیں

تو موجود تھے کچھ حیران ہو کر دیکھنے لگے۔

"آپا! آپ پانی پیجئے۔" سائرہ نے ان کے ہاتھ میں پانی کا دوسرا گلاس تھمایا۔

"شاداب کی منگنی تو ابھی ہوئی نہیں اور آپ تڑوانے پر تیار ہو گئیں پھپھو۔" جنید نے ہنس کر کہا تھا۔

"شاداب کی منگنی بچپن میں زریاب سے ہو گئی تھی اتنی بھی خبر نہیں۔"

"کیا......" سب ہی لاعلم لوگ چیخ اٹھے تھے اور سب کی نظریں نجمہ پر جمی تھیں۔

وہ گڑبڑا سی گئی تھیں۔ تب ہی گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ انہوں نے مدد طلب نگاہوں سے سائرہ کو دیکھا۔ مگر انہوں نے سوچا۔

"آر یا پار' آج فیصلہ ہو ہی جائے۔"

شابی نے سوچا اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ تب ہی دونوں ماں بیٹا ہنستے مسکراتے اندر آئے۔

"توبہ تھکا ڈالا زریاب نے' کوئی چیز اسے پسند نہیں آتی۔" نائلہ خالہ صوفے پر گر سی گئیں۔

"کیوں بیٹے کی بری خریدنے چلی گئی تھیں۔" پھپھو نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں۔" وہ ہنسیں۔ زریاب ان کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھے مسکرا رہا تھا۔

"انسان کی زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ بی بی" پھپھو تڑخ کر بولیں۔ "ہماری لڑکی میں برائی کیا تھی؟"

"خدانخواستہ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

شابی تیر کی طرح اٹھی' وہ فوراً یہاں سے جانا چاہتی تھی مگر نائلہ خالہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ لفافے سے ایک ڈبہ نکال کر کھولا۔

"کیسا ہے؟" ڈائمنڈ سیٹ جگمگا رہا تھا۔

"نائلہ! پہلے مجھ سے بات کرو۔" پھپھو کو تاؤ آیا۔ "میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے یہ' کوئی زیادتی ہو گی تو میں برداشت نہیں کروں گی۔"

رباب نے تحیر سے انہیں دیکھا۔ یہ اس کی ساس کے کلمات تھے۔

"تم نے خود دامن پھیلا کر شابی کا رشتہ مانگا تھا۔ اب کیسے توڑ سکتی ہو اور یہ رومیہ کا کیا قصہ ہے؟"

"ارے آپ سے یہ سب کس نے کہہ دیا۔" کیا سادگی تھی۔

"سارا خاندان کہہ رہا ہے۔ خود رومیہ کہہ رہی ہے زریاب نے اسے پرپوز کیا ہے۔"
سائرہ نے آہستگی سے بتایا۔ اڑتی پڑتی ان تک بھی پہنچی تھی۔

"دیکھا تم نے ......" انہوں نے پلٹ کر زریاب کو گھورا۔ "میں نے کہا تھا یہ پاکستان ہے یہاں ایسی دوستیوں کو عجیب رنگ دیا جاسکتا ہے اور آپ لوگ ......" وہ سب کی طرف پلٹیں۔ "اگر کسی کی یادداشت کمزور ہے تو میں پھر سے یہ انگوٹھی شابی کی انگلی میں پہنا کر اعلان کرتی ہوں کہ شابی میری بہو ہے۔"

انہوں نے سیٹ میں سے انگوٹھی نکال کر شابی کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور ان کے کان میں منمنائی۔

"یہ انگوٹھی بھی اسے پہنا دیں جسے پہلے ڈائمنڈ رنگ دی تھی۔"

"کسے دی تھی۔"

"رومیہ کو اس نے مجھے خود بتایا تھا۔"

(ہائے دل جل کر راکھ ہوگیا تھا اس وقت)

نائلہ خالہ نے پلٹ کر بیٹے کو دیکھا۔

"بائے گاڈ...... میں نے اسے صرف ایک پرفیوم گفٹ کیا تھا نہ جانے اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا۔"

اس نے فوراً وضاحت کی۔ رومیہ کی ان ہی حرکتوں نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا تھا۔ نائلہ خالہ نے اب کے ذرا بھی توقف کیے بغیر انگوٹھی' شابی کی انگلی میں ڈال دی۔ ایک بہت ہی سنگین صورتحال سے باہر نکلنے کے خیال نے انہیں ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ زریاب' رومیہ کی طرف مائل ہوا تھا مگر خدا کا شکر تھا اس نے بروقت ایک درست فیصلہ کر لیا تھا۔

نائلہ خالہ نے جب زریاب سے پوچھا تھا۔

"تمہیں رومیہ کی کس خوبی نے متاثر کیا تھا۔"

"اس کی بولڈنیس نے۔"

"تمہیں واپس کس چیز نے پلٹنے پر مجبور کیا۔"

"مما! اعتماد اور بے باکی میں فرق ہوتا ہے۔"

وہ خوش تھیں ان کے بیٹے نے ایک اچھا فیصلہ کیا ورنہ انہیں دوسرے رشتوں سے ہاتھ دھونا پڑتے۔

* * *

اک البیلی پگڈنڈی ہے

"اُف! میں کتنی سگھڑ ہوں۔"

جہازی سائز پلیٹ میں فرنچ فرائز کے پہاڑ اور خوشبودار کافی کے بھاپ اڑاتے مگ کو خوش ہو کر دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو داد دی تھی۔

"میں واقعی بہت سگھڑ اور خوب صورت ہوں۔ کیا ہوا جو باسط اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ کرے۔ آئی ڈونٹ کیئر سب کے سب جیلس ہوتے ہیں۔" مگر کافی کی چسکی لیتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اردگرد دیکھا۔ چھوٹے سے سفید دیواروں اور سرخ ڈھلوانی چھت والے کاٹیج پر خاموشی کا راج تھا۔ چھوٹے سے سرسبز و شاداب لان میں سرخ جنگلی گلاب اور مروا کے سفید پھولوں کی بہتات تھی۔ مگر ہر چیز سناٹے کی زد میں چپ اور گم صم تھی۔ دور پہاڑوں پر گویا سونا پگھل رہا تھا۔ افق کے کنارے میں شام کے آخری لمحات پگھل رہے تھے، نگاہوں کے سامنے دور تک جاتا ڈھلوانی رستہ جنگل و خودرو پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

"یہاں اور ہے کون میرے سوا۔ نہ کوئی آتا ہے نہ جاتا۔ اوکے کوئی مت آئے۔ مگر اللہ میاں جی۔ اس ٹام کروز کو تو یہاں کا رستہ سمجھا دیں۔ نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہے۔ منگنی کروا کے موصوف بھول ہی گئے ہیں۔ نہ کبھی کوئی کارڈ بھیجا، نہ کوئی ای میل کیا۔ فون کی تو بات ہی جانے دو۔ لگتا ہے بہت بھونڈی آواز ہے اور ماما کو دیکھو ایک تصویر پر ٹرخا دیا۔ بھلا تصویر سے کیا ہوتا ہے۔ بھلے دس سال پرانی ہو۔ مجھے بھی اتنا غصہ آیا کہ پکڑ کر باسط کو تھما دی اور وہ بھی اتنا ڈھیٹ ہے مجال ہے جو واپس کر دے۔ اب اپنے منہ سے مانگتی کیا اچھی لگوں گی۔ بندہ خود ہی سوچ لے۔ مگر عقل نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں اس بانگڑو میں اور ماما پاپا انہیں میری ذرا پروا نہیں۔"

آخری جملہ ذرا جھنجلا کر کہا گیا تھا۔

"مانا کہ تمہیں لڑنے کا بہت شوق ہے' مگر یہ چلتی ہواؤں کے ساتھ لڑنا کب سے شروع کر دیا تم نے؟" آواز کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ بھی غائب ہوا تھا۔

"سنو! اس وقت مجھ سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں سخت غصے میں ہوں۔" اس نے جھنجلا کر پاؤں سمیٹے۔

"تم کب غصے میں نہیں ہوتیں۔ غصہ تو ہر وقت تمہاری اس پھینی ناک پر دھرا رہتا ہے۔"

وہ عین اس کے سامنے بیٹھ کر فرنچ فرائز پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"اپنی شکل دیکھی ہے۔ چہرے پر سوائے ناک کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔" وہ بری طرح چڑ گئی۔

"جیسا بھی ہوں، تمہارے اس جنید احتشام سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ ویسے سنا ہے موصوف خاصے سخت بندے ہیں۔" باسط لاپروائی سے بولا۔

"میری بلا سے۔" جنید احتشام کے نام نے اسے پھر تپا دیا۔

"ہیں!" باسط قدرے حیرت سے سیدھا ہوا۔ "اوہ بی بی! تمہیں خوش ہونا چاہئے۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل ویسے جیسے وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

باسط نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔

بلیک ٹراؤزر، کلر فل ٹی شرٹ پر بلیک اسکارف گلے میں ڈالے وہ ہمیشہ سے زیادہ جھنجلائی ہوئی اور بے زار دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ باسط کی بہت اچھی دوست اور کزن تھی۔

"میں فارغ رہ رہ کر اکتا گئی ہوں باسط۔" وہ گھاس اکھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

"تو اب شادی کرنا چاہتی ہو۔"

"جسٹ شٹ اپ۔" رابیل اسے گھور کر رہ گئی۔

"تو پھر؟"

"باسط! یہ جنید احتشام کچھ عجیب سا نہیں ہے۔"

"کچھ! وہ بہت عجیب و غریب انسان ہے۔ تب ہی تو تم سے منگنی کروا بیٹھا ہے۔" باسط سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس نے کبھی مجھے فون نہیں کیا۔ بندہ کوئی وش کارڈ ہی ڈال دے۔ بھلا اپنی منگیتر کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔" رابیل کا لہجہ مایوس سا تھا۔

"پتا نہیں۔" باسط نے کندھے اچکائے۔

"کیا مطلب؟" رابیل نے گھورا تو فوراً بات بدل کر بولا۔

"یار! میری کون سی منگیتر ہے؟"

"ہونے والی تو ہے نا۔" رابیل نے کہا۔ باسط کی عنقریب منگنی اپنی کسی دور کی کزن کے ساتھ ہونے والی تھی۔

"ہو جائے گی نا۔ تب بتاؤں گا۔" باسط نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"سنو باسط!" کچھ سوچ کر اس نے پکارا۔

"باسط! بہرہ نہیں ہوا۔ بالکل سن رہا ہے۔" وہ کان میں انگلی چلا کر بولا۔

"تمہارے پاس تصویر تھی نا۔" رابیل نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کس کی، تمہاری؟ تمہاری تو بہت سی تصویریں ہیں میرے پاس بچپن سے لے کر اب تک کی۔" اسے بخوبی علم تھا کہ وہ کس تصویر کی بات کر رہی تھی' مگر یونہی بن رہا تھا۔

"افوہ! میں اپنی تصویر کی بات نہیں کر رہی۔" وہ جھنجلائی۔

"تو پھر میری تصویر کی بات کر رہی ہو۔"

"نہیں نا۔"

"تو کیا امی......"

"جسٹ شٹ اپ۔ میں جنید احتشام کی اس تصویر کی بات کر رہی ہوں۔ جو میں نے تمہیں غصے میں دی تھی۔" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ وہ تصویر ہی ایسی ہے دیکھتے ہی غصہ آ جاتا ہے۔" باسط نے لاپروائی سے کہا تو وہ چڑ گئی۔

"میں نے اس تصویر پر تبصرہ کرنے کو نہیں کہا۔"

"تو پھر......؟"

"مجھے وہ تصویر واپس چاہئے۔" اب کے وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ تو باسط کے لب بے اختیار پھیلے۔

"واپس کر کے نئی منگوانی ہے۔" اس نے رازداری سے پوچھا۔

"تمہیں اس سے مطلب؟ تم واپس کرو اور بس۔"

"وہ۔" باسط نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "پتا نہیں میں نے کہاں رکھ دی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" رابیل اچھل ہی تو پڑی۔

"بھئی، اتنی پرانی بات ہے۔ کہیں رکھی تو تھی۔ اب یاد نہیں آ رہا۔"

"صرف چھ ماہ گزرے ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔

"ہاں۔ اچھا میں دیکھوں گا۔ مل گئی تو دے دوں گا۔" اس نے گویا بات ختم کی۔

"مل گئی تو کیا مطلب ہے؟"

"رابیل جانو! تمہاری کسی فرینڈ کا فون ہے۔" ماما نے باہر آتے ہوئے بتایا۔ تب ہی ان کی نگاہ باسط پر پڑی۔

"ارے باسط بیٹا! تم کب آئے؟"

"اب، ابھی آنٹی!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔" انہوں نے خوش ہو کر بتایا۔ "میں نے سندھی بریانی بنوائی ہے۔"

"ویٹس گڈ......" وہ ان کے ہمراہ کچن کی طرف چلا تھا۔ رابیل کو مجبوراً فون سننے کے لئے اٹھنا پڑا۔

* * *

دبیز قالین پر اِدھر اُدھر بکھرے ڈھیر سارے کشنز کے درمیان آلتی پالتی مارے وہ ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بائیں ہاتھ میں تھاما ریموٹ کنٹرول مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ جبکہ دایاں ہاتھ اور منہ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ اور پلیٹ میں رکھے کاجو اور تلی ہوئی نمکین مونگ پھلی کے ڈھیر میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ سکرین پر ہر بدلتے سین کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شوق، اشتیاق اور جوش کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔

تب ہی لاؤنج میں رکھے فون نے اس کے انہماک میں خلل ڈال دیا۔

"ماما سن لیں گی۔" اس نے گویا خود سے کہا تھا۔ مگر تیسری اور چوتھی بیل کے بعد بھی کسی نے فون ریسیو کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تو اس نے جھنجھلا کر گل بی بی کو پکارا۔

"گل بی بی! خدارا اٹھ کر فون سن لیں اور اگر میرا پوچھے تو کہہ دینا گھر پر نہیں ہوں۔" آواز ہلکی کرتے ہوئے اس نے پکار کر کہا' مگر جواب ندارد تھا اور فون کرنے والا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" ریموٹ کنٹرول پٹخ کر وہ ننگے پاؤں باہر نکل آئی۔ سیڑھیوں کے اوپر سے فون سیٹ کو بری طرح گھورا۔

"نہ جانے کون احمق ہے۔ اب تک تو اسے سمجھ جانا چاہئے تھا کہ گھر پر کوئی نہیں۔ ہیلو۔"

"تھینک گاڈ۔"

"مجھے معلوم تھا، تمہارے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔" وہ منہ بنا کر قریب ہی صوفہ چیئر پر بیٹھ گئی۔ باسط ہنس دیا۔

"دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔"

"نو ڈیئر کزن! تم سے زیادہ بے وقوف اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔"

"تھینک یو عقل مند تو بس آپ ہی پیدا ہوئی ہیں۔"

"نو ڈاؤٹ۔" رابیل اترائی۔

"خوش فہم منہ کے بل گرتے ہیں۔" باسط نے چھیڑا۔

"تم کتنی بار گرے؟" رابیل برجستہ بولی۔

"اوہو! لوگوں کو بولنا بھی آ گیا۔" باسط کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

"اچھا! جلدی بولو! کیا کام ہے۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی تھی۔

"کون سی فلم دیکھ رہی ہو؟"

"تمہیں کیسے پتا چلا۔" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے تمہاری ساری روٹین ازبر ہو چکی ہے رابیل ڈیئر۔"

"اسٹوارٹ لٹل۔" اس نے فلم کا نام بتایا۔

"تم اب بھی بچوں والی موویز دیکھتی ہو۔ اوہ! گاڈ ایک چوہے کے کمالات دیکھ کر خوش ہو جاتی ہو۔ یار میں تو پریشان ہو گیا ہوں تمہارے مستقبل کے بارے میں۔ کیا کرے گا تمہارا وہ پرنس۔" باسط متفکر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، او کے۔ اب بتاؤ کہ فون کیوں کیا۔" رابیل تنک کر بولی۔

"آئی ول کل یو رابیل مراد۔" وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولا تھا۔ رابیل نے حیرت سے ریسیور کو گھورا۔

"آئی تھنک، اس لہجے میں تم صرف اپنی اس پرنس سے بات کیا کرو۔"

"جسٹ شٹ اَپ۔ تمہیں اس وقت میرے گھر ہونا چاہئے تھا۔"

"کیوں بھئی۔ میرا گھر اس وقت کرہ ارض سے غائب ہونے والا۔" رابیل مسکرائی۔

"رابیل! تم نے مجھ سے پرامس کیا تھا کہ شام میں میرے ساتھ مارکیٹ جاؤ گی۔"

باسط نے یاددہانی کرائی۔

"میں نے کب کیا تھا۔نہیں نا۔" کس قدر معصومیت تھی اس کے لہجے میں۔سامنے ہوتی تو باسط اس کا حشر کر دیتا۔

"تم پھر بھول گئی ہو۔" وہ دانت کچکچا کر بول رہا تھا۔

"میری یادداشت اتنی بھی کمزور نہیں۔مگر تم سے پرامس۔" وہ یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔ کن پٹی انگلی بجاتے ہوئے سوچنے لگی۔

"میرے لئے یہ نئی بات نہیں۔تم پندرہ منٹ میں مجھے "سہیل اسنیک بار" کے سیکنڈ فلور پر ملو۔"

"مسئلہ کیا ہے؟" وہ باہر نکلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"تانیہ کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے اس کے لئے گفٹ خریدنا ہے۔" باسط نے بتایا۔

"تو خریدلو نا جاکر۔" وہ قدرے سستی سے بولی۔باسط کو غصہ آیا مگر ضبط کر کے بولا۔

"مجھے لڑکیوں کی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو۔" رابیل ہنسی۔

"تم فضول مت بولو۔ میں بہت شریف لڑکا ہوں۔" باسط نے ڈانٹا۔

"یقین کرنے کو دل نہیں کرتا۔مگر چلو۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"تو تم آرہی ہو۔" باسط کو کام نکلوانا تھا۔سو اس کا لہجہ و انداز برداشت کرنا ہی تھا۔

"باسط! ماما بھی گھر پر نہیں ہیں شاید۔" رابیل نے اپنی مجبوری بتائی۔

"میں تمہیں آئس کریم کھلاؤں گا۔" باسط نے گویا لالچ دیا۔

"ماما نے آئس کریم کھانے سے سختی سے منع کیا ہے۔" دل تو للچایا۔مگر وہ بے نیازی دکھا گئی۔

"اوہ پوئر ماماز گرل! ان کو بتائے گا کون۔"

"میرا گلا' جو ذرا ٹھنڈی چیز کھاتے ہی بیٹھ جاتا ہے۔" رابیل نے افسوس سے بتایا۔ماما نے آئس کریم کا داخلہ گھر میں بھی بند کر دیا تھا۔

"اس کو کھڑا کر دیں گے۔تم آؤ تو۔"

"باسط!"

"میری کوئی بہن ہوتی نا تو کبھی ضد نہ کرتی' نہ ہی اتنی منتیں کرواتی۔" وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا تو رابیل ہنس دی۔

"مجھے اموشنل کرنے کی ضرورت نہیں باسط! میں آرہی ہوں۔" جذباتی تو وہ ہوگئی تھی۔ باسط مسکرادیا۔

"تھینک یو رابیل! ان فیکٹ مجھے اپنی چوائس پر بھروسا نہیں۔"

"اس بات کا اندازہ تمہاری تانیہ کو دیکھ کر بخوبی ہو جائے گا۔" وہ آرام سے بولی۔

"شٹ اپ۔تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔" باسط نے ہنستے ہوئے فون بند کیا تھا۔

رابیل نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ کنٹرول وہیں چھوڑا اور گل بی بی کو پکارتی ہوئی دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں گئی۔ بال برش کر کے بینڈ میں جکڑے۔شوریک سے جوتے نکالے اور شرٹ کی سلوٹیں ہاتھ سے نکالتی اسی رفتار سے نیچے آئی تھی۔

"گل بی بی! میں ذرا۔اوہ ممی السلام علیکم۔" ممی کو دیکھ کر وہ صوفے کے پاس رکی تھی۔ ممی نے پرس ٹیبل پر رکھا اور اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائیں۔

"بہت جلدی میں ہو۔"

"ممی! وہ باسط کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اسے تانیہ کے لئے کچھ خریدنا ہے۔بس ذرا مارکیٹ تک۔"

"کتنی بار کہا ہے اتنے رف حلیے میں مارکیٹ مت جایا کرو۔" ممی نے سرتاپا اسے دیکھا۔

"ممی! دیر ہو جائے گی تو باسط خفا ہوگا۔" وہ قدرے بے چارگی سے بولی۔

"اوکے۔" ممی مسکرادیں۔ "ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے تمہاری جنریشن تو۔"

"اوکے ممی بائے۔" وہ انہیں پیار کرتے ہوئے باہر کی طرف لپکی۔ پھر دروازے میں رک کر پلٹی۔

"اب کیا ہوا......؟"

"وہ ممی! گاڑی مل جائے گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ممی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پلیز۔" وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"اوکے مگر بہت دھیان سے۔ یہاں کے اونچے نیچے راستوں پر ڈرائیونگ کا تجربہ نہیں ہے تمہیں۔" انہوں نے تنبیہی انداز میں کہہ کر چابی اس کی طرف بڑھا دی۔

"تھینک یو مام۔یو آر سو سویٹ۔" اس نے جھٹ چابی مٹھی میں دبوچی تو وہ رابیل کو جلد

آنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

دس منٹ میں وہ مقررہ اسنیک بار کے سامنے تھی۔ اپنی ہی دھن میں وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اب نہ جانے وہ بے خبر تھی کہ سامنے والا اندھا، عین سیڑھیوں کے موڑ پر زبردست تصادم ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر دو سیڑھیاں نیچے آئی۔ مزید سڑک پر پڑی ہوتی جب اک مضبوط ہاتھ نے اسے بازو سے تھام کر سنبھالا تھا۔

"اندھے ہو۔" حواس بحال ہوتے ہی وہ الٹ ہی تو پڑی۔

"نہیں بفضل خدا دو خوبصورت آنکھیں رکھتا ہوں۔" مقابل نے قدرے خفا ہو کر اطلاع دی تھی۔

"تو کیا آنکھیں بند کر کے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔" پیشانی کو مسلتے ہوئے اس نے ہاتھ سے نکل جانے والی کی چین کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ تب ہی اس کی نگاہوں کے سامنے ہتھیلی پھیلی۔ رابیل نے ہتھیلی پر دھری کی چین اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر مٹھی بند ہو کر سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"ارے یہ کیا حرکت ہے۔" رابیل نے تپ کر سر اٹھایا اور مقابل کو بری طرح گھورنے کی کوشش کی۔ اس کے تپے تپے چہرے پر نظر پڑتے ہی مقابل کی سیاہ آنکھوں کی شفاف سطح پر تحیر جاگا۔

"ارے، تم بیلا ہو نا!" اس کے تحیر آمیز لہجے میں اشتیاق تھا۔

"جی نہیں۔" رابیل نے سختی سے کہا۔

"تم بیلا ہی ہو۔" وہ دو قدم اتر کر اس کے مقابل آ گیا۔

"ارے خواہ مخواہ ہی۔" رابیل نے عین سامنے کھڑے اس لمبے چوڑے وجود کو بے اختیار گھورا تھا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے بیلا!" رابیل کے گھورنے کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ وہ تپ اٹھی۔

"مسٹر! تم خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ چابی دو۔" رابیل کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

"چابی۔" اس نے ایک نظر چابی کو دیکھا، اور پھر دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر مزید پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ سیڑھیاں یوں بھی تنگ تھیں۔ راستہ بالکل ہی بلاک ہو گیا۔ اس کے وجود سے پھوٹتی شنیل کی مہک رابیل کے آس پاس ہی منڈلائی۔ اک ہلکے سے خوف نے اسے گھیر لیا۔

"یا اللہ! یہ زیادہ بدتمیزی نہ کر بیٹھے۔ ذرا اسٹرونگ بنو۔ اوپر باسط بھی تو موجود ہوگا۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ مگر دوسرے پل خیال آیا اگر باسط نہ آیا ہوا تو۔

"نہیں آیا تو آ جائے گا اور پھر یہ پبلک پلیس ہے۔"

وہ گویا اس کے چہرے پر اترتے ہر رنگ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور پڑھ رہا تھا۔ بہت دھیرے سے مسکرایا۔ پھر چٹکی اس کی آنکھوں کے سامنے بجا کر پوچھنے لگا۔

"کیا سوچ رہی ہو بیلا؟"

"دیکھو میں کوئی بیلا ویلا نہیں ہوں۔ چابی دو اور میرا راستہ چھوڑ دو۔" وہ سنبھل کر غصے سے گویا ہوئی۔ چابی چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی تھی ورنہ گاڑی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

"چابی تو میں دے دوں گا اور راستہ بھی چھوڑنا پڑے گا کہ بہرحال یہ جگہ میری ملکیت تو نہیں ہے۔"

وہ چابی کی نوک سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "مگر پہلے تم مان لو کہ تم......"

"خواہ مخواہ ہی مان لوں۔ جب میں بیلا نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔" وہ جھنجھلا کر تیز لہجے میں چیخی۔ عجیب سر پھرا انسان تھا۔

"تو پھر کون ہو؟" اپنی پرشوق نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ کر وہ بڑے دوستانہ انداز میں یوں پوچھنے لگا۔ جیسے وہ فٹ سے اپنا پورا بائیو ڈیٹا اس کے سامنے رکھ دے گی۔

"جو کوئی بھی ہوں۔ مگر اس طرح بدتمیزی کرنے والے کا منہ توڑ سکتی ہوں۔"

رابیل نے غضب ناک ہو کر دھمکی دی۔ غصے کی شدت سے گلابی رنگت سرخ ہو رہی تھی اسے یوں لگا جیسے برفاب پہاڑوں پر آگ دہک اٹھی ہو۔

"اچھا!" اس نے بڑی دلچسپی سے رابیل کے اس روپ کو دیکھا۔ پھر گرل پر ہاتھ ٹکا کر بہت اطمینان سے بولا تھا۔ "چلو! آج یہ شوق بھی پورا کر لو۔"

رابیل ایک پل کو شاکڈ رہ گئی۔

"آر یو میڈ؟" اب کے وہ سچ مچ خوفزدہ ہوئی تھی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ مگر ساری سیڑھیاں ویران پڑی تھیں۔ موسم خراب ہونے کی بنا پر زیادہ رش بھی نہ تھا۔

"تھا تو نہیں، ہو گیا ہوں۔" اس کی گہری آنکھوں میں ایک پل کو چمک سی ابھری۔

رابیل سر تھام کر رہ گئی۔ اب اس ڈھیٹ اور کسی حد تک خطرناک شخص کا وہ کیا علاج کرتی۔ اوپر جا نہیں سکتی تھی کہ راستہ ہی بلاک تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ واپس پلٹ جاتی۔

"اچھا اگر تم مان لو کہ تم بیلا۔"

"اوہ یو شٹ اپ۔"

"اف۔" اس نے قدرے خفگی سے رابیل کو دیکھا۔ "لو پکڑو۔ ایک دم جنگلی بلی ہو تم۔"
چابی اس کی ہتھیلی پر پٹخ کر وہ دو سیڑھیاں اترتا وہ دائیں طرف غائب ہو گیا تھا۔

"واٹ۔" رابیل نے پہلے ہاتھ پر دھری چابی اور پھر پلٹ کر اس دراز قد نوجوان کو دیکھنے کی کوشش کی کس آرام سے وہ اسے جنگلی بلی قرار دے گیا تھا۔

"اسٹوپڈ!" وہ جھنجھلا کر اوپر آئی۔ باسط میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے گلاس ونڈو سے باہر جھانک رہا تھا۔ دور پہاڑوں پر بادلوں کے رتھ اتر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بول اٹھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔ کب سے تمہاری گاڑی دیکھ رہا ہوں۔ روڈ سے یہاں تک کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں۔ کیا سیڑھیوں پر چپک گئی تھیں۔"

"تو آ کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔" رابیل الٹ ہی تو پڑی۔

"کیا ہو گیا؟" وہ قدرے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"وہ سٹوپڈ وہاں میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔" رابیل نے جھنجھلا کر شولڈر بیگ ٹیبل پر رکھا۔

"کون؟" باسط کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"تھا کوئی احمق۔ کہتا تھا کہ میں بیلا ہوں۔"

"کون بیلا؟"

"افوہ! مجھے کیا معلوم۔" پھر باسط کے تیور دیکھ کر قدرے سنبھلتے ہوئے بولی تھی۔ "ہو گی اس کی کوئی رشتے دار۔ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ اینی وے۔"
اس نے سر جھٹکا۔ "بتاؤ خریدنا ہے کچھ؟"

"ظاہر ہے، اسی لئے بلوایا ہے۔" باسط نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ان کے سامنے آئس کریم سرو کی تھی۔

"اتنی سردی میں مرواؤ گے باسط۔" دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے ہوئے اس نے آئس کریم کے پیالے میں جھانکا۔

"تو تم مت لو۔"

"بکواس نہیں کرو۔" رابیل ہنس دی۔ "ویسے باسط! مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ ہونے والی منگیتر کو کیسا گفٹ دیا جاتا ہے۔"

"میری بھی پہلی ہونے والی منگیتر ہے۔ بائی دا وے۔ جنید صاحب نے تمہیں کبھی کوئی گفٹ نہیں دیا۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے قدرے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگا۔ رابیل کا

منہ بن گیا۔

"مہا کنجوس لگتا ہے وہ بندہ۔ پتا نہیں ممی نے اس میں کیا دیکھ لیا۔"

"کچھ نہ کچھ تو دیکھا ہو گا۔"

"کتنی عجیب بات ہے۔ ہماری منگنی ہو گئی ہے اور میں اس سے کبھی ملی ہی نہیں۔" رابیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہو جاتا ہے ایسا۔ تمہارا ملنے کو دل کرتا ہے۔ فکر نہیں کرو۔ کروا دیں گے ایک ملاقات۔"

"مجھے ضرورت نہیں۔ جب اسے پروا نہیں تو...... ایسا روکھا پھیکا فیانسی بھی کسی کا ہو گا۔" وہ خاصی مایوس تھی۔

"ہاں سنا ہے۔ خاصے پراؤڈ ہیں موصوف۔"

"چھوڑو اس کو اور چلو۔ دیر ہو گئی تو ممی کلاس سے لیں گی۔"
رابیل نے کہا اور آئس کریم ختم ہونے تک وہ دونوں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں خریدنا کیا ہے۔

"آئی تھنک۔ مارکیٹ کا چکر لگاتے ہوئے "شکیل گفٹ سنٹر" تک چلتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا تمہاری اس پرنسس کے لئے۔"

"تم ابھی تک تانیہ سے ملی بھی نہیں ہو۔" باسط نے والٹ نکالا۔

"اب منگنی ہونے تک تم نے اسے چھپا کر رکھنے کا ارادہ کر رکھا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" رابیل نے کندھے اچکائے۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہیں جلد ہی ملواؤں گا۔" باسط مسکرایا۔
مختلف سجی سجائی گفٹ شاپس میں جھانکتے ہوئے موضوع گفتگو تانیہ کی ذات ہی تھی۔

"بس۔" شکیل گفٹ سنٹر کے عین سامنے رابیل کے قدموں کو بریک لگ گئے۔ "جو کچھ بھی لینا ہے یہیں سے لو۔"

"مگر میں لوں کیا؟" بہت دیر تک کئی چیزیں دیکھنے اور رد کرنے کے بعد باسط نے جھنجھلا کر پوچھا تھا۔

"پرفیوم لے لو۔" رابیل نے کارڈز الٹ پلٹ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"اتنا آرڈنری گفٹ دینا ہوتا تو یوں تمہیں ساتھ نہ لاتا۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"تو پھر......؟"

"ہائے باسط....." خوبصورت مترنم آواز پر باسط کے ساتھ ساتھ رابیل بھی پلٹی۔

"تانیہ تم۔" رابیل نے اسے بری طرح گھورا۔

"پہلے بتانا تھا کہ تمہارا یہ پروگرام تھا۔"

"ہائے گاڈ! یہ صرف اتفاق ہے۔ ایسا پروگرام ہوتا تو تمہیں ساتھ لاتا؟"

باسط نے کہا تو رابیل نے اثبات میں سر ہلا کر تانیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہائے میں ہوں۔ باسط کی فرسٹ کزن رابیل۔"

"اور بہت اچھی دوست بھی۔" تانیہ نے اس کا جملہ پورا کیا۔ "باسط اکثر تمہارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔"

"تم جیلس تو نہیں ہوتیں۔" رابیل مسکرائی۔

"نیور۔" تانیہ ہنس دی تھی۔ اچھی چارمنگ سی لڑکی تھی۔ ہنستی تو کچھ اور بھی پیاری لگتی۔

"میرا تو یہ اکثر ذکر کرتا ہے اور تمہارا ہر وقت۔"

رابیل کی بات پر باسط نے کھل کر قہقہہ لگایا تھا۔ تانیہ کی سپید رنگت میں گلابیاں سی کھل گئیں۔

"آپ لوگ یہاں شاپنگ کے لئے آئے ہیں۔" تانیہ نے باسط کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، اک فرینڈ کی شادی ہے۔ اس کے لئے گفٹ لینے آئی تھی۔" تانیہ نے سوالیہ نظروں سے باسط کو دیکھا تو وہ فوراً بول اٹھا۔

"میں بھی گفٹ لینے آیا تھا۔ رابیل کا برتھ ڈے ہے۔"

"میرا......نہیں تو۔" رابیل نے حیران ہو کر نفی میں سر ہلایا' جبکہ باسط نے دانت پیس کر اسے دیکھا جبکہ وہ کہہ رہی تھی۔

"اس کی کسی گرل فرینڈ کی برتھ ڈے ہے۔"

"میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ اسٹوپڈ گرل۔"

"کیوں نہیں ہے، ایک چھوڑ کئی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بہت سی تو......" اپنے اسٹوپڈ کہنے پر وہ تپ کر بولی تھی۔

"رابیل! دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟" باسط نے اسے گھورنے کی کوشش کی۔

"نہیں خراب ہو گیا ہے۔" وہ خفا ہو گئی۔ "اب تم گفٹ تانیہ کے ساتھ خرید لو۔" وہ خفگی سے کہہ کر تانیہ کی طرف پلٹی۔

"سوری تانیہ! باسط شاید تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اینی وے۔ پھر کبھی ملاقات ہو گی۔"

تانیہ قدرے حیرت سے باسط اور رابیل کو دیکھ رہی تھی' جبکہ وہ ہاتھ ہلا کر نکل آئی۔ بس ایسی ہی تھی وہ۔ پل پل مزاج بدلتا تھا۔ ذرا سی بات اس کی نازک طبع گراں گزرتی۔ کبھی بڑی بڑی باتوں کو درگزر کر جاتی۔ ممی، پاپا کی اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔ پاپا گورنمنٹ سروس میں تھے ممی مشہور گائنا کالوجسٹ۔ انہوں نے اپنا کلینک اپنے آبائی شہر میں ہی سیٹ کیا تھا۔ اس نے اپنی زیادہ تعلیم ہوسٹل میں رہ کر ہی حاصل کی۔ گریجویشن کے ایگزام کے بعد وہ مستقل طور پر ممی کے پاس آئی تھی۔ یہاں کوئی دوست تو تھی نہیں۔ واحد باسط تھا اس کا ماموں زاد۔ جس کے وجود میں وہ دوست، بہن، بھائی جیسے سارے رشتے پاتی تھی۔

* * *

نوخیز صبح نے بادلوں کی اوٹ میں آنکھ کھولی اور سفید برفاب پہاڑوں کے عقب سے دھیرے دھیرے جھانکنے لگی تو دریچوں سے لپٹی جنگلی گلابوں کی بیلیں مسکرا دیں۔

"رابیل۔" ممی کے دھیرے سے پکارنے پر بھی اس کے ساکت وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔ یونہی کمبل میں لپٹی محوِ خواب تھی۔ ممی نے آگے بڑھ کر پردے ہٹائے اور دریچہ کھول دیا۔ دور بہتے جھرنے کی گنگناہٹیں اب کچھ نمایاں ہو گئی تھیں۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو سے بوجھل ہوا کے نم جھونکے نے کمرے کی فضا بدل دی تھی۔

"رابیل، میری جان۔"

وہ ذرا سی کسمسائی۔

"ممی! پلیز۔" اس کی آواز بیٹھی بیٹھی سی تھی کمبل چہرے پر آ گیا تھا۔

"ناشتہ بالکل تیار ہے جانو اور مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔" ممی نے اس کے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ رابیل کا چہرہ تپا تپا سا تھا۔ ممی اس کا سرخ چہرہ اور بیٹھی آواز پر چونک گئیں۔

"کیا ہوا رابیل۔ آر یو آل رائٹ۔" ممی کا مشفق ہاتھ اس کے ماتھے پر ٹھہرا۔

"تمہیں تو بخار ہے۔"

ممی کے لہجے کی تشویش و پریشانی پر وہ مسکرا دی۔ پھر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے ممی! بخار تو آتا جاتا ہی رہتا ہے؟"

"اور تمہارا گلا؟"

"خراب ہو گیا۔" وہ قدرے اطمینان سے بولی۔ پھر دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے

مسکرائی۔ ''ممی! آج موسم غضب کا ہے۔''

''تم کل باسط کے ساتھ گئی تھیں۔ کیا کھایا تھا۔'' ممی کے گھورنے پر وہ گڑبڑا گئی۔

''کچھ بھی تو نہیں ممی۔''

''کھالی ہوگی کوئی کھٹی یا ٹھنڈی چیز۔ آج کل کے بچے تو والدین کی نصیحت کو فوراً سے پیشتر ڈسٹ بن میں ڈال دیتے ہیں۔ اتنی بار منع کیا ہے، مت کھایا کرو یہ الٹی سیدھی چیزیں۔ ہر بار یونہی گلا خراب ہوتا ہے اور پھر بخار ہو جاتا ہے۔'' ممی اس کی ٹھیک ٹھاک خبر لے رہی تھیں۔ وہ چپ کر کے سنتی رہی پھر جھنجلا کر بول اٹھی۔

''ممی! ہر بار میرے ساتھ اس طرح کیوں ہوتا ہے۔ نیچے وادی میں چلے جائیں۔ کیا بڑے کیا بچے ایسی ایسی چیزیں کھا جاتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ انہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔''

''اب انہیں کیا کہتی ہو۔ وہ تو دھول مٹی پھانک کر بھی ہٹے کٹے رہتے ہیں۔'' ممی مسکرا دی تھیں۔

''اسی لئے تو کہتی ہوں، بچوں کو اتنا نازک مزاج نہیں بنانا چاہئے۔ کون جانے انہیں زندگی میں کیا کچھ دیکھنا پڑ جائے۔''

''ول یو شٹ اپ بے بی۔'' ممی نے گھورا۔ پھر گل بانو کو پکارنے لگیں۔

''سنا ہے دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے۔'' ہلکی سی دستک کے ساتھ باسط کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟'' رابیل نے چونک کر پوچھا۔

''یہ تمہارے ساتھ اور کون بول رہا ہے۔'' باسط نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ گلا بیٹھا ہوا تھا سو عجیب و غریب آواز نکلی تھی۔

''سٹوپڈ!'' رابیل نے جھینپ کر اسے گھورا۔

''یہ تم نے رابیل کو کیا کھلایا تھا؟'' ممی نے باسط کو پکڑ لیا۔ اکلوتی اولاد ہونے کی بنا پر وہ یونہی اس کی ذرا ذرا تکلیف پر گھبرا جاتی تھی۔

''بائے گاڈ! میں نے کچھ نہیں کھلایا۔ جو کچھ بھی کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھایا تھا۔'' وہ فوراً بولا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہی۔'' ممی مسکرائیں۔

''یہ محترمہ خود ضد کر رہی تھیں کہ آئس کریم کھانی ہے۔'' وہ کھلے دریچے میں کھڑے ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ دوسرے معنوں میں اپنے لبوں پر در آنے والی مسکراہٹ چھپانے کی سعی کی

تھی۔ رابیل تو اچھل ہی پڑی۔

''میں نے کہا تھا۔''

''تم چپ رہو، بولا تو جا نہیں رہا۔ ایک کی جگہ تین تین آوازیں نکل رہی ہیں۔'' وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔

''تم۔''

''ہش!'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پھر سے خاموش کروایا۔ رابیل کلس کر رہ گئی۔

''میں تو آنٹی! اس لئے آیا تھا کہ بڑی زبردست پینٹنگ ایگزیبیشن ہو رہی تھی۔ سوچا، رابیل کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر تو محترمہ کو اکیلے ہی بور ہونا پڑے گا۔'' باسط نے پلٹ کر آنٹی کو دیکھا۔ وہ ایم سی ایس کے آخری سمسٹر میں تھا۔

''ہاں، تمہاری وجہ سے رابیل کا بھی دل لگ گیا۔ ورنہ یہاں تو اس کی کوئی دوست ہی نہیں۔'' ممی نے کہا۔

''یہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ مما! یو ڈونٹ وری۔ دل لگنے کی واحد وجہ یہ باسط نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بور ہونے سے زیادہ بہتر ہے کہ بندہ اکیلے ہی بور ہو لے۔'' وہ قدرے خفا لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اوہ بلی خفا ہوگئی۔'' باسط ہنسنے لگا۔ ''چل رہی ہو پھر۔''

''ہرگز نہیں۔'' ممی فوراً بول اٹھیں۔ ''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''بہانے ہیں آنٹی سارے۔'' وہ تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''اب تم میری بیٹی کو ستاؤ مت۔'' اس سے پہلے کہ ممی مزید سرزنش کرتیں۔ گل بانو اندر داخل ہوئی۔ وہ پینتیس چالیس کی سرخ و سپید سی پٹھانی عورت تھی۔

''بیگم صاحب! ہم کو آواز دی تم نے۔''

''ہاں گل بانو! رابیل کا ناشتہ یہیں لے آؤ۔'' ممی نے کہا پر باسط فوراً بول اٹھا۔

''صرف رابیل کا؟''

''تم میرے ساتھ کچن میں آؤ۔ ناشتے کے بعد مجھے ہاسپٹل ڈراپ کر دینا۔ میری گاڑی سروس کے لئے گئی ہے۔'' ممی نے کہا پھر رابیل کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''ناشتہ کر کے میڈیسن لے لینا۔ میں بھجواتی ہوں اور گھر سے ہرگز باہر نہیں نکلنا۔ ورنہ بری طرح پیش آؤں گی۔'' ممی نے تنبیہ کی تو وہ منہ بنا کر کمبل ہٹاتی کھڑی ہوگئی۔

''آپ کا بس چلے نا ممی! تو شیشے کے جار میں بند کر کے مجھے اپنے بیڈ روم میں رکھ

لیں۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی فوراً باتھ روم میں گھس گئی۔ باسط ہنسنے لگا۔ تو ممی اسے گھور کر رہ گئیں۔ پھر مسکرا دیں۔

"کیا کروں' بہت دعاؤں اور انتظار کے بعد پیدا ہوئی تھی یہ مراد بھی کہتے ہیں کہ میں اس پر حد سے زیادہ پریشر رکھتی ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ بچپن میں بیمار بھی تو بہت رہی تھی۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بس تب سے دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔" ان کے لہجے میں ماں کی مخصوص مامتا چھلک رہی تھی۔

"کمال ہے آنٹی! آپ ڈاکٹر ہو کر ایسی بات کر رہی ہیں۔" باسط قدرے حیران ہوا۔

"میں ڈاکٹر سے پہلے ایک ماں بھی تو ہوں۔" وہ مسکرا دیں۔

"آپ صرف اتنا سمجھ لیں کہ رابیل اب بڑی ہو گئی ہے ناؤشی از اے میچور گرل۔"

"بس میں چاہتی ہوں اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔" وہ سر جھٹک کر کھڑی ہو گئیں۔

"اور جو آپ کو پتا چل جائے کہ محترمہ کیا کچھ کرتی پھر رہی ہیں تو......" باسط جملہ ادھورا چھوڑ کر کان کھجانے لگا تو وہ چونک کر پوچھنے لگیں۔

"کیا کرتی ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں ڈیئر آنٹ۔" وہ ان کے کندھے پر بازو پھیلا کر تسلی دینے لگا۔

"وہ ناشتہ کہاں رہ گیا؟" اس نے یاددہانی کرائی تو وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

"تم نے اپنی باتوں میں مجھے بھی لیٹ کروا دیا۔ اب صرف دس منٹ ہیں تمہارے پاس ناشتے کے لئے۔"

"دس منٹ میں کیا ہوگا۔"

وہ ان کے پیچھے ہی باہر نکل گیا۔

* * *

اونچے نیچے پتھریلے رستوں پر قدم جماتے ہوئے وہ جھرنے کی سائیڈ پر مڑی اور وادی کی طرف اتر گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں باسکٹ تھی۔ جس میں کئی طرح کی چیزیں تھیں۔ ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکی۔ اس کے عین سامنے سورج کی ہلکی زرد کرنوں کا غبار وادی کے درختوں پر چھایا تھا۔ اونچے نیچے پتھریلے مکانوں کی اوٹ سے سرکاری ڈسپنسری کی چھت کا سرخ رنگ جھلک رہا تھا۔ اس کے عین عقب میں بجلی کے کھمبے اور تاروں نے وادی کے قدرتی وفطری حسن کو گویا گہن سا لگا دیا تھا۔

"اوہ، ابھی کتنا دور ہے گل بانو کا گھر۔" اس نے باسکٹ کو پتھر پر ٹکایا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

"ماما کو پتا چل جائے تو وہ یقیناً خفا ہوں گی۔ پتا نہیں وہ مجھے کب بڑا ہونے دیں گی۔ یا شاید ہر اکلوتے بندے کی یہی حالت ہوگی۔ مگر باسط کے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں، عیش کرتا ہے۔ ذرا جو روک ٹوک کرتی ہوں آنٹی اس پر۔" کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے اور زیرِ لب بڑبڑانے کے بعد وہ بولی تھی۔

"رابیل ڈیئر! اب اٹھ جائیں۔ ممی آ گئیں تو غضب ہو جائے گا۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر کھڑی ہوئی اور شاید اس کی کہنی لگی تھی کہ باسکٹ لڑھک گئی۔

"ارے......!" وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی تھی جب عقب سے کسی نے بازو تھام کر روکا تھا۔

"اگر اسی رفتار سے بھاگیں تو یقیناً اسی طرح لڑھک جائیں گی جس طرح یہ باسکٹ اور یہاں سے اوپر شہر تک پہنچانے کے لئے یقیناً مجھے۔"

"ہاؤ ڈیئر یو۔" ایک جھٹکے سے اس کی مضبوط گرفت سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے وہ تاؤ کھا کر پلٹی تھی۔

"ارے بیلا تم۔" سامنے والے کے چہرے پر شوق کے سارے رنگ بکھر گئے اور وہ اسے دیکھ کر گویا ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

"یو......"

"تمہارا پیچھا کرتے ہوئے ہرگز نہیں آیا ہوں۔"

دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے وہ صلح جو لہجے میں بولا تھا۔ "میں تو یونہی ادھر نکل آیا تھا' لیکن قسمت اگر تمہیں مجھ سے ملانے کا فیصلہ کر ہی چکی ہے تو......"

"شٹ اپ مسٹر! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم مجھ سے اتنا چڑتی کیوں ہو بیلا؟" وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"بیلا!" وہ دانت پیس کر اسے یوں گھورنے لگی جیسے کچا کھانے کی ابتدائی تیاریوں میں ہو۔

"اس وقت تمہارا یہی دل چاہ رہا ہے نا کہ اس پہاڑ سے کود جاؤں۔"

کس ہمدردی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رابیل کا دل واقعی یہی کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر وہ تنک کر بولی۔

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں یہاں سے دھکا دے دوں۔"

"تو دو نا؟" شریر سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

"تم۔" رابیل نے چڑ کر اس ڈھیٹ کو دیکھنا چاہا تو نگاہ بھٹک کر باسکٹ پر جا پڑی۔ چپس کے سارے پیکٹ۔ بسکٹ کے ڈبے، ننھے منے بھالو یہاں سے وہاں لڑھک لڑھک گئے تھے۔

"اوہ نو۔" مارے تاسف کے وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ پھر جھنجلا کر اس کی طرف پلٹی اور شرر بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"یہ سب میرے آنے سے قبل ہو چکا تھا۔" ذرا سا جھک کر اس نے سرخ چمک دار رنگ والا پھول توڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میری تمہاری دوستی کے نام۔"

"اونہہ!" رابیل نے جھک کر قریب گرے چاکلیٹ اٹھا کر جینز کی جیب میں ٹھونسے۔

"ویسے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہئے۔" پھول کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے اس کا سرتا پا جائزہ لیا تھا۔ رابیل تپ کر رہ گئی۔

"تمہاری اس بدتمیزی پر۔"

"میں نے تمہیں گرنے سے بچایا ہے۔ ورنہ ابھی تم وہاں پڑی ہوتیں۔" اس نے انگوٹھے سے نیچے کی طرف اشارا کیا۔ رابیل نے بلا ارادہ نیچے دیکھا۔ گہرائی کو دیکھتے ہی بے اختیار جھرجھری لے کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ تب ہی پیر کے نیچے سے پتھر کھسک گیا۔

"آ......" ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے خارج ہوئی اور خود کو سنبھالنے کے لئے بے اختیار رابیل نے اس کی شرٹ دبوچ لی اور فوراً ہی سنبھل کر چھوڑ بھی دی۔ موصوف کی سیاہ آنکھیں جگمگا اٹھیں اور لبوں کی مسکراہٹ۔

رابیل چڑ کر چلائی۔

"تمہیں مصیبت کیا ہے؟"

"اب کیا ہوا؟ میں نے تو تمہیں نہیں بچایا۔"

نہایت درجہ کی معصومیت و شرارت تھی اس کے لہجے میں۔

"تم جاؤ یہاں سے۔" رابیل اس کے سامنے ایک قدم بھی نہیں بڑھانا چاہتی تھی۔ مبادا پھر پھسل گئی تو وہ تو گویا مزا لے رہا تھا۔

"مگر تمہاری یہ چیزیں۔" اس نے ادھر ادھر لڑھکی چیزوں کی طرف اشارا کیا۔ وہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گئی۔

"اچھا ذرا ٹھہرو۔" اسے گویا ترس آ گیا۔ پتھروں پر مضبوطی سے قدم جماتا وہ نیچے اتر گیا۔ رابیل بے خیالی میں اس پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ اچھا خاصا دراز قد مضبوط اور خوبصورت نوجوان تھا۔

"مگر تھوڑا پاگل اور بدتمیز ہے۔"

باسکٹ بہت نیچے گری تھی۔ وہ اس کی ساری چیزیں ہاتھوں میں بھر لایا تھا۔

"لو پکڑو بیلا!"

"سنو مسٹر! میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ میں بیلا نہیں اور میں یہ سب کیسے پکڑوں گی۔" اس نے رابیل کی مدد کی تھی۔ سو لہجہ تھوڑا دھیما ہو گیا تھا۔

"جیسے میں نے پکڑا ہے۔" وہ اس کے لہجے میں اترتی نرمی محسوس کر کے مسکرایا۔

"پھر میں نیچے کیسے اتروں گی۔" رابیل نے مجبوری بتائی۔

"دھکا دے دوں۔" اس نے بہت آرام سے حل پیش کیا۔

"آر یو میڈ؟" رابیل نے دہل کر اسے دیکھا۔

"ہاں ہوں تو۔" اس نے آرام سے کندھے اچکائے۔ رابیل ڈر گئی۔ تھوڑا پاگل تو لگا تھا۔ کیا معلوم سچ مچ دے دے۔

"او کے میرے پیچھے آؤ۔" وہ پلٹ کر نیچے اترنے لگا۔ رابیل کچھ لمحے متذبذب سی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھی قدم بڑھا دیئے تھے۔ وہ عین گل بی بی کے گھر کے سامنے رکا تھا۔

"اب تو پکڑو گی؟"

"شیور اینڈ تھینکس۔" وہ صلح جو لہجے میں بولی تھی۔ اس نے کلائی موڑ کر گولڈن ریسٹ واچ پر اک نگاہ دوڑائی۔ پھر قدرے جتاتے ہوئے بولا۔

"بہت وقت ضائع ہو گیا میرا۔"

"میں نے تو نہیں کہا تھا۔" رابیل نے چڑ کر اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ واپسی کے لئے مڑ گیا تھا۔ رابیل ایک دم ٹھٹک کر رکی۔

"ارے۔ سنو رکو۔" وہ بے اختیار اسے پکارنے لگی تھی۔ وہ جو کچھ دور چلا گیا تھا۔ وہیں رک کر استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ مجھے یہاں آنا تھا۔"

رابیل حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے تمہارے بارے میں سب خبر ہے بیلا۔" وہ کہہ کر ہاتھ ہلا کر اوپر جانے والے رستے کی طرف بڑھ گیا۔ رابیل چڑ کر پلٹی تھی۔

"ہاں سب خبر ہے۔ بس یہی معلوم نہیں کہ میرا نام بیلا نہیں رابیل ہے۔"

* * *

"کیا ہوا ہمارے ماسٹر کو؟"

اس کی شوخ کھنکتی آواز پر چارپائی پر لیٹے ننھے سے وجود نے آنکھیں کھول دیں۔

"لو تمہاری باجی جی آ گئیں۔ اب تو دوا پی لے گا نا۔"

گل بانو نے خوش ہو کر اپنے بیمار و لاغر بچے کو دیکھا وہ مضمحل سا مسکرا دیا۔

"کیسی طبیعت ہے گل بانو اب اس کی؟" اس نے حسب معمول فروٹ سے بھری باسکٹ گل کی بڑی بیٹی رانو کو دی۔

"ٹھیک ہے جی پر دوائی نہیں کھاتا۔" گل بانو نے شکایت کی تو وہ منہ بنا کر مدد طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"باجی! دوائی کڑوی ہے۔"

"کڑوی ہے تو کیا ہوا؟ ہمارا گل شیر تو ایک دم شیر کی طرح بہادر ہے اور پتا ہے جب گل شیر ٹھیک ہو جائے گا تو میں اسے ڈھیر ساری سٹوری بکس لے کر دوں گی۔" گل شیر کو بہلاتے ہوئے وہ اس کی جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" گل شیر کے لہجے میں اشتیاق در آیا۔

"کہانیوں والی کتابیں۔ رانو تمہیں اس میں سے کہانیاں پڑھ کر سنایا کرے گی۔"

"پر رانو کی تو شادی ہو جائے گی۔"

"رانو کی شادی۔" اس نے تحیر سے گل بانو کو دیکھا۔

"ہاں بڑی اچھی جگہ رشتہ لگا ہے۔ لڑکے کی اپنی دکان ہے۔"

"مگر رانو تو بہت چھوٹی ہے۔" اس سے قبل کہ وہ لڑکے کی مزید خصوصیات گنواتی۔ رابیل بول اٹھی تھی۔

"کہاں، پورے چودہ برس کی ہو گئی ہے۔" گل بانو نے مسکرا کر بتایا۔

"واٹ؟" وہ تو اچھل ہی پڑی۔ "اتنی سی عمر میں شادی کریں گی اس کی۔"

"ہاں!" گل بی بی نے بڑے آرام سے سر ہلایا۔

"اس ارلی ایج میں شادی کی کیا پرابلمز ہیں۔ پتا ہے آپ کو۔" اس کے حلق سے یہ بات کسی صورت نہ اتر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا بی بی! میری شادی تو تیرہ برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔"

"مائی گاڈ!" اس کی آنکھیں پھیلیں۔ پھر اس نے سر جھٹک کر بات بدل دی۔ وہ لوگ اس کی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ ممی سے بات کرے گی۔

"اوکے گل شیر! منہ کھولو۔" وہ سیرپ اٹھاتے ہوئے گل شیر کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

* * *

"تمہیں اس معاملے میں دخل دینے کی بالکل ضرورت نہیں۔" ممی نے سنتے ہی صاف کہہ دیا۔

"مگر کیوں ممی! وہ اتنی چھوٹی سی بچی کی شادی کر رہے ہیں۔"

"یہ ان کے ہاں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔"

"مگر یہ غلط تو ہے نا۔"

"رابیل، وہ لوگ اسے خواہ مخواہ کی دخل اندازی سمجھیں گے۔" ممی جھنجھلا گئیں۔

"سمجھنے دیں۔ مگر ایک بار ان سے بات تو کریں۔ پلیز ممی۔"

"اوکے کروں گی بات۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ تمہارا اپنی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے۔" ممی نے بات ٹال کر اسے ٹکرا لیا۔

"ابھی کیا جلدی ہے ممی۔ میرا رزلٹ تو آنے دیں۔"

"رزلٹ کا شادی سے کیا تعلق ہے؟"

"ہے نا، شاید میں مزید پڑھنا چاہوں۔"

"مزید......" موبائل کی بپ نے انہیں جملہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو رابیل نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"تمہارا فون ہے۔" ممی نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو!"

"تانیہ! ہاؤ آر یو۔" کشن گود میں دبا کر وہ قدرے آرام سے ہو کر بیٹھ گئی۔

"فائن، کیا ہو رہا ہے؟" وہ بے تکلفی سے پوچھنے لگی۔

"کچھ خاص نہیں۔ بہت بور ہو رہی ہوں۔"

"تو باسط کے ساتھ آ جاؤ نا۔ آج شام میں" اس نے فوراً دعوت دی۔

"ایوننگ میں کوئی خاص بات ہے۔"

"زیادہ خاص تو نہیں۔ بس آج میرا برتھ ڈے ہے۔"

"اوہ رئیلی۔ ویٹس گڈ، میں ضرور آؤں گی۔" وہ فوراً تیار ہو گئی۔

"تم نے مائنڈ تو نہیں کیا میری فرینکنیس کا۔"

"ہرگز نہیں۔ بلکہ بہت اچھا لگا مجھے اک نئی فرینڈ مل گئی۔" وہ خوش دلی سے اسے خدا حافظ کہہ کر پلٹی کہ ممی کو بتائے تو ممی غائب تھیں۔

"ممی! ممی!"

"کیا ہو گیا، یہاں ہوں کچن میں۔"

"ممی، ممی! وہ تانیہ ہے نا، باسط کی ہونے والی فیانسی...... ممی یہ لوگ منگنی کیوں نہیں کر لیتے۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پوچھنے لگی۔

"تانیہ کے پاپا اسٹیٹس میں ہوتے ہیں اور اس کی مدر ان کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتیں۔ ویسے انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"وہ کوئی اعتراض کس طرح کر سکتے ہیں۔ جب تانیہ کو کوئی اعتراض نہیں۔"

"تم تانیہ کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں۔" انہوں نے فریزر سے قیمے کا پیکٹ نکالا اور عبدل کو آواز دینے لگیں۔

"ہاں، اس کی برتھ ڈے ہے۔ انوائیٹ کیا ہے اس نے مجھے۔" رابیل نے فریج کھول کر بڑی سی ناشپاتی نکالی اور چھری کی تلاش میں نظر دوڑانے لگی۔

"ضرور جانا۔ بہت اچھی لوگ ہیں۔ مگر کوئی ڈھنگ کا ڈریس پہن کر جانا۔"

"ظاہر ہے۔ مگر میں اسے گفٹ کیا دوں؟"

"کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ کچھ اچھی سی کتابیں لے جاؤ۔"

"کیا معلوم وہ کیسی بکس پڑھتی ہو۔"

"افوہ رابیل! کیا پرابلم ہے۔ اتنی کتابیں ہوتی ہیں کچھ اچھا لٹریچر منتخب کر لینا۔"

"اس کے لئے تو مجھے مارکیٹ جانا ہوگا۔"

"باسط کو ساتھ لے جاؤ۔"

"اب اتنے سے کام کے لئے اسے کیا بلاؤں۔ کیا آپ مجھے ایک گھنٹے کے لئے چابی عنایت کریں گی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ ممی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پندرہ منٹ کی واک پر مارکیٹ ہے۔"

"پندرہ منٹ کی واک۔" رابیل کی آنکھیں پھیلیں۔

"ویسے سارا دن ان پہاڑوں پر گھومتی رہتی ہو۔"

"ممی! جلدی آ جاؤں گی نا۔"

"او کے!" بادل ناخواستہ ممی نے اجازت دی۔

"تھینک یو ممی۔" وہ فوراً چابی اٹھا کر باہر کی طرف لپکی۔ بک سٹال پر کئی کتابیں الٹ پلٹ کرنے کے بعد بھی وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اسے لینا کیا ہے۔ تب ہی اس کی نگاہ سڑک کے اس پار گئی۔ دوسرے پل وہ بے اختیار پلر کی اوٹ میں ہوئی تھی۔ وہی شخص تھا۔ بلیک جینز شرٹ میں ملبوس وہ کسی مقامی شخص کے ساتھ محو گفتگو تھا۔

"اچھا خاصا ڈیسنٹ بندہ ہے، نہ جانے ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے اور وہ بھی میرے ساتھ۔"

"آپ یہ دیکھیں۔" شاپ کیپر نے کچھ نئی کتابیں اس کی طرف بڑھائیں تو وہ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کیا لوں؟"

"آئی تھنک، آپ کو کچھ بھی نہیں لینا۔"

"او مائی گاڈ۔"

"تھینک گاڈ کہتیں تو اچھا لگتا۔" وہ اس کے عقب سے نکل کر برابر میں آ کھڑا ہوا۔

"آپ کو دیکھ کر تو لاحول پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"ہر وقت غصہ کیوں کرتی ہیں آپ؟" وہ آہستگی سے ہنس کر پوچھنے لگا۔ رابیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی خواتین ڈائجسٹ کی ورق گردانی کرنے لگی۔

"آپ یہاں بکس لینے آئی ہیں؟"

"نہیں گوشت خریدنے آئی ہوں۔ آخر آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ جائیں یہاں سے پہلے ہی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا خریدوں۔"

وہ چڑ کر بولی تھی۔

"مے آئی ہیلپ یو۔" ڈھیٹ تو وہ تھا ہی سو اطمینان سے پوچھنے لگا۔ رابیل نے اسے سرتاپا اسے دیکھا۔

"یقین جانیں، ایجوکیٹڈ بندہ ہوں۔"

"اوکے۔ میری فرینڈ کی برتھ ڈے ہے اور وہ لٹریچر بہت شوق سے پڑھتی ہے۔" رابیل سمجھ رہی تھی وہ یوں جان نہیں چھوڑے گا۔

"انگلش یا اردو؟"

"شاید دونوں۔"

"شاید۔" اس نے رابیل کی طرف دیکھا۔ "بہت کلوز فرینڈ ہیں آپ کی۔"

"بچپن سے ساتھ ہیں ہم۔" اس نے آرام سے جھوٹ بولا۔

"اوہ!" وہ زیرلب مسکرایا۔ "آپ اپنی دوست کو بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہیں سکی۔

"تھنگ۔" اس نے کچھ کتابیں شاپ کیپر کو پیک کرنے کے لئے کہا۔

"اگر یہ اس نے پڑھ رکھی ہوئیں تو؟" رابیل نے عجب بے تکی بات کی تھی۔

"اس نے نہیں پڑھیں۔ آپ فکر مت کریں۔"

"آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"میرا اندازہ ہے اور پڑھی ہیں تب بھی اٹھا کر باہر نہیں پھینکیں گی وہ۔" اس نے پیکٹ رابیل کو تھما کر والٹ نکالا۔

"ارے، ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"پے منٹ کر رہا ہوں۔" اس نے بڑے آرام سے بتایا۔

"یہ کیسے کر سکتے ہیں آپ۔"

"ایسے۔" اس نے روپے نکال کر دکاندار کو تھمائے اور خود باہر نکل آیا۔

"ارے بات سنیں میری، یہ کیا طریقہ ہے۔" وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے آئی اور عین سڑک کے درمیان میں اس کا راستہ بلاک کیا۔

"آپ کس طرح پے منٹ کر سکتے ہیں۔ بکس تو میں نے خریدی ہیں۔"

"ایک طرف ہو کر بات کر لیں۔" اس نے اطمینان سے احساس دلایا تھا کہ وہ سڑک کے درمیان میں کھڑے ہیں۔

"گاڈ۔" وہ تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ روڈ کراس کر آئی۔ جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ساتھ ہی وہ تیزی سے اپنا بیگ کھنگال رہی تھی۔

"ایک بات تو طے ہے۔ مجھے آپ سے روپے نہیں لینے۔" دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو؟" اس نے سر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا۔

"میرے لئے امپورٹنٹ یہ ہے کہ آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں۔"

"میں آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتی مسٹر!"

"تو سمجھنے لگیں گی۔"

"خواہ مخواہ ہی۔" وہ جھنجھلا گئی۔ "اپنے پیسے لیں اور چلتے پھرتے نظر آئیں۔"

"چلتا پھرتا تو میں سارا دن رہتا ہوں۔ مگر سارا وقت آپ کو نظر آؤں، یہ تو ممکن نہیں۔ آخر مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"اویو......"

"شاید آپ کو کسی نے یہ کہہ دیا ہے کہ آپ غصے میں بہت حسین لگتی ہیں۔ مگر میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بات کچھ اتنی زیادہ سچ بھی نہیں۔"

"میں بے وقوف تھی جو آپ سے مدد مانگ بیٹھی۔"

"یہ آپ کی اپنی رائے ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔ ساتھ ہی ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی بولنے سے منع کر دیا۔

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اگر آپ کو منظور ہو تو۔"

"کہیے۔"

"آپ یہ روپے مجھے واقعی واپس کرنا چاہ رہی ہیں؟"

"آف کورس!"

"تو اس کے بدلے میں مجھے اچھی سی کافی پلوا دیجئے۔"

"واٹ۔" رابیل نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"بہت فاسٹ جا رہے ہو مسٹر۔"

"بس ایسا ہی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اوکے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو میرے گھر آنا ہوگا۔" نہ جانے کیا سوچ کر اس نے آفر کی تھی۔

"کیا ابھی؟"

"جی نہیں۔ پھر کسی روز مگر آئیے گا ضرور۔" وہ قصداً مسکرائی۔

"نہ آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"سنیئے۔" اس نے پلٹ کر دیکھا

"تھینکس!"

"فارواٹ۔"

"آج آپ نے مجھے بیلا نہیں کہا۔"

"اب میں آپ کو بیلا نہیں کہوں گا' کیونکہ مجھے یقین ہے آپ کا نام بیلا نہیں کومل ہے۔"

"جی۔" وہ جو پوری طرح اطمینان کا سانس بھی نہ لے پائی تھی چلا اٹھی۔

"جی۔" وہ آرام سے کہہ کر پلٹ گیا۔

"تم ایک بار میرے گھر تو آؤ مسٹر۔ یہ بیلا، کومل سب بھول جاؤ گے۔" وہ دانت پیس کر زیرلب بڑبڑائی تھی۔

* * *

"ممی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں کون سا ڈریس پہنوں۔" وارڈ روب سے سارے ڈریسز باہر تھے۔

وہ اورنج اور گرین کنٹراسٹ والا ڈریس نکالو نا۔ جو میں تمہارے لئے لائی تھی۔"

"یہ۔" اس نے ہینگر کھینچ کر سوٹ نکالا۔ "یہ تو بہت ڈارک کلرز ہیں۔"

"میری بیٹی پر بہت سوٹ کریں گے۔"

"اور یہ اتنا بڑا دوپٹہ۔" اس نے دوپٹے کی لمبائی ناپی۔ جس کے کناروں پر خوبصورت سی ایمبرائیڈری کے ساتھ بیل بنی تھی۔ "کیسے سنبھالوں گی۔"

"سنبھال لوگی۔ بچی نہیں ہو تم گل بی بی! گل بی بی۔" تیسری آواز پر گل بی بی چلی آئی۔

"جی بیگم صاحب۔"

"یہ سوٹ پریس کر دو۔"

"ممی! کوئی نائٹ فنکشن تو نہیں ہے جو اتنا ڈارک کلر پہنوں۔ سب مذاق اڑائیں گے میرا۔" اس نے نیا اعتراض نکالا۔ صاف ظاہر تھا وہ یہ سوٹ پہن کر نہیں جانا چاہتی۔ مگر ممی کے سامنے کس کی چلتی، نہ صرف وہی ڈریس بلکہ اس نے کے ساتھ میچنگ ہلکی پھلکی جیولری بھی پہننا پڑی۔ وہ کبھی اتنے اہتمام سے تیار نہ ہوئی تھی۔ سو جھینپ رہی تھی۔

"اتنی پیاری ہے میری بیٹی۔ مگر ہر وقت اول جلول حلیے میں گھومتی رہتی ہے۔' ممی نے اس کی پیشانی چوم کر پیار سے ڈانٹا۔

"آپ دیکھ لیجئے گا۔ سب ہنسیں گے مجھ پر اور یہ دوپٹہ چھوٹا بھی تو ہو سکتا تھا۔" اس نے کھینچ کر لمبے چوڑے دوپٹے کو کندھے پر ڈالا۔

"تمہیں دیر ہو جائے گی۔" ممی نے اکتا کر اسے باہر کی طرف دھکیلا۔ تیسری سیڑھی پر ہی اس کا دوپٹہ ایڑھی کو چھو رہا تھا۔

"ڈھنگ سے چلنا بھی سیکھ لو احمق لڑکی۔" اوپر سے ممی کی ڈانٹ پر وہ گھبرا گئی۔ تانیہ کے گھر کے سامنے گاڑی پارک کر کے گفٹ اور بوکے (ساتھ دوپٹہ بھی) سنبھال کر اس نے کھٹ سے دروازہ بند کیا۔ وہی ہوا، دوپٹہ دروازے میں تھا۔ رابیل آگے آ گے۔

"ممی، ٹھیک کہتی ہیں۔" اس سے قبل کہ وہ دوپٹہ نکالتی کسی نے دروازہ کھول کر دوپٹہ اس کی طرف اچھال دیا۔

"آپ کی ممی کیا کہتی ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر میں یہ کہتا ہوں۔ آپ ایسے ڈریسز پہنا کریں۔ ایک تو آپ پر سوٹ بہت کرتے ہیں۔ دوسرے آپ کو عادت ہو جائے گی۔"

"آپ، آپ یہاں بھی۔" وہ بے ہوش ہو جانے کو تھی۔

"جہاں جہاں آپ، وہاں وہاں ہم۔" نہایت خوش دلی سے فرمایا گیا تھا۔

"باسط، باسط!"

اس کی چیخ و پکار پر ایک باسط ہی کیا۔ سب ہی نکل آئے تھے' جبکہ وہ خود اسی کی گاڑی سے ٹیک لگائے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کے تپتے تپتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

باسط وہیں رک گیا۔

"باسط! اسے دیکھو، یہ شخص میرا تعاقب کرتا ہے۔" باسط کو دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھی۔ باسط نے ہونٹوں کو سیٹی کے انداز میں سکوڑتے ہوئے باقاعدہ اس کے گرد ایک چکر لگا کر سر تا پا اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے سامنے آتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ پوچھنے لگا۔ "کیا میں آپ کو جانتا ہوں محترمہ۔"

"واٹ نان سینس۔" ایسے نازک وقت باسط کا مذاق اسے ذرا نہ بھایا تھا۔ "اس شخص نے مجھے تنگ کر چھوڑا ہے۔ کبھی کہتا ہے تم بیلا ہو اور کبھی کومل۔"

"کہہ سکتا ہے۔ آپ کو کوئی بھی بیلا اور کومل کہہ سکتا ہے پرنس آ ج، آ۔" رابیل کی نازک ہیل نے اس کا پاؤں بری طرح کچلا تھا۔

"تم میں ذرا بھی غیرت ہے۔"

"غیرت۔" اس کی غیرت پر سچ مچ تازیانہ لگا تھا۔ تب ہی للکار کر میدان میں کود پڑا۔

"اوئے شیطانا تو میری بھین دا دوپٹہ......"

"میں نے تمہاری بہن کے دوپٹے کی ساڑھی بنائی ہے۔ محترمہ دروازے میں پھنسائے بیٹھی تھیں۔" اس نے آرام سے جواب دیا۔ تانیہ کے ابو نے آگے بڑھ کر اس کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کام کب سے شروع کر دیا برخوردار۔"

"کون سا انکل؟"

"یہی لڑکیوں کو چھیڑنے والا۔ ہم تو تمہیں خاصا شریف نوجوان سمجھتے تھے۔"

"میں اچھا خاصا شریف ہوں انکل! یہ محترمہ خوامخواہ الزام لگا رہی ہیں۔"

"میں الزام لگا رہی ہوں۔" وہ سلگ اٹھی۔

"آئی ایم ساری رابیل! ایکچوئیلی یہ میرے کزن ہیں۔ کبھی کبھی یونہی شرارت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

تانیہ اس کا ہاتھ تھام کر لان تک لے آئی کہ ارینجمنٹ وہیں تھی۔ مہمان بھی بس یہی تھے۔ تانیہ اس سے سوری کر رہی تھی جب کہ وہ خفا سی تنے تنے انداز میں اسے بری طرح گھور رہی تھی کہ اس کے عنابی لبوں پر رقصاں مسلسل مسکراہٹ زہر لگ رہی تھی۔

"بھئی، ہم تمہیں سزا تو ضرور دیں گے۔" انکل کہہ رہے تھے۔

"میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"تم ہمیں ایک گانا سناؤ گے۔"

"اوہ نو۔ اس کو سزا دیں انکل! ہمیں کس خوشی میں دے رہے ہیں۔" سب کے سب چلا رہے تھے۔ وہ گانا گانے کو تیار تھا۔ مگر انہوں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اسے روکا تھا۔ تانیہ نے فوراً سب کی توجہ کیک کی طرف دلائی تھی جو ان کی نظر کرم کا منتظر تھا۔ سب کی تالیوں میں ہیپی برتھ ڈے کے گیت اور باسط کی شوخ و شریر نگاہوں کے حصار میں تانیہ نے کیک کاٹا۔

"آپ کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے؟" وہ اس کے عقب میں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"آپ سے مطلب۔" رابیل رکھائی سے بولی۔

"بہت اچھا سا گفٹ دوں گا۔" اس نے گویا لالچ دیا۔

"آپ کو بلاؤں گی تب نا۔" وہ تانیہ کے قریب ہو گئی۔ تانیہ کے امی، ابو جلد ہی انہیں چھوڑ کر اندر چلے گئے تھے۔

"آپ سے ایک بات کہوں۔" ہاتھ میں پیپسی اور پلیٹ میں کیک لئے وہ اس کے قریب چلا گیا۔ "ہم عنقریب دوستی کرنے والے ہیں۔"

"ہم کون؟"

"میں اور تم۔"

"منہ دھو رکھیں۔" وہ پلیٹ میں ایک کباب اور ایک رول رکھ کر تانیہ کے قریب آ بیٹھی۔ پھر اچانک خیال آیا تو باسط سے پوچھنے لگی۔

"تم نے تانیہ کو گفٹ نہیں دیا؟"

"باسط محض کھانس کر رہ گیا۔ تانیہ مسکرا دی۔

"یہ سیکریٹ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نہیں سمجھو گی۔"

"میں کیوں نہیں سمجھوں گی۔"

"بچی ہیں آپ؟" وہ شیطان کی طرح پھر نازل تھا۔

"بچی نہیں ہوں میں۔" رابیل زور دے کر خفگی سے بولی۔

"اچھا تو پھر بتائیں۔ باسط نے تانیہ کو گفٹ کیوں نہیں دیا۔" ذرا سا آگے کو جھکتے ہوئے اس نے متبسم لہجہ و انداز میں پوچھا۔ رابیل نے کچھ لمحے غور کیا پھر سادگی سے کہنے لگی۔

"پیسے نہیں ہوں گے اس کے پاس۔" وجہ اتنی معقول نہ تھی۔ مگر اسے یہی وجہ سوجھی۔

"ارے تم تو واقعی بڑی ہو گئیں۔" اس نے بے اختیار داد دی۔ رابیل سمجھ نہ سکی وہ اس کا مذاق اُڑا رہا ہے یا طنز کر رہا ہے تب ہی چڑ کر بولی تھی۔

"آپ کا اور میرا کوئی مذاق نہیں ہے۔"

"افوہ! اب بس بھی کریں۔ کیا یونہی لڑتے رہیں گے۔" تانیہ نے ٹوکا۔

"میں کیوں لڑوں گی۔ مجھے تو ان کا نام تک نہیں معلوم۔"

"دوسرے معنوں میں آپ میرا نام جاننا چاہتی ہیں۔ ویسے مجھے جنید خاں کہتے ہیں۔"

"جنید!" رابیل نے چونک کر باسط کو دیکھا۔

"دنیا میں محض ایک ہی جنید نہیں ہے۔" باسط نے گویا اسے تسلی دی۔

"یہ دوسرا جنید کون ہے۔" جنید نے چونک کر کہا۔

"آہ، وہ اک دردناک داستان کا عنوان ہیں۔"

باسط نے اک سرد آہ کھینچی۔

"مطلب؟"

"بے چاری رابیل۔"

"میں کیوں ہونے لگی بے چاری۔" رابیل تنک کر بولی۔

"نہیں بے چارے تو وہ ہیں جنید احتشام۔"

"ہیں کون موصوف؟"

"رابیل کے فیانسی۔"

"فیانسی۔" مارے صدمے کے وہ چیخ اٹھا۔ "یہ انگیجڈ ہے۔"

"تو تمہیں ہارٹ اٹیک کس خوشی میں ہونے لگا دوست؟" باسط نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جس کے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔

"ڈونٹ وری۔ یہ ہر حسین لڑکی کی انگیج منٹ پر یونہی پریشان ہو جاتے ہیں۔ جب انہیں باسط کے متعلق معلوم ہوا تھا تب بھی یہی حال تھا۔" تانیہ نے تسلی دی۔

"اوہ۔ پیدائشی مرض ہے۔" باسط نے سر ہلایا۔

"آپ لوگ کچھ اور لیں گے۔" تانیہ کو آداب میزبانی یاد آئے۔

"نہیں تھینکس۔" رابیل نے سہولت سے منع کیا۔

"لیکن مجھے ضرور لینا ہے۔" تانیہ اور باسط اٹھ کر ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ پھر وہیں کھڑے نہ جانے کون سی گتھیاں سلجھانے لگے۔ رابیل بور سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ سامنے بیٹھا شخص پچھلی رات کے سحر کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔ رابیل نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔" جنید نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر تاریکی میں ڈوبے خوبانی کے پیڑ کو دیکھنے لگا۔ رابیل نے ذرا سا رخ موڑ کر باسط اور تانیہ کو دیکھا۔ باسط نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اک نازک سا بریسلیٹ نکالا۔ پھر دھیرے سے اس کی کلائی میں پہنا دیا۔ نازک کلائی جگر جگر کرنے لگی۔ تانیہ کے احمریں لبوں پر تھرکتی مسکان، چہرے پر اترتے الوہی جذبوں کے رنگ، وہ مبہوت سی ہوگئی۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا۔ جنید کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب ہی اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے وہ چونکی۔

"آئی ایم ساری۔" وہ سنبھل کر بولا۔

"فارواٹ؟"

"فار ایوری تھنگ۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔ مگر میں تمہیں جب بھی دیکھتا تھا۔ مجھے ہمیشہ بیلے کی ادھ کھلی کلیوں کا خیال آتا تھا۔ تم اتنی ہی نازک کومل اور خوبصورت نظر

آتی تھیں۔ میں بنا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ مذاق کر بیٹھتا تھا۔ مگر اب سوچتا ہوں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" وہ صاف گوئی سے کہتا چلا گیا۔ رابیل کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے اور وہ اٹھ کر چلا بھی گیا۔

"یہ جنید کہاں گیا؟" باسط نے قریب آ کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "تانیہ! اب میں چلتی ہوں۔"

"ارے اتنے جلدی۔ کچھ دیر تو رکو۔"

"نہیں ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"میں گاڑی لے کر آئی تھی۔"

"اوکے۔" وہ تانیہ کی طرف پلٹا۔ "خدا کرے تانیہ! تم ایسی برتھ ڈے سال میں تین تین بار مناؤ۔"

"سوچ لو، سال میں تین بار گفٹ دینا پڑے گا۔" وہ ہنسی۔

"اٹس مائی پلیشر۔"

تانیہ انہیں گیٹ تک سی آف کرنے آئی۔

"رئیلی رابیل! تمہارا آنا بہت اچھا لگا۔" اس نے محبت سے رابیل کا ہاتھ تھاما۔

"اب تم آنا۔"

"شیور۔" وہ دونوں باہر نکل آئے۔

"کیا ہوا؟"

"ہوں۔" وہ چونکی۔

"کچھ خاموش سی ہوگئی ہو۔"

"نہیں تھک گئی ہوں۔"

"تھکن اور رابیل، امپاسبل۔" وہ ہنسا۔ "اچھا تمہیں جنید کیسا لگا؟"

"ٹھیک ہے۔"

"بہت نائس ہے، آخر تانیہ کا کزن ہے نا۔" اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"ڈرائیونگ احتیاط سے کرنا۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔"

اس نے سر ہلا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مما ٹی وی کھولے اس کی منتظر تھیں۔

"کیسا رہا فنکشن؟" اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

"ٹھیک تھا۔" اس نے دوپٹہ اور بیگ ایک طرف رکھا۔

"کون کون تھا؟"

"زیادہ لوگ نہیں تھے۔ تانیہ کے گھر والوں کے علاوہ باسط، میں اور تانیہ کے ایک کزن جنید بھی تھے۔"

"جنید؟"

"تانیہ کے کزن ہیں۔ ممی! آپ کبھی ملی ہیں ان سے۔"

"نہیں۔ تم کھانا کھاؤ گی؟"

"نو مما! میں بس چینج کر کے سوؤں گی۔"

"اتنی جلدی۔"

"بس نیند آ رہی ہے۔"

"او کے۔ مگر دودھ ضرور پی لینا اور اپنا یہ بیگ اور دوپٹہ لے جاؤ۔"

رابیل مسکرا دی۔ کپڑے چینج کر کے وہ بیڈ پر آنے کے بجائے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ پورے چاند کی نرم کرنوں کا دودھیا غبار نیچے وادی کے مکانوں پر چھایا تھا۔ کہیں کہیں اسٹرابری کی جھاڑیوں میں جگنو ایک پل کو چمک کر غائب ہو جاتا۔ ڈسپنسری کے برآمدے میں جلتا بلب بھی اک جگنو ہی کی طرح لگتا تھا۔ وہ خاموش کھڑی طلسم پھونکتی رات کی جادوگری دیکھتی رہی۔ ذہن کے پردے پر کبھی تانیہ کی کلائی میں بریسلیٹ جگمگانے لگتی تو کبھی اس اجنبی شخص کی مانوس باتیں۔

* * *

"میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پرسوں میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ منگوانا تو نہیں۔"

کافی کا مگ ہاتھ میں لئے وہ لان کی طرف بنی چھوٹی سی پتھروں کی دیوار پر آ بیٹھا۔ وہ جو بڑے انہماک سے سفید گلاب کے پودوں سے فالتو شاخیں الگ کر رہی تھی۔ قینچی رکھ کر کھڑی ہوئی۔

"منگوانا تو کچھ نہیں۔ مگر باسط میں تمہارے ساتھ نہ چلوں۔"

"آنٹی سے پوچھ لو۔"

"کیا؟" وہ ہاتھ میں سرخ خوبانیوں سے بھری پلیٹ لئے نمودار ہوئیں۔

"ممی! میں باسط کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤں۔ پاپا بھی بلا رہے ہیں۔"

"ہاں۔ ابھی آئے ہوئے تمہیں دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"ممی! میں بور ہونے لگی ہوں۔ یہاں کچھ کرنے کو بھی تو نہیں۔" وہ ہاتھ جھاڑتی ان کے قریب چلی آئی۔

"رزلٹ آ جائے تو چلی جانا۔" ان کے صاف انکار پر رابیل کا منہ بن گیا۔

"ممی کی تنہائی کا کوئی خیال نہیں تمہیں۔ تمہارے پاپا تو پہلے ہی کئی ویک اینڈ مس کر جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں مصروف ہوتی ہوں۔ مگر جب گھر لوٹتی ہوں تو محض ایک تمہاری صورت دیکھ کر کتنی فریش ہو جاتی ہوں۔ یہ تم نہیں جانتیں۔"

"ممی! آپ تو اموشنل ہو گئیں۔ ٹھیک ہے نہیں جاتی۔" اس نے ممی کی گال پر پیار کیا۔ تو وہ مسکرا دیں۔

"مجھے مسز شاہنواز کے گھر جانا ہے۔ تم لوگ یہ سرخ خوبانیاں انجوائے کرو۔ خاص وادی ہنزہ کی سوغات ہیں۔"

"کون لایا تھا۔"

"ان ہی کا بیٹا۔" وہ پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر اندر چلی گئیں۔

"آنٹی تمہارے بارے میں بہت پچی ہیں۔ تم ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے ایک موٹی سی خوبانی باسط کی طرف اچھالی۔ جو اس نے باآسانی کیچ کر لی تھی۔

"تم چلے جاؤ گے تو میں بہت اداس ہو جاؤں گی باسط۔"

"اچھا تم ہی تو کہتی تھیں کہ دل لگنے کی واحد وجہ یہ باسط نہیں۔ کہاں گئے وہ تمہارے ڈھیر سارے دوست۔" باسط نے چھیڑا۔

"رانو کی شادی ہو گئی ہے۔ اب تو گل شیر بھی ٹھیک ہے۔"

"تو کوئی اور ڈھونڈ لو۔ یہاں وادی میں ایسے لوگوں کی کمی تو نہیں جنہیں تمہاری ہمدردی اور مورل سپورٹ کی ضرورت ہے۔"

"تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتے ہو۔"

"ہرگز نہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ ورنہ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ دوسروں کے دکھ سکھ بانٹ سکے اور تم تو بچپن سے ہی ایسی ہو۔ جب بھی راستے میں کوئی زخمی کتا بھی نظر آتا تھا تو اٹھا کر گھر لے آتی تھیں اور جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ تم اپنا کھانا پینا بھی بھول جاتی

تھیں۔ کتنا ڈانٹتی تھیں آنٹی تمہیں۔ پھر روتی ہوئی میرے پاس بھاگ آتی تھیں۔‘‘

’’بچپن کتنا خوبصورت ہوتا ہے باسط! تتلیوں کے پیچھے کہاں کہاں نہیں نکل جاتے تھے ہم۔ بہت دور نیچے وادی میں اتر کر ہم اسٹرابری کی جھاڑیاں ڈھونڈا کرتے تھے۔ کبھی یونہی کوئی جگنو پکڑ لیتے تو اسے یوں مٹھی میں قید کرتے جیسے نہ کبھی مٹھی کھلے گی اور نہ یہ جگنو اڑے گا۔ مگر دیکھو مٹھی بھی کھل گئی اور جگنو بھی اڑ گیا۔‘‘ اس نے ہاتھ پھیلا کر خالی ہتھیلی کو دیکھا۔

’’ہمارا بچپن اپنے ساتھ وہ تتلیاں بھی لے گیا اور جگنو بھی۔ مگر تمہیں پتا ہے میں آج بھی تتلیوں کے پیچھے بھاگ پڑتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں اب بھی آدھی رات کو جگنوؤں کی تلاش میں گھر سے نکل پڑوں۔ مجھے اب بھی کوئی زخمی کتا ملتا ہے تو میں اسے اٹھا کر گھر لے آتی ہوں۔ بس ممی کو نہیں بتاتی۔‘‘

اس نے بات ختم کر کے باسط کی جانب دیکھا۔ جو پُرسوچ نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکائے نہ جانے کہاں گم تھا۔

’’کیا سوچنے لگے؟‘‘

’’بہت نازک ہو تم۔ سوچتا ہوں وہ کیپٹن جنید تمہیں سنبھال بھی سکے گا کہ نہیں۔ اچھا ہے، بہت سوبر اور ڈیسنٹ مگر بہت پریکٹیکل۔ ایک ایک سیکنڈ کو کیلکولیٹ کرنے والا یہ تتلی، جگنو کے پیچھے بھاگنا شاید اس کے لئے محض وقت کا زیاں ہو۔‘‘

رابیل کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی آئی۔

* * *

اسے گھر سے نکلے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر اتر کر سرمئی بادلوں نے خوبصورت گھروں کی سرخ ڈھلوانی چھتوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ پھر کن من بوندیں برسنے لگیں۔ پہلی بوند نے اس کے گلابی گال پر بوسہ دیا تو اپنے ہی کسی خیال سے ہاتھ چھڑا کر، اس نے سر اٹھایا۔ آسمان پوری طرح سرمئی بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ اس کی انگلیوں نے نرمی کے ساتھ اپنے گال پر بکھری بوند کو سمیٹ لیا۔

’’ٹپ، ٹپ، ٹپ۔‘‘

اس کے سامنے سارا رستہ بھیگتا چلا گیا۔ وہ آج بھی اپنے ساتھ چھتری لانا بھول گئی تھی اور خود وہ نہ جانے چلتے چلتے کہاں نکل آئی تھی۔

’’واپس نکل جانا چاہئے۔‘‘ وہ جانتی تھی۔ یہاں موسموں کے تیور زندگی کی طرح بدلتے تھے۔ کبھی بہت مہربان، کبھی بالکل بے مہر۔ اس نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے تب ہی اس

نے دوسری طرف سے آتی خاتون کو چکرا کر گرتے اور ان کے ہاتھ سے چھتری چھوٹتے دیکھا تو تقریباً بھاگتی ہوئی ان تک آئی تھی۔

’’اوہ مائی گاڈ۔‘‘ وہ پوری طرح بے ہوش تھیں۔ اس نے مدد کے لئے ارد گرد دیکھا۔ بارش تیز ہو رہی تھی اور رستے سنسان تھے۔ تب ہی اس کی نظر کچھ دور اونچائی پر ناشپاتی کے درختوں میں گھرے سفید کاٹیج پر پڑی۔ تو وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی پتھریلی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ بند دروازہ دھڑ دھڑانے پر جو شخص باہر آیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ششدر سی رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بھی تحیر جاگا تھا۔

’’رابیل تم۔‘‘

’’جنید!‘‘

’’خیریت ہے نا؟‘‘ وہ اس کی پریشان صورت دیکھ کر پوچھنے لگا تو وہ چونکی۔ ’’وہ وہاں کوئی خاتون بے ہوش پڑی ہیں۔‘‘

’’اوہ نو!‘‘ وہ اسے ایک طرف ہٹا کر تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ رابیل کو ظاہر ہے اس کی تقلید کرنا تھی۔ بارش خاصی تیز تھی اور وہ خاتون اب اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

’’آپ ٹھیک تو ہیں ماما!‘‘ جنید کے مضبوط بازوؤں نے انہیں سہارا دے کر کھڑا کیا۔

’’ماما!‘‘ رابیل نے چونک کر جنید کو دیکھا۔

’’ہاں ٹھیک ہوں۔ یونہی چکر آ گیا تھا۔‘‘

’’آؤ رابیل۔‘‘ جنید نے کہا اور انہیں سہارا دے کر اوپر لے جانے لگا۔ رابیل نے تیز ہوتی بارش کو دیکھا۔ پھر خاموشی سے ان کے پیچھے ہولی۔

’’آپ ملازم کے بغیر مت نکلا کریں۔‘‘

’’چہل قدمی کے لئے نکلی تھی۔ یونہی چکر آ گیا۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں لڑکے۔ تم خوامخواہ پریشان مت ہو۔‘‘ تب ہی ان کی نگاہ دروازے کے ساتھ کھڑی رابیل پر پڑی تو سوالیہ نظروں سے جنید کی طرف دیکھا۔

’’یہ رابیل ہے۔ اسی نے آپ کو گرتے دیکھا تو مجھے بتانے آئی تھی۔‘‘ جنید نے بتایا۔

’’ارے یہ رابیل ہے۔‘‘ ایک بے ساختہ سی خوشی ان کے لہجے میں در آئی۔ ’’ادھر میرے پاس آؤ بچے۔‘‘

رابیل ان کے قریب چلی آئی۔

’’ماشاء اللہ کیسی پیاری بچی ہے۔‘‘ انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے

بے اختیار کہا۔

”اس پیاری بچی کے ساتھ آپ ڈھیر ساری باتیں کیجئے گا۔ مگر ابھی آپ لیٹ تو جائیں۔

جنید نے کہا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پہلے کپڑے بدلوں گی۔ رابیل بیٹی! تم اس آتش دان کے پاس بیٹھو۔“ وہ محبت سے کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جنید سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر شاید کوئی میڈیسن ڈھونڈنے لگا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر خاموش کھڑی رابیل کو دیکھا۔

”رابیل! تم کافی بنا لیتی ہو؟“

”رابیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”پلیز، تین کپ کافی بنا لاؤ۔ یہیں دائیں سائیڈ پر کچن ہے۔“ مصروف سے انداز میں کہتے کہتے وہ رکا۔

پھر مسکرا دیا۔“ اگر کوئی پرابلم نہ ہو تو۔“

”بنا دیتی ہوں۔“ اسے حیرت تو ہوئی تھی۔ مگر وہ کچن میں آ گئی۔ چھوٹا سا آراستہ و پیراستہ کچن تھا۔ اسے کافی کا ڈبہ اور شوگر وغیرہ ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگی۔ کافی بنا کر لائی تو وہ دونوں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔

”آپ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتیں۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”عجیب باتیں سوجھتی ہیں تمہیں اور یہ کیا طریقہ ہے مہمان سے کام کرواتے ہو۔ خود نہیں بنا سکتے تھے۔“ انہوں نے رابیل کو دیکھتے ہی جنید کو ڈانٹا۔ اس نے پلٹ کر رابیل کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔

”یہاں بیٹھو رابیل! آتشدان کے پاس۔“ خود وہ جگہ خالی کر کے دوسری سائڈ پر چلا گیا تھا۔

”اب کیا خالی کافی پر ٹرخاؤ گے۔“ انہوں نے گھورا۔ تو وہ کان کھجاتا کچن میں چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں وہ اخروٹ کا حلوہ دو پلیٹوں میں نکال لایا تھا۔ ایک پلیٹ اس نے رابیل کے سامنے رکھی، دوسری خود لے کر بیڈ پر ماما کے پاس ٹک گیا۔

”تم آئے کب تھے؟“ ماما نے کافی کا سپ لیا۔ پھر رابیل کو دیکھ کر بولیں۔“ بہت اچھی بنی ہے۔“

”واقعی حیرت ہے۔“ جنید نے اپنا مگ اٹھایا تو ماما اسے گھورنے لگیں۔

”میں تم سے آنے کے متعلق پوچھ رہی تھی۔“

”اب تو جانے کی بات کریں۔“

”مطلب۔“

”ایک گھنٹہ پہلے آیا تھا۔ محض آپ کو دیکھنے اب تو واپس جانا ہے۔“

”کیوں؟“

”ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ ویک اینڈ پر آؤں گا۔“

”پرامس۔“ انہوں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”پرامس۔“ جنید نے گرمجوشی سے ان کا ہاتھ دبایا۔

”یہ بچی یونہی خاموش رہتی ہے۔“ انہوں نے چپ بیٹھی رابیل کو دیکھا۔

”نہیں، بہت بحث کرتی ہے۔ بہت لڑتی ہے اور بہت غصہ بھی کرتی ہے۔ یہ تو آپ کا رعب یا جلال ہے جو یوں گم صم ہو گئی ہے۔“

”ہوں بہت بولنے لگے ہو۔“

”میں اب چلتی ہوں آنٹی۔“ وہ مگ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اتنی جلدی۔“ وہ اس کے یوں اٹھ جانے پر حیران ہوئیں۔

”تم نے تو حلوہ بھی نہیں کھایا۔“ جنید یوں بولا گویا وہ یہاں صرف اخروٹ کا حلوہ کھانے آئی تھی۔

”بارش رک گئی ہے اور ممی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ گویا اجازت مانگ رہی تھی۔

”میں چھوڑ آتا ہوں۔“ جنید نے پلیٹ اور مگ ایک طرف رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

”ہاں، تم چھوڑ آؤ۔“

”آؤ نہیں مام جاؤ۔ میں بس جا رہا ہوں۔ پھر ویک اینڈ پر آؤں گا۔“ وہ جھکا۔ انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور ان کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

”خود کو فورس مت کرنا۔ اگر فری ہوئے تب آنا۔“

”فورس تو مجھے آپ اور آپ کی محبت کرتی ہے مام۔“

”رابیل بیٹا! پھر کبھی ضرور آنا۔ میں تو سارا دن گھر پہ تنہا ہی ہوتی ہوں۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

”تم اتنی دور تنہا مت نکل آیا کرو۔“ وہ اس کے برابر چلنے لگا۔

”آپ میری تھوڑی برائیاں اور گنوا دیتے۔“

"ہاں۔" اس کا جان دار قہقہہ فضا میں بکھرا۔ "گنوا دیتا جو...... ماما مجھے روک نہ دیتیں۔ بائی دا وے ماما کیسی لگیں تمہیں؟"

"نائس۔ آپ سے بہت مختلف ہیں۔"

"خوامخواہ میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ یقین کرو اتنا برا نہیں ہوں۔"

"اس سے زیادہ ہیں۔"

وہ ایک دم رک کر سامنے آیا۔

"تم مجھے واقعی ایسا ہی سمجھتی ہو۔"

رابیل کچھ لمحے اسے یونہی دیکھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر مسکرائی۔

"سینس آف ہیومر تو آپ میں بھی نہیں ہے۔" وہ اس کے سائیڈ سے نکل کر آگے چلنے لگی۔ بارش میں دھل دھلا کر سبزہ نکھر آیا تھا۔ چہار سو گویا بارش نہیں رنگ برسے تھے۔ جنید نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔ پھر پرسوچ انداز میں مسکرایا۔

"تمہارا میرے ساتھ ایک وعدہ تھا۔"

"کافی کا۔" رابیل کچھ سوچ کر بولی۔

"تمہیں یاد ہے؟"

"میری یادداشت اتنی کمزور نہیں۔ دوسرے وہ وعدہ نہیں ادھار تھا۔"

"کب چکاؤ گی وہ ادھار؟"

"آپ کہیں تو آج ہی۔" وہ اپنے گھر کے عین سامنے کھڑی تھی۔ جنید نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر سہی۔ دوبارہ ملنے کا بہانا تو چاہیے نا۔"

رابیل نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈھلوانی رستے پر چڑھنے لگی۔ پھر پلٹ کر اسی نے جنید کو پکارا۔

"جنید صاحب! مجھ سے ملنے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں میں اور میرے گھر والے بہت مہمان نواز ہیں۔ آپ کو جب بھی آنا ہوا تو بغیر کسی بہانے کے آجائیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ ہاتھ ہلا کر چل دی۔

جنید نے اسے گھر کے اندر غائب ہونے تک دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

* * *

کئی دن ایک ایک کر کے بیت گئے۔ کبھی وہ تانیہ کی طرف چلی جاتی۔ کبھی تانیہ اس کی

طرف آ جاتی۔ وہ دوستوں کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ تب ہی محض تانیہ کے ساتھ ہی دوستی ہوئی البتہ جان پہچان بہت سے لوگوں کے ساتھ تھی۔ لیکن ان میں بھی اکثریت وادی کے ان پڑھ اور محنت کش لوگوں کی تھی۔ وہ ان کے مسائل دیکھتی اور سمجھتی تھی۔ جہاں تک ہو پاتا مدد بھی کرتی۔ باسط اور پاپا کا ایک دو بار فون آیا تھا۔ اس دن تانیہ نے سارا دن اس کے پاس گزارا تھا۔ وہ اسے سی آف کرنے گیٹ تک چلی آئی۔ تب ہی راستے کے اختتام پر ایک مقامی شخص نے تانیہ کو روک کر کچھ پوچھا تھا۔ تانیہ نے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ جو پلٹنے والی تھی۔ وہیں رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی باسکٹ تھی۔

"آپ رابیل بی بی ہو؟" اس نے قریب آکر پوچھا۔

"ہاں!"

"یہ ہماری بیگم صاحب نے بھجوائی ہیں۔" اس نے ٹوکری رابیل کی طرف بڑھائی۔

"بیگم صاحب۔" رابیل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ چھوٹے سے کاغذ پر ایک ہی سطر تھی۔

تم نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا تھا اچھی لڑکی۔

جنید کی ماما

"انہیں میری طرف سے شکریہ کہنا اور کہنا میں آؤں گی۔" رابیل نے مسکرا کر کہا اور باسکٹ تھام لی۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔ رابیل باسکٹ سنبھال کر اندر لے آئی۔

"یہ کیا اٹھا لائی ہو؟" ماما نے پوچھا۔

"ممی! وہ جنید کی ماما ہیں نا۔ انہوں نے بھجوایا ہے کچھ۔" وہ ان کو پہلے ہی سب بتا چکی تھی۔ ساتھ ہی اس نے باسکٹ کھولی۔ ناشپاتیاں تھیں۔ ہلکی زرد اور بڑی بڑی۔

"تم ان کا شکریہ ادا کرنا۔ مگر باسکٹ خالی مت لے جانا۔"

"اوکے۔"

اگلے دن تک وہ سوچتی رہی کہ باسکٹ میں کیا لے کر جائے اور پھر کچھ سوچ کر وہ سہ پہر میں بارش ہو جانے کے بعد چھتری اور باسکٹ لے کر نکل آئی۔ جنید کا گھر ان کی بیک سائیڈ پر تھا۔ اسے ایک لمبا چکر کھا کر جانا پڑتا تھا۔ اسے آنٹی ناشپاتی کے چھوٹے سے باغ میں ہی مل گئی تھیں۔ وہ ناشپاتی اتروا رہی تھیں۔ جبکہ ان کے دونوں ملازم ان کو ٹوکریوں میں رکھ رہے تھے۔

"ہیلو آنٹی۔"

"اوہ رابیل۔" وہ چونک کر پلٹیں۔ "کتنے دنوں بعد آئی ہو۔ میرا تو خیال تھا تم اگلے دن ہی آؤ گی۔"

"وہ بس کچھ مصروفیت رہی آنٹی! تو اس لئے۔" وہ ان کی اتنی محبت پر شرمندہ سی ہوگئی۔

"یہ بتاؤ ناشپاتی کھائی تھی؟" اسے شرمندہ دیکھ کر انہوں نے موضوع ہی بدل دیا۔

"ارے آنٹی! ان میں تو بیج ہی نہیں تھے اور بہت مزے کی تھیں۔ آپ کے اپنے باغ کی تھیں نا۔"

"آف کورس!"

"ممی تھینک یو کہہ رہی تھیں۔"

"شکریہ کی کیا بات ہے بیٹا۔ آؤ اندر کافی پیئیں گے اور بہت سی باتیں کریں گے۔ اس دن تو تم سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ تم اتنی جلدی چلی گئی تھیں۔"

"ممی کو بتا کر نہیں آئی تھی نا اس لئے۔ آج تو بالکل فارغ ہوں۔"

"اور آج تمہیں اخروٹ کا حلوہ بھی کھانا ہوگا۔ بالکل تازہ بنایا ہے میں نے۔"

"آپ کوکنگ بھی کر لیتی ہیں آنٹی۔"

"تو کیا کروں۔ سارا دن فارغ ہی تو ہوتی ہوں۔ بس یہی کچھ کر کے خود کو مصروف رکھتی ہوں۔"

"ممی بھی بہت اچھی کوکنگ کر لیتی ہیں۔"

"حالانکہ وہ ڈاکٹر ہیں۔" وہ اسے لئے اندر آ گئیں۔ "بیٹھو۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" اس نے باسکٹ اور چھتری نیچے رکھی اور خود کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"جنید نے بتایا تھا۔"

"اچھا!" رابیل کی نظریں کارنس پر دھری جنید کی تصویر پر گئیں۔

"میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

"میں آپ کے ساتھ آتی ہوں آنٹی! یہاں اکیلی کیا کروں گی۔" وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

"اچھی بات ہے۔" وہ خوش دلی سے بولیں اور اسے ساتھ لے کر کچن میں آ گئیں۔

"تم پڑھتی ہو؟"

"بی اے کا ایگزام دیا ہے۔ رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"آگے پڑھو گی؟"

"سوچوں گی۔" اس نے لاپروا سے لہجے میں کہا۔

"لائیں کافی میں بناتی ہوں۔" وہ مشفق سی خاتون تھیں۔ پھر تنہا۔

کافی لے کر وہ لوگ سٹنگ روم میں آ گئے۔ آنٹی اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہیں۔ تب ہی میاؤں میاؤں کی معصوم سی آوازوں سے وہ چونک گئیں۔

"یہ، یہ بلی کہاں سے آ گئی؟"

"وہ۔" رابیل کی نگاہ باسکٹ تک گئی۔

"یہ، یہ آوازیں باسکٹ سے آ رہی ہیں۔"

"وہ آنٹی! ممی کہہ رہی تھیں باسکٹ خالی مت لے جانا۔ تو میں یہ......" اس نے باسکٹ سامنے کر کے ڈھکن اٹھا دیا۔

"اور تم میرے لئے یہ بلی کے بچے لے آئیں۔" ننھے منے روئی کے گالے جیسے دو سفید بچے باسکٹ سے جھانک رہے تھے۔

"دراصل آنٹی! وہ ان کی مدر اک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئی ہے۔ میں نے گیراج میں چھپا کر رکھے تھے، آپ، آپ کو اچھے نہیں لگے۔" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے میری بیٹی لائی ہے تو اچھے کیوں نہیں لگیں گے۔" وہ مشفق لہجے میں بولیں ساتھ ہی گلریز کو آواز دی۔

"یہ لے جاؤ ان کو اور بہت سنبھال کر رکھنا۔" گلریز کے آنے پر انہوں نے کہا۔

"ان کو دودھ بھی پلا دینا۔ کسی کم گہرے پیالے میں ڈال کر اور باری باری پلانا۔ یہ کلی ہے نا بڑا تیز ہے۔ سب پی جائے گا۔" اس نے ایک بچے کے سر پر پیار بھری چپت لگائی۔

گلریز نے بڑی حیرت سے انہیں پھر بلی کے بچوں کو دیکھا۔

"مگر بیگم صاب!"

"تم لے جاؤ گلریز۔" انہوں نے رسانیت سے کہا۔ وہ ٹوکری اٹھا کر باہر نکل گیا۔

"آنٹی ہم ان کے لئے علیحدہ گھر بھی بنائیں گے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔ رابیل آنٹی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار کر آئی تھی۔

"ممی! آپ بھی ان سے ملیے گا۔ وہ بہت اچھی، بہت نائس ہیں۔"

"ہاں بھائی! اب تو ملنا ہی پڑے گا۔ ہماری بیٹی نے اتنی تعریفیں جو کر دی ہیں۔"

"مجھے تو حیرت ہے۔ آپ آج تک ان سے ملیں نہیں۔ حالانکہ وہ ہمیشہ سے یہیں رہتی

آئی ہیں۔"

رابیل نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"میں تو ہمیشہ سے یہاں نہیں رہی۔ زیادہ تر ایجوکیشن کے سلسلے میں پنڈی اور اسلام آباد ہی رہی تھی۔ اب بھی اتنی مصروفیت ہے کہ زیادہ ملنے جلنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔" ممی نے قدرے تفصیل بتائی۔

"کل چلیں گی میرے ساتھ۔"

"کل نہیں پھر کسی دن سہی۔" انہوں نے اپنی مصروفیت سوچ کر انکار کیا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ بھی فوراً مان گئی۔

"ویسے اچھا ہے۔ تمہیں اک نئی مصروفیت مل گئی۔ اب خوب اپنی آنٹی کے ساتھ گپیں لگانا۔" ممی نے ہنس کر کہا اور اگلے دن وہ آنٹی کے ساتھ مل کر کلی اور ڈکی کے لئے چھوٹا سا گھر بنا رہی تھی۔

"تمہاری انگیجمنٹ ہوگئی ہے رابیل۔" آنٹی نے اچانک پوچھا۔

"جی ہوگئی ہے۔" رابیل نے منہ بنایا۔

"کہاں ہوئی ہے؟"

"کوئی انجینئر ہیں۔ جنید احتشام اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ پاپا کے کسی دوست کے بیٹے ہیں۔"

"تم اس سے ملیں نہیں۔" آنٹی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" رابیل نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"اچھا تمہاری فیملی اتنی کنزرویٹو لگتی تو نہیں۔" انہوں نے رابیل کے حلیے پر نگاہ کی۔ حسب معمول وہ سفید جینز اور ییلو شرٹ میں ملبوس تھی۔

"منگنی کیسے ہوئی۔"

"جنید کے ممی ڈیڈی آئے تھے۔ اس کی ممی نے ...... رنگ پہنائی اور منگنی ...... ہوگئی۔" اس نے اپنی بے رنگ منگنی کی تفصیل بتائی۔

"تم سے پوچھا بھی نہیں کسی نے۔"

"پوچھا تھا۔ تصویر بھی دکھائی تھی۔ مگر میں اس وقت غصے میں تھی۔ لفافہ باسط کے منہ پر دے مارا۔ وہ اتنا ذلیل نکلا۔ آج تک واپس ہی نہیں دی حالانکہ میں کئی بار چپکے چپکے اس کے کمرے کی تلاشی لے چکی ہوں۔" وہ بڑی بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

"تو تم اس سے ایک بار مل ہی کیوں نہیں لیتیں۔" آنٹی نے مشورہ دیا "اور یہ کوئی اتنی معیوب بات بھی نہیں۔ حق ہے تمہارا۔"

"پہلے تو نہیں۔ بٹ اب میرا دل چاہتا ہے ایک بار اس سے ملنے کو مگر میں ملوں گی نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیا اس نے ایک بار بھی کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے، وہ مصروف ہو۔"

"ہاں مصروف تو بہت ہیں وہ۔ سنا ہے بہت پریکٹیکل انسان ہے۔ ایک ایک سیکنڈ کو کیلکولیٹ کرنے والا۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ چلتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایسے لوگ تو بہت آگے جاتے ہیں۔"

"بظاہر۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کو پتا ہے یہ بڑے بڑے عظیم لوگوں کی ازدواجی زندگی کیوں ناکام رہتی ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ ہر فیصلہ دماغ سے کرتے ہیں۔ دل جیسی کوئی چیز ہی نہیں ہوتی ان کے پاس ان کے نزدیک نازک وخوبصورت جذبات کچھ بھی معنی نہیں رکھتے۔" یہ سب کہتے ہوئے آنٹی کو وہ ہرگز وہ رابیل نہیں لگی تھی جو ان کے لئے بلی کے بچے لائی تھی۔

"شادی کے بعد تم بھی تو پریکٹیکل ہو جاؤ گی۔ ہر لڑکی ہو جاتی ہے۔

اسے تتلی اور جگنو کے پیچھے بھاگنا وقت کا زیاں لگتا ہے۔ شادی کے بعد کہاں یاد رہتے ہیں یہ تتلی اور جگنو۔"

"میں باسط اور تانیہ کو دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ کتنا سمجھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو ان کی تو چلیں بچپن سے دوستی بھی ہے۔ مگر کبھی کوئی کارڈ بھی کوئی فون، کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے لئے اس بے جان ڈائمنڈ رنگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جسے میری انگلی میں ڈال کر وہ بھول گیا ہے۔" وہ سخت برگشتہ تھی کہ جس طبقے سے وہ تعلق رکھتی تھی وہاں یہ سب بہت اہمیت رکھتا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے لئے کچھ لاتی ہوں۔" آنٹی تسلی آمیز لہجے میں کہہ کر کھڑی ہوگئیں۔

"مجھے لگتا ہے آنٹی! میں اس جیسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"تو کیسا شخص چاہئے تمہیں؟" آنٹی نے ذرا رک کر پوچھا۔ وہ خاموشی سے لکڑی میں کیل ٹھونکنے لگی۔ آنٹی کچھ لمحے منتظر رہیں۔ پھر اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ وہ ہاتھ روک کر نہ جانے کیا سوچنے لگی۔ پھر زیرلب بڑبڑائی۔

"ہاں اگر جنید خان جیسا ہوتا تو......"

"تو......" وہ عین اس کے سامنے بیٹھا۔ رابیل ششدر سی اسے دیکھے گئی اور جب اپنا ہی جملہ سمجھ میں آیا تو تیزی سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" جنید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں چلتی ہوں۔" رابیل بہ دقت بولی۔

"کیوں؟" اس کی نگاہوں میں مسکراہٹ جاگی۔ رابیل بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی۔ جنید اٹھ کر گرل تک آ گیا۔ اس نے بہت دور تک رابیل کو بھاگتے دیکھا۔ سرخوشی کا ایک عجیب احساس اس کے پورے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ دونوں ہتھیلیاں گرل پر ٹکا کر اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ بڑی جان دار تھی۔

* * *

"اوہ گاڈ! کیا ہو گیا تھا مجھے۔ ابھی اس شخص کو جانتی ہی کتنا ہوں میں۔ ابھی کچھ دن پہلے تک وہ شخص کتنا برا اور ناقابل برداشت لگتا تھا۔ پھر میں اتنی جلدی کس طرح سوچ سکتی ہوں کہ میں رابیل مراد، جنید خاں جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں۔"

مارے خجالت و شرمندگی سے اس کا برا حال تھا۔

"کیوں پھسل گیا وہ جملہ میرے منہ سے اور یہ بھی ضروری تھا کہ جنید سن بھی لیتا۔" جب سے آئی تھی بس یہی سوچے جا رہی تھی۔ ممی کب سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ پھر خود ہی اس کے کمرے تک چلی آئیں۔

"کہاں گم ہو رابی؟ کب سے پکار رہی ہوں۔ باسط کا فون ہے تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔" انہوں نے موبائل اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود چلی گئیں۔

"ہیلو۔"

"تھینک گاڈ! تم زندہ ہو۔"

"تم نے کیا سوچا تھا، تمہارے جانے کے بعد میں خودکشی کر لوں گی۔"

"جس طرح آنٹی مسلسل تمہیں آوازیں دے رہی تھیں اور تم جس طرح خاموش تھیں۔

اس کے بعد تو میں یہی سوچ سکتا تھا۔ کیا سو رہی تھیں؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"سمجھ لیا۔ شام کو چھ بجے سونے کی نامعقول حرکت صرف تم کر سکتی ہو۔"

"فون کیوں کیا ہے؟"

"تمہارا حال پوچھنے کے لئے، کیسی ہو؟"

"آئی ایم فائن......!"

"شہر کا موسم کیسا ہے؟"

"جب سے تم گئے ہو، بہت اچھا ہے۔"

"یہ تو تم کہہ رہی ہو، ذرا تانیہ سے پوچھو۔"

"اس سے تم خود پوچھا کرو۔ تمہاری اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

"بہت زوروں پر ہیں۔ اگلے دو ماہ تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔"

"سرونٹ بھجوا دوں۔"

"کس لئے؟"

"سر کھجانے کے لئے۔"

"ناٹ بیڈ آئیڈیا۔" وہ ہنسا۔ "اچھا سنو! میں تمہارے اس پرنس چارمنگ سے ملا ہوں۔ یار! کیا غضب کا بندہ ہے اور کیا ڈریسنگ ہے۔ مجال ہے جو اس کے لباس پر کبھی ایک شکن بھی دیکھی ہو۔ اس کا بیڈ روم دیکھو۔ ایک سے ایک خوبصورت اور قیمتی چیز سجی ہے۔ میرا تمہارا بیڈ روم تو کباڑ خانہ ہے اس کے نزدیک۔"

"تو مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" اسے کوفت ہونے لگی۔

"یار! اس لئے بتا رہا ہوں کہ تھوڑا اسدھر جاؤ۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے تو بہت الرٹ ہونا پڑے گا۔" باسط جانتا تھا، وہ کتنی لاپروا ہے۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی بڑھا دیتا تھا۔

"ویسے پوچھ رہے تھے تمہارا؟"

"کیا؟" وہ بے اختیار پوچھنے لگی۔

"یہی کہ ان کی پرنسس نے تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھاگنا بند کیا یا نہیں۔"

"میں کسی کے بھی پیچھے بھاگوں، انہیں کیا تکلیف ہے۔" وہ چڑ ہی تو گئی۔

"یہی تو معلوم نہیں۔ پوچھ کر بتا دوں گا۔"

"اب واقعی پوچھنے مت بیٹھ جانا۔" رابیل نے بے اختیار کہا۔

"اچھا کیا بتا دیا۔ میں تو واقعی پوچھ لیتا کہ سر آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے اگر ہماری رابیل تتلوں کے پیچھے۔"

رابیل نے چڑ کر فون بند کر دیا۔

"سمجھتا کیا ہے وہ خود کو۔"

* * *

وہ گل بی بی سے بیکڈ قیمہ بنانا سیکھ رہی تھی جب عبدل نے آ کر بتایا۔

"آپ کا کوئی مہمان آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ نام نہیں بتایا۔"

"عبدل! نام تو پوچھ آیا کرو۔" وہ ایپرن اتارتے ہوئے بولی۔ "ممی نہیں آئیں؟"

"آ گئی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

"اچھا!" ہاتھ دھو کر وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو جنید کو دیکھ کر رک سی گئی۔

"آؤ بیٹا! جنید کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" ممی نے شاید مکمل تعارف حاصل کر لیا تھا۔ تب ہی خوش دلی کے ساتھ بولیں۔

"گل بی بی! کافی لے آؤ۔" رابیل نے پلٹ کر آواز دی۔

"نہیں میں کافی پینے نہیں آیا۔" جنید نے فوراً انکار کر دیا۔

"تو؟"

"آپ کو لینے آیا ہوں۔ ممی بلا رہی ہیں۔"

وہ ابھی کوئی معقول بہانا سوچ ہی رہی تھی کہ ممی بول اٹھیں۔

"ہاں ہاں، چلی جاؤ۔"

"ممی! وہ میں۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پلیز۔"

"او کے۔" وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ آ گئی تھی۔

"اتنا سا سچ بول کر گھبرا گئیں۔" پتھریلا رستہ عبور کر کے وہ لوگ روڈ پر آئے تو جنید اچانک بولا تھا۔

"جی؟"

"اگر اپنے ہی سچ کو فیس کرنے کی ہمت نہیں تو اسے جھوٹ کا لبادہ اڑھا دیں۔"

"میں نے کوئی سچ جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"لیکن یہ تو سچ ہے نا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔"

وہ ساکت ہو گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

"سچ تو یہ بھی ہے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔"

جنید نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

"جنید احتشام کو کرتی ہو۔"

"ہاں۔" وہ جز بز ہو کر بولی۔

"اس کے باوجود کہ تمہارے اور اس کے مزاج میں کوئی مطابقت نہیں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی تو مجھے اسی کے ساتھ کرنا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ "اور جنید صاحب پلیز، آپ میری پرسنل لائف میں انٹرفیئر مت کیا کیجئے۔"

"پرسنل لائف۔" اس نے زیر لب دہرایا پھر کندھے اچکا کر بولا تھا۔ "او کے۔"

"آنٹی کو کیا ہوا ہے؟"

"جا رہی ہیں۔ پوچھ لیجئے گا۔" وہ رکھائی سے بولا تھا۔

آنٹی کو بخار تھا۔ دیکھتے ہی شکوہ کرنے لگیں۔

"اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی ہو؟"

"آپ کو کیا ہوا؟" وہ ان کا سوال نظر انداز کر گئی۔ جنید اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

"جب بہت تنہا ہوتی ہوں تو بیمار ہو جاتی ہوں۔ شاید اپنوں کو پاس بلانے کا بہانا ڈھونڈنے لگتی ہوں۔" وہ مضمحل سا مسکرائیں۔

"اپنوں کو پاس بلانے کے لئے بہانوں کی ضرورت ہوتی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں! پہلے تو کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنے پاس بلا سکتی۔ اب دھیان بار بار تمہاری طرف جاتا تھا۔ مگر میں نے سوچا، تم مصروف ہو گی۔ اس لئے ملازم کو نہیں بھیجا۔ آج جنید خود ہی لے آیا۔" انہوں نے پانی ڈالنے کو جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ خالی تھا۔

"بہت اچھا کیا انہوں نے۔ میں پانی لاتی ہوں۔" رابیل جگ اٹھا کر کچن میں آئی۔

جنید شاید کافی بنا رہا تھا۔ آہٹ پر پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"پانی لینا تھا۔"

"میں لاتا ہوں۔تم چلو۔" جنید نے جگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔رابیل پلٹ آئی۔
وہ اس کے پیچھے ہی پانی اور کافی لے آیا۔مگ اس کے ہاتھ میں تھما کر پھر باہر نکل گیا۔رابیل وہاں بہت دیر رکنا چاہتی تھی مگر اس وقت گھر میں جنید کی موجودگی ڈسٹرب کر رہی تھی اگرچہ وہ کمرے میں نہیں تھا۔سوا گلے دن کا وعدہ کر کے اٹھ گئی۔جنید باہر ہی بیٹھا تھا۔کافی کا خالی مگ سامنے پڑا تھا۔

"بہت جلد جا رہی ہو۔"

رابیل نے بس اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"پھر ضرور آنا۔ممی بہت یاد کرتی ہیں تمہیں۔"

وہ خاموش ہی رہی۔

"پتا ہے رابیل! ہمارے گھر کے پیچھے ایک چھوٹی سی آبشار ہے۔"

"جانتی ہوں۔"

"میں وہاں بیٹھ کر اکثر ایک بات سوچتا ہوں۔"

"کیا؟" پہلی سیڑھی پر رک کر اس نے یوں ہی پوچھا تھا۔

"کاش تمہاری انگیج منٹ نہ ہوئی ہوتی۔" وہ محض نظروں کا زاویہ بدل کر بولا تھا۔نہ جانے وہ یہی بات سوچتا تھا۔یا اب اس کے ذہن میں آئی تھی۔رابیل کی پیشانی پر اک شکن سی ابھری مگر نہ جانے کیوں وہ خاموشی سے لوٹ آئی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے ان کی؟" ممی نہا کر نکلی تھیں۔

"ٹھیک ہیں۔بس ہلکا سا بخار ہے۔"

"جنید بہت اچھا لڑکا ہے۔میں آج پہلی بار ملی ہوں اس سے۔"

"وہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔میں کئی بار ملی ہوں اس سے۔"

ممی نے بے حد حیرت سے اسے اوپر جاتے دیکھا تھا۔

شاید انہیں جنید کا شوخ و شریر، سادہ سا بے تکلفانہ انداز اچھا لگا تھا۔کچھ بھی تھا۔مگر وہ شخص اسے دھیرے دھیرے ڈسٹرب کرنے لگا تھا اور وہ ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتی تھی۔تب ہی وہ کئی روز وہاں جاتی رہی۔مگر کبھی ویک اینڈ پر نہیں گئی تھی۔

* * *

"ممی! آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔" وہ نیوز بڑے انہماک سے سن رہی تھیں۔

"آپ نے میری منگنی...... جنید احتشام کے ساتھ ہی کیوں کی؟"

"ہم کسی سے بھی کرتے۔آج تم یہ سوال کر رہی ہوتیں۔"

"ممی پلیز۔"

ممی نے ٹی وی آف کر دیا "یہ کیسا سوال ہے بیٹا۔وہ ایک اچھا، معقول اور شریف انسان ہے۔تمہیں خوش رکھے گا۔بس یہی سوچ کر بات طے کر دی۔"

"آپ کو یقین ہے، وہ مجھے خوش رکھے گا۔"

"رابیل۔" ممی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بظاہر ایک اچھے پرپوزل میں جو خوبیاں ہوتی ہیں۔وہ سب جنید کے پرپوزل میں موجود تھیں۔وہ ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔کامیاب انجینئر ہے۔گڈ لکنگ ہے۔باقی تو تمہاری قسمت ہے بیٹا۔"

"ممی! کیا جنید خوش ہیں؟"

"کیوں نہیں ہوگا اور تم کیا سوچ رہی ہو۔اتنی کیئر کرتے ہیں وہ لوگ۔تمہاری ساس تو کئی کئی بار تمہارے لئے فون کرتی ہیں۔"

"میری شادی اس کی مدر کے ساتھ نہیں ہوگی ممی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"تو پھر تم چاہتی کیا ہو؟"

"اس سے ملنا۔میں کم از کم ایک بار اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کیا ہوا رابیل؟" انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے۔ہمارے لئے زیادہ بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مل لیں۔"

"تم نے پہلے تو ایسی بات نہیں کی تھی۔"

"اب کر رہی ہوں نا۔"

"اب کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"ممی! کوئی انہونی بات تو نہیں کہہ دی میں نے، کیا کوئی پرابلم ہے۔"

"تو پرابلم کیا ہوگی۔وہ تو نہ جنید نے ایسی کوئی بات کی اور نہ تم نے۔"

"یہی پرابلم ہے ممی۔جنید احتشام جیسا شخص یوں بنا سوچے سمجھے کس طرح راضی ہو سکتا ہے۔"

"بنا سوچے سمجھے۔بھئی، اس نے تمہیں دیکھ رکھا تھا۔"

"مجھے کہاں؟"

"کہیں بھی دیکھا ہوگا۔ تب ہی تو پرپوزل بھیجا تھا۔ پھر تمہاری تصویریں بھی لے گئی تھیں مسز احتشام۔"

"اور منگنی...... کے وقت غائب ہو گئے تھے موصوف۔" وہ جل کر بولی۔

"اسے جاپان جانا پڑ گیا تھا ایک کورس کے سلسلے میں۔ سب کچھ طے تھا۔ سوچا کیا ڈیلے کریں۔ سو یوں ہی منگنی کر دی۔ تمہارے پاپا سے تو ملاقات ہوتی رہتی ہے اس کی۔ باسط بھی مل چکا ہے۔ اگر تم ملنا چاہتی ہو تو میں تم دونوں کی ایک میٹنگ ارینج کروادوں گی۔" انہوں نے مسئلہ حل کیا۔

"تھینک یو مام۔"

* * *

"آنٹی! میں نے ممی سے کہہ دیا ہے، میں جنید احتشام سے ملوں گی۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا۔" وہ آنکھیں موندے ایزی چیئر پر نیم دراز تھیں۔ گود میں کتاب الٹ کر رکھی تھی جبکہ رابیل خود اِدھر اُدھر ننھے ننھے کاسنی پھول جمع کر رہی تھی۔

"اب میں بہت پریکٹیکل ہو رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اگر وہ ویسا ہی ہوا جیسا باسط بتاتا ہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"خوابوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو لڑکی۔ بی پریکٹیکل۔"

"اگر وہ مجھے بالکل پسند نہ آیا تو؟"

"فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہے۔"

"ہاں۔" رابیل پھول سمیٹ کر ان کے قریب چلی آئی۔

"آنٹی! ایک بات پوچھوں۔"

"اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟"

"آپ کے شوہر یہاں نہیں آتے؟" رابیل نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ اتنے ڈھیر سارے دنوں میں اس نے ایک بار بھی ان کو یہاں آتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی آنٹی نے ذکر کیا تھا۔ ان کی ہر بات جنید سے شروع ہو کر جنید پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ کرید کی اسے عادت نہیں تھی۔ سو اس نے یہی سمجھا جنید ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ آج اچانک خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

آنٹی کی جھولتی کرسی رک گئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر عین سامنے سرسبز پہاڑوں کی چوٹیوں پر اترتے شام کے نارنجی رنگوں کو دیکھا۔

"جنید کے پاپا کا پوچھ رہی ہو؟"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک بات نہیں ہے۔" ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ کی لڑائی ہے ان سے؟" ان کے جواب سے وہ یہی اندازہ لگا سکی تھی۔

"وہ مجھے چھوڑ چکا ہے۔"

"واٹ، یو مین ڈائیورس۔"

"زبان سے تو نہیں مگر دل سے تو اسی دن طلاق دے دی تھی جب نکاح کے تین بول پڑھے تھے۔"

"بٹ وائے۔"

"میں عمر میں اس سے بڑی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق اسے مجھ سے شادی کرنا پڑی۔ وجہ معقول تھی۔ اولاد نہیں دے سکی میں اسے۔" وہ بالکل سپاٹ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"تو...... تو یہ جنید......"

"ہی از مائی اسٹیپ سن۔"

"اوہ نو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اتنا پیار کرتے ہیں وہ آپ سے اور آپ ان سے۔" وہ متحیر سی کہہ رہی تھی۔

"ہاں، بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔ بچپن کے کچھ سال اس نے یہیں گزارے تھے۔ جب اس کے دادا دادی زندہ تھے۔ اب بھی ہر ویک اینڈ پر صرف میرے لئے آتا ہے۔"

ان کے لہجے میں وہی شفقت و محبت در آئی تھی جو کسی ماں کے لہجے میں اپنی اولاد کے لئے ہوتی ہے۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" اسے واقعی بہت دکھ ہوا تھا۔

"اسی لئے تو کہتی ہوں۔ خوابوں کے پیچھے مت بھاگا کرو۔ یہ زندگی اتنی رحم دل نہیں۔" وہ اک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی۔ تم کچھ بتا رہی تھیں۔"

"ہوں۔" وہ چونکی۔

"جنید احتشام کے بارے میں۔"

"نہیں۔ کچھ خاص نہیں، اب چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

"اچھی بات ہے۔ یوں بھی شام گہری ہو رہی ہے اور یہ پھول......" انہوں نے ٹیبل پر رکھے پھولوں کی طرف اشارا کیا۔

"آپ کے لئے توڑے تھے۔" وہ مسکرا دی۔

"کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کاش تم میری بیٹی ہوتیں۔"

"آپ کی بیٹی ہی تو ہوں آنٹی۔" رابیل نے جھک کر ان کے گال پر پیار کیا۔

* * *

رانو گل بی بی کے ساتھ اس سے ملنے آئی تھی۔

"تم خوش تو ہو نا رانو۔"

"جی باجی۔" آتشی گلابی کڑھائی والے فراک میں وہ بہت بڑی بڑی اور بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تمہارا میاں خیال تو رکھتا ہے نا؟"

"جی بہت۔" وہ شرما رہی تھی۔ کھل کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

"رابیل، رابیل۔" ممی اسے پکار رہی تھیں۔

"تمہارا رزلٹ آ گیا تھا۔"

"اوہ۔" وہ سرپٹ اندر بھاگی۔ پاپا کا فون تھا۔

"مبارک ہو بیٹا۔ بہت اچھے مارکس آئے ہیں تمہارے۔"

"تھینک گاڈ۔" وہ ممی سے لپٹ گئی۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" پاپا پوچھ رہے تھے۔

"سوچوں گی پاپا!"

"سوچنا کیا ہے، میں تو کہتا ہوں اب شادی کر لو آرام سے۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"اس کے بارے میں بھی سوچوں گی۔" رابیل نے ہنس کر ٹال دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی باسط کا فون آیا تھا۔

"نام ڈبو دیا اپنے والدین کا۔ اللہ کی بندی کوئی چھوٹی موٹی پوزیشن ہی کھینچ لیتیں۔"

"میں نے کیا کرنا تھا پوزشن لے کر۔" وہ کھلکھلائی۔

"ہاں تم سدا کی اتنی ہی قناعت پسند ہو۔"

"تم یہ بتاؤ۔ مجھے گفٹ کیا دو گے؟"

"جو تم کہو۔" وہ شرافت سے بولا۔

"او کے۔ سوچ کے بتاؤں گی۔"

"جب سوچ لو تو فون کر دینا۔"

"او کے بائے۔"

"اوہ ممی۔" وہ پھر ان سے لپٹ گئی۔ پھر الگ ہو کر بولی۔ "میں آنٹی کو بتا کر آتی ہوں۔"

"چلی جانا۔ جلدی کیا ہے؟"

"ممی! وہ بہت خوش ہوں گی۔ آپ کو نہیں معلوم، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں۔"

"اچھا جاؤ۔ لیکن جلدی آ جانا۔ آج تمہاری خالہ کے ہاں جانا ہے۔"

"مجھے یاد ہے ممی۔ بس یوں گئی اور یوں آئی۔" اس نے چٹکی بجائی۔ اپنی دھن میں مگن گنگناتی ہوئی وہاں تک پہنچی تو سیڑھیوں پر ہی جنید خاں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، پھر بے اختیار بولی۔

"آج تو ویک اینڈ نہیں ہے۔"

"تو؟" اس نے استفہامیہ انداز میں رابیل کی جانب دیکھا۔

"آپ صرف ویک اینڈ پر گھر آتے ہیں نا۔"

"تم اسی لئے ویک اینڈ پر نہیں آتیں۔" وہ متبسم لہجے میں پوچھنے لگا۔

"آنٹی ہیں؟" رابیل اس کی بات یکسر نظر انداز کر گئی۔

"ہاں، کوئی خاص بات ہے، بہت خوش نظر آ رہی ہو۔"

"خوش تو میں ہوں۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" جنید کی نظروں نے چہرے پر بکھرے خوشی کے رنگ دیکھے اور مسکرا دیا۔

"بالکل پوچھ سکتے ہیں۔"

جنید کچھ لمحے منتظر رہا پھر ہنس دیا۔

"کیا وجہ ہے؟"

"میرا رزلٹ آ گیا ہے۔"

"اوہ مبارک ہو۔"

"تھینکس۔ دراصل مجھے کچھ ڈاؤٹ تھا کہ ہسٹری میں رہ جاؤں گی۔" وہ اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بتا رہی تھی۔ جنید نے ذرا سا جھک کر ایک سرخ ادھ کھلا گلاب توڑ کر اس

کی طرف بڑھا دیا وہ کچھ متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔

"آئی نو۔ اگر میں نے تمہیں کوئی گفٹ دیا تو تم نہیں لوگی۔"

"اگر میں یہ پھول بھی نہ لوں تو۔"

"میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

رابیل نے ہاتھ بڑھا کر پھول لے لیا پھر تیز تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔ آنٹی کچن میں تھیں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

بتایئے، آج میں خوش کیوں ہوں۔"

"جنید سے ملاقات ہوگئی۔"

"اوہ کس کا نام لے رہی ہیں آپ۔" وہ بدمزہ ہوگئی۔ "میرا رزلٹ آ گیا ہے۔"

"بہت بہت مبارک ہو۔" آنٹی نے اسے پیار کیا۔

"ابھی میں نے بتایا تو ہے ہی نہیں کہ رزلٹ کیا رہا؟"

"اگر خراب ہوتا تو کیا تم یوں ہنستی مسکراتی میرے پاس آتیں؟" انہوں نے چھیڑا۔

"یہ تو ہے۔"

"کافی بناؤں؟"

"نہیں، میں تو جا رہی ہوں۔ ابھی تو ثانیہ کو بھی نہیں بتایا۔ پھر آؤں گی مٹھائی لے کر۔"

"اچھا، میرے ساتھ تو آؤ۔" وہ اسے ساتھ لے کر اندر چلی گئیں۔ الماری سے اک بہت خوبصورت لاکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تمہارا گفٹ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے آنٹی۔"

"بالکل ہے۔"

"ممی ڈانٹیں گی۔" وہ بسوری۔

"بالکل نہیں ڈانٹیں گی۔ اگر تم نے نہ لیا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔" انہوں نے چھوٹی سی ڈبیہ میں ڈال کر اسے تھما دیا۔ "اب کچھ مت بولنا۔"

وہ جیسے بے بس ہوگئی۔ باہر نکلی تو جنید بلی کے بچوں کو کھیلتے دیکھ رہا تھا۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

"یہ مجھے آنٹی نے گفٹ دیا ہے۔" رابیل نے لاکٹ دکھایا۔ وہ خاموش ہی رہا۔ رابیل نے ہاتھ پیچھے کر کے اس کے حد درجہ سنجیدہ انداز کو دیکھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں رابیل کاش تم مجھے نہ ملی ہوتیں۔" وہ بڑی یاسیت سے بولا تھا۔ رابیل نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"آپ ایسی باتیں مت کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کون میں؟" اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا۔ رابیل بری طرح چڑ کر پلٹی تھی۔

"پتا نہیں۔ میں آپ سے بات کیوں کر لیتی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ زیرلب بڑبڑایا تھا۔

* * *

"وہ لوگ شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔" ممی نے اسے ڈنر پر بتایا تھا۔

"آپ نے ان سے بات نہیں کی؟" رابیل نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

"ڈائریکٹ بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ وہ لڑکا ہو کر ایسی کوئی شرط نہیں رکھ رہا۔ یونہی ان ڈائریکٹلی کہا تھا کہ شادی سے پہلے تم لوگوں کو ایک بار مل لینا چاہئے۔ وہ بھی مان گئی تھیں مگر......"

"مگر؟"

"اب جنید نے کہہ دیا ہے کہ وہ ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"بٹ ممی! میں تو محسوس کرتی ہوں نا۔"

"اچھا نہیں لگتا رابیل! کیا سوچیں گے وہ تمہارے بارے میں۔"

"کیا سوچیں گے۔ ممی آپ ایجوکیٹڈ ہو کر ایسی بات کر رہی ہیں۔"

"رابیل! وہ لوگ شادی جلد کرنا چاہ رہے ہیں اور تمہارے پاپا کا بھی خیال ہے کہ۔" وہ ٹیبل چھوڑ گئی تھی۔ ممی پکارتی ہی رہ گئیں۔ شاید وہ جانتی تھی کہ ممی سے بحث نہیں کر سکے گی۔ کی بھی تو ہار جائے گی۔ ممی نے بعد میں بھی اسے بہت پیار سے سمجھایا تھا۔

"میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ جانو! ہم لوگ کتنے بھی ایجوکیٹڈ ہو جائیں رہیں گے تو وہی روایتی پٹھان۔ تمہارے پاپا تو غضب اٹھا دیں گے۔ پھر الزام مجھ پر کہ......"

"میں کیا کہہ رہی ہوں ممی۔" وہ بیزاری سے اٹھ بیٹھی۔

"سب کچھ ہم پر چھوڑ دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا نا۔" انہوں نے رابیل کے بکھرے بال سمیٹے پھر دیر تک اسے نہ جانے کیا کیا سمجھاتی رہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ رابیل کبھی ان کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتی تھی۔

"یونو آنٹی! اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔" وہ بہت دل شکستہ تھی۔

تب ہی ممی کے جانے کے بعد آنٹی کو فون کر بیٹھی۔

"میری اس کے نزدیک بس اتنی ہی اہمیت ہے۔"

"اتنا حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! کچھ لوگوں کا محبتوں کا انداز بہت عجیب ہوتا ہے۔ شاید وہ اپنی ساری فیلنگز بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے چشمہ بالکل خشک ہے۔ مگر قریب جاؤ تو معلوم ہوتا ہے ان کی ذات پورا سمندر ہے۔"

"آئی ڈونٹ نو۔ میں کیا کروں آنٹی؟"

"اگر خود فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں تو سب خدا پر چھوڑ دو کہ وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

"کیا سوچنے لگیں؟" اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ پوچھنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔" وہ اک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"ڈسٹرب ہو۔ میرے پاس آ جاؤ۔"

"کل آؤں گی۔" آج سنڈے تھا۔ جنید کی یقینی موجودگی۔ وہ مزید ڈسٹرب ہو جاتی۔ اس لئے انکار کر دیا تھا۔

* * *

"آنٹی! ثانیہ کے فادر واپس آ گئے ہیں۔ ہفتے کو باسط اور ثانیہ کی انگیج منٹ ہے شام میں۔ آپ کو بھی انوائیٹ کریں گے اور آپ کو آنا ہوگا۔ کوئی بہانا نہیں چلے گا۔ بلکہ میں خود آپ کو لینے آؤں گی۔ میں نے پرامس جو کیا ہے باسط کے ساتھ۔"

سلاد کے لئے ٹماٹر کاٹتے ہوئے وہ مسلسل بول رہی تھی۔ آنٹی نے اسے غور سے دیکھا پھر رسانیت سے بولی تھیں۔

"تم وہ کہو جو کہنا چاہ رہی ہو۔"

رابیل چپ ہو گئی۔ پھر ٹماٹر سلاد کے پتے ایک طرف کر کے ان کی طرف پلٹی۔

"میری شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔"

"ارے۔" آنٹی نے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"اتنی اچھی خبر اتنی رونی صورت بنا کر دی جاتی ہے۔"

"تو کیا کرتی؟"

"مٹھائی ساتھ لے کر آتیں۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"شادی سے۔"

رابیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر کیوں؟"

"وہ شخص بہت عجیب سا لگتا ہے مجھے۔ اوپر سے باسط کی باتیں۔"

"تم کیا بچپن ہی سے ایسی ہو۔" انہوں نے پیار سے اسے دیکھا۔

"کیسی؟" رابیل نے پلکیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے والی۔ حد درجہ حساس۔ کزنز تو ایسی چھیڑ خانیاں کرتی ہی ہیں۔ یوں بھی جو کچھ تم نے بتایا ہے مجھے تو اس میں کوئی خاص برائی نظر نہیں آتی۔ بہت اچھی لائف گزارو گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا۔

"شاید۔"

"شاید نہیں یقیناً۔ کبھی کبھی بظاہر ہمیں لگتا ہے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ درحقیقت تقدیر اس کے عقب میں ہمارے لئے بہت سی خوشیاں چھپائے بیٹھی ہوتی ہے اور ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا۔"

"یہ کیسے پتا چلے کہ فیصلہ غلط ہے یا درست۔"

"وقت کرے گا یہ فیصلہ۔"

"تب تک بہت دیر ہو گئی تو؟"

آنٹی اس کی طرف دیکھ کر ہنس دیں۔

"اکلوتے بچوں کی یہ بہت پرابلم ہے۔ والدین کی بے تحاشا محبت یا تو انہیں بہت بہادر بنا دیتی ہے یا بہت بزدل۔"

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔؟"

خفگی سے گویا ہوئی۔ ظاہر ہے آنٹی نے اسے بزدل ہی تو سمجھا ہوگا۔

"بہادری و بزدلی کا سنگم۔ سمجھ داری و معصومیت کا مرقع ہو تم۔"

"مطلب؟"

"کبھی تو اتنے بڑے بڑے فیصلے یوں چٹکی بجاتے کر لیتی ہو کہ سب حیران رہ جائیں اور کبھی اتنی سی بات کو لے کر گھنٹوں ڈرتی رہتی ہو۔ تم نے والدین کی بات مان لی۔ بہت سمجھ داری کا ثبوت دیا اور اب اپنے ہی بے معنی سے مفروضوں اور خدشوں سے دہل رہی ہو۔"

انہوں نے بڑی خوبی سے اس کی ذات کا تجزیہ کیا۔

"کیا کروں، میں ایسی ہی ہوں۔" رابیل ہتھیلیاں مسلتے ہوئے بولی۔

"بھروسا کرنا سیکھو۔ خود پر بھی اور خدا پر بھی۔" انہوں نے رابیل کا کندھا تھپتھپایا۔ پھر سالن کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"لگتا ہے، آج صرف باتوں سے پیٹ بھرنا ہے ہم نے۔ جاؤ آبشار کی طرف جنید نکلا ہے۔ اسے بلا لاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

آنٹی سالن نکالنے لگی تھیں۔ رابیل آبشار کی طرف آ گئی۔ وہ اک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا۔ آبشار کا پانی اک شور کے ساتھ نیچے آ رہا تھا اور پتھروں سے ٹکرا کر سفید جھاگ بنا رہا تھا۔ اس کی بوچھاڑ سے اڑتے پانی کے قطرے اس پر پڑ رہے تھے۔ رابیل نے پکارا تو وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر اٹھ کر قریب آ گیا۔ رابیل نے ایک طویل سانس بھر کر ارد گرد دیکھا۔ ست رنگے پھولوں کی چادر سی بچھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سبزہ نہیں صرف پھول کھلے ہیں۔ ہر پھول کا رنگ بہت خوبصورت چمکدار تھا۔ تم ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔

"بہت خوبصورت جگہ ہے۔ میں تو اس سے پہلے ادھر آئی ہی نہیں۔ بس وہیں سے یہ موسیقی سنتی تھی۔" رابیل نے اپنے اڑتے بالوں کو سمیٹا۔

"تمہاری شادی ہو رہی ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" رابیل نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کب؟"

"ممی! پاپا سوچیں گے۔" رابیل اس کی نگاہوں سے خائف ہو کر بولی تھی۔ وہ ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم کچھ نہیں سوچو گی۔"

"کس بارے میں۔" رابیل واقعی کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"میرے بارے میں۔" رابیل کا چہرہ اس کی نگاہوں کی تپش سے جلنے لگا تھا۔ تب ہی نظریں چکرا کر بولی تھی۔

"میں یہ کہنے آئی تھی۔ آنٹی بلا رہی ہیں۔"

وہ جانے کو پلٹی۔ جنید نے سامنے آ کر رستہ بلاک کر دیا تھا۔ ایک پل کو وہ کچھ بول نہ سکی۔

"کیا ہے؟"

"اک البیلی پگڈنڈی ہے۔"

"ہاں۔" رابیل نے سر اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھا۔

افتاں خیزاں، گرتی پڑتی
ندی کنارے اتری ہے
اک انوکھا پیڑ کھڑا ہے
پیڑ نے رستہ روک لیا ہے
پگڈنڈی حیران کھڑی ہے
جسم چرائے آنکھ جھکائے
دائیں بائیں دیکھ رہی ہے
جانے کب سے بانہیں کھولے
رستہ روکے پیڑ کھڑا ہے
جانے کب سے جسم چرائے
آنکھ جھکائے، پگڈنڈی حیران کھڑی ہے

رابیل نے سرعت سے نکل جانا چاہا۔ جنید نے اسی تیزی سے کلائی کھینچ کر اسے اپنے سامنے کیا تھا۔

"ایسے کس طرح جا سکتی ہو تم۔"

"میرا ہاتھ چھوڑیں جنید۔" رابیل نے اس کی سرکش گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی سعی کی۔ وہ ایک دم سے پریشان اور ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

"مجھے غور سے دیکھو رابیل! میں ہی وہ پیڑ ہوں جو صدیوں سے تمہارے راستے میں بانہیں کھولے کھڑا ہے۔ تمہارا منتظر ہے اور تم ہو کہ نظر چرا کے گزر جاتی ہو۔"

"مجھے جانے دیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"کیوں جانے دوں۔ محبت کرتا ہوں تم سے۔ اس طرح کیسے جانے دوں اور تم بھی تو محبت کرتی ہو مجھ سے۔ پھر یہ منافقت بھری زندگی کیسے گزارو گی۔"

"مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔"

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔" وہ چلایا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" رابیل رو دی تھی۔

"تم نے خود کہا تھا اگر وہ جنید خان جیسا ہو تو، تو کیا آگے بولو۔ اپنا جملہ پورا کرو۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی تھی اور اس کا رخ نیچے کی سمت تھا۔ وہ یہاں سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی کہ آنسوؤں کی دھند نے سیڑھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ پہلی سیڑھی سے پھسلی اور اس کے لبوں سے آزاد ہونے والی تیز چیخ نے جنید اور آنٹی دونوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

* * *

رابیل کو ہوش آیا تو وہ ہاسپٹل میں تھی۔ اس کی ٹانگ میں فریکچر تھا۔ سر پر بھی شدید چوٹ آئی تھی۔ سب ہی اس کے گرد تھے اور اس کے لئے بہت پریشان بھی، پاپا اور باسط بھی آ گئے تھے۔ پاپا تو اسے اسلام آباد لے جانے کو تیار تھے۔ مگر ڈاکٹر نے کہا بہت زیادہ سیریس فریکچر نہیں ہے، وہ جلدی ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔

ثانیہ بھی آئی تھی۔ نہیں آیا تھا تو جنید خان جو اس حادثے کا ذمہ دار تھا۔

کم از کم رابیل تو یہی سمجھی تھی۔

تقریباً دس دن کے بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ مگر ابھی وہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ کہاں تو وہ ان اونچے نیچے رستوں پر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی پھرتی تھی اور کہاں چپ چاپ ایک کمرے میں پڑی تھی۔

ماما کا دل اسے دیکھ دیکھ کر کٹتا۔ اس کی چوٹ اتنی تکلیف دہ نہیں تھی۔ جتنی اس کی چپ تھی۔ نہ کسی سے بات کرتی، نہ کسی سے ملتی۔ وادی سے کتنے لوگ اس کے حادثے کی خبر سن کر عیادت کرنے آئے تھے اس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ رانو سے بھی۔ ماما حیران تھیں اسے اتنے لوگ کیسے جانتے ہیں۔

''رابیل بیٹا! دیکھو تو آپ سے ملنے کون آیا ہے۔'' وہ جو آنکھیں موندے پڑی تھی۔ چونک کر دیکھنے لگی۔

''آنٹی!''

''میری بیٹی۔'' انہوں نے ساتھ لگا کر پیار کیا۔ ہسپتال میں وہ کئی بار اس سے ملنے آ چکی تھی لیکن گھر پہلی دفعہ آئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

''اب تو ٹھیک ہوں۔'' رابیل آہستگی سے بولی۔

''بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایک تو اتنی خاموش رہتی ہے کہ مجھے یونہی ہول اٹھنے لگتے ہیں اور کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں ہے۔ رنگت دیکھیں کتنی پیلی پڑ گئی ہے۔'' ممی خالص مادرانہ

انداز میں بول رہی تھیں۔ آنٹی خاموشی سے اسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ نظریں چرا کر کھلے دریچے سے باہر جھانکنے لگی۔

''میں آپ کے لئے چائے بنواتی ہوں۔'' ممی باہر نکل گئی تھیں۔

''کیا سوچتی رہتی ہو رابیل؟'' آنٹی نے اس کے بال سمیٹے۔

''کچھ بھی نہیں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری۔

''میں جانتی ہوں۔ وہ آنا چاہتا تھا۔ مگر بہت شرمندہ ہے۔'' رابیل بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''بعض اوقات ہماری ذرا سی بھول، ذرا سی غلط فہمی و جلد بازی کوئی نہ کوئی نقصان کر دیتی ہے۔'' آنٹی تاسف سے کہہ رہی تھیں۔ ''مگر وہ آئے گا تمہارے ساتھ معذرت کرے گا۔''

''آنٹی! میری ایک بات مانیں گی آپ۔'' رابیل نے ملتجی انداز میں انہیں دیکھا۔

''کہو۔''

''اس سے کہیے گا مت آئے۔''

''کیوں؟''

''مجھے ادھورے جملے پورے کرنے نہیں آتے۔'' وہ مضمحل سا مسکرائی۔

''مگر......'' آنٹی نے کچھ کہنا چاہا۔ تب ہی ممی گل بی بی کے ساتھ چائے لے آئیں۔ تو وہ خاموش ہو گئیں۔

''تم چائے لو گی رابیل؟'' ممی نے مگ آنٹی کو تھما کر اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کچھ کھا لو۔ پھر دوا بھی لینی ہے۔''

''ممی! ابھی نہیں ٹھہر کر لوں گی۔'' وہ بےزاری سے ٹال گئی۔ آنٹی نے اشارے سے منع کیا تھا۔ ممی خاموش ہو گئیں اور جب تک آنٹی نے چائے ختم کی اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''میں اب چلتی ہوں۔ اچھا رابیل بیٹا! پھر کسی دن آؤں گی اور تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔ اس طرح منہ بنائے بستر پر بیٹھی ذرا اچھی نہیں لگ رہیں۔''

آنٹی کے پیار بھرے لہجے پر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''کلی اور ڈکی کیسے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔ مگر بہت اداس۔ رابیل! تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' وہ ذرا سا اس کی

طرف جھکیں رابیل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں بلیوں سے الرجک ہوں۔''

''واٹ۔'' رابیل نے تعجب سے انہیں دیکھا۔

''ہاں، میں بلی کو کہیں قریب بولتے ہی سن لوں تو مجھے ٹینشن ہونے لگتی تھی۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھیں۔

''اور آپ یہ ٹینشن اتنے دنوں سے برداشت کر رہی ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔'' وہ متحیر سی پوچھ رہی تھی۔

''تم اتنے پیار سے میرے لئے لائی تھیں اور وہ کلی، ڈکی اتنے کیوٹ ہیں کہ اب انہیں دیکھ کر مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہوتی۔''

''اوہ آنٹی! اب کیا کہوں میں آپ سے۔'' بہت دنوں بعد وہ کھل کر ہنسی تھی۔

''کچھ مت کہو۔ بس جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔''

انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔ ممی انہیں سی آف کرنے باہر تک چلی گئیں۔

''اوہ مائی گاڈ! آنٹی نے انہیں کس طرح برداشت کیا ہوگا۔''

رابیل سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

''مجھے آج جانا ہوگا' لیکن ویک اینڈ پر اپنی بیٹی سے ملنے ضرور آؤں گا۔''

پاپا کے آفس سے فون آیا تھا اور وہ گویا مجبوراً جانے کو تیار ہوئے تھے۔

''آپ جایئے پاپا! اب تو میں کافی ٹھیک ہوں۔'' رابیل آہستگی سے گویا ہوئی۔

''ہم اپنی بیٹی کو بالکل ٹھیک دیکھنا چاہتے ہیں۔''

سب لوگ اس کے لئے اپنا اپنا کام چھوڑ بیٹھے تھے۔ رابیل کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماما بھی سارا دن اسی کے ساتھ لگی رہتیں۔ باسط اور ثانیہ بھی ہمہ وقت اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے۔ پھر اس کی بےزاری دیکھ کر ہٹ جاتے۔ پاپا کو اچانک جانا پڑا۔ تو ایک دن اس نے ماما سے بھی پوچھ لیا۔

''آپ ہسپتال کیوں نہیں جا رہیں ماما؟''

''تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں جانو۔''

''میں ایک مہینہ مزید ٹھیک نہ ہوئی تو آپ مہینہ بھر نہیں جائیں گی۔'' رابیل نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔ میری بیٹی سے زیادہ تو نہیں یہ سب۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''دیٹس ناٹ فیئر مام! ہسپتال میں کتنے مریض ہیں جنہیں آپ کی ضرورت ہے اور آپ ان سب کو محض میری وجہ سے اگنور کر رہی ہیں۔''

''تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔''

''آپ صرف ماں نہیں ایک ڈاکٹر بھی ہیں ممی! اور بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے اور تنہا نہیں ہوں میں۔ سب لوگ تو میرے پاس ہوتے ہیں۔'' وہ رسانیت سے بولی۔

''مگر......''

''مگر کچھ نہیں ممی! آپ صبح سے ہسپتال ضرور جائیں گی۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی تھی۔ ممی مسکرا دیں۔

''اوکے۔''

اگلے دن سے وہ ہسپتال جانے لگی تھیں۔ مگر دو دو بار فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتی تھیں۔ پھر ایک دن انہوں نے بتایا تھا۔

''آج جنید کا فون آیا تھا۔''

رابیل کو ایک لمحے کو سوچنا پڑا کہ وہ کس جنید کی بات کر رہی ہیں۔ پھر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''جنید احتشام کا؟''

''ہاں......''

''کیا کہہ رہے تھے؟'' رابیل نے نارمل سے انداز میں پوچھا۔

''تمہاری خیریت دریافت کر رہا تھا۔ بات کرنا چاہتا تھا تم سے۔ مگر تم سو رہی تھیں۔''

''اچھا ہوا۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ ممی بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''کبھی کبھی اپنی ہی فیلنگز کو سمجھنا کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔'' کتاب بند کر کے اس نے اپنی نظریں بند کتاب پر جما دیں۔

''یہ دل کوئی ایسی ہی بند کتاب لگتا ہے۔ جس کی تحریر میں خود بھی نہیں پڑھ پا رہی۔''

دروازہ اک آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ باسط ٹی وی اٹھائے اندر داخل ہوا۔

''یہ کیا ہے؟'' رابیل نے حیرت سے پوچھا۔

''ٹی وی۔'' بڑی معصومیت سے بتایا۔

"یہاں کیا کر رہا ہے۔" رابیل نے گھورا۔

تمہارے سامنے ہے، خود ہی پوچھ لو۔" اس نے خالی پڑے ٹیبل پر ٹی وی ٹکایا۔ پھر پلٹ کر پوچھنے لگا۔

"یہاں ٹھیک ہے۔"

"تم اسے یہاں کیوں لائے ہو۔"

"ہاں، یہ معقول سوال ہے۔" وہ اس کے پاس آیا، پھر انگلی اس کے چہرے کے گرد گھما کر بولا۔ "یہ جو تم سڑی ہوئی شکل کے ساتھ سارا دن ان دیواروں کو گھورتی رہتی ہو۔ اس سے زیادہ بہتر ہے تم ٹی وی دیکھ لو۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے باسط۔"

"ضرورت تو تمہیں اب کسی کی بھی نہیں رہی۔ ہماری بھی نہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔

آپ خود ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

"میں نے کیا کہا ہے تم یونہی الزام دھر رہے ہو۔"

"دشمن تو تم میری اول نمبر کی تھیں۔ کبھی کوئی خوشی برداشت ہوئی ہے تم سے میری۔" وہ گویا دھاڑا تھا۔

"کیا بکواس ہے باسط۔" رابیل چڑ گئی۔

"میری اتنی مشکلوں سے ہوتی ہوئی منگنی میں تم نے اپنی ٹانگ اڑا دی۔" غصے سے بولا تھا۔

"تو تم کروا لو۔"

"ہاں، تمہارے بغیر تو جیسے میں کروا ہی لوں گا......"

وہ چڑ کر بولا۔ رابیل سر جھٹک کر خاموش ہو گئی۔

"اور یہ تو بتاؤ۔ تم نے لوگوں سے ملنا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ کیا وزیراعظم سمجھنے لگی ہو خود کو۔ سب کو باہر سے لوٹائے جا رہی ہو۔"

"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔"

"کیوں؟......"

"مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں......" وہ چیخ اٹھی۔

"بہت خوب!" باسط نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا۔ "جب تم ان کے پاس ہمدردیوں کے بورے بھر بھر لے جاتی تھیں تو کیا انہوں نے بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔"

"باسط گیٹ لاسٹ......" وہ چیخ پڑی۔

"گیٹ لاسٹ ہونے سے قبل ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے......" وہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔

"کہو......" رابیل بیزار تھی۔

"جنید احتشام کا فون آیا تھا۔"

"آئی نو......" ہنوز وہی لہجہ تھا۔ بیزار اور اکتایا ہوا۔

"دوبارہ آیا تھا۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

رابیل نے حیرت سے اسے دیکھا اور تیکھے انداز میں کہا۔

"کیوں......؟"

"عیادت کرنا چاہتا ہے تمہاری......"

"اب اس کا فون آئے تو اس سے کہہ دینا۔ رابیل مراد کو اس سے نہیں ملنا کیونکہ رابیل کو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر وہ یہاں آیا بھی تو میں اس سے ملنے سے انکار کر دوں گی۔ ڈو یو انڈرسٹینڈ۔" اس کا لہجہ صاف اور سخت تھا۔

"مگر تم یہ سب کیوں کر رہی ہو۔ تمہاری اپنی بھی تو خواہش تھی کہ تم اس سے ملو۔" وہ واقعی حیران تھا۔

"جب میری خواہش تھی۔ تب اس نے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کی خواہش ہے تو میں انکار کر رہی ہوں۔"

"سمپلی۔"

"مگر کیوں......؟"

"اس لئے باسط! کہ وہ میری عیادت کو نہیں آ رہا وہ یہ دیکھنے آ رہا ہے کہ جس خوبصورت شوپیس کو اس نے اپنے خوبصورت گھر میں سجانے کے لئے پسند کیا تھا اس میں کوئی کمی تو نہیں آ

گئی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ باسط اسے متحیر سا دیکھے گیا پھر بمشکل بولا تھا۔
"تم اسے مس جج کر رہی ہو رابیل۔"
"کیوں تم نے اس کی ڈھیر ساری خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی نہیں بتائی تھی کہ اسے خوبصورت اور قیمتی چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔"
"وہ ایسا نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہی ہو۔"
"وہ جیسا بھی ہے مجھے اس سے کچھ مطلب نہیں اور تم اب جاؤ یہاں سے۔" رابیل رکھائی سے بولی تھی۔ باسط کچھ لمحے لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔ پھر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

جب بھی دیکھا ہے اسے دل نے یہ محسوس کیا
جیسے میرے سحر و شام کا محور ہے یہی
میرے تخیل کے آذر نے تراشا ہے جسے
میرے خوابوں کا وہ بے نام سا پیکر ہے یہی
کوئی خلوت ہو......

دروازہ دھیرے سے ناک ہوا تھا۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل کر ادھ کھلے دروازے کو دیکھنے لگی۔ اندر آتے شخص کو اس کی نگاہوں نے پل بھر کو دیکھا اور پھر جیسے دروازے پر جم گئیں۔
"مجھے کچھ کہنا ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر رکا۔
"میں سن رہی ہوں......"
رابیل کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پر جم گئیں۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں......" وہ متذبذب تھا۔
"رابیل! میں...... میں جنید احتشام ہوں۔"
کوئی تمہید نہ تھی۔ مگر انکشاف ایسا تھا کہ وہ ساکت رہ گئی۔ ایک جھٹکے سے سر بھی نہ اٹھا سکی۔ کئی ساکت لمحوں کے بعد اس نے بہ دقت اس کی جانب دیکھا تھا۔
"ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ یہ مذاق......"
"مذاق......" رابیل نے بے خیالی میں خود کلامی کی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے بتانے لگا۔
جب وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی ...... منگنی ہو گئی۔ رابیل مراد کے ساتھ پھر رابیل کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات، وہ پہچان گیا تھا۔ اس کی تصویر جو دیکھی تھی۔ پہلی نظر کی

محبت کیا ہوتی ہے، وہ جان گیا تھا۔ اک ذرا سی شرارت۔ جس میں دھیرے دھیرے سب انوالو ہو گئے۔ ثانیہ کی برتھ ڈے پر ملاقات، ایک پلاننگ۔ وہ اسے اپنی بڑی ماما سے ملوانا چاہتا تھا۔ رابیل خود ہی وہاں پہنچ گئی۔ ماما کن مشکلوں سے اس کھیل کا حصہ بنیں۔ پھر دھیرے دھیرے واقعات خود بخود بنتے رہے۔ پھر وہ حادثہ......" رابیل ششدر سی سنتی رہی۔ چپ، گم صم اور ساکت۔
"آئی ایم سوری رابیل! میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں تمہیں کوئی تکلیف دے ہی نہیں سکتا تھا کہ یہاں کہیں دل بن کر دھڑکنے لگی ہو تم۔ مگر نادانستگی میں تمہیں تکلیف دے بیٹھا۔ آئی ایکسٹریملی ساری رابی۔"
وہ اب بھی چپ تھی۔
"کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟"
وہ ساکت تھی۔
"تمہارا مجرم ہوں، کوئی بھی سزا دو؟"
اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوا۔ رابیل نے آہستگی سے ہاتھ کھینچ لیا۔
وہ کھڑا ہو گیا۔
"قصوروار میں تنہا نہیں ہوں رابیل! مگر سزا میں تنہا بھگتوں گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ کبھی تو وہ ادھورا جملہ پورا ہو گا جو میری زیست کا عنوان بن گیا تھا۔
وہ پلٹ گیا۔ رابیل نے سر اٹھایا اور متذبذب سی اسے دیکھے گئی۔ پھر بے اختیار پکارا تھا۔
"جنید......!" جنید رک کر پلٹا اور منتظر نگاہوں سے سے دیکھنے لگا۔
"جنید! آپ نے یہ ڈرامہ اس لئے کیا نا کہ آپ یہ دیکھ سکیں میں کتنی اسٹرونگ ہوں۔"
"مطلب......؟"
"آپ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ رابیل مراد اپنے فیانسی کے ہوتے ہوئے کسی اور میں انوالو تو نہیں ہو جاتی۔"
"رابیل......!" جنید کی نگاہوں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔
"اگر میں جنید خان کے ساتھ انوالو ہو جاتی تو آپ کیا کرتے...... ہاں...... چھوڑ کر چلے جاتے کیونکہ آپ کو تو ایک ایسی ساتھی کی ضرورت تھی جو ہر لحاظ سے مکمل ہوتی۔"
"رابیل پلیز جسٹ شٹ اپ، ......" وہ سر تھام کر بولا کہ اس کا ذرا سا مذاق کوئی اور

رنگ اختیار کر گیا تھا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ بلیو می، میں ایسا کس طرح......''

''آپ چلے جائیں یہاں سے، مجھے آپ کی جھوٹی کہانیاں نہیں سننی۔ فار گاڈ سیک آپ چلے جائیں یہاں سے اور ادھر کبھی مت آیئے گا۔'' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' ممی بھاگتی ہوئی آئیں۔ جنید تیزی سے باہر نکل گیا۔ ممی روتی سسکتی رابیل کو سنبھالنے لگی تھیں۔

سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے۔ مگر وہ سب سے خفا تھی۔

باسط نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

''چوٹ اس کی ٹانگ سے زیادہ سر پر آئی ہے۔''

جنید تو جیسے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے لئے تو سوچنا ہی محال تھا کہ وہ اسے اتنا غلط سمجھ سکتی تھی۔

''تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا، وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔'' آنٹی نے کتنے افسوس کے ساتھ کہا تھا۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

بہت سے دن گزر گئے۔ اس کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی تھی۔ تب بھی وہ باہر نہیں نکلتی تھی۔ یونہی گھر میں بند رہتی۔ بہت ہوا تو لان میں آ کر بیٹھ جاتی۔ باسط اور تانیہ کی منگنی پر وہ گویا جبراً گئی تھی۔

''وہ آئیڈیا تو ہم سب کا تھا، ہم سب اس میں برابر کے شریک تھے۔ تم نے سزا دی تو صرف اس کو، تمہیں تو انصاف کرنا بھی نہیں آتا۔'' باسط بڑے طنز کے ساتھ کہتا تھا۔ تو اک آواز سی اس کے گرد پھیل جاتی۔

''قصوروار میں تنہا نہیں ہوں رابیل! مگر سزا میں تنہا بھگتوں گا۔ اس یقین کے ساتھ کہ کبھی تو وہ ادھورا جملہ پورا ہو گا۔ جو میری زیست کا عنوان بن گیا تھا۔''

''محبت سے منہ موڑنے والے تنہا رہ جاتے ہیں۔ اور محبت کو خفا کرنے والے......''

تانیہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگتی۔

''تم اپنے ہی گھڑے ہوئے بے معنی مفروضوں اور خدشوں سے دہل رہی ہو۔''

آنٹی نے ایک بار کہا تھا۔ آج پھر وہ اپنے ہی بے معنی خدشے کے زہر سے نیلو نیل ہو رہی تھی۔

''اعتماد کرنا سیکھو، خود پر بھی اور خدا پر بھی۔''

ہر گزرتے وقت کے ساتھ اسے لگتا، وہ ہی غلط تھی۔ سب لوگ کتنی عجیب اور ترحم بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ اندر ہی اندر ہارنے لگی تھی۔ مگر کوئی فیصلہ تھا کہ ہوتا ہی نہ تھا۔

''رابیل بی بی! یہ آپ سے ملنے آیا ہے۔''

عبدل کی آواز پر لان میں بیٹھی رابیل نے آنکھیں کھولیں۔

''آؤ گل۔''

''یہ ہمارے صاحب نے بھیجا ہے۔''

اس نے خوبصورت سا بوکے اور کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

کتنی خواہش تھی اس کی، کبھی وہ کوئی کارڈ، کوئی گفٹ بھیجے۔

وہ کچھ لمحے دیکھتی رہی۔ پھر آہستگی سے تھام لئے۔

''ٹھیک ہے گل ریز! تم جاؤ۔''

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ رابیل کی انگلیوں نے دھیرے سے پھولوں کی نرمی کو محسوس کیا۔ ان کی خوشبو نے بڑھ کر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ اس نے اک طویل سانس لے کر کارڈ کھولا۔

''اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر
پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی اجنبی سے لگتے ہیں......''

اس کی گم صم نگاہیں لفظوں پر پھسل رہی تھیں اندر کہیں بدگمانی کا جال دھیرے دھیرے کٹنے لگا تھا۔ اک بے چینی سی رگ و پے میں اتر آئی تھی۔ پھول میز پر رکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ دل یقین و بے یقینی کے بھنور میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ اس کا دل آج بھی ایک ایسی بند کتاب کی طرح تھا جس کی تحریر وہ خود بھی نہ پڑھ سکتی تھی۔

وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر باہر نکل آئی۔

''اگر خود فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں۔ تو سب خدا پر چھوڑ دو کہ وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

اس کے قدم خود بخود اسی رستے کی طرف بڑھ گئے۔

''رابیل......!'' آنٹی نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

''جنید کہاں ہیں......؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔
''آبشار کے پاس جاؤ۔''
سارا منظر وہی تھا گرتا پانی، نم ہوا، پھولوں کی خوشبو، وہ بھی وہیں تھا۔ رابیل متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔ جنید نے ایک دم پلٹ کر دیکھا، پھر کھڑا ہو گیا۔
''رابیل......!''
وہ آہستگی سے چلتی اس کے قریب آ گئی۔ کچھ لمحے اس کی شرٹ کے بٹن کو گھورتی رہی۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔ ''مجھے ادھورے جملے پورے کرنے نہیں آتے۔''
''میں اصرار نہیں کروں گا۔'' اس نے قدم بڑھا دیے۔
''جنید......'' رابیل نے بے اختیار پکارا۔ وہ رک گیا۔
''مجھے وہ نظم سنائیں گے۔''
جنید نے رخ موڑ کر اسے حیرت سے دیکھا۔
''کون سی......؟''
''اک البیلی پگڈنڈی ہے......'' وہ اس کے سامنے آ گئی۔
جنید نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔
''کیوں نہیں......'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ رابیل نے دور پہاڑوں پر پھسلتی برف کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں پگڈنڈی کا رستہ روکے پیڑ پر جم گئیں تو محبت لبوں پر مسکراہٹ بن کر کھل اٹھی۔

* * *

گل صنوبر

آم کے درخت پر بور آنے کے ساتھ ہی کوئل کی کوک سنسان دوپہر کے سینے میں چھید ڈالنے لگی۔ اس کی کتنی کوشش تھی کہ وہ صاحب آواز کو دیکھ لے' مگر ناکام...... پھر وہ سفید پلیٹ میں نیچے گرے فالسے اکٹھے کرتی گردن اٹھا اٹھا کر درخت کی شاخیں کھوجا کرتی۔

آم پر بور آتا تو شہد کی مکھیاں ہلہ بول دیتیں۔ بچوں کو ادھر آنے کی ممانعت ہوتی مگر وہ چپکے سے کچن کا پچھلا دروازہ کھول کر پچھلے برآمدے میں نکل آتی۔ آم کا بور جھڑتا' ننھی منی امبیاں اس کی جگہ لے لیتیں۔ فرح اور زیبا کی موج ہو جاتی۔ وہ کچی کھٹی امبیاں کچر کچر کھاتیں۔ خواتین ڈائجسٹ' میں نئی آنے والی رائٹر ہما کوکب بخاری کے ناولٹ اور بشریٰ رحمٰن کے ناول پڑھتی رہتیں اور بیلا کے دانت خوامخواہ کھٹے ہوتے رہتے۔ اسے امبیاں کبھی اچھی نہ لگیں۔ بس آموں کے پکنے کا انتظار کرتی۔ پھر کبھی کوئی آم پٹ سے پکے فرش پر گرتا اور پھٹ جاتا تو اس کی دوڑ لگ جاتی۔

بچپن بیت گیا مگر اس رسیلے پختہ آم کا ذائقہ آج بھی اس کے لبوں پر تازہ تھا۔ پھر بڑی امی آگے بڑھتیں جو بیلا کی تائی بھی تھیں اور خالہ بھی۔ کچا پھل درخت سے اترتا' لکڑی کی پیٹیوں میں بند کر کے پال ڈالی جاتی۔ پیٹیاں اسٹور میں' چابی بڑی امی کے بٹوے میں۔ تھوڑے دنوں میں سبز پر پیلا رنگ غالب آنے لگتا تو پکے آموں کی خوشبو اسٹور کی کھڑکیوں' دروازے کی درزوں سے پھوٹتی کچن تک آنے لگتی۔ ذکی' فیضا اور سفیان کی آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوتے اور بڑی امی سارے گھر میں اسٹور کی چابی ڈھونڈتی پھرتیں۔ جو کبھی وہاں سے نہ ملتی' جہاں انہوں نے رکھی ہوتی اور جب اسٹور سے پیٹیاں نکلتیں تو ایک آدھ خالی ہوتی۔ جب تک داجی زندہ تھے۔ ایسے میں پچھلے برآمدے میں پلنگ پر آ بیٹھتے' کسی کو ٹب لینے بھگایا' تو کسی کو برف' بڑے سے ٹب میں آم بھگو کر خود نگرانی کرتے۔

"نہ......نہ ابھی ان کی گرمی نکلنے دو' بڑی بہو کچی لسی کا ڈول بنالاؤ۔"

ٹب کے پہلو میں کچی لسی کا سرخ ڈول رکھا جاتا۔ پھر سب کو آوازیں پڑتیں۔ ذکی' فیضان اور سفیان' داجی کا خوب ہی مقابلہ کرتے۔ فرح اور زیبا کی کوشش ہوتی زیادہ سے زیادہ آم چھپا کر خفیہ ٹھکانے تک پہنچا دیں تاکہ بعد میں اطمینان سے کھائے جاسکیں ورنہ لڑکوں کی اسپیڈ کا کون مقابلہ کرسکا۔ عاشر اور بیلا چھوٹے ہونے کی بنا پر ایک ایک آم ہاتھ میں لئے عقب میں بیٹھے گٹھلی چوستے رہتے' پھر وہ تھی' جو سب میں موجود ہونے کے باوجود کہیں نہ ہوتی۔

پھر داجی کو اپنے عقب میں بیٹھے وجود کا احساس ہوتا تو پکار اٹھتے۔

"گل صنوبر......تم بھی لونا۔"

مگر اسے خود سے ہاتھ بڑھا کر لینے کی عادت کہاں تھی۔ بس دوپٹے میں چھپی مسکرائی جاتی۔ کوئی ہاتھ میں تھما دیتا تو وہ ہاتھ ہی میں پکڑا رہ جاتا یا وہ چپکے سے عاشر اور بیلا کی سمت بڑھا دیتی اور بیلا کو تو وہ آم اچھا لگتا تھا جو درخت سے ٹپکا ہو۔ نہ جانے کیوں اسے سب کے درمیان بیٹھ کر کھانے کی عادت ہی نہ تھی۔ حالانکہ پھل کسی بھی موسم کا ہو' اسے بے حد مرغوب تھا۔ اسی لئے بڑی امی اگر اس کا حصہ رکھنا بھول بھی جاتیں تو امی کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ پھر داجی سب کو لائن میں کھڑا کر لیتے۔

"آموں کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور کچی لسی اس گرمی کا توڑ ہے۔"

بیلا کو یہ دودھ' پانی اور نمک سے بنی لسی زہر لگتی تھی۔ سوفوراً ہی کھسک لیتی مگر اس کا ہاتھ عاشر کے ہاتھ میں جکڑا جاتا جو اس سے پورے ساڑھے تین سال بڑا تھا اور گھر میں واحد بیلا تھی جس پر وہ اپنے بڑے پن کا رعب جما سکتا تھا۔ داجی سے شکایت لگائی جاتی اور اسے سب کے سامنے کھڑے ہو کر پورا گلاس پینا پڑتا پھر ذکی بھیا ہاتھ منہ صاف کرتے کھڑے ہو جاتے۔

"اچھا مامی! ہمارا حصہ ہمارے گھر پہنچا دیجئے گا۔"

اور ان کا گھر آٹھ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر والا پورشن تھا۔ جہاں بیلا کی بیوہ پھپھو اپنے دو بیٹوں ذکی اور عاشر اور بیٹی مریم کے ساتھ قیام پذیر تھیں جبکہ نچلے پورشن میں دونوں بھائی داجی کی وفات کے بعد بھی باہم شیروشکر رہ رہے تھے کہ ان کی بیویاں آپس میں بہنیں بھی تھیں۔ سوروایتی دیورانی' جٹھانی والی رقابت درمیان میں آئی ہی نہیں۔ وہ بڑی امی کہلائیں تو یہ چھوٹی امی' وہ بڑے ابو تو یہ چھوٹے ابو......سب سے بڑی گل صنوبر پھر سفیان بھیا' فیضان

بھائی اور آخر میں زیبا۔ چھوٹے ابو اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ فرح اور بیلا' پھر یوں ہوا کہ......

ذکی بھیا کو اپنی تایا زاد شائستہ بھا گئیں۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جو ایم بی اے کررہی تھیں۔ خوب صورت' طرح دار' اعلیٰ تعلیم یافتہ' فرفر انگریزی بولتی اور جدید فیشن سے آراستہ شائستہ کے سامنے خاندان کی ساری لڑکیاں پانی بھرتیں اور بے حد معمولی دکھائی دیتیں۔ پھر ذکی بھیا بھی تو ایسے تھے۔ ایک دم دراز قامت' جاذب خدوخال' ہالی ووڈ کے ہیرو جیسے شان دار اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مزید تعلیم کے لئے باہر جانے کے لئے کوشاں۔ اب پھپھو کی بھلے اپنے جیٹھ' جٹھانی سے کبھی نہ بنی ہو مگر شائستہ اور ذکی ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے۔

دونوں کی شادی ہوئی اور دونوں باہر جا بسے اور ایسے بسے کہ پھر لوٹ کر نہ آئے۔ ہاں ان دونوں کی مزید کامیابیوں کی اطلاع کے ساتھ پھپھو کے نام ڈرافٹ باقاعدگی سے پہنچتے رہے۔

مریم بیاہ کر جدہ چلی گئی۔ عاشر نے اپنے لئے آرمی کا شعبہ پسند کیا۔ اوپر کا پورشن بالکل ہی خالی ہوگیا تو پھپھو جنہوں نے ساری زندگی دونوں بھابیوں کو گھاس نہ ڈالی تھی اوپر کی تنہائی سے گھبرا کر سارا دن نیچے گزارنے لگیں۔ سفیان اور فیضان کے لئے خاندان ہی سے دلہنیں پسند کی گئیں۔

فرح کو اس کے ماموں نے مانگ لیا۔ دونوں کی شادی چھ ماہ قبل ایک ساتھ ایک ہی دن ہوئی۔ فیضان کے ولیمہ والے دن فرح کی بارات تھی۔

داجی دنیا سے رخصت ہوئے اور آم کے پیڑ نے پھل دینا بند کردیا تو ایک دن کٹوا دیا گیا۔ مگر اب بھی کالونی میں آم کے درختوں پر بور آتا تو اس کی گھنی شاخوں میں کوئل کوکتی چلی جاتی۔

"مگر......یہ کس کو پکارتی ہے؟"

"دور دیس میں بسنے والی سکھیوں کو آواز دیتی ہے۔" زیبا' فرح کو بہت یاد کرتی تھی۔

"اوں ہوں......آنے والے ساون کی راہ دیکھتی ہے۔"

"ساون کی یا ساجن کی؟" اک معنی خیز سرگوشی' شرارتی ہنسی۔

"نہیں......کسی کے ہجر میں کرلاتی ہے۔"

پاس بیٹھی گل صنوبر گھبرا کر فریم ہاتھ سے رکھ کر یوں دوپٹے کی بکل میں چھپتی' جیسے گھنی شاخوں میں کوئل۔ اسے لگتا' اس کا وجود کوئل کی کوک میں ڈھل کر آنے والے ساون کی راہ

دیکھتا ہے یا کسی کے ہجر میں کرلا رہا ہے۔ یہ کرلاہٹ زیادہ بڑھتی تو وہ وضو کر کے پنج سورہ کھول لیتی۔ اس کا وجود آم کی گھنی شاخوں میں بدل جاتا' جس میں کوئل کوکتی چلی جاتی۔

* * *

بالکونی کا درواہ کھلا تو تازہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ کوئل کی کوک کمرے میں چکرانے لگی۔ اسے ابھی اور سونا تھا' سو تکیے میں سر گھسا دیا مگر تکیہ بھی کھینچ لیا گیا۔

"اٹھ جاؤ...... ورنہ مزے دار سے ناشتے سے محروم رہ جاؤ گی۔"

"کیوں؟ سونیا بھابی میکے سے واپس آ گئیں؟" اس نے کسل مندی سے کروٹ بدلی۔

"ہاں ...... رات کو فیضان بھائی جا کر لے آئے تھے۔ تم تو کھانا کھا کر یوں مدہوش ہوئیں کہ ساری رات کروٹ بھی نہیں بدلی۔"

فرح کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ رسالے' واک مین' برش' واٹر کلرز' نائٹ کریم ...... وہ سرعت سے ہر چیز ٹھکانے لگا رہی تھی۔ بیلا نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر تکیہ گود میں رکھا اور باہر جھانکنے لگی۔ اسے یہ کمرہ اور اس کا یہ نظارہ ہمیشہ سے بے حد پسند تھا۔ جہاں بیڈ پر بیٹھ کر باہر دور تک پھیلے درختوں کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ اس نے کھڑکیوں سے پردے ہٹا دیئے۔ سامنے دو رویہ درختوں میں گھری سڑک بے حد سیاہ محسوس ہوتی۔ کالونی کے درختوں' خوب صورت گھروں کی چھتوں پر ایک روشن' خوش گوار صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔

"ایک اچھے دن کا آغاز۔" امتحانوں کی طویل تھکا دینے والی روٹین کے بعد اس نے خود کو بے حد تر و تازہ اور بشاش محسوس کیا۔

نیچے کچن میں ہنگامہ بپا تھا۔ شن کی آواز سے پوری گھی میں پڑتی اور سوندھی سوندھی مہک سارے گھر میں منڈلانے لگتی۔ پوریاں بنانے میں جو مہارت سونیا کو تھی کسی کو نہ تھی۔ کسی بیلن کی ضرورت نہیں بس ہاتھ سے جھٹک کر گھی میں اور نرم خستہ پوری تیار۔ ایک کڑاہی میں خوشبو دار میوے والا حلوہ' دوسری میں آلو کی بھجیا اور ایک چولہے پر الائچی والی چائے دم پر۔ سونیا سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے چولہوں کے گرد چکرا رہی تھی اور پوریوں کے لئے بے تاب افرادِ خانہ' جہاں جہاں سما سکے' سما گئے کچھ ناشتے کی میز کے گرد تو کچھ نیچے پیڑیوں پر۔

بیلا دروازے میں ہی ٹھٹک گئی۔ پوری کا نوالہ بناتے ہاتھ رکے اور عاشر نے چمکتی براؤن آنکھوں کے ساتھ دروازے میں ایستادہ بیلے کی کلیوں سی نازک لڑکی کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر تحیر آمیز سادہ سی خوشی رقم تھی۔ جبکہ براؤن آنکھوں میں جہان شوق امڈ آیا تھا۔

"تم کب آئے؟" وہ اس سے پورے ساڑھے تین سال بڑا تھا مگر گھر کے دو چھوٹے

افراد ہونے کی بنا پر ساری زندگی خود کو مظلوم عوام سمجھتے رہے۔ سو دونوں میں بچپن سے بلا کا ایکا رہا۔ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے عاشر کو گڑیاں کھیلنا پڑتیں تو عاشر کو بوریت سے بچانے کے لیے بیلا کو بیٹ پکڑنا پڑتا۔

"تم ٹھیک ٹھاک نکمی ہو' دیکھو ناشتے کے لیے بھابی کو ان کے میکے سے لانا پڑا۔" گویا وہ رات ہی آ گیا۔

"خیال سے' نکمے پن کا یہ طعنہ صرف مجھے نہیں باقی سب گھر والوں کو بھی لگے گا۔"

"اوہو' بچی تو سیانی ہو گئی ہے۔"

"اب تم سیٹ خالی کرو' بچی نے بھی ناشتا کرنا ہے۔"

"ارے ...... ارے۔" ایک ساتھ کئی آوازیں اس کی بدتہذیبی و بدتمیزی پر ابھریں جبکہ وہ سعادت مندی سے اٹھا۔ ایک فوجی سلوٹ اسے پیش کیا اور جگہ خالی کر دی' وہ پوری تمکنت اور وقار کے ساتھ خالی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"عاشر! اور لو نا۔"

"نہیں بھابی! میں کھا چکا۔" وہ دروازے سے پلٹا' پھر ذرا سا رکا' وہ اسی کی پلیٹ میں اسی کی چھوڑی ہوئی پوری کھا رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگا۔ سعدیہ بھابی ابرار کو کندھے سے لگائے گھوم رہی تھیں۔ وہ خوامخواہ ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ اسے زیبا نے لے لیا تا کہ وہ بھی ڈھنگ سے ناشتا کر سکیں۔ سونیا نے چولہے بند کئے' ٹرے میں بڑے اور چھوٹے ابو کے لیے چائے کے برتن رکھے' باہر نکلی تو فیضان آفس کے لیے جا رہے تھے۔

"ارے ...... آپ ناشتا تو کر لیں۔"

انہوں نے اک خفا سی نظر بیوی پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے گئے۔ سونیا اپنی جگہ حق دق رہ گئی۔ چھوٹی امی غالباً چائے ہی کے لیے کہنے آئی تھیں۔

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں۔"

"بغیر ناشتے کے چلا گیا۔"

سونیا نے گردن جھکا لی' آنکھیں خوامخواہ بھر آئیں۔ ابھی شادی کو کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ صاحب کے تیور بدلنے لگے۔

"ہیوی ناشتا نہیں کرنا چاہتا تھا تو تم پوچھ کر کچھ ہلکا پھلکا بنا دیتیں۔"

سونیا کیا پوچھتی' وہ تو اپنے ہاتھوں کا جادو دکھانے کو فیضان کے اٹھنے سے پہلے ہی کچن

میں موجود تھی۔

"لاؤ مجھے ٹرے دو' تم بھی اچھی طرح ناشتا کرو' اس کی فکر نہ کرو آفس میں کچھ کھا لے گا۔"

انہوں نے نرمی سے تسلی دی تو وہ پلکیں جھپکاتی کچن میں آ گئی۔ جہاں سب ان کے ہاتھ کے ذائقے کے معترف ہو رہے تھے اس کی آنکھ کی نمی خشک ہونے لگی۔

کھاتے کھاتے بیلا کا ہاتھ تھم گیا۔ اس نے ذرا سا اچک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہیں زرد چنبیلی کے جھاڑ کے پاس وہ ہی سفید جھولا' جس کے جوڑ جوڑ میں زنگ کے بدنما داغ نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب ہلتا تو فضا میں چرخ' چوں کی بدصورت آوازیں ابھرتیں۔

گل صنوبر سر جھکائے تکیے کے سفید غلاف پر گلاب کے پھول کاڑھ رہی تھی۔

اتنا انہماک' تسلسل اور روانی۔

مگر...... یہ تسلسل اور روانی...... خود ان کی اپنی زندگی میں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟

سوال کی سوئی ایک جگہ اٹک کر ذہن کی شفاف سطح پر ٹک ٹک کرنے لگی۔ اسے دیکھ کر بیلا کو ہمیشہ گھنے جنگل سے گزرتی ایسی ندی کا خیال آتا جس پر سورج کی کرنوں نے کبھی قوس قزح نہ بکھیری ہو۔ جس کے وجود کو ہاتھی ڈباؤ لمبی گھاس نے ڈھانپ رکھا ہو۔ بیلا کو اس شدید ٹھہراؤ سے ڈر لگتا' کہیں یہ شفاف' ان چھوئی' کنواری ندی' متعفن بدبودار دلدل میں نہ بدل جائے۔

بہتا پانی' ندی۔

کھڑا پانی' دلدل۔

وہ ٹرے اٹھا کر پچھلے دروازے سے باہر آ گئی۔

"میں ناشتا آپی کے ساتھ کروں گی۔"

اس کے بیٹھنے سے جھولا چرخ' چوں' چرخ چوں کرنے لگا۔ اس نے آلتی پالتی مار کر ٹرے درمیان رکھ لی۔ گل صنوبر نے فریم میں سوئی اٹکائی اور فریم کڑھائی والی چھوٹی سی بید کی ٹوکری میں رکھ دیا۔ اب وہ ہولے ہولے نوالے توڑنے لگی تھی۔ بیلا نے چور نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ارے......" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا' گل صنوبر نے چونک کر دیکھا۔ بیلا کی نظریں اس کے دوپٹے سے جھانکتے بالوں پر تھیں۔ جہاں سیاہی پر سفیدی غالب آ رہی تھی۔ اس نے ماتھے تک دوپٹہ کھینچ لیا۔ بیلا خاموشی سے اٹھ کر چائے لینے کچن میں چلی آئی۔ وہاں

زیبا بکھرا سمیت رہی تھی۔ وہ ٹرے لے کر باہر آئی تو ٹھٹک گئی۔

وہ زرد چنبیلی جیسی لڑکی وہاں کہیں نہ تھی۔ سفید جھولے کے عقب میں چنبیلی کے جھاڑ پر کوئی ایک پھول بھی نہ تھا۔ اسے لگا گل کا وجود اس جھاڑی میں ڈھل گیا ہے جس پر خواہشوں کا کوئی پھول نہیں کھلتا۔

بیلا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

* * *

گھر میں ناشتے کے بعد کی افراتفری تھی۔ گھر مختلف آوازوں سے گونج رہا تھا۔ افراہیم نفیس یعنی بڑے ابو چونکہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ سو ان کے کمرے کا ٹی وی اک تواتر کے ساتھ خبریں سنا رہا تھا۔ کچن میں برتن دھلنے کی کھٹ پٹ' صحن میں شڑاپ شڑاپ کی آوازیں' اندر ہی کہیں واشنگ مشین کی گھوں گھوں' سب کمروں سے گندے کپڑے' چادریں اکٹھی کرتی زیبا کے چپلوں کی گھسٹ گھسٹ عاشر نے دیکھا ایک وہ ہی تھی جو برآمدے میں کرسی پر براجمان اخبار دیکھ رہی تھی۔

"یہ ہفتہ کیسا رہے گا۔"

اس نے عقب میں کھڑے ہو کر باآواز بلند پڑھا۔ اس نے کھسیا کر اخبار لپیٹ دیا۔

"تم لڑکیوں کو ان چیزوں میں کیا دلچسپی ہوتی ہے۔"

"دلچسپی کیا' میں تو یوں ہی دیکھ رہی تھی۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"ایک پیالی اچھی سی چائے ملے گی۔"

"ابھی لیجیے۔" وہ کچن کی طرف چل دی۔ ایک چائے ہی تو اچھی بنانا آتی تھی ورنہ ہنڈیا میں ابھی تک نمک' مرچ کا تناسب ٹھیک نہ ہو سکا اور روٹی گول کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ چائے لے کر آئی تو عاشر کرسی پر بیٹھا آنکھیں موندے بڑے پُرسکون انداز میں گنگنا رہا تھا۔

"تو ہی حقیقت خواب تو
دریا تو ہی پیاس تو
تو ہی دل کی بے قراری تو سکون
جاؤں......"

"چائے...... تمہاری آواز ذرا بھی اچھی نہیں۔" کپ تھماتے ہوئے منہ بنا کر بتایا گیا۔

"اور تمہاری چائے۔" اس نے سپ لیتے ہوئے بدلہ چکایا۔

"ارے ...... سنو بیلا ...... میں نے ایک بہت ہی عجیب خواب دیکھا۔" ناراضی نے پلٹتی بیلا کو روکنے کے لیے وہ تیزی سے بولا اور بیلا نہ صرف رک گئی بلکہ اس کی طرف پلٹ بھی آئی کہ بچپن کی عادت تھی۔ وہ اپنے سارے خواب ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

"اک بہت ہی خوب صورت وادی ہے۔" بیلا اس کے قریب موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"بے حد سرسبز و شاداب' ڈھلانی چھتوں والے گھر جن کے کھلے دریچوں میں پھول ہی پھول ہیں۔ بے حد نیلا شفاف امبر' خوشبوؤں سے بوجھل ہوائیں۔ میں ایک بڑے سے سفید پتھر پر کھڑا ہوا ہوں اور مجھے اپنا آپ اتنا سبک محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہوا میں تیرتا وہاں تک آیا ہوں۔ اسی پتھر کے پاس بہتی ندی کے کنارے ایک لڑکی پھول چن رہی ہے۔ اس کے کندھوں تک کھلے بال بے حد سیاہ ہیں۔ اس کا نیلا آنچل بار بار اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرا رہا ہے۔ پھر وہ آہستگی سے پلٹی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔"

"وہ کون تھی؟"

"افسوس ...... تم۔" عاشر نے اس کی پر اشتیاق آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"ایک ...... میں کیوں؟" وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

"یہ تو تم بتاؤ۔" وہ مزے سے چائے پینے لگا۔ "سنو اس خواب کی تعبیر کیا ہوگی۔"

"عاشر! مجھے لگتا ہے عنقریب تمہارا ٹرانسفر کسی خوب صورت سی وادی میں ہونے والا ہے۔ پلیز مجھے ضرور ساتھ لے جانا۔ تمہیں پتا ہے مجھے خوب صورت وادیاں دیکھنے کا کتنا کریز ہے۔" وہ جوش سے گویا ہوئی۔ پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "زیبا آپی کو بتاتی ہوں۔"

"ارے ......" گرم گرم چائے اس کے ہونٹ جلا گئی مگر وہ لمحوں میں غائب تھی۔

"بے وقوف لڑکی' جو سمجھانا چاہتا ہوں نہیں سمجھتی۔"

اور وہ بے وقوف لڑکی جب زور و شور سے زیبا کو عاشر کا خواب سنا رہی تھی تو آخری حصے میں تنہا عاشر کے ساتھ اتنی خوب صورت وادی میں موجود ہونا اچانک قابل اعتراض لگا تو اپنی طرف سے زیبا آپی کا اضافہ خود ہی کر دیا۔

وہ ٹیرس کی ریلنگ پر جھکی نیچے زیبا سے باتیں کر رہی تھی۔ جب گیٹ کے اس پار ایک سیاہ لمبی سی گاڑی پانی کی طرح پھسلتی چلی آئی۔ اس کا لشکارا پورے منظر پر حاوی ہوگیا۔ وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر ٹکا کر سیدھی کھڑی ہوئی اور اعلان کے انداز میں بولی۔

"لیڈی توصیف ہمدانی تشریف لا رہی ہیں۔"

زیبا نے آن واحد میں کپڑوں کا ڈھیر دونوں بازوؤں میں دبوچا اور غڑاپ سے اندر

...... برآمدے کے تخت پر سبزی کاٹتی بڑی اماں نے ٹوکری پرے کھسکائی اور دوپٹے کے پلو سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ صاف کئے۔ چھوٹی امی مہمان کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھیں۔ جن کے ساتھ امارات کا مخصوص رعب و دبدبہ گھر میں گھستا چلا آیا اور فوراً ہی بڑی اماں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیاہ بغیر آستین بلاوز والی ساڑھی میں لپٹا وجود حسن' تمکنت اور وقار کا مجموعہ تھا۔ انداز میں ٹھہراؤ اور ہونٹوں پر ایسی دلفریب مسکراہٹ جو دیکھنے والے کو مسحور کرنے کے ساتھ ساتھ مرعوب بھی کر دیتی تھی۔

یہ سونیا کی ممی تھیں۔ مسز منیبہ توصیف ہمدانی۔

رسمی سی ملاقات کے بعد وہ سیدھی سونیا کے کمرے میں چلی گئیں اور بڑی اماں نے ملازم کے لڑکے کو بیکری دوڑا دیا۔ دنیا جہاں کے لوازمات' جن کے بارے میں سب جانتے تھے کہ ان میں سے صرف کولڈ ڈرنک کے ایک دو سپ لیے جائیں گے۔

تو پھر کیا ہوا؟

آخر وہ اس گھر کی بہو کی ماں اور ان کی سمدھن تھیں۔

چھوٹی امی کے چہرے پر تفکر کی ہلکی سی لکیریں تھیں۔ انہوں نے سونیا کی آنکھوں کو سرخ دیکھا تھا اور ناشتے کے بعد سے وہ کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی تھی۔ پون گھنٹے کے بعد جب ناشتے کے تمام لوازمات میں سے حسب توقع کولڈ ڈرنک کے چند سپ لینے کے ساتھ ہی وہ رخصت ہوئیں انہوں نے اپنے اندر طمانیت کا احساس ابھرتے دیکھا تو حیرت سے خود سے سوال کیا۔

"کیا میں بھی ان سے مرعوب ہوں؟"

* * *

عاشر نے کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی پچھلے صحن کی طرف کھلتی تھی اور اس میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ وہ وہیں جھولے کے پاس چوکی پر بیٹھی تھی اور گل صنوبر اس کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ نہ جانے کون سے قصے تھے جو وہ اسے سنائے جا رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے حسب عادت اس کے دونوں ہاتھ متحرک تھے۔ لاکھ ٹوکنے کے باوجود وہ آدھی باتیں ہاتھوں کے اشارے سے کیا کرتی۔ عاشر ہمیشہ اسے چھیڑتا۔ "کیا انٹینا ہلائے بغیر تمہاری آواز صاف نہیں آتی۔"

تو کبھی کہتا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو تو یہ بات کرنا ہی بھول جائے گی۔"

لڑکپن میں ایسی ہی باتوں پر ان کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

عاشر نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ انگلیوں کی پوروں میں اس کی خواہش دبی تھی یا دل دھڑ کتا تھا۔ اس نے ادھ کھلے گلاب کو لبوں سے چھولیا۔ اسے ابھی واپس جانا تھا اور وہ چاہتا تھا جانے سے پہلے اپنی اس لا پرواسی کزن کو بتائے' دن ہو یا رات' کوئی بھی موسم ہو' کیسی بھی روٹین' جانے انہ جانے' وہ اسی کو سوچنے لگا تھا۔ وہ چنبیلی کی خوشبو جیسی لڑکی کب اس کے حواسوں پر چھاتی چلی گئی۔ خود عاشر کو بھی خبر نہ تھی وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"کیا یہ محبت ہے؟"

اس نے کھڑکی بند کی اور خود اس کمرے میں آ گیا جو زیبا اور بیلا کا مشترکہ تھا۔ بیلا کی ساری کتابیں اک ترتیب سے الماری میں لگی تھی مگر اک کتاب بیڈ کی سائیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔ عاشر نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھالی۔ پہلا صفحہ کھولا اس پر بیلا کا نام جگمگا رہا تھا۔ یہ کتاب پچھلی برتھ ڈے پر اس کی کسی سہیلی نے گفٹ کی تھی۔ عاشر نے ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔

"خانہ بدوش۔" اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

"میں بھی خانہ بدوش ہوں۔ مگر یہ خانہ بدوشی مجھے راس نہیں آئی اب کوئی ٹھکانا چاہتا ہوں۔"

اس نے وہ ادھ کھلا گلاب کتاب میں رکھا اور کتاب بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا بیلا سے پہلے کسی کی نظر اس کتاب پر پڑے۔

اور جب وہ اس کتاب کو تلاشے گی اور کھولے گی تو۔

ایک خوش گوار سے تصور کے ساتھ وہ تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

* * *

زیبا کب سے نیٹ پر چیٹنگ میں مصروف تھی اور وہ موبائل پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ میسجنگ میں۔ پھر اکتا کر موبائل ایک طرف رکھ کر زیبا کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مدھر مسکان ان کہے افسانے سنا رہی تھی۔

"فہد بھائی ہیں؟"

"ہوں۔" زیبا کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"میرا بھی سلام لکھ دو۔"

"لکھ دیا۔" وہ بے توجہی سے بولی۔

"دو گھنٹے سے تم چیٹ کر رہی ہو۔ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو ختم ہی نہیں ہو رہی ہیں۔" زیبا کے انداز سے وہ ذرا سی جیلس ہوئی۔

"تم ابھی بچی ہو۔"

"اور یہ فہد بھائی وہاں پڑھنے کا بہانا کر کے بیٹھے ہیں۔ سارا وقت تو تمہارے ساتھ باتوں میں گزر جاتا ہے۔"

"تم کیوں جیلس ہو رہی ہو۔" وہ ہنسی۔

"میں کیوں جیلس ہوں گی ایسی ہی بے تابی تھی تو تمہیں بھی ساتھ لے جاتے نکاح تو ہو گیا تھا۔"

"سویٹی! یہ محبت کے معاملے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ اس دوری میں بھی نزدیکیاں ہیں۔" اس نے غالباً فہد کو گڈ نائٹ لکھ دیا تھا۔ تب ہی کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے کلینزر اٹھایا اور اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"اتنی فریش اسکن ہے پھر بھی رگڑے لگاتی رہتی ہو۔"

"اسی لئے فریش ہے۔" وہ ہنسی' جب بھی اس کی فہد سے بات ہوتی۔ ہنسی بات بے بات لبوں سے پھٹتی۔

"وہ واپس کب آئیں گے۔"

"اوائل سرما میں۔"

"پھر فوراً تمہاری رخصتی ہو جائے گی۔" بیلا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"ظاہر ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ' کیا یہ ضروری ہے کہ جس بندے کے ساتھ شادی ہو اس کے ساتھ محبت بھی ہو جائے۔" دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجاتے ہوئے معصومیت سے سوال کیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگرچہ فہد ان کا رشتے دار ہی تھا مگر زیبا اور اس کی بے تکلفی نکاح کے بعد ہی شروع ہوئی تھی۔ اب دونوں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے سے بات کئے بنا نیند ہی نہ آتی۔

"اللہ تعالیٰ نے اس رشتے میں ایک قدرتی کشش رکھی ہے۔ بیلا ڈیئر۔"

"اگر تمہارا نکاح فہد کی جگہ کسی اور سے ہوتا' تب بھی تم اس سے ایسی ہی محبت کرتیں؟"

"اللہ نہ کرے' کیا بے تکے سوال کر رہی ہو۔" زیبا نے دہل کر کہا اور کلینزر واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تم سچ مچ ان سے محبت کرنے لگی ہو؟" بیلا مسکرا دی۔

"اب لائٹ بند کر دوں؟" اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

''کر دو' میں نہیں چاہتی تمہارے خواب' ڈسٹرب ہوں' ویسے خواب سنسر پالیسی کو مدنظر رکھ کر دیکھتی ہونا۔'' بیلا نے شرارت سے پوچھا۔

''ہمارے تو اب ڈراموں میں بھی کوئی سنسر پالیسی نہیں رہی' تم خوابوں کی بات کرتی ہو۔'' زیبا نے لائٹ بند کی تو وہ بھی تکیہ کھینچ کر لیٹ گئی۔ تب ہی ہاتھ کتاب سے ٹکرایا۔ اس نے کروٹ بدلی اور کتاب کو اندھیرے میں شیلف میں گھسا دیا۔ کبھی کچھ باتیں ان کہی ہی رہ جاتی ہیں۔ گلاب کی خوشبو کتاب کے صفحوں میں مقید ہو کر رہ گئی۔

***

زیبا کے لاکھ اکسانے کے باوجود وہ اس کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ جانے پر رضا مند نہ ہوئی۔ جہاں زیبا مختلف قسم کے کورسز کر کے ٹائم پاس کر رہی تھی۔ اسے تو گھر میں رہ کر سونیا بھابی سے مختلف چائنیز' اٹالین اور انگلش کھانے پکانا سیکھنے تھے۔ گل آپی سے کشیدہ کاری سیکھنا تھی۔ اس کا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور اس کے اس فیصلے کو سب سے زیادہ عاشر نے سراہا۔ وہ جو اپنی سخت ترین روٹین میں بھی سوچتا' جب اس نے کتاب میں ادھ کھلا گلاب دیکھا ہوگا تو کیا سوچا ہوگا اور فون پر اس کے لہجے میں کچھ الگ' کچھ ان کہی سی محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہاں تو وہ ہی لا پرواہی اور ازلی بے نیازی تھی۔ بس جلدی جلدی باتیں کیں اور ریسیور پھوپھو کو تھما دیا۔ یہ تک نہ پوچھا کہ ''عاشر! تم کب آؤ گے؟ یا ہم سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔'' وہ خود ہی ان فقروں میں اپنے مطلب کی بات چن لیتا مگر بیلا کو تو سونیا بھابی سے بریانی کی پوری ترکیب سیکھنا تھی۔

اور بریانی کا مسالہ تیار کرتے ہوئے دونوں کو خبر بھی نہ ہوئی کب گیٹ پر سیاہ گاڑی رکی' کس نے دروازہ کھولا اور کب مسز منیبہ توصیف ہمدانی ان کے سر پر آ کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی اور بڑی امی دونوں کسی کی عیادت کے لیے گئی تھیں۔

''مما۔'' سونیا ٹھٹکی' پھر پذیرائی کو آگے بڑھی۔

''یہ اتار کر کمرے میں آؤ۔'' ان کا اشارہ ایپرن کی طرف تھا۔ خود وہ تیزی سے پلٹ کر اس کے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ فضا میں کچھ لمحے اس کی ہیل کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔ پھر سونیا کو ہوش آیا۔ اس نے ایپرن اتارا ہاتھ دھوئے اور ان کے پیچھے لپکی۔

''اب میں کیا کروں۔'' بیلا نے اناڑی باورچی کی طرح اردگرد پھیلے سامان کو دیکھا پھر خیال آیا۔ یوں ہاتھ لٹکانے سے کچھ نہ ہوگا۔ عزت مآب مہمان کی خاطر داری کرنا ہے اور گھر میں اس کے سوا کوئی نہیں ...... سعیعہ بھابی بھی اپنے میکے گئی تھیں۔ اس نے فریزر سے کباب

نکال کر باہر رکھے۔ خود کرسٹل کے نفیس گلاس میں کولڈ ڈرنک انڈیلی ...... مگر سونیا بھابی کے کمرے میں داخل نہ ہو سکی کہ وہاں ماحول کچھ اور تھا۔

''یہ کمرے کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟''

''مما! آج ملازمہ ابھی تک نہیں آئی تو۔'' وہ گڑبڑا کر کمبل تہ کرنے لگی۔

''ملازمہ نہیں آئی یا تمہیں کچن سے فرصت نہیں ملی' اپنا حلیہ دیکھا تھا۔'' وہ کسی انسپکشن آفیسر کی طرح ہر چیز کو جانچ رہی تھیں۔ سونیا نے کچھ جھنجلا کر کمبل چھوڑا۔

''کیا ہوا مما! سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو ہے۔''

''تم نے فیضان سے بات کی؟''

''کس بارے میں؟'' وہ لب بھینچے بیٹی کو گھورتی رہیں۔ سونیا بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''سونو! میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔'' انہوں نے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا تمہیں ابھی تک احساس نہیں ہوا کہ تم نے کیا کچھ کھویا ہے۔''

''نہیں ...... کیونکہ یہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے فیضان سے محبت کی ہے اور اسے پانے کے لیے کچھ بھی کھونے کو تیار تھی اور جہاں تک بات ہے علیحدہ گھر میں شفٹ ہونے کی تو وہ مجھ پر یہ بات واضح کر چکے تھے کہ وہ ابھی علیحدہ نہیں ہو سکتے اور مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں' میں یہاں خوش ہوں' آپ بار بار ایک ہی بات دہرا کر مجھے ڈسٹرب مت کریں۔'' سونیا کو لگا اسے ماں سے دوٹوک بات کرنا ہی ہوگی۔

''یہ گھر ہے؟''

''اب یہ ہی میرا گھر ہے۔'' سونیا نے اعتماد سے جواب دیا۔ ''یہاں کے لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں' مان دیتے ہیں اور میں یہاں بہت خوش ہوں۔''

''نوکرانی بن کر رہ گئی ہو۔''

''اپنے گھر کا کام کرنے سے کون نوکر بنتا ہے۔''

''تمہیں تمہاری دادی نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے ...... ورنہ اس لوئر کلاس کے فیضان سے شادی نہ کرتیں۔''

''ٹھیک ...... لیکن یہ سب آپ کو اس وقت سوچنا چاہئے تھا جب مجھے دادی کے پاس چھوڑ کر فارن ٹور پر نکل گئی تھیں۔ بہرحال یہ لاحاصل بحث ہے۔ آپ کولڈ ڈرنک لیں گی یا کافی؟''

تب ہی باہر کھڑی بیلا کو ہوش آیا تو وہ ہڑبڑا کر اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے ایک اچٹتی

سی نگاہ اس پر ڈالی۔

"چلتی ہوں، لیکن زندگی میں جب کبھی اپنی حماقت کا احساس ہو، چلی آنا۔"

بیلا کی موجودگی سے سونیا بُجھل سی ہوگئی۔ وہ اپنے پیچھے ایک بوجھل سی خاموشی چھوڑ گئی تھیں۔ بیلا نے سونیا کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، آؤ کچن دیکھیں۔"

"بھابی! آپ یہاں خوش تو ہیں ناں؟" بیلا نے فکرمندی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہنس دی۔

"ہاں بھئی، اب یہ کولڈ ڈرنک تو بے کار ہوگئی۔"

"ایسی بے کار چیز اب میرے پیٹ میں ہی جائے گی۔" بیلا نے بے چارگی سے کہا اور گلاس منہ کو لگا لیا۔

* * *

فرح اپنے میاں کے ساتھ اچانک ہی وارد ہوئی۔ اس کے میاں کو یہاں کچھ کام تھا اور انہیں ایک ہفتہ یہیں رکنا تھا۔ وہ صبح کا گیا شام کو آتا اور فرح سارا دن سسرال میں گزرے پچھلے ماہ کے شب و روز انداز بدل بدل کر سناتی۔ ہر روز رات کے کھانے کے بعد لاؤنج میں محفل جم جاتی۔ وہ تھی بھی بہت زندہ دل، اپنے قصوں میں کوئی نہ کوئی گیم نکال لیتی۔ سنیعہ ابرار کو سلانے کے بہانے اٹھ جاتیں۔ گل صنوبر عشاء کے بعد نوافل اور تسبیحات میں مشغول ہو جاتیں۔ ایسے میں سونیا اپنی بامروت طبیعت کی بنا پر پھنس جاتی۔ فیضان بیڈروم میں تنہا غصے میں کھولتے، کروٹیں بدلتے رہتے اور جب تک سونیا اس سب سے جان چھڑا کر کمرے میں آتی ان کا موڈ بگڑ چکا ہوتا یا وہ سو چکے ہوتے اور سونیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گھر اور شوہر کے درمیان توازن کیسے رکھے۔

"سونیا! فیضان کو دودھ کا گلاس دے دیا تھا۔" فیضان کو کچن میں جاتے دیکھ کر چھوٹی امی نے نرمی سے اسے ٹوکا، وہ سب کے ساتھ کیرم کی بازی جمائے بیٹھی تھی ہڑبڑا کر اٹھی۔ بیلا کچن میں سب کے لیے چائے بنا رہی تھی اور فیضان فریج کھولے کھڑے تھے۔

"دودھ سادہ لو گے یا......" سونیا نے جلدی سے دودھ کا برتن نکالا مگر فیضان نے جھپٹ لیا۔

"خود ہی لے لوں گا۔"

ان کا لہجہ بے حد سرد اور سپاٹ تھا۔ سونیا کی رنگت متغیر ہوگئی۔ بیلا دانستہ رخ بدل کر مگ نکالنے لگی۔ فیضان نے دودھ گلاس میں نکالا۔ گلاس مائیکرو ویو میں رکھا پھر اوولٹین کا ڈبہ نکالنے لگے۔ سونیا تیزی سے باہر نکل گئی۔

"کچھ گڑبڑ ہے۔" بیلا کو شدت سے احساس ہوا۔ چائے لے کر لاؤنج میں گئی تو سونیا اور فیضان دونوں ہی وہاں نہ تھے۔ وہ سونیا کا کپ لے کر دانستہ ان کے کمرے کی طرف آ گئی مگر وہاں بہت گہری چپ دروازے کے دوسری طرف سرسرا رہی تھی۔ وہ متذبذب سی کھڑی رہی۔ دستک دے یا نہ دے پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی مگر اس رات ماں کے پہلو میں دبک کر ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی۔

"ہاں، محسوس تو...... میں نے بھی کیا ہے دونوں کے درمیان کچھ فاصلے ہیں۔" ماں کے دوسری طرف لیٹی فرح اٹھ بیٹھی وہ تو سن کر ہی پریشان ہوگئیں۔

"آپ کہیں تو میں بات کروں۔" فرح نے اپنی خدمات پیش کیں۔ شادی کے بعد وہ خود کو خاصا معتبر اور سیانا تصور کرنے لگی تھی۔

"نہیں، ابھی تو کچھ بھی واضح نہیں میں دیکھ لوں گی۔" انہوں نے منع کر دیا اور اگلے چند دن جائزے کے بعد انہیں مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا۔

جو باتیں ابھی معمولی تھیں آگے جا کر بگاڑ کا باعث بن سکتی تھیں۔ انہیں افسوس سا ہوا، کہیں نہ کہیں چوک ہوگئی تھی۔ گھر کا توازن گھر کے بڑوں کے ہاتھ ہوتا ہے اور یہاں توازن بگڑ رہا تھا۔ سنیعہ اکثر ابرار کے بہانے ادھر ادھر ہو کر ذمہ داری سے پلو بچا جاتی اور سونیا مروت میں بہت ذمہ داریاں خوامخواہ اپنے اوپر لیے بیٹھی تھی اور وہ دونوں یعنی ثوبیہ اور ثمینہ گھر میں بہوئیں لا کر بے فکر ہوگئی تھیں۔ ثمینہ آپا کو بیرونی دوروں سے فرصت نہ تھی اور خود انہوں نے نہ جانے کب کے سنبھال سنبھال کر رکھے شوق ابھی پورے کرنا تھے۔ ثمینہ آپا سے تو توقع ہی فضول تھی وہ لاپروا خاتون تھیں اب جو کچھ کرنا خود ان ہی کو کرنا تھا۔

* * *

"فیضی! تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" کھلی کھڑکی سے آواز باہر کو لپکی، تو پچھلے برآمدے میں سب سے چھپ کر بیر کھاتی بیلا کے کان کھڑے ہوگئے۔

"مسئلہ...... مجھے تو لگتا ہے ہمارے درمیان اب کچھ رہا ہی نہیں۔"

"جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہو۔"

"مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

"واہ فیضان واہ...... میں تمہاری خاطر کیا سے کیا ہوگئی اور تم۔"

"تم نے جو کچھ کیا اپنی خوشی سے کیا اب پچھتا رہی ہو تو۔"

"میں نہیں پچھتا رہی' ہاں تم اور تمہارا رویہ ضرور پچھتانے پر مجبور کرے گا۔"

"اور تمہارا رویہ؟"

"کیا ہوا میرے رویے کو۔"

"تم بدل گئی ہو سونیا بیگم...... مجھ سے کتراتی اور بھاگتی ہو۔ تمہارے پاس وقت ہی نہیں' میرے پاس بیٹھنے اور بات کرنے کا۔ کیا ثابت کرنا چاہتی ہو یہ صبح سے شام تک کچن میں گھس کر کہ ہم لوگ بہت ظالم ہیں۔ روایتی لوگوں کی طرح ساری ذمہ داریاں تم پر لاد رکھی ہیں' تمہارے......"

"خدا کے لیے فیضان اتنی بدگمانی' کچھ تو خیال کرو' میں دو' دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتی ہوں۔"

"کون سے محاذ کھولے ہیں اور آواز دھیمی کرو۔"

ساتھ ہی کھڑاک سے کھڑکی بند ہوگئی۔ وہ بگٹٹ ماں کی طرف بھاگی انہوں نے پہلے بیلا کو ہی لتاڑا۔

"یہ دروازے کے ساتھ لگ کر کن سوئیاں لینے کی عادات کہاں سے پڑ گئی تمہیں۔"

"میں تو پچھلے برآمدے میں بیٹھی تھی۔" اس نے احتجاجاً پاؤں پٹخے۔

"ٹھیک ہے' جاؤ کچھ کرتی ہوں اور خبردار جو آئندہ ٹوہ لی۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے' ہونہہ! میں نہ بتاتی تو پتا کیسے چلتا' خود تو سارا دن کالج گرلز کی طرح نت نئی کتابیں پڑھتی رہتی ہیں اور بڑی اماں...... انہیں سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آگئی۔

اور رات فیضان کے ساتھ ثوبیہ بیگم کی طویل نشست ہوئی اور اگلے دن گھر کے کام تقسیم کر دیئے گئے۔ جس پر سب سے زیادہ اعتراض سنیعہ بھابی کو تھا جن کے ذمے رات کا کھانا لگا۔

"ابرار تنگ کرتا ہے' اس کے سونے کا وقت......"

"بھئی ابرار کو ہمیں دے جایا کرو' آخر اس کی دو' دو دادیاں موجود ہیں۔"

انہوں نے خوش مزاجی سے اعتراض ٹالا ورنہ بڑی اماں تو دو' چار سنانے کو پر تول رہی تھیں۔ آخر انہوں نے بھی چار' چار بچوں کے ساتھ کچن سنبھالا تھا۔ وہ ایک وقت کا کھانا نہیں

بنا سکتی تھی۔ سونیا کے ذمے دوپہر کا کھانا تھا۔ اب وہ شام کو فری تھی۔ سو' میاں کے ساتھ کہیں بھی سیر سپاٹے یا خاندان میں نکل سکتی تھی۔ زیبا کو شام کی چائے ملی' وہ سستا چھوٹ جانے پر خوش تھی۔ شامت بیلا کی آئی' جس کے ذمے صبح کا ناشتا تھا۔

"میں ہی کیوں؟"

"بعد میں سارا دن فارغ بھی تو ہوگی۔" بڑی اماں نے پچکارا۔

"ہاں' صبح صبح اٹھو' کسی کو پراٹھے چاہئیں تو کسی کو آملیٹ' کبھی بریڈ' تو کبھی فرائی انڈے' مجھ سے تو ہمیشہ زردی ٹوٹ جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں' ہم وہ ٹوٹا پھوٹا انڈا کھالیں گے' ہمیں یقین ہے وہ ہمارے پیٹ میں کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں مچائے گا۔" زیبا نے دندیاں نکالتے ہوئے تسلی دی۔

"بڑے ابا چھ بجے بیڈ ٹی لیتے ہیں۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"اچھی بات ہے تمہاری فجر کی نماز نہیں چھوٹے گی' جس کا آئے دن بہانا کرتی ہو۔"

"ہاں...... تم تو پانچ وقت کی نمازن ہو۔" وہ لڑنے کو تیار ہوئی۔

"بیلا! مجھے لڑکیوں کا زیادہ بکواس کرنا پسند نہیں۔"

امی نے "راجہ گدھ" سے نظریں ہٹا کر سکون سے کہا اور اس کی بولتی بند ہوگئی اور یوں اک بڑا مسئلہ ثوبیہ بیگم کی مداخلت اور بروقت اقدام سے خود بخود دب گیا۔

شام کو سونیا تیار ہو کر ان سے دعا لینے آئی تو انہوں نے اس کی نظر اتارتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

"میں جانتی ہوں' تم یہ سب اس گھر کو اپنا بنانے کے لیے کر رہی تھیں' لیکن سونیا! تمہاری سسرال روایتی سسرال نہیں ہے جہاں جگہ بنانے کے لیے دن رات گھن چکر بننا پڑے۔ یہاں کے مکین ہر آنے والے کو بصد احترام اس کی جگہ دے دیتے ہیں' تم ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتی ہو' ہمیں بہت اچھا لگتا ہے اور قدر بھی ہے۔ تم جو اتنی آسائشوں سے نکل کر یہاں ایڈجسٹ کر رہی ہو' لیکن ایک بات یاد رکھو۔ تمہاری اولین ذمہ داری تمہارا شوہر ہے' جس کے حوالے سے تم یہاں ہو' شوہر اور گھر میں توازن رکھنا سیکھ لوگی تو بہت خوش رہوگی۔"

"جی امی۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔

"ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔" فیضان کلائی پہ گھڑی باندھتا اندر آیا۔

"فیضی! آج میری بہو کو ڈنر باہر کروانا۔"

"امی! آپ کا بیٹا خاصا غریب ہے۔" اس نے دہائی دی۔

"ہاں ..... یہ غریب بیٹا مہینے میں ایک' دو ڈنر تو افورڈ کر سکتا ہے۔"

"بیلا! تم بھی چلو۔" سونیا نے مروتاً کہا' وہ جو ابھی تک خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ پر جوش ہو اٹھی' مگر اس کی ہاں ماں نے اپنے پیر سے دبائی تھی' وہ لبوں سے اٹھتی چیخ کو دباتی سابقہ پوزیشن میں بیٹھ گئی۔

"کیا تھا' جو میں چلی جاتی۔" دونوں کے جانے کے بعد وہ اپنا پیر سہلاتے ہوئے بولی۔

"کباب میں ہڈی والا محاورہ سنا ہے؟" ماں نے عینک کے پیچھے سے جھانکا۔ "شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ جایا کرنا۔"

"اچھا..... جو میری ساس آپ جیسی دیالو نہ ہوئی تو' یا میری شادی ہی نہ ہوئی۔" وہ چمک کر بولی تو پاس ہی ابرار کے ساتھ مشغول ثمینہ تڑپ اٹھیں۔

"خدا نہ کرے' اللہ سب بچیوں کو اپنے گھر بار کا کرے' وہ ایک بدنصیب کافی نہیں۔" ان کی آواز بھرا سی گئی' بیلا نے چونک کر دونوں کو دیکھا۔ وہ یقیناً گل صنوبر کی بات کر رہی تھیں۔

"بڑی اماں! آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ گل آپی کی شادی بہت اچھی جگہ ہوگی۔" اس نے نادانستگی میں ان کے زخم چھیڑ ڈالے۔

"گل اتنی بخت آور ہوتی تو وہ اسے یوں ٹھکراتا؟" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔ اس سے قبل کہ بیلا کوئی سوال کرتی ماں نے ڈانٹ کر اٹھا دیا

"جاؤ' اپنی پھوپھو کو دیکھ آؤ' آج صبح سے نیچے نہیں آئیں۔"

وہ کچھ الجھتی اوپر گئی تو پھوپھو مزے سے خراٹے لے رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں واپس آ گئی۔

* * *

فضا میں آتی بہار کی آہٹیں اور کلیوں کے چٹکنے کی صدائیں گھلی ملی تھیں۔ دھوپ چلچلاتی اور کمروں میں خوش گوار ٹھنڈک کا احساس' ایسی خوش گواریت' جس میں خوامخواہ آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

پھپھو نیچے آئیں تو ساتھ ہی ذکی کے پاکستان آنے کی خبر بھی آ گئی۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے آنکھیں نم۔ اتنے سالوں کے بعد بیٹا پردیس سے آ رہا تھا۔

"میں تو سمجھی تھی' اب جیتے جی اس کی شکل نہیں دیکھ پاؤں گی۔"

"ایسا کیوں کہتی ہیں' کیا شائستہ بھی ساتھ آ رہی ہے۔" ثوبیہ بیگم نے پوچھا۔

"نہیں ابھی اکیلا ہی آئے گا۔" ایسا کہتے ہوئے ان کے لہجے میں ہلکی سی یاسیت گھل گئی۔ بیٹے کی بے اولادی کا دکھ انہیں اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ ثمینہ خاموش سی تھیں۔ زیبا نے اس خبر کو نارمل ہی لیا جبکہ بیلا پُر جوش تھی۔ وہ بچپن ہی سے ان سے بہت متاثر تھی۔

"گل آپی! آپ کو پتا ہے ذکی بھائی آ رہے ہیں۔" انہیں اطلاع دینے والی بیلا ہی تھی۔ وہ کچھ لمحے ساکت سی رہ گئی۔ دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے دوپٹہ سر پر پھیلاتے ہوئے سوچا۔

"میں جانتی تھی' تم اسی موسم میں لوٹ کر آؤ گے۔"

* * *

"تم نے خانہ بدوش پڑھ لی۔"

وہ دونوں آج بھی اس گھر کے ننھے بچے تھے' جو سب کی نظر بچا کر پچھلے برآمدے میں ایک دوسرے سے زمانے بھر کی شکایتیں لگانے اکٹھے ہوئے تھے۔ سامنے جھولے پر صنوبر کا سامان بکھرا تھا اور کچن میں ہوتی کھٹ پٹ بتاتی تھی کہ صنوبر وہیں ہے۔

"مجھے سفرنامے اچھے نہیں لگتے۔ اچھا بھلا اپنا گھر چھوڑ کر مارے مارے پھرتے رہو۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ چائے کا کپ اپنے اور اس کے درمیان رکھ لیا۔

اوپر کی منزل پر نیا رنگ روغن کروایا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بڑی اماں کی بڑبڑاہٹیں اور غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ خوامخواہ سب سے الجھنے لگتیں۔ ثوبیہ بیگم چپکے چپکے انہیں کچھ سمجھاتی رہتیں اور جب وہ اکتاتیں تو خاندان کے دورے پر نکل جاتیں۔

"اچھا۔" عاشر کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی در آئی۔ اس نے گردن موڑ کر سبز کپڑوں میں ملبوس لاپروا سی لڑکی کو دیکھا' جو اس سے دنیا جہاں کی باتیں کر جاتی تھی مگر وہ اس سے اپنے جذبات' ایک نئے اور اچھوتے احساس کو بیان نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے بیلا کا رکھا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"اوں ہوں..... میری جھوٹی کیوں پی رہے ہو' میں اور لا دیتی ہوں۔"

"بچپن سے لے کر آج تک ہم نے ایک دوسرے کی ہر چیز شیئر کی ہے' خواہ وہ لسی کا ایک گلاس ہی کیوں نہ ہو' پھر آج یہ احساس کیوں؟" اس نے کپ نہیں رکھا۔

"امی کہتی ہیں' اب تم بڑی ہو گئی ہو۔"

"ہاں..... وہ تو ہے....." عاشر نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ اب وہ اس کے

سامنے دوپٹہ خوب پھیلا کر اوڑھتی تھی۔

"دیکھو عاشر! نئی کلیاں چٹکنے لگی ہیں۔"

"ہاں' وہ تو ہے۔" اس کا لہجہ و انداز دونوں ہی بدلے۔

"پھر سفید اور پیلی تتلیاں آئیں گی' یاد ہے تم مجھے تتلیاں پکڑ کر دیا کرتے تھے۔"

"ہاں' وہ تو ہے۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔" بیلا نے مشکوک نگاہوں سے دیکھا تو وہ سنبھل گیا۔

"اچھا عاشر! ذکی بھائی سے ایک موبائل کی فرمائش ہی کر دو۔"

"کیوں' میرے پاس تو آل ریڈی ہے۔"

"بدھو' میرے لئے۔"

"آئندہ مجھ سے اس ٹون میں بات مت کرنا' ورنہ......" اس کا بدھو کہنا بہت برا سا لگا تھا۔

"سوری' کہہ دو گے نا؟"

"دیکھوں گا۔"

"گھر میں سب کے پاس ہے۔"

"سب کو ضرورت ہے۔" اس نے چائے ختم کی۔

"زیبا کو کیا ضرورت ہے' سوائے سارا دن اپنے منگیتر کے ساتھ باتیں کرنے کے۔"

"تو تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی؟"

"تو میں بھی تو......" کچھ کہتے کہتے زبان لبوں تلے دبالی۔ عاشر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"واہ...... منگنی ہوئی نہیں اور موبائل پہلے سے ارینج کیا جا رہا ہے۔"

بیلا نے غصے و خجالت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کپ اس کے ہاتھ سے جھپٹا تو عاشر نے اس کا ہاتھ تھام لیا' پھر بچوں کی طرح پچکار کر بولا۔

"اچھا وعدہ' تمہیں موبائل میں گفٹ کر دوں گا۔"

"ہونہہ! مجھے نہیں چاہئے۔" وہ ہاتھ چھڑا کر پچھلے دروازے سے کچن میں چلی گئی۔ عاشر نے دونوں ہاتھ عقب میں رکھے اور پاؤں پھیلاتے ہوئے گنگنانے لگا۔

تو ہی حقیقت' خواب تو

* * *

ادھ کھلی چاندنی' خاموش فضا' ہوا چنبیلی کے جھاڑ میں پتے اوڑھے سو رہی تھی۔ اس کی

ہلکی سی کروٹ پر پھول اوڑھے سفید تتلیاں کسمساتیں' ہلکے سے پھڑ پھڑاتیں اور پھر سے محو خواب ہو جاتیں۔

"کیا تتلیاں بھی رات کو نیند اوڑھتی ہیں۔"

اس نے اک بے تکے سے خیال کے ساتھ اپنی سوچ کے زاویوں کو بھٹکانا چاہا۔

'کیا ان کی آنکھیں بھی خواب دیکھتی ہیں۔"

ہلکی سی جنبش سے جھولا چرخ چوں' چوں کرنے لگا تو وہ اپنے ہی خیالوں سے چونکی اور گڑبڑا گئی۔ سوال ہی ایسا تھا۔

"تمہاری نیندوں نے پہلی بار خواب کا ذائقہ کب چکھا۔"

پہلی اور آخری بار؟

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا' ریشمی سفید دوپٹہ سر سے سرک گیا۔ اسے لگا وہ اپنے ہی سامنے بے نقاب ہو گئی ہے۔ اپنی دانست میں دھیان کے طاقچے میں سارے چراغ بجھائے بیٹھی تھی۔

تو آج یہ ہلکی سی روشنی کیوں؟

یہ کس نے بے خواب اندھیاری راتوں کی دہلیز پر دھرا بجھا دیا' پھر سے جلا دیا تھا۔

وہ سمجھی تھی کہ وہ سب کچھ بھول گئی' مگر سرہانے رکھے یادوں کے گلاب اب بھی تر و تازہ تھے۔ پہلا خواب' یہیں اسی آنگن میں جب لیموں کے سفید پھولوں پر پیلی تتلیاں منڈلاتی تھیں اور زرد چنبیلی اپنے جوبن پر تھی۔ داجی نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اعلان کیا تھا۔

"یہ میرے ذکی کی دلہن بنے گی۔"

تب پہلی بار معصوم ہاتھوں نے گڑیا کو دلہن بناتے بناتے' ٹیکا اپنے ماتھے پر سجا کر دیکھا اور شرما گئی تھی۔ زیست کا ایک ایک پل' ایک ایک لمحہ اس نے خود کو ذکی کی امانت سمجھا اور جب وقت آیا تو وہ سرے سے انکاری تھا۔ اک اضطرابی لہر اٹھی اور دوپٹہ کندھے سے پھسل کر گود میں آ گرا۔ اس نے گھبرا کر ننگے پاؤں نیچے رکھے' وہاں اس کے ادھورے خواب کی کرچیاں بکھری تھیں۔ وہ چاہتی تو بھی خود کو لہولہان ہونے سے بچا نہ پاتی اور یہاں تو زخم بھی عزیز تھے۔ اس نے کس حوصلے سے اپنے محبوب کو رخصت کیا۔

تم جاؤ

سمندر' سمندر اپنی پیاس بجھاؤ

جن آنکھوں میں اترو

جس دل میں ڈوبو

میری تنہائی تمہیں آواز نہ دے گی۔

اور اس نے آج تک اسے کبھی نہیں پکارا۔ کبھی اپنی راکھ ہوتی جوانی کا حساب نہ مانگا کہ حساب کتاب تو برابری میں ہوتا ہے۔ وہ تو در پر بیٹھی سوالی تھی جسے چاہو تو چند سکے دان کردو' چاہو تو دھتکار دو...... اور وہ دھتکار دی گئی تھی اس کا کشکول خالی کا خالی رہا۔

"کہاں میں اور کہاں وہ۔ ایف' اے پاس بے وقوف سی لڑکی' کیا میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتی ہے؟ یوں بھی میں اس بچپن کی منگنی ونگنی کو نہیں مانتا۔ میں شائستہ سے شادی کر رہا ہوں اور بس۔"

اور اس ایف۔ اے پاس بے وقوف لڑکی نے یہ سب کس صبر اور حوصلے سے سنا' بنا آنکھ سے آنسو بہائے۔ محبت کی کتاب بند کر کے سنبھال کر دل کے طاق میں سجائی اور خود رب سے لو لگالی۔ حال دل محرم راز جان سکتا ہے اور رب سے بڑا محرم کون ہوسکتا تھا لیکن آج لگا وہ تو صدیوں سے خود کو اور رب کو دھوکا دیتی آئی ہے۔ یا شاید صرف خود کو کہ رب کو دھوکا کون دے سکتا ہے۔ وہ تو ایک ایسی ماں کی طرح جو بچے کی ہر غلطی اور نقصان کو جانتے بوجھتے انجان بنے کا کھیل کھیلتی' اپنے دامن میں سمیٹ کر تھپکنے لگتی ہے وہ بھی شفقت سے اسے اپنی پناہ میں لے کر مسکراتا رہا تھا۔ اسے ایک دم بے پناہ رائیگانی کے احساس نے نڈھال کر دیا تو گھٹنوں میں سر چھپا کر بے آواز سسکتی چلی گئی۔

"تو نے مجھے قبول ہی نہیں کیا۔ ورنہ وہ آج بھی میرے اندر کیوں بستا؟ یا میرے اندر ہی خلوص نہ تھا۔ میرے سجدے ہی بے کار تھے۔ مجھے اپنا بنالے یا اسے مجھے بخش دے کہ میں دو کشتیوں میں سوار نہیں ہوسکتی۔"

وہ آپ ہی اپنی دعا پر ٹھٹک گئی۔ گزرے ماہ و سال میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ اس نے رب سے ذکی کو مانگا ہو۔

یا شاید ہر لمحہ مانگا ہی اسی کو تھا۔

دل کا چور آج آنگن میں دندناتا پھر رہا تھا۔

ادھ کھلی چاندنی میں تیز ہوتی کال بیل نے سوئے ہوئے مکینوں کو ہڑبڑا دیا۔

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ دوپٹہ اس کے پیروں میں آ گرا تھا۔

* * *

"گڈ مارننگ بے بی۔"

وہ بڑی سرعت سے آملیٹ بنا بنا کر بڑی سی پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔ جب عقب میں

آواز سن کر پلٹی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ایک ہاتھ میں سگار دبائے فریش موڈ کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

"گڈ مارننگ......" وہ مسکرائی...... وہ آج بھی ویسے کے ویسے تھے شان دار اور چھا جانے والے۔

"اس گھر میں پہلی صبح آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔" وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

"اوہ تھینک یو لیڈی۔" انہوں نے سر کو ہلکے سے خم کیا۔

"ناشتے میں کیا لیں گے؟ ویسے آپ اتنی صبح کیسے اٹھ گئے؟"

"رات بھر نیند ہی نہیں آئی' کافی ملے گی۔"

"ٹائمنگ کا فرق ہے نا۔" اس نے آخری آملیٹ پلیٹ میں نکالا اور کیبنٹ کھول کر کافی کے لوازمات نکالنے لگی۔

"تم اپنا کام سمیٹو میں بنا لیتا ہوں۔"

"میں بنا دیتی ہوں۔" وہ جانتی تھی اگر کسی نے ذکی کو یوں پہلی صبح کچن میں کام کرتے دیکھ لیا تو اس کی خیر نہیں' پھوہڑپن کی مہر لگ جائے گی۔

"مجھے کافی صرف اپنے ہاتھ کی اچھی لگتی ہے۔" ذکی نے مگ اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا اور پوچھنے لگے۔

"باقی لوگ اٹھے نہیں۔"

"اس گھر میں اگر کوئی کام کی بندی ہے تو وہ میں ہوں۔" اس نے فخر سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اب یہی دیکھ لیں۔ صبح نماز کے فوراً بعد سب کو بیڈٹی پہنچانا میرا کام ہے ناشتے کے اتنے ڈھیر سارے لوازمات بنانا کسی اور کے بس کی بات کہاں۔ اور......"

وہ آملیٹ کے بعد اب دلیہ بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بات کرنے کے انداز میں بلا کی روانی اور...... بے ساختگی تھی۔ اک نپے تلے ماحول سے نکل کر یہ خالص پن اور جوش بڑے عرصے کے بعد نصیب ہوا تھا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کافی پیتے دلچسپی سے سنتے رہے۔ اسے بولنے کا شوق تھا اور کافی ختم ہونے تک ذکی کو خاندان کے بارے میں وہ ساری معلومات مل گئیں جو آج تک فون پر نہ مل سکی تھیں۔

"یہ کس کے لیے؟" اس نے ٹرے میں صرف دلیہ اور دودھ پتی کا مگ رکھا تھا۔

"گل آپی کے لیے۔ انہیں رات سے بہت تیز بخار ہے' دوا کھلانا ہے۔"

"سنو! یہ بڑی اماں نے تمہاری گل آپی کی شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟" بڑی سرعت سے سوال کیا گیا۔

بیلا نے ایک لمحے غور کیا' پھر لاعلمی سے کندھے اچکا دیئے اور ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ خالی مگ سنک میں رکھتے کچن کے اس دروازے پر آ گئے' جو پچھلی طرف کھلتا تھا۔ لیموں کی ہلکی ترش مہک لئے سپید کلیاں' انار کے نارنجی پھول اور زرد چنبیلی۔ ہوا تیز تھی اور نیچے ان پھولوں کا ایک فرش سا بچھا تھا اور وہ خاموشی سے اس جھولے کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ان کے اردگرد ان کا بچپن کھیلنے لگا۔ انہیں ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ بیمار گل کی مزاج پرسی ہی کر آئیں۔ یہاں تک کہ فیضان انہیں ناشتے کے لئے بلانے آ گئے۔

* * *

اگلے کچھ دن خاصے ہنگامہ خیز رہے۔ ذکی کی وجہ سے نت نئے پروگرام بنتے۔ انواع و اقسام کے کھانے بنتے۔ وہ سب کے لئے مختلف تحائف بھی لائے تھے۔ ایک عدد شان دار موبائل بھی۔ مگر وہ سیل فون عاشر کے لئے تھا جو بھائی کی آمد کا سن کر محض دو گھنٹے کی چھٹی لے سکا تھا۔ وہ بیلا کو ڈھونڈتا بڑی امی کے کمرے میں آیا وہ گل کا سر دبا رہی تھی۔ عاشر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ بظاہر لاپروا نظر آنے والی لڑکی سب کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ وہ دوسری طرف بیٹھ کر گل کی خیریت پوچھتا کن اکھیوں سے بیلا کا پھولا ہوا منہ دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا بیلا یوں ہی ناراض تھی۔ آخر اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"یہ تم نے ناراض بلی جیسا منہ کیوں بنایا ہے؟"

بیلا نے غصے سے اسے گھورا۔ "تم چیٹر ہو۔"

"میں نے کسے چیٹ کیا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"تم نے ذکی بھائی سے سیل فون کی فرمائش کی مگر اپنے لئے۔ تم کتنے خودغرض ہو۔" وہ غصے سے بول رہی تھی اور عاشر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

گل صنوبر نے دونوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر لاتعلقی سے چادر منہ تک کھینچ لی۔ عاشر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور ذرا آگے کو جھکتے ہوئے اس کی گود میں ڈال دیا۔ بیلا نے تحیر سے موبال کو پھر اسے دیکھا۔

"ہاں' تم رکھ لو۔"

"نہیں' میں نہیں رکھ سکتی۔"

"رکھ لو' تمہیں اپنے منگیتر کے ساتھ لمبی لمبی باتیں نہیں کرنا کیا؟"

"بدتمیز' مذاق اڑاتے ہو' میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔" وہ موبائل کو الٹ پلٹ رہی تھی پھر مایوسی سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ بہت خوب صورت اور قیمتی ہے۔ میرے پاس کسی نے نہیں چھوڑنا' کوئی نہ کوئی لے لے گا۔"

"اوہ...... تو پھر تم اپنے فیانسی سے باتیں کیسے کرو گی؟" وہ مصنوعی فکرمندی سے کہنے لگا۔

"تمہیں میرے فیانسی کی اتنی فکر ہے تو اپنا پرانا موبائل مجھے دے دو' یہ تم رکھ لو۔" اس نے آرام سے حل نکالا۔

"واقعی۔"

"ہاں...... کسی کو اعتراض بھی نہ ہوگا۔ میں کہوں گی' عاشر کے پاس فالتو رکھا تھا اس نے مجھے دے دیا۔" وہ خوش ہو کر بولی تو عاشر اک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"میں تمہیں فالتو چیز نہیں دینا چاہتا دوست۔ پر اس وقت یہ ہی مناسب ہے۔"

شام کو وہ عاشر کے پرانے موبائل میں نئی سم ڈالے اتراتی پھر رہی تھی۔

* * *

"جب سے گل کا بخار اترا ہے' بالکل ہی خاموش ہوگئی ہے۔" تائی اماں فکرمندی سے کہہ رہی تھیں' وہ جو تیل کی شیشی اٹھائے بال بکھرائے چلی آ رہی تھی' فوراً ہی بول اٹھی۔

"وہ تو ہمیشہ ہی کم بولتی ہیں' تیل لگا دیں۔" اس نے ماں کی طرف شیشی بڑھائی۔

انہوں نے "خاکم بدہن" سے نظریں اٹھا کر پہلے آپا کو ایک "ہوں" سے نوازا' پھر اسے حکم دیا۔

"گل سے لگوا لو۔"

"آپ کا صبح پرچہ ہے؟" وہ چڑ کر بولی' تو انہوں نے گھور کے اسے دیکھا۔

"ساری عمر لگا دی' اس گھر کو سنبھالنے' مہمان داری اور تم لوگوں کو پالنے پوسنے میں' تمہارے اسکولوں' کالجوں کے مسئلوں سے نمٹتے نمٹتے اس عمر میں اپنے شوق کی تسکین کرنے لگی ہوں تو بیٹی کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

"اچھا...... تائی امی! آپ تو خیر' ساری زندگی عیش ہی کرتی رہیں۔"

وہ ابھی تک گل کی چپ میں الجھی تھیں۔ سو جواب نہ دیا' البتہ ماں کی اک تنبیہہ بھری نگاہ نے وہاں سے کھسکنے پر مجبور کر دیا۔ گل ہاتھ میں فریم لئے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بیلا نے

محسوس کیا' وہ کل سے اسی ایک پھول پر اٹکی تھیں۔

''گل آپی! کیا ہوا ٹانکا بھول گیا۔'' وہ جان بوجھ کر زور سے بولی تو گل چونک گئی' پھر سر جھکا کر پھول کو گھورنے لگی۔

(دھیان کا ایک ٹانکا بھی غلط لگ جائے تو جذبوں کے پھول بے وقعت سے لگنے لگتے ہیں)

''کتنا خوب صورت دوپٹہ ہے نا۔'' بیلا نے شیشی ایک طرف رکھی اور اس کا دوسرا پلو اٹھا کر دیکھنے لگی' جو مکمل ہو چکا تھا۔ وہ یہ دوپٹہ زیبا کے جہیز کے لئے بنا رہی تھیں۔

''ایسا ایک دوپٹہ اپنے جہیز کے لیے بھی کاڑھیں۔'' اس نے عجیب سی فرمائش کی۔

''سرخ دوپٹے ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتے بیلا! تمہارے لئے بنا دوں گی۔''

''خوامخواہ۔'' بیلا نے چڑ کر کہا اور پھر ایک عجیب سی حرکت کی۔ وہ سرخ دوپٹے کا پلو ان کے سر پر ڈال چکی تھی۔

''ارے واہ! آپ تو بنا سنگھار کے بھی دلہن لگتی ہیں۔'' وہ کھلکھلائی۔

گل اپنی جگہ ششدر سی رہ گئی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا' پھر چہرے کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ سیڑھیوں کے کنارے ذکی کھڑے ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

ساوی نے اپنی چنری رنگ ساز کی گود میں پھینکی اور کہنے لگی۔

رنگ ساز میری چنری سرخ رنگ نہ رنگنا کہ سرخ ملن کا رنگ۔

اور میرا پریتم سمندر پار ہے۔

اے رنگ ساز! میری چنری لاجوردی نہ رنگنا کہ لاجورد امید کا رنگ۔

اور میرے ساجن نے نہ لوٹنے کی قسم کھائی ہے۔

ہاں! اسے سرمئی رنگ دے کہ سرمئی ہجر کا رنگ۔

اور یہ ہی میرا سنگھار ہے۔

''دیکھا' ذکی بھائی! گل آپی کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔''

''کیسی ہو گل! تمہارا بخار اتر گیا۔'' وہ عام سے لہجے میں کہتے قریب آئے۔

سرخ آنچل ڈھلک کر گل کی گود میں آ گرا' وہ گھبرا کر اپنا سرمئی دوپٹہ ٹھیک کرتی منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

''ٹھیک ہوں۔'' پھر تیزی سے اٹھ کے کچن میں چلی گئی۔

''یہ تمہاری گل آپی کچھ بدل نہیں گئیں۔'' انہوں نے وہ ہی دوپٹہ ہاتھ میں لے کر

ادھورے پھول کی خالی پتی پر انگلی پھیری۔

''نہیں' بچپن سے ایسی ہی ہیں۔''

''کس کے بچپن سے......''

''میرے بچپن سے۔'' وہ ہنس دی۔

''اچھا......تم بھی بچپن سے ایسی ہو۔'' انہوں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

''میں بچپن میں خاصی شریف ہوا کرتی تھی۔''

''اچھا' تو اب؟''

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

کچن میں کانچ کا گلاس گل کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

* * *

رات کو سفیان اور فیضان نے ذکی کو گھیر لیا۔

''سچ سچ بتاؤ' شائستہ نے تمہیں پاکستان آنے کی اجازت کیسے دے دی؟''

''مجھے اس کی اجازت کی ضرورت نہیں۔''

''جانے دو' خوب جانتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔''

''بھئی' یہاں میری ماں ہے' تم لوگ ہو' میں کبھی بھی آ سکتا ہوں''

وہ اطمینان سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے جو ابھی بیلا دے کر گئی تھی۔ اس کا ارادہ تو بیٹھنے کا تھا مگر فیضان کی گھوری نے اٹھنے پر مجبور کر دیا مگر دروازے سے کان لگانے پر اسے کون روک سکتا تھا۔ موضوع ہی ایسا تھا۔

''ماں ہمیشہ سے یہیں ہے اور میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں' شروع سے خود غرض واقع ہوئے ہو۔ سچ بتاؤ' ماں سے کون سا کام آن پڑا؟'' فیضان نے صاف صاف جتا دیا۔ مزید لقمہ سفیان نے دے دیا۔

''ہاں ......شائستہ بھی اس کی کاپی ہے' بنا مطلب کسی سے ہاتھ ملانے کی روادار نہ ہوتی تھی۔''

''یار! تم لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔''

''تم سچ اگل دو۔''

ذکی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا' پھر ایک طویل سانس لے کر مگ رکھ دیا۔ گویا اب فرار

ممکن نہ تھا۔

"دوسری شادی کرنے آیا ہوں۔"

دونوں نے تحیر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیلا نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ کر باہر نکلتی آواز کا گلا گھونٹا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ شائستہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" اس نے انکشاف کیا۔

"مگر میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے' ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔"

"سب کچھ کر چکے ہیں۔" ذکی نے تحمل سے بات قطع کی۔ "مگر کچھ ایسی کمپلیکشنز ہیں کہ کچھ بھی ممکن نہیں۔"

"تو کوئی بے بی ایڈاپٹ کرلو۔" کچھ دیر کے بعد سفیان نے مشورہ دیا۔

"وہ میرا خون ہوگا۔؟" ذکی نے پوچھا تو وہ خاموش ہو گئے۔

"شائستہ جانتی ہے؟"

"ہوں...... اس کی اجازت کے بغیر ممکن ہی کہاں ہے۔"

کچھ لمحے خاموشی سی چھائی رہی' گویا ہر کوئی اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کر رہا تھا پھر سفیان نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے' پھر یہ ہی مناسب ہے' پھر تم دو بیویاں افورڈ بھی کر سکتے ہو' ڈھونڈو کوئی اچھی سی لڑکی۔"

بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی اور بیلا کے ہاتھ اک گرما گرم خبر وہ بگٹٹ بھاگ لی۔

کچن میں تائی کڑھی بنا رہی تھیں۔ اماں حسب معمول اپنے کمرے میں' نماز میں مصروف۔ بیلا کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ماں نے نماز ختم کی تو پہلا سوال کیا۔

"نماز پڑھ لی؟"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

"پھاپھا کٹنیوں کی طرح کن سوئیاں لینے سے فرصت ملے تو نماز کا خیال آئے۔"

"اف...... پھاپھا کٹنی تو نہ کہیں۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"اگر میں نہ ہوں تو آپ لوگوں کو خبر بھی نہ ہو کہ گھر میں ہو کیا رہا ہے؟"

"آج ہماری بیٹی کے پاس کون سی خبر ہے۔" تائی امی دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی آ گئیں۔

"اسے اتنی شہ مت دیں' یہ حرکتیں اچھی نہیں' سسرال میں......"

"آنے والے ہر خطرے کے لیے تیار رہوں گی۔' بیلا نے فخر و لاپروائی سے جملہ مکمل کیا' پھر تائی کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

"پتا ہے' ذکی بھیا پاکستان کیوں آئے ہیں۔"

"اللہ جانے' یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ بیٹھا ہے' گویا واپسی کا ارادہ ہی نہیں۔" تائی کے لہجے میں بے زاری تھی۔

"دوسری شادی کیلئے۔" اس نے دھماکے کے ساتھ پوری تفصیل سنائی۔

دونوں خواتین گم صم ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ پھر امی نے سنبھل کر بیٹی کو دیکھا اور آہستگی سے کہنے لگی۔

"بیلا! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے' پڑھ لو۔"

وہ یہ روکھا پھیکا ردعمل دیکھ کر بدمزا ہوتی وضو کے لیے اٹھ گئی۔

* * *

کون سی رُت تیرے نام لکھوں
جنوری کی صبح روشن کہ فروری کا ابھرتا جوبن
مارچ کھلا کھلا سا کہ اپریل دھلا دھلا سا
مئی کی اگتی ہوئی دھوپ کہ جون کا چبھتا ہوا سکوت
جولائی کا سر چڑھتا ہوا سورج کہ
اگست میں غلامی کا ڈھلتا ہوا سورج
ستمبر میں جنم لیتی کوئی خواہش کہ
اکتوبر میں پیار کی بارش
نومبر کی ساری رعنائیاں کہ دسمبر کی تنہائیاں
کون سی رُت تیرے نام لکھوں

وہ آرام سے بیڈ پر دراز اپنی فرینڈ ارم کے میسج پڑھ رہی تھی' اک انجان نمبر سے ایسا میسج پڑھ کر چونک کر سیدھی ہو گئی۔

"ارے...... دیکھو زیبا۔" اس نے کمپیوٹر پر مصروف زیبا کی آنکھوں کے سامنے موبائل لہرایا۔ زیبا نے ایک سرسری نگاہ ڈالی۔

"ایسے میسج آتے ہی رہتے ہیں۔"

"کوئی بنا جانے خوامخواہ بھیج دیتا ہے' خواہ فون کسی دادی اماں کا ہو؟"

زیبا مصروف ہو چکی تھی مگر وہ پہلا پیغام نہ تھا۔ ہر صبح گڈ مارننگ اور ہر رات گڈ نائٹ کہنا نہ بھولتا' اور پیغام بھی اتنے خوب صورت' اچھوتے اور رومینٹک' ایک دن تنگ آ کر بیلا نے جواب دیا۔

"میں دادی ہوں۔"

"کس کی؟" جواباً دریافت کیا گیا۔

"ظاہر ہے' اپنے پوتے پوتیوں کی۔"

"ماشاء اللہ! ویسے خاصی ایجوکیٹڈ دادی ہیں' کھٹ کھٹ جواب لکھ رہی ہیں۔" بیلا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو ذرا ٹھہر کر لکھا۔

"ہاں اچھے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔"

"اوہ تب ہی' ورنہ ہمارے ابا کو تو سیل پر ایک لفظ لکھنا نہیں آتا۔"

"تو ابا کو پڑھا لینا تھا۔" اس نے چڑ کر لکھا اور موبائل سرہانے ڈال دیا۔ وہ بہت دیر تک بیل دیتا رہا۔ بیلا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بات شروع ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اس نے چور نظروں سے زیبا کو دیکھا اور موبائل آف کر دیا۔ جس کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ نماز قضا ہوئی۔ بڑے ابا کو چائے نہ ملی۔ ابو کے لیے ناشتا امی کو بنانا پڑا اور ذکی کے سامنے اچھی خاصی جھاڑ الگ پڑی۔

"تم کیوں منہ پھلائے بیٹھی ہو۔" ہاتھ میں گاڑی کی چابی لیے ذکی تیار شیار باہر نکلے۔ اسے دیکھا تو رک گئے۔

"اس گھر میں میری کوئی قدر نہیں۔"

"ارے بھئی ہم جو ہیں اس شہزادی کے قدر دان' چلو آئس کریم کھلا لاؤں۔" وہ وہیں بیٹھی رہی۔

"کم آن بے بی۔" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا' پھر چونک کر اس کا ہاتھ دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا؟"

"تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں۔" انہوں نے دوسرا ہاتھ تھامنا چاہا مگر بیلا نے جھینپ کر کھینچ لیا۔ بھلا اس گھر میں ایسی بے باکی کی گنجائش کہاں تھی۔

"آپ آئس کریم گھر لے آیئے گا۔ سب کے ساتھ مل کر کھائیں گے۔" اس نے سادگی سے کہہ کر ان کی توجہ خود سے ہٹائی۔

نہ جانے کیوں وہ غور غور سے دیکھ رہے تھے۔

"گویا میری جیب کا کباڑا کرواؤ گی۔"

"اتنی کنجوسی' تھوڑے ڈالر کمائے ہیں؟"

"او کے' صرف تمہاری خاطر۔" وہ ہاتھ ہلا کر چلے گئے' بیلا حیران سی سوچتی رہ گئی۔

"میری خاطر کیوں؟ چلو' کسی کو تو ہماری قدر ہے۔"

اسے از سر نو صبح والی ڈانٹ یاد آ گئی تھی۔

* * *

"کتنے اچھے اچھے کپڑے یوں ہی پڑے پڑے پرانے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں کوئی فنکشن بھی نہیں آتا۔" ساری الماری کے کپڑے بیڈ پر ڈھیر تھے اور وہ سیاہ کلیوں والی فراک خود سے لگائے افسوس کر رہی تھی۔ ایک ڈیزائن تخلیق کرتی زیبا نے اسکرین سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں ہی شوق تھا گھر بیٹھنے کا۔ میرے ساتھ اکیڈمی جوائن کرتیں تو سارے کپڑے کام آ جاتے۔"

"چھوڑو' میں ایسے ہی ٹھیک ہوں' عاشر کہتا ہے۔"

"یہ عاشر تم سے کچھ زیادہ ہی نہیں کہتا۔" زیبا نے شرارت سے پوچھا وہ سٹپٹا گئی۔

"تمہیں پتا ہے' ہم بچپن ہی سے......"

"مس بیلا! اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔ تھوڑا اپنا زاویہ نگاہ وسیع کر کے دیکھیں' چیزوں کی ماہیت اور لوگوں کی حیثیت بدل رہی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"ذکی بھائی سے زیادہ فری مت ہو' کل تم ان کے ساتھ کچن میں پزا بیک کر رہی تھیں۔ چھوٹے ابا وہاں سے گزر رہے تھے۔ مجھے لگا انہیں اچھا نہیں لگا۔"

"اچھا۔" وہ ایک دم خفیف سی ہو گئی۔

"وہ تو بہت عرصہ باہر رہ کر آئے ہیں اور ہمارے ہاں اتنی بے تکلفی بھائیوں کے ساتھ بھی نہیں ہوتی۔ ہاں' عاشر کی بات اور ہے۔" وہ پھر سے شوخ ہوئی۔ بیلا نے آخری بات پر غور نہیں کیا۔ وہ پہلی میں ہی الجھی تھی۔ تب ہی ہلکی دستک کے ساتھ ذکی اندر آئے۔ بیلا کو ایک دم جھنجلاہٹ نے گھیر لیا۔

"لگتا ہے آپ کو کوئی اور کام نہیں ہے' سوائے اُدھر اُدھر گھومنے کے۔" قصور ان کا نہیں

تھا۔ وہ تو دستک دے کر آئے تھے۔ وہ ہی کپڑوں کے ڈھیر میں دوپٹہ گم کر بیٹھی تھی اور اب کالی فراک دوپٹے کی طرح لپیٹے کھڑی تھی۔

"کیوں' کیا ہوا؟" وہ ٹھٹک سے گئے۔

"کچھ چاہئے؟"

ذکی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر شکن سی ابھری اور وہ "کچھ نہیں" کہتے چلے گئے۔

"اب اتنا روڈ ہونے کو بھی نہیں کہا تھا۔" زیبا کی بڑبڑاہٹ پر اس نے چڑ کر فراک پھینکی اور اپنا دوپٹہ ڈھونڈنے لگی۔ آخری کپڑا تہ کر کے الماری میں رکھنے تک اک ہلکی سی پشیمانی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ اسے مہمان کے ساتھ اس طرح پیش نہیں آنا چاہئے تھا۔ تب ہی شام کو خاص طور پر ٹرائفل بنا کر اوپر لے گئی۔ ذکی فون پر بات کر رہے تھے اور پھوپھو کچھ تصویریں ہاتھ میں لئے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے فون بند کر کے اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی تو وہ جلدی سے بولی۔

"آپ کے لیے ٹرائفل لائی تھی۔"

"فریج میں رکھ دو' ٹھہر کے کھالے گا اور شائستہ کیا کہہ رہی تھی؟" پھوپھو اس سے کہہ کر ذکی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کچھ نہیں۔" ذکی نے ٹالا۔

وہ ٹرائفل فریج میں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

"بتاؤ بھلا' کیا کمی ہے ان لڑکیوں میں' اس کی نظر میں کوئی سماتی ہی نہیں۔" بیلا نے ایک تصویر اٹھا کر دیکھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی اور نیچے کسی کو خبر ہی نہیں۔

"بتاتے کیوں نہیں۔"

انہوں نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں میں دبائی اور لائٹر کی تلاش میں ٹیبل پر نگاہ دوڑائی۔ وہ بیلا کے داہنی طرف پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ جسے ایک خشک سے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔

"امی! میں جس سے بھی شادی کروں گا' ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا' وہ یہیں رہے گی آپ کے پاس سو' جو بھی ہو وہ باہر جانے کا خواب ساتھ لے کر مت آئے۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

"یہ شائستہ کی شرط ہے؟"

وہ ایک پل کو خاموش ہو کر سگریٹ سلگانے لگے۔

"لیکن اس طرح کیسے چلے گا؟" انہوں نے بیلا کو دیکھا۔

"میں چکر لگاتا رہوں گا۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"جیسے پہلے لگاتے رہے ہو۔" پھوپھو نے طنز کیا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں' ایسی تو ہو کہ واپس آنے کو دل چاہے۔" ان کے لہجے میں شرارت در آئی۔ بیلا نے چاروں تصویریں اٹھا کر غور سے دیکھیں۔ اسے تو اچھی ہی لگیں۔

"ان میں کیا خرابی ہے؟"

انہوں نے کچھ لاپروائی سے تصویریں اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پر ڈال دیں۔ بیلا کو بہت برا لگا۔ وہ اسے مسلسل نظرانداز کر رہے تھے۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ تب ہی فیضان تیزی سے اندر آئے۔

"ذکی! فارغ ہو تو میرا اک کام تو کر دو۔ سونیا کو اس کی امی کے ہاں سے پک کرنا ہے میں ذرا بزی تھا اگر تم ......"

ذکی نے چابی ان کے ہاتھ سے لی۔ دونوں باتیں کرتے باہر نکل گئے۔ پیچھے وہ رہ گئی' پھوپھو کے دکھڑے سننے کیلئے۔

* * *

ذکی کو دیکھ کر سونیا کے چہرے پر جھنجلاہٹ سی چھا گئی۔ وہ یقیناً فیضان کی منتظر تھی۔ گھر میں کچھ مہمان تھے۔ وہ غالباً ان ہی سے فیضان کو ملوانا چاہتی تھی۔ تب ہی واپسی کے سفر میں خاموش سی تھی۔ ذکی نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ ابھی ابھی اس کے محل نما گھر سے نکلا تھا۔ اس کی انتہائی ماڈرن مگر گریس فل ماں سے ملا تھا۔ سونیا کا اسٹیٹس اس کے سامنے تھا۔

"فیضان نے زندگی میں بس ایک ہی کام ڈھنگ کا کیا ہے؟" سونیا نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

"آپ سے شادی۔" ذکی کے کہنے پر سونیا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"آپ دونوں کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔" ذکی کا لہجہ محتاط سا تھا۔

"یہ فرق تو آپ کے اور شائستہ کے مابین بھی ہے۔" ذکی نے چونک کر سونیا کو دیکھا' پھر ہلکی مسکراہٹ لبوں پر پھیلی۔

"آپ تو خاصی باخبر ہیں بھابی!"

"رہنا پڑتا ہے۔"

"لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ فیضان کو کنویں سے نکالنے کے بجائے آپ تو خود کنویں کی مکین بن گئیں؟ یہ تو محل سے جھونپڑے تک کا سفر ہے۔"

"کبھی کبھی محل وہ خوشیاں نہیں دے پاتے ذکی بھائی! جو......"

"جانے دیں۔ زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ پیچھے پلٹنے کا نہیں اور یہ ہی بات میں فیضان سے بہت بار کہہ چکا ہوں۔"

"وہ اپنی فیملی سے بہت کمیٹڈ ہیں۔"

"ہر کوئی ہوتا ہے' اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان آگے بڑھنا ہی بھول جائے۔ ٹو ویری فرینک بی' یہ رشتے ناتے ہمارے لئے اتنے ہی اہم ہونے چاہئیں جتنا کہ ہم کو فائدہ پہنچا سکیں۔" انہوں نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ سونیا الجھ سے گئی۔

"آپ کے خیالات بہت عجیب ہیں۔ بالکل ممی جیسے۔ اب پتا چلا وہ آپ سے مل کر اتنا خوش کیوں ہوئی تھیں۔"

"شی از ویری نائس وومن۔" وہ مسکرائے۔

* * *

ٹی وی چل رہا تھا مگر سب باتوں میں مگن تھے۔ وہ بھی کونے والی کرسی پر دونوں پاؤں اوپر رکھے موبائل میں گم تھی۔ ساری سہیلیاں رابطے میں تھیں۔ زیبا اس کا کپ قریب ہی ٹیبل پر رکھ گئی۔ ذکی اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

"یار تم لوگ ترقی کرنا ہی نہیں چاہتے ہو۔ کنویں کا مینڈک بن کر رہ گئے ہو۔ اس ملک کے حالات دیکھ رہے ہو' مہنگائی' اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ روٹی' دال کے چکروں میں پڑ کر رہ گئے ہیں۔ کاروبار کا کوئی حال نہیں' نوکری کی کوئی گارنٹی نہیں' آج قناعت کر کے بیٹھے ہو' کل کا کیا ہوگا؟"

"یار! تم ٹھیک کہہ رہے ہو' پر کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔" سفیان بھائی نے کندھے اچکائے۔

"کچھ کرنے کی ٹھان لو' تب ہی رستے کھلیں گے۔ اچھا تم بتاؤ' کل کو تم لوگوں کی اولادیں بڑی ہوں گی' ایک ایک بیڈ روم والے اس گھر میں گزارا ہو جائے گا؟ اس گھر کے حصے بخرے ہوں تو تم لوگوں کے ہاتھ اتنا بھی نہیں ہوگا کہ اپنے لئے ڈھنگ کا ایک گھر خرید سکو۔"

"اللہ نہ کرے' جو اس گھر کے حصے بخرے ہوں۔" بڑی امی تڑپ اٹھیں۔

"پتا نہیں' ذکی بھائی کی سوچ اتنی مادیت پرست کیوں ہے۔" وہ کچھ چڑ کر اور کچھ اکتا کر اپنا کپ اٹھاتی باہر نکل آئی۔ باہر ہلکی چاندنی رات پھیلی تھی اور برآمدے میں گل صنوبر عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔

"یا اللہ! ایسا جذب مجھے بھی نصیب کر۔"

تب ہی میسج ٹون بج اٹھی۔ وہ ہی انجان نمبر جو اب اتنا بھی انجان نہیں رہا تھا۔

اپنے ہونٹوں پہ سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں
تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

"توبہ! یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔" اس نے جلدی سے ڈیلیٹ کر دیا۔ پھر عاشر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بہت دن ہوئے اس سے بات نہیں ہوئی تھی مگر اس کا نمبر بند تھا۔ تب ہی اس کے عقب میں ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ ایک دم گھبرا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔

"ذکی بھائی! آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔ اتنا دبے پاؤں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ خاموشی سے سگریٹ سلگاتے رہے۔

"آپ ابھی تک ناراض ہیں۔" انہوں نے اک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا تو وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"مجھے آپ کا سگریٹ پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"چھوڑ دوں؟" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی......" وہ متحیر سی ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"سگریٹ چھوڑ دوں؟"

"مرضی ہے۔" بیلا نے جھک کر کپ اٹھایا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"سنو......" وہ ان کی پشت کی طرف ذرا دیر کو رکی۔

"یہ سچ ہے کہ میں اپنی انسلٹ کبھی نہیں بھولتا لیکن ...... میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتا۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

گل نے سلام پھیرا تو نگاہ ان پر ٹھہر گئی۔ وہ خاموش کھڑے سگریٹ کو سلگتا ہوا دیکھ رہے

تھے۔انہیں احساس ہی نہ تھا کہ ان کے داہنی طرف کوئی اور ذی نفس بھی موجود ہے۔

گل صنوبر نے دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

* * *

گھٹا گھنگھور گھور

مور مچاوے شور

مورے سجن آ جا

کیبل کے دور میں' نہ جانے کون تھا جو پی ٹی وی پر نیرہ نور کو سن رہا تھا۔ اور وہ تھی کہ دونوں پاؤں جھولے پر رکھے سر جھولے کی پشت سے ٹکائے اپنے وجود پر بوندوں کی گدگداہٹ محسوس کرتی سُر سے آواز ملا رہی تھی۔ ابھی کل ہی تو گرمی سے گھبرا کر اس نے زیبا سے کہا تھا۔ ''فہد بھائی سے کہو نا' تھوڑے بادل ہمیں بھی بھجوا دیں۔''

اس کا پیغام غالباً براہ راست اللہ میاں تک پہنچا تھا۔ تب ہی تو آنکھ بادلوں بھری صبح میں کھلی۔ اب وہ تھی اور برستی بوندیں۔ گل صنوبر کو بارش سے الرجی تھی' سو ماں کے کمرے میں جا گھسی تھی اور جھولے پر بیلا کا قبضہ تھا۔ اپنے عقب میں کھلی کتنی ہی کلیاں توڑ کر اپنے آنچل میں جمع کر لیں' جن کی خوشبو مٹی کی خوشبو سے ہم آہنگ ہو کر مشام جاں کو مہکانے لگی تھی۔ اس نے اک زرد کلی بالوں میں سجاتے ہوئے فالسے کے پیڑ کو دیکھا۔

فالسہ ابھی کچا تھا۔ بچپن کی ایک میٹھی سی یاد نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

اسے خبر ہی نہ تھی کوئی تھا جو بہت دیر سے اس کے وجود کی رعنائیوں کو اپنی آنکھوں میں سمو رہا تھا۔ وہ بس خود میں گم' خود ہی مزا کر رہی تھی۔ تب ہی اوپر کی کھڑکی کھلی اور زیبا نے جھانکا۔

''اے لڑکی! فہد کا گفٹ ملا؟''

''مجھے نہیں پتا تھا' قدرت بھائی کا اس حد تک ساتھ دیتی ہے۔'' وہ پکاری۔

''اچھا سنو' آج ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں فنکشن ہے' تمہاری بلیک فراک پہن رہی ہوں' پیغام کے ساتھ ہی کھٹ سے کھڑکی بند۔

''ہائے نہیں۔'' وہ ایک دم جھولے سے کھڑی ہوئی۔ ساری کلیاں سبز گھاس پر بکھر گئیں۔

''زیبا! خبردار جو میری فراک کو ہاتھ لگایا۔''

وہ پچھلے دروازے سے اندر کی طرف بھاگی۔ اس کے گیلے پاؤں برآمدے' کچن اور لاؤنج تک نشان بناتے چلے گئے اور سیڑھیوں سے ایک قدم پہلے وہ بری طرح کسی سے

ٹکرائی۔ بلکہ اس افراتفری میں بھی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ نہیں' سامنے والا اس سے ٹکرایا ہے اور ساتھ ہی اسے گرنے سے بچانے کے لئے تھام بھی لیا۔

ایک ثانیے کو وہ حواس باختہ ہوئی۔

''اوں ہوں' اگر چوٹ لگ جاتی۔''

بیلا کی ساری حسیات ایک دم چوکنا ہوئیں' وہ کسی کے حصار میں تھی' مگر اس حصار میں نہ حفاظت تھی' نہ پناہ۔ ایک ثانیے کو دانستہ طول دے کر لمحوں پر محیط کرتا حصار۔ وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بلا کا اداکار تھا۔ ایک ہی پل بس اور ذکی کا بت پاش پاش ہو کر قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ اس کے پہلو سے نکلتی سیڑھیاں پھلانگتی چلی گئی۔

ذکی کے لبوں پر محفوظ سی مسکراہٹ بکھری۔

یہ زرد چنبیلی کی خوشبو تھی یا کنوارے وجود سے پھوٹتی۔

ان کی گہری سانس وہیں اٹک گئی۔

لاؤنج کے کھلے دروازے میں شائستہ ساکت سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''شائستہ! تم؟'' وہ سامان گھسیٹتی عین ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا ذکی؟''

* * *

''کیا بات ہے' تم کچھ الجھی الجھی سی لگتی ہو۔'' زیبا نے اس سے کئی بار پوچھا تھا۔ وہ کیا بتاتی' کنی کترا گئی۔ بڑی امی نے بھی بڑی تشویش سے اس کا ماتھا چھوا۔

''طبیعت ٹھیک ہے' بینا چہکنا کیوں بھول گئی۔''

اور امی' وہ سمجھتی تھیں کہ لڑکیاں اس عمر میں کئی قسم کے فیز سے گزرتی ہیں اور اس صورت حال کا واحد علاج مصروفیت ہے۔ سو وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہوتی تو کوئی نہ کوئی لان کا سوٹ دے کر بٹھا دیتیں کہ صنوبر سے کٹنگ اور سلائی سیکھو۔ خود اس کی بھی کوشش تھی کہ ذکی سے سامنا ہی نہ ہو۔ وحشت زدہ ہرنی کی طرح چوکنا رہتی۔ وہ ایک لمحہ اس پر بہت کچھ منکشف کر گیا تھا۔

بھائی کہنے سے کوئی بھائی نہیں بن جاتا۔ رشتہ وہ ہی' جو خون کا ہو۔

''مگر کیوں' یہ غلاظت کہاں سے ان کے ذہن میں آ گھسی۔''

شائستہ بہت دیر سے اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"شائستہ بھابی! کچھ چاہیے؟" بیلا اپنے خیالوں سے چونکی تو وہ نظر آئی۔ شائستہ نفی میں سر ہلاتے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ جن میں سرِفہرست اس کی ذات سے متعلق سوالات تھے۔

"آگے کیوں نہیں پڑھا؟"

"مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟"

"کہیں منگنی وغیرہ ہوئی؟"

یہ سچ تھا کہ شائستہ بہت خوب صورت اور چھا جانے والی شخصیت تھی۔ وہ کچھ نروس سی ان کے سوالوں کا جواب دیتی رہی۔ سونیا آئی تو اس نے کچھ سکون محسوس کیا۔ سونیا بھی اپنی مام کے ساتھ فارن ٹرپ پر جاتی رہی تھی۔ سو گفتگو پلٹ گئی۔ اب وہ بس ہونقوں کی طرح ان کی معلومات کے تبادلے سن رہی تھی۔

"شائستہ بھابی! آپ کو پھوپھو یاد کر رہی ہیں۔"

"آتی ہوں۔" شائستہ نے لاپروائی سے کہا اور پھوپھو کو اچھا خاصا انتظار کروانے کے بعد اٹھی۔ سونیا خاموشی سے بیٹھی ناخن پر لگی پالش کریدنے لگی۔ ہلکی سوچ کی پرچھائیں اس کے چہرے پر چھائی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بھابی۔"

"مجھے لگتا ہے میں کہیں گم ہو گئی ہوں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی' کسی انسان کے لئے خود کو اتنا بدل لینا کہ اپنا چہرہ ہی اجنبی لگنے لگے' کیا ٹھیک ہے؟"

"میں کچھ سمجھ نہیں پائی۔" بیلا نے ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھا۔

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آیا تمہیں کیا سمجھاؤں۔" وہ بے معنی سی ہنسی ہنس دی۔

"بھابی! بہت دنوں سے آپ نے پزا نہیں بنایا' آج بنائیں نا۔" بیلا نے یوں ہی ان کا دھیان بٹانے کو کہہ دیا۔

"آج موڈ نہیں ہے' پھر کبھی سہی۔" وہ کہہ کر چلی گئی' بیلا کو یاد نہ تھا کہ آج سے قبل انہوں نے کبھی کسی کی فرمائش کو یوں رد کیا ہو

"سب کام کاج چھوڑ کر یہاں ایک ہفتے سے کیا کر رہے ہو۔" شائستہ نے جس طرح ذکی کے لتے لئے تھے۔ پھوپھو نے انگلی دانتوں میں دبالی اور شکر کیا کہ بہو مستقل امریکہ میں

رہتی ہے۔

"میں تم سے چوری چھپے تو نہیں آیا۔" ذکی نے جھنجلا کر سگریٹ سلگائی۔

"ایک ماہ میں تو شادی تو کیا' تم لڑکی بھی فائنل نہ کر سکے اور چچی آپ......"

"ارے' میں نے تو بہت لڑکیاں دکھائیں' مگر یہ ہی۔" وہ گڑبڑا گئیں۔

"ہاں' یہ جن چکروں میں ہے اس کا مظاہرہ میں نے آتے ہی دیکھ لیا۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"فار گاڈ سیک شائستہ! تم چاہتی کیا ہو۔"

"مت بھولو' میں نے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دی ہے' ورنہ وہاں کے قانون کی رو سے تم دوسری شادی نہیں کر سکتے۔"

پھوپھو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ نقص تو شائستہ میں ہے' پھر ان کا بیٹا اس طرح دب کر کیوں بات کر رہا تھا۔ تین لفظ کہہ کر جان چھڑائے اس چڑیل سے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اس چڑیل سے جان چھڑانے کی پاداش میں ذکی کو بہت کچھ کھونا پڑتا' جو انہیں گوارا نہ تھا۔

"تو......" ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اپنی خوب صورت اور طرح دار بیوی کو دیکھا۔

"تو اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو۔" وہ چیخ اٹھی۔

"تم مجھے دوسری شادی کی اجازت دے چکی ہو۔" ذکی نے جتایا۔

"شادی کی اجازت تمہیں اپنے لئے شریک حیات منتخب کرنے کے لیے نہیں دی' اولاد کے لئے دی ہے' اور یہ کام کوئی بھی کر سکتی ہے۔"

"کسی ماسی کی لڑکی سے شادی کر لوں؟" وہ چڑ کر بولے۔

"کیوں......اس گھر میں تمہاری ایک سابقہ منگیتر بھی تو ہے۔"

ذکی اپنی جگہ ششدر سے رہ گئے۔

پھوپھو کا منہ کھل گیا' وہ بڑبڑائیں۔

"گل صنوبر؟"

"ہاں' گل صنوبر' بے چاری' اب تک کنواری بیٹھی ہے۔ اس ڈھلتی عمر میں اسے کون بیاہنے آئے گا۔ اب کچھ کرنے ہی چلے ہو تو تھوڑا ثواب ہی کما لو' اسے سہارا مل جائے گا اور تمہیں بچہ۔" شائستہ نے آرام سے کندھے اچکائے۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" ذکی نے غصے سے سگریٹ مسل دیا۔

"میرا نہیں تمہارا۔ اپنی اڑان نیچی کرو' اور چچی! آپ بڑے ابا سے گل صنوبر کے رشتے

کی بات کریں‘ مجھے یقین ہے انکار نہیں ہوگا۔“

وہ ذکی کو کھولتا اور پھوپھو کو ہکا بکا چھوڑ کر کھٹ کھٹ کرتی نیچے چلی گئی۔ ذکی ایک ہاتھ کا مکا دوسرے ہاتھ پر مار کر رہ گئے۔ پھوپھو نے غور سے بیٹے کے تیور دیکھے پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تو پھر کروں بھائی صاحب سے بات؟“

”امی! آپ بھی......“

”کیونکہ گل صنوبر بڑی سیدھی سادی ہے۔ اللہ بخشے تمہارے نانا کہا کرتے تھے‘ میری گل بڑی اللہ لوک ہے۔ اسے دکھی کرنے والا کبھی سکھی نہیں رہے گا۔ مجھے تو ہمیشہ سے یہ ہی لگتا ہے کہ تمہاری بے اولادی اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ یاد ہے‘ جب بچپن میں سفیان نے ایک بار گل کو تھپڑ مارا تھا تو اس کے ہاتھ پر شہد کی مکھی نے......“

وہ نہ جانے کون سے قصے لے کر بیٹھ گئی تھیں حالانکہ جب شادی کی بات ہوئی تو سب سے پہلے وہ ہی بیٹے کی ہمنوا ہوئی تھیں۔ تب شائستہ انہیں چودھویں کا چاند لگتی تھی اور گل......

وہ غصے سے کھولتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

* * *

صبح سے گھر کے بڑوں کی سرگرمیاں خاصی پُراسرار تھیں۔ بڑے ابا نے سب کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ ان بڑوں میں فیضان اور سفیان بھی شامل تھے۔ پھر بھابیاں بھی شریک کر لی گئیں۔ باوجود کوشش کے بیلا کو کوئی سن گن نہ مل سکی۔ غصے سے پلاؤ کو دم پر رکھا اور کھیر میں چمچہ چلانے لگی۔

”بلی تھیلے سے باہر آ ہی جائے گی‘ تم کیوں فکر مند ہو۔“ دوپہر کے کھانے میں ابھی تھوڑی دیر بھی تھی اور زیبا انسٹی ٹیوٹ سے جلدی گھر آ گئی تھی۔ سو اب سینڈوچ بنا کر پیٹ پوجا کر رہی تھی۔

”ہاں‘ سارے گھر کو جمع کر لیا‘ ہم کسی کھاتے میں نہیں۔“

”سب کو چھوڑ کر تم سے مشورہ کرتے۔“ زیبا ہنسی۔

”تمہیں تو کسی بات کی فکر ہی نہیں ہوتی۔“

”میں خوامخواہ کی فکریں نہیں پالتی۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور اپنا کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

شام تک اسے کسی بات کی سن گن نہ ملی۔ وہ گل کے پاس بیٹھی‘ جلے دل کے پھپھولے

پھوڑتی رہی‘ تب ہی گل نے اچانک کہا۔

”آج کی شام بہت عجیب سی ہے۔“

بیلا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہلکے زرد آسمان پر اک چیل منڈلا رہی تھی۔

”شاید آندھی آنے والی ہے۔“ بیلا نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ پھر موبائل پر آیا میسج دیکھنے لگی۔

پھیلتی جا رہی ہے خوشبو سی
دل میں کسی کا خیال آیا ہے

”توبہ! یہ بندہ تو تھکتا ہی نہیں۔ عاشر آئے تو سم ہی بدلوا دوں گی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی‘ پھر اٹھ کر ماں کے پاس آ گئی۔

”خیریت امی! یہ سارا دن بڑے ابا کے کمرے میں کیا ہوتا رہا ہے۔“

”تمہارے مطلب کی بات ہوئی تو سامنے آ جائے گی۔“ انہوں نے بیٹی کو گھور کر دیکھا۔

وہ منہ بنا کر رہ گئی۔ رات کو کھانے پر آخر کار دھماکا ہو ہی گیا۔ کم از کم بیلا کے لیے تو دھماکا ہی تھا۔ جب بڑے ابا نے آرام و سہولت سے اعلان کیا کہ انہوں نے گل کا رشتہ ذکی سے طے کر دیا ہے اور یہ کہ جمعہ کو نکاح ہے۔

بیلا کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ اس نے تحیر و استعجاب سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا۔ سب مطمئن تھے‘ مسکرا رہے تھے۔ اس نے گل کی طرف دیکھا۔ پھوپھو اسے خود سے لپٹائے بلائیں لے رہی تھیں۔ گویا سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ گل کا چہرہ اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ سکی مگر خود اس کے اندر آگ سی لگ گئی تھی۔

گل صنوبر اور ذکی۔

ذکی اور گل آپی۔

ایک سلگتا ہوا لمس‘ اک آگہی دیتا لمحہ۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ پلیٹ کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔

امی نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھاما۔

* * *

دھن...... دھن...... سرخ مرچیں اڑ اڑ کر اس کی آنکھوں اور ناک کا ناس کر رہی تھیں۔ پر نہ ہاتھ رکتا تھا‘ نہ چھینکیں‘ اور نہ آنکھوں سے بہتا پانی‘ گویا اسے اپنا سارا غصہ ان ہی ثابت مرچوں کو کوٹ کر نکالنا تھا۔

ہر کوئی روک روک کر تھک گیا۔ بڑی اماں الگ پچھتائیں۔ نہ وہ سوکھنے کو ڈالتیں نہ بیلا کا یہ حشر ہوتا' لیکن سوال یہ تھا کہ پھر اس کا غصہ کیسے نکلتا؟

وہ ایک ایک سے لڑی تھی مگر سب کے نزدیک وہ بالکل ناسمجھ بلکہ بے وقوف تھی' سو کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ہر کوئی یوں مطمئن' شاداں و فرحاں جمعہ کو ہونے والے نکاح کی تیاریوں میں مگن تھا۔ ذکی کی دوسری' مگر گل کی تو پہلی شادی تھی۔ اس کا کوئی ارمان ادھورا نہ رہ جائے۔ بنا بنایا خوب صورت فرنیچر اوپر کی منزل پر سیٹ ہو گیا۔ درزی کو بٹھا کر ہنگامی طور پر ملبوسات سلائے جا رہے تھے۔ گھر کی آرائش' مہمانوں کو بلاوے۔ کھانے کا انتظام' پارلر کے چکر...... سو کس کو فرصت تھی کہ بیلا کی اس بے تکی بات پر کان دھرے ذکی کسی صورت گل کے قابل نہیں۔

سو اب وہ تھی اور سرخ مرچیں۔

آنکھوں کی جلن۔

ایک تواتر سے آتی چھینکیں۔

وہ حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ مگر ہاتھ نہ رکتی تھی۔

تب ہی کسی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر بلکہ گھسیٹ کر کھڑا کیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپی۔ مگر گرفت مضبوط تھی۔ موسل ہاتھ سے چھوٹ کر دور تک لڑھکتا گیا۔ وہ چیختی رہی مگر اس نے گھسیٹ کر بیسن کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ زیادہ مچلی تو چلو میں پانی لے کر چھپاک سے منہ پر دے مارا۔

"شرافت سے ہاتھ منہ دھو لو' ورنہ گردن پکڑ کر نل کے نیچے کر دوں گا۔" غصے بھرا تحکمانہ لہجہ بیلا نے اس سے بھی زیادہ غصے سے گھورنا چاہا۔ مگر آنکھوں کی حالت زیادہ نازک ہو چکی تھی' سو وہ جھک کر اور بے حد غصے سے رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھونے لگی اور تب تک دھوتی رہی جب تک عاشر کا صبر ساتھ دیتا رہا۔ آخر تنگ آ کر عاشر نے نل بند کیا۔ وہ بازو چھڑا کر صحن میں چارپائی پر جا بیٹھی۔ عاشر نے کچن سے آئس کیوبز اور ٹشو پیپر لا کر اس کے قریب رکھ دیئے۔

"لو اچھے بچوں کی طرح ٹکور کرو۔"

اس نے واقعی اچھے بچوں کی طرح عمل شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ستون سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔

"تم کب آئے؟" غصے اور جلن کا گراف نیچے آ گیا۔

"ابھی...... پوچھ سکتا ہوں یہ کیا ہو رہا تھا۔"

"مجھ سے نہیں گھر والوں سے پوچھو۔" اس کی آنکھیں بے بسی کے احساس کے ساتھ لبالب بھر آئیں۔

"گل آپی کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"کس کے ساتھ؟" بیلا نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ بھائی کا نام لیتے لیتے رک گیا۔

"بیلا! تمہیں بھائی پر اعتراض کیوں ہے۔"

"وہ کسی بھی طرح گل آپی کے قابل نہیں۔ تم بتاؤ' کیا گل آپی کے نصیب میں یہ ہی ہے کہ کوئی ان سے دوسری شادی کرے اور وہ بھی اولاد کی خاطر۔"

"ہاں...... لیکن......" عاشر کچھ کہہ نہ پایا۔ بظاہر اس میں کچھ حرج بھی نہ تھا۔ مگر وہ کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جس سے بیلا کی تشفی ہو سکے۔

"ہاں تم بھی ان ہی کا ساتھ دو گے' آخر وہ تمہارے بھائی ہیں۔ تمہیں کسی لڑکی کے احساسات و جذبات کی کیا قدر۔" وہ اسی پر الٹ پڑی۔

"بیلا......" بڑی اماں پکار رہی تھیں۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مرے مرے قدموں سے ان کے پاس آئی۔ انہوں نے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گئیں اور لے جا کر پچھلے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا کر دیا۔ قرآن پاک کی تفسیر پڑھتی امی نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"اسے غور سے دیکھو بیلا! یہ لڑکی میری بیٹی ہے۔ پر میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس میں کوئی ایسا گن نہیں کہ کوئی اسے گھر لے جانے اور بسانے کا سوچے۔" بیلا نے تڑپ کر انہیں دیکھا مگر وہ بڑی سفاکی سے کہہ رہی تھیں۔ ایسی سفاکی جس کے عقب سے درد ہی درد چھلک رہا تھا۔

"اس کی ڈھلتی عمر' سر پر بکھرتی سفیدی' بغیر تعلیم' بغیر تیزی طراری' ہوشیاری کے' کون ہے جو اسے بیاہنے آئے گا اور اگر کوئی ایسا دل والا ہوتا تو آج والدین کی دہلیز پر بیٹھی گل صنوبر بوڑھی نہ ہو رہی ہوتی۔ یہ پھول مرجھا چکا ہے بیلا! اس سے قبل کہ یہ خزاں کا مارا پھول اس ہنستے بستے گلشن کا بدنما داغ بن جائے' اسے کسی کے نام ہو جانے دو۔ میں ماں ہوں' اس کی سونی مانگ میرا چین چھین لیتی ہے۔ اس کی خالی کلائیاں میرا دل نوچتی ہیں۔ اس کی ویران زندگی میری نیندیں چھین لے گئی ہے۔ ہر ماں کی طرح میرا بھی یہ ہی ارمان ہے۔ میں اپنی بیٹی کو دلہن بنا دیکھوں۔ اس کی مانگ میں افشاں سجاؤں' اسے سرخ جوڑے میں لپٹا دیکھوں۔

میں نے بہت عرصہ انتظار کیا ہے۔ تھک گئی تھی' مایوس ہوگئی تھی۔ آج اگر وہ دلہن بن رہی ہے تو تم بدشگونی کی باتیں مت کرو۔ ارے اس بدنصیب کے سینے میں بھی دل ہے' کیسی بہن ہو کہ بہن کی آنکھوں میں سجے سپنے ہی دکھائی نہیں دے رہے۔ اسے سرخ جوڑا پہننے دو' اس کی کلائیوں میں چوڑیاں سجنے دو بیلا! اس کی سونی مانگ میں افشاں چمکنے ......'' بڑی اماں روتے روتے کہتی گئیں اور کہتے کہتے چلی گئیں۔

بیلا اپنی جگہ دم بخود تھی۔

اس کے سامنے اک لڑکی تھی' جس کی مانگ سفید تھی مگر جس کے ہاتھوں میں اک سرخ دوپٹہ تھا۔ جس پر اس کی انگلیاں سنہری کرن ٹانک رہی تھیں'' یارو پہلے خواب'' وہ ذرا سا لڑکھڑائی اور سہارے کے لیے کرسی تھام لی۔

امی نے قرآن شریف بند کر کے ریک میں رکھا اور عینک اتار کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئیں۔

''کبھی کبھی حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے لیکن اس کی تمام تر تلخی کے باوجود قبول کرنا پڑتا ہے اور پھر صنوبر' اس نے تو بچپن سے اپنے نام کے ساتھ ذکی کا نام سنا تھا۔ یہ خواب ادھورا سہی' مگر اس کی آس' اس کا سہارا تھا' یوں سمجھو کہ گل کی محبت اسے واپس آنے پر مجبور کر گئی۔''

بیلا کے لیے ایک اور انکشاف اور اس کے بعد بیلا کو لگا کہ اب وہ کبھی اس رشتے کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہہ پائے گی۔

* * *

''لڑکیاں نیچے شفٹ ہو جائیں۔'' یہ بڑے ابا کا حکم تھا۔ بیلا کو پہلا قلق اگر گل کی ذکی کے ساتھ شادی کا تھا تو دوسرا یہ کمرا چھوڑنے کا۔ وہ بے دلی سے اپنا چھوٹا موٹا سامان اٹھا رہی تھی۔ زیبا بھی الماری سے اپنے کپڑے نکال رہی تھی۔ مریم تو اتنی جلدی آ نہ سکی تھی' البتہ فرح سنتے ہی آ گئی۔ باقی مہمان بھی جمع ہو رہے تھے۔ شائستہ اپنے والدین کے گھر جا چکی تھی۔

''تمہارا یہ سوجا ہوا منہ ٹھیک نہیں ہو سکتا' تاکہ شادی پہ تھوڑا مزا آ سکے۔'' فرح نے جھنجلا کر کہا۔

''میں نے کسی سے کیا کہا ہے' کرو مزے ...... مجھے اس شادی سے کوئی خوشی نہیں ہو رہی' تو میں کیا کروں؟''

''اف وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ' آخر تو کس مٹی سے بنی ہے۔''

''جس میں خودغرضی شامل نہیں۔''

''اور خودغرضی کون دکھایا ہے۔''

''آف کورس ذکی بھائی' وہ جانتے ہیں کہ وہ گل آپا سے کبھی محبت نہیں کر سکیں گے۔ وہ صرف اولاد کے لئے شادی کر رہے ہیں۔''

''پاگل! کبھی کبھی محبت اتنی ضروری نہیں ہوتی' زندگی گزارنے کے لیے کچھ اور سہاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ...... بیلا ...... ماں' باپ کسی کے ہمیشہ نہیں رہتے۔ کم از کم گل کے ساتھ ذکی کے نام کا سہارا تو ہوگا۔'' فرح نے سمجھانے کی کوشش کی اس کے ذہن میں ایک ساتھ کئی سوالا کلبلائے ......تب ہی ذکی دروازے کھٹکھٹا کر اندر آ گئے۔

''پیکنگ ہو رہی ہے؟''

''نہیں شفٹنگ۔ دیکھ لیں' آپ کی شادی نے ہم سے ہمارا کمرہ چھین لیا۔''

فرح ہنسی۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ بیلا پر ڈالی' جو انہیں یکسر نظرانداز کئے کتابوں کا بکس کھولے اس میں مزید چیزیں بھرنے لگی تھی۔

''اوہ! تو لوگ اسی لئے مجھ سے خفا ہیں۔''

''نہیں ......خفا ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔'' فرح شرارت سے گویا ہوئی۔

''کیوں بیلا رانی ...... سنا ہے' آپ کو ہماری شادی پر سب سے زیادہ اعتراض ہے۔'' انہوں نے جھک کر بکس میں سے ایک کتاب اٹھائی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''تو پھر یہ بے اعتنائی کیسی؟'' انہوں نے کتاب کی ورق گردانی کرنا چاہی تو وہ عین وہاں سے کھلی جہاں ادھ کھلا گلاب سوکھ کر باسی خوشبو چھوڑ رہا تھا۔

''اوہو تو بیلا کو کتابوں میں پھول رکھنا پسند ہے۔'' بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔

''کسی کی نشانی یا کوئی چھوٹی سی یاد۔''

بیلا نے جھپٹ کے پھول اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور چبا چبا کر بولی۔

''مجھے خوشبو کو قید کرنا پسند نہیں۔''

فرح نے کچھ محسوس کیا تو تیزی سے آگے بڑی۔

''آئیں ذکی بھائی! نیچے چلتے ہیں۔ مزدور یہاں سے قالین وغیرہ اٹھوا لیں۔''

انہوں نے دزدیدہ نگاہوں سے بیلا کو دیکھا' جو ان کی طرف پشت کئے مصروف ہوگئی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے اور کھڑکی کے نیچے کھڑے عاشر نے بے حد تحیر سے خود پر نچھاور ہوتی سوکھی پتیاں دیکھیں۔ پھر سر اٹھا کر اوپر کھڑکی کو۔'' کیا یہ میری محبت کا جواب

ہے؟'' وہ ششدر سا کھڑا سوچ رہا تھا۔

* * *

دلہن بنی گل صنوبر کو دیکھ کر بیلا کو احساس ہوا کہ ہر ماں کے دل میں بیٹی کو دلہن بنا دیکھنے کی خواہش اتنی شدت سے کیوں پیدا ہوتی ہے۔ گل کا رنگ صاف تھا۔ اس کے نقش بھی خوب صورت تھے مگر وہ ہمیشہ بے رنگ اور بجھی بجھی سی لگتی تھی مگر آج یوں لگتا تھا سارے رنگ اس ایک وجود میں سمٹ آئے ہوں۔ بیلا نے مہمانوں کے ہجوم پر اک نگاہ دوڑائی۔ بڑی اماں کتنا ہنس رہی تھیں۔ گویا آج ساری دنیا کے سوالوں کا جواب دے دیا۔ بڑے ابا کتنے مطمئن اور مسرور سے پھر رہے تھے۔

''کیا بیٹی کی ذمہ داری واقعی اتنی بھاری ہوتی ہے۔''

عاشر نے دور سے فراک اور پاجامے میں ملبوس سجی سنوری بیلا کو دیکھا۔ اعصاب پر باسی پھولوں کی مہک بوجھل پن بڑھا گئی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں الجھی اسٹیج پر دولہا' دلہن کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں نکاح کا مقدس فریضہ انجام دیا جا رہا تھا۔ کچھ بھی سوچے بنا اس نے موبائل نکال کر میسج کیا۔ بیلا نے چونک کر اپنے ہاتھ میں پکڑا سیل دیکھا۔

''تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ......

''کلیوں سی نازک لڑکی! خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔''

بیلا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تب ہی نگاہ عاشر پر پڑی۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی تیز تیز قدموں سے اس تک آئی۔

''عاشر! دیکھو' کوئی مجھے تنگ کرتا ہے۔'' عاشر نے حنائی ہاتھ میں دبے سیل کو دیکھا۔

''کب سے چل رہا ہے؟''

''جب سے تم نے مجھے یہ سیل دیا ہے۔''

''تنگ کرتا ہے؟''

''نہیں......بس اچھے اچھے رومانٹک میسج بھیجتا ہے۔'' وہ شرارت سے ہنسی۔

''ہوسکتا ہے......واقعی تم سے محبت کرتا ہو۔''

''چھوڑو......موبائل ہو یا انٹرنیٹ' سب جھوٹ ہوتا ہے۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''اچھا اور اصل زندگی میں؟'' عاشر نے اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکا۔

''میں نہیں پڑتی ان خرافات میں۔''

''خرافات کیوں؟''

''امی کہتی ہیں' اچھی لڑکیاں صرف اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں'' وہ بزرگی سے بولی۔

عاشر کا قہقہہ ابھرا تو وہ ناراض ہوگئی۔

''اچھا سنو......اگر کوئی سچ مچ تم سے محبت کا اظہار کرنا چاہے تو۔''

''سر پھاڑ دوں گی...... جسے مجھ سے محبت ہے' سیدھے سیدھے اپنے گھر والوں کو بھیجے۔''

''ارے......تو وہ درمیانی رومانٹک پیریڈ؟''

''مجھے نہیں پسند۔'' وہ تنک کر کہتی اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ عاشر نے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا پھر ہنس دیا۔

''بیلا رانی! گویا آپ سے محبت کروانے کے لیے پہلے آپ کا شوہر بننا پڑے گا۔''

''ہاں......مگر کس کا؟'' پاس سے گزرتی سونیا ٹھٹک کر رکی۔

عاشر خجل سا ہوگیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کا نام لبوں کی جنبش میں رہ گیا تھا۔ ورنہ بھانڈا چوک میں پھوٹتا۔

* * *

بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا......گھر والوں کے خوش و خرم چہرے' گل کی کھلی کھلی رنگت' ہونٹوں پر کھلتی شرمگیں مسکان...... ذکی کا رویہ بھی اچھا تھا' پھر وہ اکیلی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیا بناتی۔ سب کچھ بھول کر ذکی کو بہنوئی کی حیثیت دینا ہی پڑی۔ گل زیادہ تر اوپر ہی رہتی۔ شاید یہ بڑی اماں کی ہدایت تھی۔ نت نئے زرق برق ملبوسات میں وہ کتنی بدلی بدلی سی لگتی۔ جھولے پر اب بیلا کا قبضہ تھا۔ وہ فارغ وقت میں اے حمید کا زرد گلاب منہ پر رکھے اونگھتی رہتی۔

تب ہی ایک دن شائستہ چلی آئی۔ گل سب کچھ بھول کر اپنی سوکن کی خدمت میں مصروف ہوگئی۔ اسے تین دن کے بعد واپس جانا تھا۔ وہ اور ذکی تیار شیار ہو کر شاپنگ کے لیے نکل جاتے۔ پیچھے گل ان کے لئے نئے نئے کھانے بناتی رہتی اور بیلا کو جلنے کڑھنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔

اس دن دونوں کے جانے کے بعد وہ سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آ گئی۔ جہاں ساس' بہو راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ گل ان کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی اور پھوپھو انہیں ذکی کو قابو کرنے کے طریقے سمجھا رہی تھیں۔

(وقت وقت کی بات ہے) بیلا کندھے اچکاتی آگے بڑھی۔

"آپ ذکی بھائی کو روکتی کیوں نہیں' روز اس کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔"

"اے ہے..... کیسے' آخر وہ اس کی پہلی بیوی ہے۔" پھوپھو بوکھلائیں۔

"اور گل آپی کیا ہیں؟ کتنے دن ہو گئے ایک بار بھی انہیں شاپنگ کرانے یا کھانا کھلانے نہیں لے کر گئے۔" وہ گویا لڑنے آئی تھی۔ پھوپھو ہنس دیں۔

"گل خود ایسی جگہوں سے گھبراتی ہے' پھر دو' چار دن کی بات ہے' وہ تو چلی ہی جائے گی۔" وہ گویا پچکارتے ہوتے بولیں۔

"بس کہہ دیں ذکی بھائی سے' ہمیں یہ ناانصافی اچھی نہیں لگتی۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"توبہ' یہ بڑی اماں کہاں سے آ گئی۔ گل! اسے تو تم ہی سنبھالو۔" وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئیں' گل نے مسکرا کر بیلا کو دیکھا۔

"گل آپی! آپ کو برا نہیں لگتا۔"

"پاگل' جو میرے نصیب کا ہے' وہ مجھے ہی ملے گا۔"

"آپ بھی نا بس' اچھا اٹھیں' میں نے آپ کے ہاتھ کے پکوڑے کھانے ہیں۔" وہ انہیں گھسیٹتی کچن میں لے گئی۔

شام کو غالباً پھوپھو نے ان سے کہا تھا' تب ہی گاڑی کی چابی گھماتے چلے آئے۔

"چلو بھئی! آج ڈنر باہر کریں گے۔ سنا ہے لوگ تشویش کا شکار ہیں۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی شرارت تھی۔ بیلا نے پہلو میں کھڑی گل کو دیکھا' جو سبز لباس میں تیار کھڑی تھی۔

"جب شائستہ آپ کے ساتھ جاتی ہیں' تب آپ سب کو لے جاتے ہیں؟" یہ اچھی خاصی بدتمیزی تھی جو بیلا سے سرزد ہوئی۔ ذکی نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ گل کی خواہش تھی۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ سب اسے لعن طعن کرنے لگے۔

"میں گاڑی میں ہوں' جس نے جانا ہو آ جائے۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنی شرمندگی مٹانے کو اسے زیبا کے ساتھ جانا پڑا۔

* * *

زندگی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی۔ سونیا امید سے تھی۔ سو زیادہ وقت اپنی مما کی طرف گزارتی۔ فیضان پہلے وہاں قدم بھی نہ رکھتا تھا۔ اب اکثر آفس سے واپسی پر وہیں پایا جاتا۔ بیلا نے گھر کی روٹین سے گھبرا کر کمپیوٹر سنٹر جوائن کر لیا۔ عاشر کا تبادلہ کوہاٹ ہو گیا تھا۔ سو رابطہ صرف فون پر محدود ہو گیا۔ بڑی اماں اٹھتے بیٹھتے گل کے لیے دعا کرتیں اور شاید

ان ہی کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ شادی کے ڈھائی ماہ بعد ساون کے مہینے میں گل نے انہیں خوش خبری سنائی۔

"پتا ہے گل! مجھے اب بھی اعتبار نہیں آ رہا۔" وہ دونوں جھولے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ذکی کے ہاتھ میں فالسوں سے بھری پلیٹ تھی۔ گل آگے کو جھک آنے والی شاخ کی پتیاں نوچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا وہ بے حد کمزور ہے۔ اسے اپنی غذا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہو گا۔ ملٹی وٹامنز' سپلیمنٹ' کیلشیم' ذکی اس کا بے حد خیال رکھتے۔ گل کو یقین ہی نہ آتا۔ یہ وہ ہی ذکی ہیں' جنہوں نے کبھی اس سے شادی سے انکار کیا تھا۔ دودھ' پھل' وہ خود کاٹ کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے اسے کھلاتے۔

"میں نے پورے دس سال اس خوش خبری کا انتظار کیا ہے۔ دس سال کا عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ جو مجھے خبر ہوتی کہ مجھے یہ تحفہ تم سے ملنے والا ہے تو کبھی دیر نہ کرتا۔" گل مدھم سا مسکرائی۔

"تم اتنا کم کیوں بولتی ہو' کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" انہوں نے اپنا بازو گل کے کندھے پر پھیلایا۔

"ہے نا۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور سرخ ہو گئی۔

"تو یار! کھل کر کہو نا..... گل! کیسا ہو گا ہمارا بچہ..... تمہارے جیسا یا میرے جیسا۔ تمہارے جیسا تو بالکل نہ ہو' گھنٹوں گپ چپ بیٹھی رہتی ہو۔ شائستہ جیسا ہو تو کیا بات ہے۔ کانفیڈنٹ اور جینئس..... تمہیں پتا ہے' وہاں لوگ شائستہ کو....."

گل نے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا بہت خلوت میں بھی انہیں شائستہ یاد آ جاتی۔ حالانکہ شائستہ جیسی گرم جوشی دکھانا گل جیسی لڑکی کے بس کی بات کہاں تھی۔ مگر اب تو وہ اپنے بچے کی بات کر رہے تھے۔ اپنے اور گل کے بچے کی' اس میں شائستہ کہاں سے آ گئی' مگر وہ مگن تھے۔

"گل! دعا کرو ہمارے ہاں پہلا بیٹا ہو' تمہاری تو اللہ کے ساتھ ڈائریکٹ ڈیلنگ ہوتی ہے۔ ہمہ وقت نماز و تسبیح میں لگی رہتی ہو۔ تمہاری بات تھوڑی ٹالے گا۔"

"ایسی بات مت کریں' جو اللہ کو منظور۔" وہ اپنی جگہ کانپ سی گئی۔

"اچھا..... یہ فالسے کھاؤ' سنا ہے عورتیں ایسی حالت میں کھٹی میٹھی۔" ان کا موبائل بجنے لگا۔ انہوں نے نمبر دیکھا' پھر پلیٹ گل کے ہاتھ میں تھما دی۔

"اس کا شربت بنا لاؤ۔"

وہ پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیسی ہو جان من......"

"تمہارا کام ہو گیا......اب وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔" شائستہ نے تڑخ کر پوچھا۔

ذکی اک طویل سانس لے کر رہ گئے۔

* * *

"تم اتنا اداس کیوں ہو رہی ہو۔" گل نے ان کی ساری پیکنگ چپ چاپ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ کی تھی۔

"مجھے جانا تو تھا ہی۔" ذکی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"مت جاؤ......میرا دل گھبراتا ہے۔" وہ اس کے کندھے سے لگ کر سسک اٹھی۔ ذکی نے کوفت سے اسے دیکھا۔ عورتوں کا یہ جذباتی پن انہیں زہر لگتا تھا۔

"جاؤں گا نہیں تو واپس کیسے آؤں گا۔ اتنے مہینوں کی غیر حاضری میں جو حرج اور نقصان ہوا' وہ اگلے پورے سال تک پورا ہو سکے گا۔" انہوں نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم رکھا۔

"تو کیا پورا سال نہیں آؤ گے" گل نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

"کیوں نہیں آؤں گا' جب بھی تم بلاؤ۔"

"ذکی! میں اکیلی......"

"اکیلی......سب گھر والے تمہارے پاس ہیں' اکیلی تو وہاں شائستہ ہے' دیکھو' کتنے دنوں سے میرے بغیر تنہا وہاں رہ رہی ہے۔"

گل کے سارے جذبوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ کر آنسو صاف کرنے لگی تو وہ سکون کا سانس لے کر کھڑے ہو گئے۔

"آؤ......نیچے سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔"

دونوں ساتھ ساتھ نیچے اتر آئے۔ جہاں سب گھر والے جمع تھے۔ پھوپھو' بیٹے کو گلے لگا کر رو دیں۔

"اتنے سالوں کے بعد شکل دکھائی' اب ایسا نہ کرنا۔"

بڑے ابا نے آگے بڑھ کر بہن کو پیچھے ہٹایا اور آہستگی سے بولے۔

"اب تم پر دہری ذمہ داری ہے بیٹا! ان میں توازن رکھنا۔"

"ماموں! آپ بالکل فکر مت کریں۔ ان شاء اللہ کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔"

کچھ دن قبل ہی وہ گل کو لے کر بینک گئے تھے۔ اس کے نام اکاؤنٹ کھلوایا تھا کہ گل

کے خرچے کے لیے وہ الگ سے رقم بھجوائیں گے۔ سب سے مل کر بیلا کے سامنے رکے' جو گل کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

"اچھا بیلا رانی! تمہیں ہم سے بہت شکایتیں سہی ...... پر اپنی امانت چھوڑے جا رہا ہوں۔ میری مسز کا خیال رکھنا۔"

اور بیلا سب کچھ بھول کر ان کے بازو سے آ لگی' وہ ہنس دیئے۔

"شکر ہے' تمہارا اعتبار تو جیتا۔"

اک جذباتی سے سین کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوئے۔ گل پلٹ کر ماں کے کمرے میں جا گھسی۔ فیضان انہیں چھوڑنے جا رہے تھے۔ باقی سب کو انہوں نے خود ہی ایئر پورٹ آنے سے منع کر دیا تھا۔ یوں وہ جس طرح اچانک آئے تھے۔ اسی طرح لوٹ گئے۔ گل کے پاس پہلے ان کا انتظار تھا اور اب بھی ......بس یہ تھا کہ اب اس انتظار میں وہ تنہا نہ تھی۔ اپنے اندر سانس لیتے وجود کا احساس اسے دسراہٹ دیتا۔

گل کے لئے نہ سہی' ذکی کو اپنے بچے کے لیے تو لوٹ کر آنا تھا۔

* * *

"مجھے تیمور احمد کہتے ہیں۔"

وہ دونوں ابھی انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکلی ہی تھیں۔ جب سر تیمور عین سامنے آ کھڑے ہوئے۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا' پھر زیبا بولی۔

"جی ہم جانتے ہیں۔" سر تیمور کو یہ انسٹی ٹیوٹ جوائن کئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ وہ ینگ تھے اور اسمارٹ بھی' سو لڑکیوں میں خاصے مقبول بھی تھے۔

"دراصل یہ بات ایسی نہیں کہ یوں سر راہ کی جائے ......مگر مجبوری ہے' میں بلاوجہ آپ کو اپنے آفس میں بلانا نہیں چاہتا' دراصل میں مس رابیل کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہتا ہوں' اگر یہ کہیں انگیجڈ نہ ہوں تو۔" سنجیدہ چہرہ' پرمتانت لہجہ' دونوں ہکا بکا رہ گئیں۔ خصوصاً بیلا کا تو اچھا خاصہ منہ کھل گیا تھا۔

"آئی ایم سوری' شاید آپ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔" وہ ان کے ردعمل پر شرمندہ ہو گئے۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" بالآخر زیبا سنبھلی۔

"دراصل ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں ہوتے۔" وہ بیلا کا ہاتھ پکڑ کر آگے نکل گئی۔ جبکہ وہ حسرت زدہ چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔ بیلا کچھ دیر خاموشی

سے چلتی رہی، پھر ایک دم ہنس پڑی۔

"خیریت ......" زیبا ٹھٹک کر رکی، جبکہ وہ ہنستی چلی گئی، پھر بمشکل بولی۔

"اسی لئے میں گھر سے باہر نہیں نکلتی، لوگ دیدہ و دل فرش راہ کئے رہتے ہیں۔ لوگ کیا کریں، حسن جہاں سوز کی تاب لانا ممکن کہاں؟"

"اتنا مت پھیلو......" زیبا نے برا سا منہ بنایا۔ "سر تیمور کی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔"

"تب ہی تو نظر نزدیک نہیں دور پڑی ہے۔" وہ مزید اٹھلائی کہ زیبا ان کی سٹوڈنٹ رہ چکی تھی۔

"لیکن سنو! تم نے منہ پھاڑ کر انکار کیسے کر دیا۔" بیلا کے قدم ایک دم رکے۔

"کیونکہ بڑی بہن ہونے کے ناتے مجھے پتا ہے، تمہارے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔"

"اچھا تو کیا یہ پروپوزل میرے لئے اچھا نہیں تھا۔" بیلا نے مایوسی سے پوچھا۔

"سر تیمور کی طرح تمہاری بھی نزدیک کی نظر کمزور ہے۔" زیبا کہہ کر رکی نہیں۔ پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی جبکہ اس کا جملہ بیلا کے سر پر گزر گیا تھا۔

* * *

ان ہی دنوں گھر میں نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تو وہ بھول بھال گئی۔ فیضان نے اچانک ہی باہر جانے کا اعلان کر دیا۔ سب ششدر سے رہ گئے۔ بالا ہی بالا سارے انتظامات کر کے انہیں صرف بتایا جا رہا تھا۔ مارے صدمے کے بڑے ابا کچھ بول ہی نہ سکے۔ فیضان سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"میں بہت مجبور ہو گیا ہوں ابو......سونیا......" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اب ساری وضاحتیں بے کار تھیں۔

بڑی امی پھپک کر رونے لگیں۔

"آخر تمہاری سسرال کا رنگ تم پر چڑھ ہی گیا۔ مجھے تو اسی دن سمجھ جانا چاہئے تھا جب اس بڑے گھر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔ جب پرندے اڑان بھرنا سیکھ لیں تو انہیں گھونسلوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں نئی پرواز بھرنے دیں بھائی صاحب!" ابو نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھائی۔ فیضان سرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھ گئے۔ یہ تو وہ ہی جانتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کس مجبوری میں کر رہے تھے۔ یہ ان کی اولاد کے مستقبل کا سوال تھا۔ ورنہ سونیا نے

علیحدگی کی دھمکی دی تھی۔

* * *

عجیب سی بے چینی تھی، جو اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اے سی کی خنکی کے باوجود پسینے میں نہائے جا رہی تھی۔ اچانک لگا، دم گھٹ رہا ہے۔ کمرے میں آکسیجن کم ہے۔ اس نے گردن موڑ کر پاس سوئی پھوپھو کو دیکھا۔ وہ منہ کھولے ہولے ہولے خراٹے لے رہی تھیں، وہ اٹھ بیٹھی۔ دو گھونٹ پانی پیا، پھر چپل پہن کر باہر نکل آئی پھر کمر پر ہاتھ رکھے ہولے ہولے چکر لگانے لگی۔

اوائل جون کی رات تھی، مگر خوش گوار......اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آدھے چاند کو دیکھا، جو تھا تو ادھورا مگر بے حد روشن تھا۔

کتنے موسم بیتے۔

ساون، پت جھڑ، سرما اپنی گلابی ٹھنڈک بانٹ کر چلا گیا۔

اب پھر سے وہی موسم ہے، جب تم لوٹ کر آئے تھے۔

جب تم نے مجھے اپنا بتایا۔

میرے ادھورے وجود کو اپنی روشنی سے بھر دیا۔

"اب آ جاؤ پھر سے آ جاؤ، درد کے اس صحرا کو میں اکیلے کیسے پار کر پاؤں گی۔"

اس کے وجود میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس پورے عرصے میں ذکی کے فون متواتر آتے رہے تھے مگر انہوں نے کبھی گل کا حال نہ پوچھا تھا۔ ان کی ساری فکریں اپنے بچے کے گرد گھومتیں اور آخر میں کہتے۔

"میری امانت کا خیال رکھنا۔"

گل کا جی چاہتا! وہ کبھی تو پوچھے۔ "میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ تمہاری زندگی میں میری حیثیت کیا ہے؟"

مگر سارے سوال اندر ہی سر پٹختے رہ جاتے، اسے سوال جواب کی عادت ہی کہاں تھی۔

کبھی لگتا یہ گزرا وقت اک حسین خواب کے سوا کچھ بھی نہیں، ابھی آنکھ کھلے گی اور......وہ سہم جاتی۔ مگر اس کے باوجود میں ہوتی آہٹیں بتاتیں یہ سپنا نہیں حقیقت ہے۔

درد کی اک لہر اٹھی، اس نے لب بھینچ کر دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ایک پل کو لگا اک بھاری گرم ہاتھ اس کی پیشانی پر آ رکا ہو۔

وہ ہلکا سا مسکرائی لیکن......

درد کی انتہا پر اس نے خدا کے بعد اسی کو پکارا تھا۔

پھوپھو ہڑبڑا کر جاگیں۔

* * *

ابرار کے لئے وہ ننھا سا وجود عجیب کشش رکھتا تھا۔ وہ بار بار اپنی انگلی سے اس کی آنکھ کی پتلی چھو کر دیکھنا چاہتا۔ وہ خود اس کے گلابی روئی سے پیروں کو گدگدا کر خوش ہو رہی تھی۔ فیضان کے بیٹے کی تو صرف تصویریں دیکھنے کو ملی تھیں، مگر یہ جیتا جاگتا کھلونا تو سب کے ہاتھوں میں سفر کر رہا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں لے کر بیٹھنا چاہتا، بڑی امی شکرانے کے نفل پڑھتے نہ تھکتیں، انہیں لگتا ان کی بیٹی، ماں بن کر معتبر ہوگئی ہے۔ پھوپھو پورے خاندان میں مٹھائی بانٹ رہی تھیں۔ آخر ان کا پہلا پوتا اور اللہ تعالیٰ نے پورے دس سال کے بعد نوازا تھا۔ ذکی بھائی کو اسی وقت فون کیا گیا۔ نیٹ پر بچے کی تصویریں بھیجی گئیں۔ عاشر کو سب سے پہلا بیلا کا پیغام ملا کہ وہ چچا بن گیا ہے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر پہنچ جائے۔ ذکی کی بھی یہ ہی کیفیت تھی۔ انہوں نے گل سے بھی بات کی اور پہلی دستیاب فلائٹ سے آنے کا وعدہ بھی۔

* * *

فہد نے واپس آ کر پاکستان میں ہی جاب شروع کی تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ زیبا نے کورسز ادھورے چھوڑ کر شادی کی تیاری شروع کر دی۔ وہ اپنے ملبوسات خود ڈیزائن کر رہی تھی۔ سو مصروف تھی۔

کہاں ذکی کہتا تھا کہ بس بھاگا آ رہا ہوں اور کہاں تین ماہ گزر گئے، آنے کا نام ہی نہیں۔ بیلا ابھی ابھی آئی تھی، بیگ جرنل ایک طرف رکھ کر جوتے اتارنے لگی۔

”باہر کے سو بکھیڑے، اب ہم ان چکروں کو کیا جانیں۔“ بڑی امی بس اسی بات پر راضی تھیں کہ بیٹی شادی شدہ بھی تھی اور اولاد والی تھی۔ اس سے آگے وہ سارے سمجھوتے بخوشی کرنے کو تیار تھیں۔ بیلا ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں چلتی گل کے کمرے میں چلی آئی۔ واپس آ کر جب تک صائم کو نہ دیکھ لیتی، چین نہ پڑتا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”ارے، تم کب آئے؟“

وہی بے ساختہ خوشی جو عاشر کی ساری تھکن مٹا دیتی۔ وہ جو منے کو سینے پر لٹائے، اسے گدگدا رہا تھا، سیدھا ہو بیٹھا۔ بیڈ پر وہ تمام کھلونے بکھرے تھے جو وہ صائم کے لیے لایا تھا۔

”اس بار کتنے مہینوں کے بعد آئے ہو۔“

”بہت ٹف ڈیوٹی ہے محترمہ! چھٹی بالکل نہیں ملتی۔“

”تم تو کال بھی ریسیو نہیں کرتے۔“

”بتایا نا...... تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ صائم کے ننھے منے ہاتھوں کو تھام کر تالی بجوا رہا تھا اور صائم کھلکھلا رہا۔ بیلا پاس بیٹھ کر دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

”وہ ہی کچھ، تمہیں اپنا بھتیجا کیسا لگا؟“

”یہ میرا تمہارا کیا ہوتا ہے۔“ عاشر نے جس لہجے میں پوچھا، بیلا شرمندہ سی ہوگئی۔

”باری! میرے پاس آؤ، کہو آنی گندی ہے، چاچو چاکلیٹ دے گا۔“ ابرار نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ آنی کا چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا اور چاچو کبھی کبھار نظر آنے والا چاند، سو وہ آنی سے لپٹ گیا۔

”دیکھا جو ہم سے پیار کرتے ہیں، وہ پارٹی نہیں بدلتے۔“ وہ اترائی۔

”بدل کر جائیں گے کہاں؟“ عاشر بڑبڑایا۔ تب ہی صنوبر واش روم سے باہر نکل آئی۔

بیلا آ گئی ہو، کھانا کھالیا؟ جیسے سوال کرنے لگی، عاشر نے محسوس کیا، گل اب پہلے کی طرح گم صم نہیں رہتی تھی۔ اس کی شخصیت میں اعتماد کی جھلک دکھائی دیتی۔ ضرورت کے مطابق اچھے طریقے سے بات چیت کرتی۔

”میں صائم سے ملنے آئی تھی، یہ تو چاچو کی گود سے ہی نہیں نکل رہا۔“

”میں کھانا گرم کرتی ہوں، تم دونوں آ جاؤ۔ عاشر نے بھی نہیں کھایا۔“ وہ باہر نکل گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے بیلا نے عاشر کو گزرے تمام دنوں کی روداد سنائی۔ اس نے کھانا کم کھایا اور بیلا کو سنا اور دیکھا زیادہ تھا۔ لیکن اس کے دیکھنے میں اتنی سادگی تھی کہ بیلا کو کبھی کچھ خاص محسوس ہی نہ ہوا۔

یہ ہی چہرہ ہے، میری محبت کا خوب صورت چہرہ، جو پُرخطر گھڑی میں مجھے زندگی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

یہ ہی آواز ہے، میری محبت کی آواز، جو ہر تاریکی میں روشنی بن کے لپکتی ہے۔

اے خدا! میری محبت کا چہرہ یوں ہی جگمگاتا رہے۔

اس کی آواز کی خوشبو یوں ہی میرے وجود کے گرد اپنا حصار باندھے رکھے۔ جدائیوں کی خلیج کبھی ہمارے درمیان حائل نہ ہونے پائے۔

”میں پوچھ رہی ہوں، تمہارا ذکی بھائی سے کوئی رابطہ ہے یا نہیں۔ چار ماہ ہوگئے ہیں۔ وہ آ کیوں نہیں رہے۔“

"میرا خیال ہے تم تصور میں زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔" وہ بھنا کر بولا۔
"اس بات کا مطلب؟" بیلا نے چمچہ پٹخ کر گھورا۔
"کچھ نہیں۔ آج فون کرتے ہیں بھائی کو۔" عاشر نے بدمزا سا ہو کر پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

* * *

نومبر کی رعنائیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ وہ ایک خوب روشن اور چمک دار سا دن تھا۔ بڑی امی نے صائم کو نہلا دھلا کر سفید کڑھائی والا کرتا پاجامہ پہنا کر پرام میں بٹھایا تھا۔ اب وہ خوب آوازیں نکالتا' ہنستا' مانوس چہرے دیکھ کر کلکاریاں مارتا۔ سیفٹی بیلٹ لگا کر وہ فیڈر لینے کچن میں چلی گئیں۔ وہ اپنے سامنے اک اجنبی چہرہ دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر جھک کر ہولے سے اس کے گلابی پھولے پھولے گالوں کو چھوا۔ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ ان کا اپنا بیٹا ہے اور وہ اتنے ماہ اس سے دور کیسے رہ لئے۔ صائم کھلکھلا اٹھا۔ انہوں نے بے اختیار اٹھا کر اسے سینے میں بھینچ لیا۔ اندر باہر لگی آگ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسی۔
"ذکی ......" اپنی دھن میں باہر آتی بڑی امی ٹھٹک کر رکیں۔ آن واحد میں سب گھر والے جمع ہو گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ ساتھ شائستہ بھی آئی تھی۔ پھوپھو نے وہیں ان کے لتے لینے شروع کر دیئے۔ صنوبر نہا کر نکلی تھی۔ جب بیلا نے اطلاع دی۔ گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے وہ تھم سی گئی۔ پھر تولیہ ایک طرف رکھ کر سر پر دوپٹہ لیتی باہر آ گئی۔ پہلی نظر شائستہ پر پڑی اور شائستہ کی اس پر' شائستہ ٹھٹک سی گئی۔
یہ کیسی روشنی اور ملاحت تھی جو گل کے چہرے کو تابناکی بخش رہی تھی۔ کیا ماں بننے کا فخر و غرور ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو سر تا پا بدل دے۔
گل ذکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"کیسے ہیں؟"
"ہوں ......ٹھیک ہوں۔" نہ جانے کیوں جواب دیتے ہوئے وہ نظریں چرا گئے۔
بیلا نے کچھ حیرت سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔

* * *

"یہ کیا پہن رہی ہیں؟" بیلا نے اس کے ہاتھ سے براؤن سوٹ لے کر ایک طرف رکھ دیا اور خود وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سرخ' کڑھائی والا سوٹ نکال لیا' جس کے

دوپٹے پر بہت خوبصورت بیلیں کڑھی ہوئی تھیں۔
"آپ یہ پہنیں گی' ہر وقت رب کو راضی کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ آخر وہ بھی آپ کے مجازی خدا ہیں۔"
"پگلی ......اگر رب راضی ہو جائے تو......"
"میں کچھ نہیں سنوں گی۔ اتنے عرصے کے بعد ذکی بھائی آئے ہیں 'آپ بن سنور کر رہا کریں اور ہاں یہ پیغام میرا نہیں' آپ کی ساس کا ہے۔" اس نے صائم کو گود میں بھر لیا۔
"اسے لے جا رہی ہوں' آپ اچھی طرح تیار ہو کر آیئے گا۔" وہ تیز تیز کہتی باہر نکل گئی۔ گل نے کپڑے اٹھا کر دیکھے' پھر ڈریسنگ روم میں چلی گئی' ذکی بھائی' صائم کے لیے بہت سامان لائے تھے۔ شائستہ دو دن یہاں رکی' پھر اپنے میکے چلی گئی۔
"تم گل کے لئے کیا لائے ہو۔" نہ جانے کیوں ماں نے ایسا سوال کیا تھا۔ ذکی گڑبڑا سے گئے۔ کتنی عجیب بات تھی' صائم کے لیے بہت کچھ خریدتے ہوئے ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ انہیں گل کے لیے بھی کچھ خریدنا چاہیئے۔ وہ ان کی بیوی ہی نہیں بچے کی ماں بھی تھی۔
ماں کچھ لمحے بیٹے کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر ایک طویل سانس لے کر اٹھیں۔ الماری کھول کر ایک سرخ کیس نکالا' پھر ذکی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔
"یہ صنوبر کو دے دینا' مت بتانا کہ میں نے دیا ہے۔" ذکی نے کھول دیکھا' وہ اک خوب صورت لاکٹ سیٹ تھا۔
"ذکی! دو بیویاں بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ ان میں انصاف اور توازن رکھو' پھر گل تو تمہارے بچے کی ماں بھی ہے۔ اس کا پلڑا یوں بھی بھاری ہے۔ بیوی کی حیثیت سے نہیں تو صائم کی ماں کی حیثیت سے اسے توجہ اور مان دو۔ ٹھیک ہے اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے' مگر مجھے میرے بھائی کے سامنے تو شرمندہ مت کرو۔"
وہ سرخ کیس پر نظریں جمائے خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔
"جاؤ' اسے دے دو' صائم کو میرے پاس بھجوا دو۔"
وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتے اپنے بیڈ روم میں آئے۔ صائم وہاں نہیں تھا اور گل آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے بال سلجھا رہی تھی۔ دوپٹہ بیڈ پر پڑا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی اس کا جسم بے ڈول نہیں ہوا تھا۔ سرخ رنگ میں گوری رنگت دمک رہی تھی۔ گل نے آئینے میں ذکی کا عکس دیکھا۔ کچھ جھینپ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے کو مڑی' مگر بغیر دوپٹہ اٹھائے سیدھی ہو کر ذکی کو دیکھنے لگی۔

وہ اس کے شوہر تھے مگر یوں نظریں پھیرے کھڑے تھے۔ گویا وہ ان کی بیوی نہیں کوئی نامحرم ہو' حالانکہ وہ بہت مہینوں کے بعد مل رہے تھے اور ایسا پہلی بار نہ تھا۔ وہ جب سے لوٹے تھے' اس سے یوں ہی کترا رہے تھے۔ بیڈ روم میں ہوتے تو صائم میں کھوئے رہتے۔ کوئی صائم کو لے جاتا تو خود بھی بدک کر بھاگتے۔

گل کی چھٹی حس جاگنے لگی۔

اس نے ذکی کو بہت انتظار کے بعد پایا تھا۔ اب کھونے کی ہمت نہ تھی۔

وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیسی لگ رہی ہوں۔" یہ اس کی سرشت نہ تھی۔ مگر سامنے کھڑا شخص کوئی غیر نہیں اس کا شوہر تھا۔

"ہوں۔" ذکی نے نظریں اٹھا کر اسے بس ایک ہی پل کو دیکھا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا کیس اس کی سمت بڑھا دیا۔

"یہ تمہارے لئے لایا تھا۔"

گل نے نظریں جھکا کر دیکھا۔ اس کے اور ذکی کے بیچ صرف ایک کیس کا فاصلہ تھا۔ اگر وہ یہ فاصلہ خود سے پاٹ دے' گل کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔ اس نے ڈبہ پکڑ لیا مگر...... ذکی تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئے تھے۔

وہ ششدر سی کھڑی ڈبے کو گھورتی رہی۔

پھر اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

نہ جانے کیوں؟

* * *

"مجھے تو لگتا ہے' مجھ سے پہلے تم پیا دیس سدھار جاؤ گی۔" جھنجلائی ہوئی زیبا کمرے میں داخل ہوئی تو بیلا نے رسالہ رکھ کر اس کی سمت دیکھا۔

"اب فہد صاحب نے شادی چند ماہ لیٹ کر دی تو اس میں میرا کیا قصور۔"

"اٹھو' ٹھیک ٹھاک ہی ہو' اٹھ کر مل لو۔"

"کس سے؟"

"اپنی ہونے والی ساس سے۔"

"ہائیں۔" وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ "میں ہاتھ منہ دھولوں۔"

"بکواس مت کرو' وہ بیٹھی ہیں' سر تیمور کی والدہ محترمہ۔"

"ارے...... انہیں تو تم نے......"

"بھگا دیا مگر انہیں پتا چلا کہ تم اب تک سنگل ہو' تو قسمت آزمانے کو اماں بھیج دی۔"

"تو تم کیوں جل بھن رہی ہو۔" وہ کھکھلائی۔ آئینے کے سامنے بال ٹھیک ٹھاک کیئے۔ کپڑے تو تھوڑی دیر قبل ہی نہا کر تبدیل کیئے تھے پھر گنگناتی ہوئی کچن میں سنعیہ بھابی کے پاس چلی گئی' جو مہمانوں کے لیے چائے کا بندوبست کر رہی تھیں۔ جبکہ زیبا سر پکڑ کر رہ گئی۔

"یا اللہ! کیسی بے خبر لڑکی ہے۔"

مہمانوں کے جانے کے بعد گھر والے سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔ کیونکہ سر تیمور کی والدہ باقاعدہ رشتہ ڈال گئی تھیں۔ ظاہر ہے جب بیٹا ہی راضی تھا تو انہیں کیا اعتراض ہوتا۔

عاشر کو زیبا نے فون کیا تھا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے' تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

"میں جانتی ہوں مگر وہ احمق...... تم نے بھی تو اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کی کچھ سمجھ میں بھی تو آئے' میں نے سوچا تھا اس احمق اور اول جلول سی لڑکی کو کون پسند کرے گا' سوائے میرے۔"

"وہ اول جلول لڑکی اچھی خاصی خوب صورت ہے۔" زیبا نے جتایا۔

"اچھا۔ مجھے تو کبھی نہیں لگی۔" وہ ہنسا۔

"پھر خوامخواہ دل ہارے پھر رہے ہو۔"

"وہ تو بچپن سے اسے دیکھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔"

"خیال رہے' عادتیں بدلی بھی جاسکتی ہیں۔" زیبا نے دھمکی دی۔

"ہاں...... مگر محبتیں نہیں۔" عاشر نے دھیرے سے کہہ کر لائن کاٹ دی۔

"سنو! گھر والوں نے سر تیمور کو کیا کہا۔" شام کو بیلا بڑی راز داری سے زیبا سے پوچھ رہی تھی۔

"بہت جلدی ہے تو کل ہی نکاح پڑھوا دوں؟" زیبا جل بھن کر رہ گئی۔

"ہائے نہیں' تم سے پہلے اچھی لگوں گی؟" وہ شرما گئی۔ زیبا بس مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

گھر میں کچھ دن پُراسرار سرگرمیاں چلتی رہیں۔ باوجود کن سوئیاں لینے کے بیلا کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ پھر پتا چلا سر تیمور کو انکار کر دیا گیا ہے اور ایک شام پھوپھو نے اسے دبوچ کر خوب بلائیں لیں۔ پانچ ہزار ہاتھ پر رکھے۔ مٹھائی منہ میں ٹھونسی...... وہ نوٹ ہاتھ اور مٹھائی منہ میں لئے ہکا بکا سب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

* * *

"مجھے لگتا ہے میں دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوں۔" بیلا نے کان سے موبائل ہٹا کر گھورا...... عاشر کی اس ٹون کو ہضم کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

"اچھا......" بیلا کو گویا شک تھا۔

"بیلا! تم خوش ہو۔"

"ہاں بہت۔" اس نے عاشر کی تسلی کے لیے کہہ دیا۔

"لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔" وہ پورے وثوق سے بولا۔

"ہاں......تم تو تھوڑا تھوڑا کھسکے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"بیلا! تم نیند میں ہو؟" کچھ چپ رہنے کے بعد عاشر کو پوچھنا پڑا۔

"نہیں...... نہیں...... میں تو پوری طرح جاگ رہی ہوں۔" اس نے بدقت جمائی روکی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اچھا خاصا خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی' جب عاشر کی کال آئی۔

"بیلا! چاند کیا کہہ رہا ہے۔"

"چاند......" بیلا نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ چودھویں کا چاند عین دیوار پر کسی چوڑے تھال کی طرح پڑا تھا۔ "کانسی کا ایسا تھال جسے اچھی طرح مانجھا نہ گیا ہو...... اف بیلا کی بچی! بری پھنسی' زیبا کے موبائل سے چند رومانٹک اشعار ہی چرا لیتی۔ ساری زندگی تو عاشر کو عاشر سمجھ کر بات کی' اب منگیتر سمجھ کر بات کیسے کروں۔"

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے' کچھ نے کہا چہرہ تیرا

"ہائے اللہ! ایسا داغ دھبوں سے بھرا چہرہ...... عاشر! لگتا ہے تم نے مجھے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔" وہ بدک کر بولی۔

"میں نے تو ساری عمر تمہارے سوا اور کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ پتا ہے جب تم پالنے میں تھیں......"

"پالنے میں؟" وہ چلائی۔

"مطلب...... جب تم پاؤں پاؤں......"

"گویا تمہاری نیت بچپن سے ہی خراب تھی۔"

"تم چپ کر کے اظہار محبت نہیں سن سکتیں؟"

"تم نے ہی پالنے اور پاؤں پاؤں چلنے کا ذکر شروع کر دیا۔ گویا کسی پیمپر کا اشتہار ہو۔"

"تم انتہائی بے ہودہ لڑکی ہو اور جب میں نے کتاب، میں پھول رکھا تو......"

"اچھا تو وہ فضول حرکت تمہاری تھی؟"

وہ ایک پل کو بالکل خاموش ہو گیا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بیلا! میرا دل چاہتا ہے' سامنے والی دیوار سے سر ٹکرا دوں۔"

"تمہارے پاس بینڈیج کا سامان تو ہے نا۔" اس نے ازراہِ احتیاط دریافت کیا۔

"بیلا! میں جا رہا ہوں۔"

"ٹکر مارنے؟"

"اوہ یو شٹ اپ۔"

"اچھا عاشر! غصہ مت کرو۔ وہ ایسا ہے کہ میں بچپن سے تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتی آئی ہوں۔ اب ایک دم منگیتر کی حیثیت سے تمہاری رومانٹک گفتگو مجھے ہضم نہیں ہو رہی' اب تھوڑا ٹائم تو......"

"گڈ نائٹ بیلا! اور ہو سکے تو اس رشتے کی خوب صورتی اور لطافت کو محسوس کرنے کی کوشش کرنا۔"

لائن کٹ گئی تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پھر عقب میں جھولے پر سر ٹکا کر پورے چاند کو دیکھنے لگی۔ خنک ہوا میں موتیا و چنبیلی کی باس گھلی ملی تھی۔ خوشبوؤں سے بوجھل رات ہولے ہولے سرگوشیاں کرنے لگی' وہ ہولے سے مسکرائی۔

"میں اتنی بھی بے وقوف نہیں عاشر صاحب کہ اس رشتے کی لطافت و خوب صورتی کو محسوس نہ کر سکوں۔"

اس نے نظروں کا زاویہ بدلا تو نگاہوں میں کھلی کھڑکی میں ایستادہ وجود آ گیا۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

"ذکی بھائی! نیند نہیں آ رہی۔" اس نے ننگے پاؤں نیچے گھاس پر رکھے۔ وہ کچھ نہیں بولے' البتہ کھڑکی سے ہٹ گئے تھے۔ بیلا الجھ سی گئی۔

* * *

"امی! آپ کو نہیں لگتا' ذکی بھائی کچھ پریشان اور الجھے ہوئے ہیں۔" بیلا کو عادت تھی' جو دل میں ہوتا فوراً اگل دیتی۔ امی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"سوچتی ہوں' زیبا کے ساتھ اس کی بھی شادی کر دوں۔" سب نے اس غیر متوقع بات

پر انہیں حیرت سے دیکھا۔

''کم از کم میرے سر سے یہ بلا تو ٹلے۔''

''ہا...... ہا......شادی کے بعد بھی یہ بلا آپ کے سر رہے گی۔ آخر مجھے جانا ہی کہاں ہے؟'' وہ کھلکھلائی' بڑی امی ہنس دیں۔

''بھئی' یہ تو اس گھر کی رونق ہے اور کہتی بھی ٹھیک ہے۔ نہ کوئی ہنسی' نہ مذاق' جب سے آیا ہے یوں ہی سنجیدہ سا اندر باہر پھرتا ہے' حالانکہ بیٹے کی خوشی میں تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے چاہئے تھے۔''

''میں پھوپھو سے پوچھوں گی۔''

''خبردار...... تمہیں کوئی ضرورت نہیں دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔'' امی نے گھر کا۔ ''اور یہ بھی یاد رکھو' تمہارا ان کے ساتھ اب دہرا رشتہ ہے' سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔''

''اسی لئے تو ان کے تمام مسائل کو میں اپنے مسائل سمجھتی ہوں۔'' بیلا اترائی' تو وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

''کیا کروں اس لڑکی کا' زیبا بھی تو ہے' موقع محل' حساب کتاب دیکھ کر بات کرتی ہے' اسے تو پتا ہی نہیں چلتا کون سی بات کہاں کرنا ہے۔''

''اچھا...... وہ کون سا غیروں میں جا رہی ہے' یہیں آنکھوں کے سامنے رہے گی۔''

''اٹھ کر کچن دیکھو' سعیہ اکیلی لگی ہوئی ہے۔'' امی نے حسب دستور اسے مصروف کرنا چاہا۔

''لیکن میری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔'' بیلا کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ماں کے تیور دیکھ کر کچن میں بھاگی اور بڑی اماں کو اور کچھ ہو نہ ہو' بیلا کی باتوں پر یقین ضرور تھا' تب ہی صنوبر کو بلا کر پوچھنے لگیں۔

''ذکی ٹھیک تو ہے' کچھ پریشان ہے' تمہیں کچھ بتایا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں امی! سب ٹھیک ہے۔'' گل نے آہستگی سے کہہ کر بات پلٹی۔

''اللہ کرے' سب ٹھیک ٹھاک ہی رہے۔''

* * *

وہ جھولے پر بیٹھے بالکل خاموش اور کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ ماتھے پر گہری ہوتی شکنیں ان کی پریشان خیالی کی غماز تھیں...... تب ہی ان کا سیل فون گنگنا اٹھا...... انہوں

نے چونک کر اسکرین پر چمکتے نام کو دیکھا۔ پھر اک طویل سانس لے کر آن پر انگلی رکھ دی۔

''تم نے گل سے بات کی......؟'' شائستہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''نہیں' لیکن میں جلد ہی......''

''کیا جلد ہی...... ذکی ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کتنے دنوں سے تم اس کے گھٹنے سے لگے بیٹھے ہو۔ ابھی تک بات نہیں کر سکے۔''

''شائستہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''میں تمہاری بیوی ہوں...... تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہارے لئے کچھ بھی مشکل نہیں' خاص طور پر وہ بات جس میں تمہارا فائدہ ہو' اس کے استہزائیہ لہجے پر ذکی لب بھینچ کر رہ گئے۔

''بہر حال' تم آج ہی اس سے بات کرو...... حتمی اور نتیجہ خیز بات......''

اسکرین بجھ گئی...... مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ شام گرد آلود ہو رہی تھی......

''آندھی آئے گی۔ لڑکیو! سمیٹا سمیٹی کرلو۔'' بڑی امی کی آواز آئی۔ ذکی نے سر اٹھا کر گھرے ہوئے آسمان کو دیکھا۔

''سفیان! ذکی تمہیں بتا کر گیا ہے۔'' ماں کی آواز اوپری صحن سے ابھری۔ وہ اٹھے اور چوروں کی طرح کچن کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔

''فہد کی امی کا فون آیا ہے کہہ رہی تھیں شادی کی تاریخ طے کر لیں۔'' وہ سب کی نظروں سے بچ کر اوپر جانا چاہتے تھے۔

''امی! پہلے دروازے کھڑکیاں بند کر لیں۔'' بیلا کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ گل بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ انہیں دیکھا تو دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

''طوفان آنے والا ہے۔'' بلا ارادہ ذکی کے منہ سے نکلا۔

''ہاں...... آندھی کے آثار ہیں۔ کھڑکی تو بند کر دیں۔''

ذکی نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی...... کچھ لمحے متذبذب سے بند کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے۔

''آپ کچھ پریشان ہیں۔'' گل کو پوچھنا ہی پڑا۔

''ہوں' نہیں۔'' ان کے اندر سگریٹ کی طلب اٹھی۔ جسے دباتے ہوئے وہ اس کے قریب آ بیٹھے...... گل سمٹ سی گئی۔ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے اس کا سر ہٹاتے ہوئے قمیض برابر کی...... ذکی آہستہ آہستہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

گل کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ یوں اس کے قریب بیٹھے تھے۔ تب ہی انہوں نے اچانک پوچھا۔

"گل! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟"

گل کی سمجھ میں نہ آیا وہ کون سا پیمانہ ہو' جس سے وہ اپنی محبت ناپ کر بتا سکے۔ ذکی نے آہستگی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"بہت۔" گل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"محبت قربانی مانگتی ہے۔" انہوں نے ایک بازو پھیلا کر اسے خود سے اور قریب کر لیا۔

"کیسی قربانی؟" گل کا دل دہل سا گیا۔

"دے سکو گی؟" ذکی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیسی قربانی؟" گل نے دہرایا...... اس کا لہجہ اور آنکھیں دونوں خوف زدہ تھیں۔

"صائم مجھے دے دو......"

بہت زور کی آندھی اٹھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ اک آواز سے کھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔

"مجھے اور شائستہ کو...... یہ وہاں امریکہ میں پلے گا...... وہاں کی نیشنلٹی ملے گی...... کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ اس کا بہتر مستقبل......"

"اور میں......" گرد کا طوفان بیڈ روم میں گھس کر ہر شے کو آلودہ کرنے لگا۔

"تم دوبارہ ماں بن سکتی ہو...... صائم کے بعد اور بچے بھی ہوں گے...... میں آتا جاتا رہوں گا۔"

گل نے بے یقینی سے ذکی کو...... پھر سر جھکا کر گود میں سوئے بچے کو دیکھا اور اسے ایک دم سے سینے میں بھینچ لیا...... اور تیزی سے دور ہٹ گئی۔

کوئی...... اپنا کلیجہ نوچ کر کسی دوسرے کو دے سکتا ہے......؟ پھر ایک ماں سے اس کی اولاد۔ یہ کیسا سنگ دل انسان تھا...... وہ لب بستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"خدا کے لیے گل...... تمہیں تو اللہ سے بہت محبت ہے' اسی کی خاطر۔ ہماری طرف دیکھو۔ ہم نے اک طویل عرصہ اولاد کے لئے ترستے ہوئے گزارا ہے...... تم عورت ہو' اس عورت کی محرومی محسوس کرو' جو کبھی ماں نہیں بن سکتی...... تمہیں اللہ اور اولاد دے گا۔ یہ بچہ ہمیں دے دو...... میں اس کے بدلے' تمہیں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں...... تم کہو تو یہ گھر تمہارے نام کر دوں...... اس گھر میں جو حصہ ہمارا ہے' وہ میں تمہیں دے دوں گا اس کے علاوہ بھی......"

وہ فریاد کر رہے تھے...... رو رہے تھے اور گل کا دل چاہ رہا تھا۔ اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر یہاں سے دور بھاگ جائے...... اسے ذکی سے گھن سی آئی۔ وہ اس کا بچہ خریدنا چاہتے تھے۔

"گل!" انہوں نے گل کا پلو پکڑ لیا...... "تم مجھ سے محبت کرتی ہو...... تمہیں اسی محبت کا واسطہ...... اپنے ذکی کو مایوس مت کرنا۔"

"ذکی! چلے جاؤ۔" وہ بچے سمیت بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ ذکی کے ہاتھ سے اس کا پلو چھوٹ گیا۔ وہ کچھ لمحے چہرہ جھکائے یونہی بیٹھے رہے پھر آہستگی سے سر اٹھایا تو چہرے کے تاثرات جامد تھے اور بولے تو آواز میں بلا کا ٹھہراؤ۔

"ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابلہ آ کھڑے ہوئے...... گل سہم کر پیچھے ہٹی۔

"شائستہ نے مجھے تم سے شادی کی اجازت صرف اسی شرط پر دی تھی کہ میں تمہارا پہلا بچہ اس کی گود میں ڈالوں گا۔ اب یہ نہیں ہوا...... تو میں پاکستان میں نہیں رہتا ہوں کہ جہاں ایک وقت میں دو دو بیویاں رکھ سکوں۔ وہ میرے خلاف کورٹ میں بھی جا سکتی ہے...... بلکہ جائے گی...... سو میرے پاس اس کے سوا اور کوئی آپشن نہیں کہ تمہیں طلاق دے دوں......"

انہوں نے اتنے آرام اور سکون سے کہا' گویا طلاق نہیں کوئی نیا سوٹ دلانے کی بات کر رہے ہیں۔ گل دم بخود ٹکر ٹکر ذکی کا چہرہ دیکھتی رہی...... ہواؤں کی شوریدہ سری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ گل کو لگا تیز ہوا اسے اڑائے لے جا رہی ہے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہواؤں میں بکھر رہا تھا اور وہ دم بخود کھڑی تھی۔

"اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بچے کی لیگل کسٹڈی کا کیس کر دوں گا...... کب تک اسے اپنے پاس رکھو گی...... آخر کو اسے میرے پاس ہی آنا ہے۔ فیصلہ تمہارا ہے...... اب دو گی یا طلاق کے بعد......"

گرد سے گل کی آنکھیں اٹ گئیں۔ اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں......

بچہ اس کی گود میں زور سے کسمسایا۔

* * *

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا کھا کر اس سانپ کو جنم دیا تھا...... جو اپنے ہی گھر میں نقب لگانے سے باز نہ آیا۔ اپنے ہی خونی رشتوں کو ڈستے ہوئے اسے ذرا حیا نہ آئی۔"

"کیسا بے غیرت و بے حس انسان ہے۔ اک ماں کی گود سے بچہ چھین کر لے گیا۔"

ہر کوئی بپھرا ہوا تھا...... ذکی سامنے ہوتے تو نہ جانے کیا کر ڈالتے...... پھوپھو گل سے ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہی تھیں...... حالانکہ اس پورے قصے میں ان کا ذرا بھی ہاتھ نہ تھا۔ انہیں تو رتی بھر خبر نہ تھی کہ بیٹا کیا کچھ سوچ بیٹھا ہے۔ بھنک بھی پڑ جاتی تو کیا ایسا ہونے دیتیں؟

شائستہ اور وہ دونوں ہی غائب تھے اور ان کے موبائل بھی بند تھے۔

"کیوں کیا...... گل! تو نے کیوں اپنا بچہ اسے دے دیا...... ارے کچھ ہمیں بتایا ہوتا۔ آواز تو دی ہوتی...... کیسے اپنا کلیجہ نکال کر اپنی سوکن کو سونپ دیا...... گل! تو انسان ہے یا پتھر......" بڑی امی اسی کو دوہتڑ مارنے لگیں...... جو یوں چپ اور گم صم تھی...... گویا نہ کچھ دیکھتی نہ سنتی اور اس کی چپ سے سب کو خوف آ رہا تھا۔ صبح معمول کے مطابق ہی ہوئی تھی۔ گھر کی خواتین نے رات کی آندھی کی وجہ سے اٹھتے ہی دھلائیاں شروع کر دی تھیں۔ پھوپھو نے تشویش سے گل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ گل نے فجر کے وقت اٹھ کر کمرے کا دروازہ نہ کھولا ہو۔

"ابھی تک سو رہے ہیں۔" وہ فکر مند تو تھیں' مگر کچھ سوچ کر مسکرا دیں۔ تھوڑی دیر میں بیلا اوپر آئی اور آتے ہی دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ صائم کو دیکھے بنا اس کی صبح ہی کہاں ہوتی تھی۔ دروازہ لاک نہ تھا کھلتا چلا گیا وہاں نہ صائم تھا نہ ذکی بس گل کسی بے جان مجسمے کی طرح بیٹھی تھی...... بیلا کے بار بار جھنجھوڑنے پر اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

"وہ صائم کو لے گیا۔"

"کیوں اس بدنصیب کو ستاتی ہو۔ میرا بیٹا ہی ذلیل اور کمینہ نکلا کاش! وہ واپس ہی نہ آیا ہوتا۔" پھپھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بڑے ابا بے جان سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"لیکن ہم یوں خاموش ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتے...... ہم اس کے خلاف کیس کریں گے ابو...... وہ اتنے چھوٹے بچے کو ماں سے الگ نہیں کر سکتا......" سفیان بہت غصے میں تھے۔

"گل بیٹا! اس نے تم سے کچھ کاغذ وغیرہ تو سائن نہیں کروائے۔" چھوٹے ابو بار بار پوچھ رہے تھے۔ گل نے باری باری اپنے پیاروں کے پریشان چہروں کو دیکھا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے باہر نکلی۔ دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھا اور سائیڈ سے جائے نماز اٹھا کر بچھانے لگی...... وہ سب جو کون سے وکیل سے مشورہ کریں' ڈسکس کر رہے تھے۔ ایک دم چپ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

پھپھو اپنی جگہ لرز کر رہ گئیں۔

گل نے اپنا مقدمہ رب کے حضور پیش کر دیا تھا۔

* * *

حبس زدہ دنوں کا سلسلہ تھا۔ اداسی گھر کی دیواروں پر مکار بلی کی طرح پھسکڑا مارے بیٹھی رہتی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتا...... کبھی کبھی بڑی امی ضبط نہ کر پاتیں تو سسکیوں سے رونے لگتیں اور بیلا بے حسی سے سوچتی۔

"انہیں تو اور رونا چاہئے۔"

وہ سب کو گل کا مجرم سمجھتی تھی...... ان سب نے مل کر گل کو برباد کیا تھا...... نہ جانے اسے کس کس پر غصہ تھا کہ سب کام چھوڑے بیٹھی تھی اور پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی...... سنا تھا' ذکی کا فون پھپھو کے پاس آیا تھا...... بہت معافی تلافی کر رہے تھے...... پتا نہیں پھپھو نے کیا کہا۔ بیلا کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا...... جو ظلم ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کیسی معافی اور تلافی تو ممکن ہی نہ تھی۔

گل کئی دن بے حس و حرکت جھولے پر پڑی رہی...... بہت دن بخار ہی نہ اترتا تھا...... اس کے اندر رزق کا دریا خشک ہو کر صحرا ہو گیا تھا۔

"اب وہ ڈبے کا دودھ پیتا ہوگا۔" وہ اپنے خشک سینے پر ہاتھ رکھ کر ہوکتی۔

"کیا وہ شائستہ کو دیکھ کر اسی طرح ہمکتا ہوگا...... جیسے مجھ دیکھ کر۔"

"پتا نہیں وہ اسے شہد بھی چٹاتی ہوگی یا نہیں۔"

قریب ہی آہٹ ہوئی پھر بیلا کی آواز آئی۔

"آپی! کھانا کھالیں۔"

"یہ سب لوگ مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"

گل نے بے حد چڑ کر سوچا مگر خاموشی سے اٹھ بیٹھی۔ بیلا نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔ شملہ مرچ اور قیمے کا سالن تھا۔ کھیر کی پلیٹ' سلاد رائتہ...... اس نے بے دلی سے نوالہ بنایا۔

"آپی! آپ نے صائم ان کو کیوں دیا۔" اس کا جواب مل کے ہی نہ دیتا تھا۔

"جاؤ...... بیلا! میرے لئے کھانا مت لایا کرو۔ بھوک ہوگی تو کچن سے لے لوں گی۔"

بیلا کے لاکھ اصرار پر بھی اس نے دوسرا نوالہ نہ توڑا۔ وہ پچھتاتی ہوئی ٹرے کچن میں پٹخ کر کمرے میں آ گئی۔

"بے وقت تذکرہ چھیڑ دیا۔"

"ہر وقت جھنجلاتی رہتی ہو۔ اس طرح صائم واپس آجائے گا؟" زیبا نے ٹوکا۔ اس کے جواب دینے سے قبل ہی بیڈ پر پڑا اس کا موبائل بجنے لگا۔

"عاشر! بار بار کال کررہا ہے۔" زیبا غالباً پہلے ہی اس کا نام پڑھ چکی تھی۔ بیلا نے موبائل اٹھا کر آف کیا اور الماری میں ڈال دیا۔ زیبا نے تعجب سے بیلا کے اس طرزِ عمل کو دیکھا۔

"تم عاشر کو کیوں اگنور کررہی ہو۔" بیلا نے جواب نہیں دیا۔ مڑ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"اس کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہوگیا ہے۔" زیبا زیر لب بڑبڑائی پھر اپنے موبائل سے عاشر کا نمبر ملانے لگی۔

* * *

کوئی کب تک بیٹھ کر ایک دکھ کو روئے ...... انسانی فطرت ہے۔ سو سب ہی دھیرے دھیرے اپنی اپنی زندگیوں کی طرف پلٹنے لگے۔ اب یہ تو ماں کا دل جانتا ہوگا جس نے اپنی نیندیں اپنے لختِ جگر کی کاٹ میں رکھ دی تھیں اور اب دن رات مصلّی پر بیٹھی اپنے رب سے مناجات کرتی تھی۔

سنا تھا کہ ذکی نے گل سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا' مگر اس نے انکار کردیا...... اب کوئی بھی پچھتاوا اس کے لگائے زخم کو سکون نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے الفاظ گل کے سینے میں انی کی طرح گڑے تھے۔ اس نے ذکی سے محبت کی تھی اور ذکی نے اسے صرف استعمال کیا تھا۔

"کیا رشتوں کو بھی چیزوں کی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟" عاشر کو چھٹی نہیں ملی تھی۔ مگر گل کے لئے بے حد دکھی تھا۔ اوپر سے بیلا کی بے رخی' جو موبائل بند کرکے اسے یکسر نظر انداز کررہی تھی۔

"آخر وہ چاہتی کیا ہے......" اس نے جھنجلا کر زیبا سے پوچھا۔

"ذکی بھائی کا غصہ تم پر نکال رہی ہے۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو ٹھیک ہوجائے گی۔" زیبا نے تسلی دی۔

"فہد کے والدین تاریخ طے کرنا چاہتے ہیں۔"

بڑی امی نے بڑے ابو سے کہا۔ رات کے کھانے پر سب ہی موجود تھے...... بڑے ابو کی نظریں بے اختیار گل کی طرف اٹھیں...... گل نے بغیر نظریں اٹھائے بہ آہستگی سے کہا۔

"بلالیں ابو...... کب تک ٹالیں گے۔"

"ہوں۔" انہوں نے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

"اتوار کو بلالیں......" انہوں نے گویا سہارا دیا۔ پھپھو نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا' پانی کا گلاس بھرا...... ذرا سا کھنکاریں۔

"وہ عاشر چاہ رہا تھا۔ زیبا کی شادی میں اس کا اور بیلا کا نکاح بھی ہوجائے تو۔"

ذکی نے انہیں بھائیوں کے سامنے نکو بنا دیا تھا۔ باقی سب نے صلاح کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیلا نے چمچ اک آواز کے ساتھ پلیٹ میں پٹخا زیبا نے گھبرا کر اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا۔ جسے بیلا نے تیزی سے جھٹک دیا۔

"ابو۔" اس نے سب کو چھوڑ کر براہِ راست باپ کو مخاطب کیا۔ "زیبا کی شادی طے کریں' میری نہیں۔"

"کیا حرج ہے اگر......" پھپھو نے کچھ کہنا چاہا۔ اس نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

"حرج ہے پھپھو! کیونکہ مجھے عاشر سے شادی نہیں کرنا ہے۔"

اس نے صاف لہجہ و آواز میں کہا اور دسترخوان سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سب اپنی جگہ متحیر سے رہ گئے تھے۔

* * *

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا مگر اس کی ناں' ہاں میں نہ بدلی۔ وہ ضدی تو کبھی بھی نہ تھی مگر اب ضد کررہی تھی۔

"تم عاشر کو کھو کر پچھتاؤ گی۔" زیبا نے لتاڑا۔

"میں پا کر پچھتانا نہیں چاہتی۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"سب کو ایک ہی لاٹھی سے کیوں ہانک رہی ہو...... عاشر ایسا نہیں ہے۔"

"اچھا...... کیا گارنٹی ہے۔؟" اس نے طنزاً پوچھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟" زیبا چڑ گئی۔

"تم خاموشی سے اپنی شادی کی تیاری کرو...... میری فکر چھوڑ دو۔" وہ آرام سے اٹھ کر نہانے چل دی۔

"لیکن عاشر میں برائی کیا ہے۔" زیبا نے چلا کر پوچھا۔

"یہی کہ وہ ذکی کا بھائی ہے۔" اس نے دھاڑ سے دروازہ بند کردیا۔ عاشر نے فون پر سنا تو خوب ہنسا۔

"یہ ہنسنے کی بات ہے؟" زیبا نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

"اس کی عقل پر ہنسی آ رہی ہے۔"

"تم یہ سوچو کہ اس کے عقل ٹھکانے کیسے لائی جائے۔"

"فکر نہ کرو...... ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی غصے نے ہر جذبے پر پردہ ڈال دیا ہے...... تھوڑا وقت گزرے گا تو سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگے گا۔ میں بھی اور میری محبت بھی۔"

"گویا تم نکاح کے فیصلے سے دستبردار ہو رہے ہو؟"

"ہونا پڑے گا۔ میں زبردستی اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا خودغرض کہلاؤں گا۔"

"اور اگر وہ......" زیبا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"وہ جذباتی ہے' بے وقوف نہیں...... مجھے اپنے رب اور اپنی محبت پر پورا یقین ہے۔"

"اچھا بھئی' جیسے تم لوگوں کی مرضی' شادی میں تو آؤ گے نا......"

"کوشش کروں گا' چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔ گل آپی کیسی ہیں؟"

"بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہیں" زیبا نے اک طویل سانس لے کر کہا۔

* * *

گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ تیاریاں تو دونوں گھروں میں بہت عرصے سے ہو رہی تھیں۔ پھر بھی چھوٹے چھوٹے کام نکلتے چلے آ رہے تھے...... گل نے کئی سوٹ اپنے ہاتھوں سے کاڑھے تھے...... بس ایک ہی دل دکھائی بات تھی کہ ہر آنے والا مہمان' گل سے بچے کی بابت ضرور دریافت کرتا' پھر تبصرے' حیرانی' وہ کس حوصلے سے یہ سب سہار رہی تھی۔

وہ مہندی کی رات تھی۔

خوشبو بھرا ہنگامہ عروج پر تھا۔ بیلا کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھنے کمرے میں آئی تھی۔ جہاں خواتین جمع تھیں۔

"بھئی! اب بیلا کے بارے میں سوچو...... لڑکیوں کا مناسب عمر میں رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔"

بیلا نے پلٹ کر اس خاتون کو دیکھا' جو اس کی ماں کو گھیرے بیٹھی تھی۔

"جو اللہ کو منظور......" وہ ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھیں...... بیلا کو عجیب سے احساس نے گھیر

لیا۔ اس نے پہلی بار اپنے معاملے کو ماں کے حوالے سے دیکھا تو ندامت سی محسوس ہوئی۔ اس کے انکار انہیں کس مشکل سے دوچار کیا ہے' اس کا احساس بھی اسی لمحے ہوا...... وہ ٹال رہی تھیں اور خاتون کو بیلا کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہ مل رہا تھا۔ بیلا جھنجھلا کر باہر نکلی' تو دروازے میں کسی سے ٹکرا گئی۔

"سنبھل کر یار......"

"تم۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ عاشر کو افسوس سا ہوا۔ اس کا وہ بے ساختہ اظہار آج مفقود تھا۔

"تو بیلا بی بی! میری رسائی ابھی تک آپ کے دل تک نہیں ہوئی۔" عاشر نے سوچا' بیلا کترا کر نکل گئی۔

عاشر خواتین کے گھیرے میں تھا...... مریم اور فرح کے آنے سے شادی کی رونق دوبالا ہوگئی۔ فیضان اور سونیا آ تو نہ سکے مگر زیبا کے لئے بہت سے گفٹس بھجوائے تھے۔ خصوصاً فیضان کو شادی میں شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا' جس کا اظہار اس نے بار بار فون کر کے کیا۔

فون کی بیل پھر سے بج رہی تھی۔

بیلا نے چونگا اٹھایا...... مگر دوسری طرف ذکی تھے...... بیلا کی طبیعت مکدر ہوگئی۔ وہ چونگا رکھنا چاہتی تھی...... مگر ذکی بول اٹھے۔

"پلیز بیلا! فون بند مت کرنا۔"

"میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتی۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "میں تو شروع سے جان چکی تھی' آپ انتہائی خودغرض اور بے حس انسان ہیں۔ نہ جانے گھر والے کس خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔"

ذکی اس کے لہجے کے تنفر پر ایک پل کو خاموش ہو گئے۔ پھر قدرے ناگواری سے بولے۔

"وہ میرا بچہ ہے...... میرے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"اچھا اور گل آپی......؟ اس پورے ڈرامے میں ان کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ صرف بچہ پیدا کرنے کی مشین تھیں۔" وہ پھٹ پڑی۔ "ایک ماں کا کلیجہ نوچتے ہوئے آپ کو ذرا بھی خوف خدا نہ آیا...... ذکی صاحب! آپ کو بددعاؤں سے خوف نہیں آتا۔"

عقب سے کسی نے آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ریسیور تھام لیا۔ وہ پلٹی پھر

گل کو دیکھ کر ساکت ہوگئی۔

"گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے بیلا ...... جاؤ باہر مہندی کی رسم شروع ہو رہی ہے۔" بیلا متذبذب سی اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔

"گل! کیسی ہو......؟" ذکی غالباً اس کی آواز سن چکے تھے۔ وہ خاموش ہی رہی۔

"اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں پوچھو گی"

گویا زخم دے کر زخم کریدنے کی عادت بھی تھی۔

"وہ تمہارا بیٹا ہے۔" گل کا لہجہ سپاٹ تھا۔ باہر ڈیک فل آواز میں چلنے لگا۔

"تم نے شادی کے لیے کپڑے بنوا لئے ...... میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں......"

گل کو لگا اس کے کان بند ہو رہے ہیں اور وہ کہہ رہے تھے۔

"تم میری بیوی ہو......تمہاری ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے......اور جو احسان تم نے ہم پر کیا ہے......یقین جانو...... ہمارا اپارٹمنٹ خوشیوں سے بھر گیا ہے۔"

وہ اب یہ سب کیوں کہہ رہے تھے اور کس لئے؟

کیا یہ ان کے اندر کا احساس ندامت تھا۔

گل نے ریسیور پٹخا اور تیز تیز چلتی اندر چلی گئی۔ باہر ہنگامہ تھا۔ شور اور خوشیاں۔ اندر وہ تھی ...... اپنی آہوں کو دباتی نہ جانے آج ہوا کیا تھا کہ وہ قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی ...... اس کا اندر کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔

اب یہی تھا اس کے اور ذکی کے مابین رشتہ ...... وہ دنیا کی نظر میں ان کی بیوی تھی اور وہ اس کے رشتے کو روپے پیسے سے تول رہے تھے۔

وہ مطمئن تھے کہ ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا...... اور یہ بھول گئے کہ ان خوشیوں کے لیے انہوں نے کسی کی گود ویران کی تھی۔

آج صائم اس کی گود میں ہوتا تو کیا وہ یوں دنیا کی ترحم بھری نگاہوں کا سامنا کر رہی ہوتی ...... اس کا خیال تھا۔ اسے صبر آ گیا ہے۔ وہ خود کو سنبھال چکی ہے۔ مگر آج اس خوشیوں بھرے ماحول میں اس نے خود کو کس قدر تنہا، اداس اور ویران محسوس کیا تھا ...... اس کا صائم ......اس کا لخت جگر۔

اس کی کلکاریاں، کھلکھلاہٹیں۔

اک ہوک تھی، جو دل سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیل رہی تھی۔

اک درد تھا، جو ہمت ڈھا رہا تھا۔

اک آہ تھی، جو عرش تک جا رہی تھی۔

ایسی آہ، جو ظلم کرنے والے کے ظلم کا حساب لیتی ہے۔

ایسی آہ جو نہ چاہتے ہوئے بھی، بددعا بن کر لبوں سے لپٹ جاتی ہے۔

* * *

دو بجے کا عالم تھا...... تھکن کی ماری خواتین لڑکیاں اور بچے یہاں وہاں لڑھک گئے۔ بیلا نے بھی جلدی جلدی مٹھائیوں کے ڈبے وغیرہ سنبھالے......

چائے کا کپ امی کو دینا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً سو جانا چاہتی تھی ...... اس نے چائے کپ میں نکالی، کچن کی لائٹ اور دروازہ بند کیا ...... اور چائے لے کر ماں کے کمرے میں آ گئی، جہاں دیگر خواتین محو خواب تھیں۔

"جیتی رہو بیٹی ...... اب تم بھی سو جاؤ ...... ورنہ صبح آنکھ نہیں کھلے گی۔" انہوں نے نرمی و شفقت سے کہا تو وہ جاتے جاتے پلٹی اور جھجکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"امی! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں۔"

"کس لئے؟" وہ چونکیں۔

"وہ میں نے عاشر کے ......" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا ...... انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا...... پھر پوچھا۔

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے؟"

"غلطی!" اس نے تحیر سے ماں کو دیکھا۔ "مجھے نہیں لگتا، میں غلطی پر ہوں۔"

"والدین اپنی اولاد کا برا چاہ سکتے ہیں؟" انہوں نے رسانیت سے دریافت کیا۔

"لیکن ان کے فیصلے غلط تو ہو سکتے ہیں۔" اس نے واضح انداز میں ان سب کے ایک غلط فیصلے کو جتایا تھا۔ وہ خاموش سی ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے ...... میں آپ سب کی رضا میں راضی ہوں لیکن ......" اک رشتے دار خاتون نے کروٹ بدلی تو اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اوپر آ گئی، جہاں بیڈ پر زیبا، مریم، ان کے بچے گتھم گتھا سو رہے تھے، نیچے فرح اور اس کی نند گدے بچھائے پڑی تھیں۔ اسے بھی انہی کے درمیان جگہ بنانا تھی۔ مگر بے چینی سی تھی ...... تب ہی لیٹنے کے بجائے وہ موبائل نکال کر بیٹھ گئی۔ شادی کی وجہ سے اسے اپنا موبائل دوبارہ آن کرنا پڑا تھا، ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سیل عاشر کو واپس کر دے گی۔

وہاں اسی نمبر سے SMS منتظر تھا۔

بیلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھول لیا۔

"کیا تم بھی پھر
شام کی دہلیز پہ آس کی آہٹ پر
دروازے کی جانب بھاگے جاتے ہو
کیا تم بھی درد چھپانے کی کوشش کرتے
اکثر تھک جاتے ہو اور بن کارن مسکاتے ہو
کیا تم بھی
نیند سے پہلے پلکوں پر ڈھیروں خواب سجاتے ہو
یا پھر بے خواب چیزوں میں
روتے روتے سو جاتے ہو
کیا تم بھی؟
میں اس وقت کا انتظار کروں گا' جب میری محبت تمہارے دل پر یقین بن کر اترے۔"

"گل آپی پر بھی یہ محبت یقین بن کر اتری تھی۔" اس نے بیزاری سے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔

"محبت ذکی نے نہیں گل نے کی تھی۔" کوئی اس کے اندر بولا۔

"تب بھی کیا گل صنوبر اسے رویے کی حقدار تھی ...... جو ذکی نے اس کے ساتھ روا رکھا۔"

"ذکی اور عاشر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" دل باغی ہو رہا تھا۔

"سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

"ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟"

"میں انگلیوں کی بات نہیں کر رہی۔"

"ایک ماں کی پانچ اولادیں اپنی عادات' خیالات و جذبات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ تم عاشر اور ذکی کو ایک پلڑے میں کیسے رکھ سکتی ہو؟"

"تم بکواس بند کرو۔"

"اچھا آخری بات' محبت کو ٹھکرانے والے بدنصیب ہوتے ہیں ...... بالکل ذکی کی طرح......"

وہ دم بخود رہ گئی۔ کیا وہ بھی ناشکری کی مرتکب ہو رہی ہے' جس طرح ذکی ہوئے۔

کمرے میں گھٹن بڑھ گئی یا اس کے اندر اضطراب۔

اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی' پھر ٹھٹک گئی۔

سامنے اندھیرے میں دو نفوس تھے۔

ایک آنسو بہاتا' دوسرا آنسو پونچھتا ہوا۔

وہ دونوں اس کے دل کے بے حد قریب تھے۔

"اب بولو! کیا اس حساس دل کو ٹھیس پہنچا کر خوش رہ پاؤ گی؟"

اس نے بے جان ہاتھوں سے کھڑکی بند کر دی۔

* * *

اسٹیج پر بیٹھی زیبا کے چہرے پر الوہی خوشیوں کا عکس چھلکتا تھا۔

وہ ولیمہ کی دلہن تھی' سو شرماہٹ کی جگہ مسکراہٹ اور گھبراہٹ کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ پہلو میں بیٹھا فہد شاداں و فرحاں دکھائی دیتا تھا۔ ہلکی پھلکی آپس میں گفتگو میں جاری و ساری تھی۔

"ابھی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں ...... کچھ عرصے کے بعد آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔" ساڑھی سنبھالتی فرح نے چڑ کر کہا۔ اس کی ساس کی فرمائش تھی کہ وہ شادی میں سارا زیور پہنے ......سو وہ لدی پھندی بیزار بیٹھی تھی۔ بیلا کو ہنسی آ گئی۔

"سچ کہتی ہوں بیلا! شادی کے بعد سب کچھ بدل جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید روشنی ڈالتی ......امی نے بیلا کو آواز دے دی۔

"گل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ...... ہم ابھی گھر چلتے ہیں۔ کھانا تو کھا ہی چکے ہیں۔ میرے بھی سر میں درد ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ زیبا سے ملنے اسٹیج کی طرف چلی گئی۔ باہر آئی تو عاشر گاڑی لئے منتظر تھا۔ اسے بھی ابھی واپس جانا تھا...... سارا راستہ وہ اور امی باتیں کرتے آئے جبکہ بیلا گاڑی سے باہر جھانکتی رہی۔ عاشر کا دل چاہا وہ اس کی تعریف کرے۔ وہ آف وائٹ فراک اور پاجامے میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی مگر ایک تو ممانی کا لحاظ مانع تھا...... دوسرا اس کے خیال میں وہ پہلے ہی خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ گھر آ کر امی نے گل کو دیکھا...... وہ نڈھال سی لیٹی تھی۔ حالانکہ بخار بھی نہ تھا۔ بس کل سے یونہی پڑی تھی۔

"میں کپڑے بدل لوں ...... گل کو کھانا کھلا دو۔"

"میں کھا لوں گی' آپ فکر نہ کریں......" گل اٹھ کر بیٹھ گئی...... امی گئیں تو اس نے بیلا کا

ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''ابھی رہنے دو...... بعد میں کھا لوں گی ......تم بتاؤ زیبا کیسی لگ رہی تھی؟''

''بہت پیاری......'' وہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگی۔ تب ہی عاشر آ گیا۔

''اچھا گل آپی! اب مجھے اجازت دیں۔''

''اتنی جلدی؟''

''جی' اتنی ہی چھٹی ملی تھی۔'' وہ ان کی دوسری طرف پر بیٹھ گیا۔ بیلا اٹھنے کے لیے پرتولنے لگی۔ گل نے بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نرمی سے پوچھنے لگی۔

''ابھی تک عاشر سے خفا ہو......''

''میں کسی سے خفا نہیں ہوں......'' وہ جزبز ہو گئی۔ عاشر کے سامنے جواب طلبی کی توقع ہی کہاں تھی۔ عاشر مبہم سا مسکرایا۔

''محبت کو ناراض نہیں کرتے۔''

''مجھے کسی سے محبت نہیں۔'' بیلا نظریں چرا گئی۔

عاشر بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''اسے تو ہے......''

''آپی! مجھے جانے دو'' وہ بے بس ہو کر بولی۔

''جاؤ......لیکن میری بات سنو......''

''آپ بتائیں......کیا آپ کو صبر آ گیا ہے؟'' بیلا نے تیزی سے بات قطع کی۔

''بار بار ایک ہی بات کیوں کرتی ہو۔ محبت نے قربانی مانگی تھی' میں نے دے دی۔''

''اولاد کی قربانی؟'' بیلا سے قبل عاشر بول اٹھا......گل صنوبر چپ سی ہو گئی پھر دھیرے سے بولی۔

''بیلا...... عاشر! مجھے صرف ایک بات کا یقین ہے۔ میرا خدا ناانصافی نہیں کرتا...... جو میرا ہے' اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے۔''

گل صنوبر کا لہجہ پرسکون تھا۔ فون کی گھنٹی اک تواتر سے بجنے لگی تھی...... پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ یقیناً امی نے فون ریسیو کر لیا تھا۔

''آپی! یہ لاجک میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کب صائم بڑا ہو گا۔ کب اسے پتا چلے گا کہ اس کی ماں شائستہ نہیں' گل صنوبر ہے۔''

''گل صنوبر......'' امی افتاں وخیزاں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''کچھ سنا' ذکی کا فون تھا۔ وہ شائستہ...... شائستہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں......'' ان کا گلا رندھ گیا۔

''ذکی...... ڈیڈی باڈی کے ساتھ کل پاکستان آ رہا ہے۔''

وہ سب دم بخود تھے۔ گل صنوبر ساکت وصامت تھی۔

اس نے تو ایک بار بھی شائستہ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا تھا۔ اس کا اس قصے میں کیا کردار ہے......اس نے تو کسی کو بددعا نہیں دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ شائستہ کی جواں مرگی پر افسوس کرے یا بیٹے اور شوہر کی واپسی کی خوشی منائے۔

وہ آہستگی سے اٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔

امی رو رہی تھیں۔

عاشر اپنے موبائل پر کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔

گل صنوبر جائے نماز بچھا رہی تھی۔ اس نے ابھی کہا تھا۔

''مجھے خدا کے انصاف پر پورا یقین ہے...... جو میرا ہے' اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آنا ہے۔''

* * *

راستے محبت کے

کہانی کیا ہے؟
کہانی جنگل کی ہوا ہے۔
کہانی درختوں کی اوٹ سے جھانکتی غزال آنکھوں کا طلسم ہے۔
کہانی دل کی کوئیا میں جھلملاتا کوئی حسین عکس ہے۔
جذبوں کے تاج محل' خوابوں کے اڑن کھٹولے' خاک و خون میں لتھڑے چہرے' ٹوٹتی سانسیں' شکست کا عذاب' ذلت کی دھول' یقین کے پرچم' محبت کے دریا سب کہانیاں ہیں۔
''کہانی وہ پرندہ ہے جس نے سمندر کے کنارے ایک دن جل پری کو دیکھا اور گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔''
کتاب ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اس سے آگے میرے ذہن میں سوچ کا پنچھی پر پھڑپھڑانے لگا تھا۔ میری خوبصورت آبنوسی لکڑی سے بنی رائٹنگ ٹیبل پر میرے نئے ناول کا مسودہ پڑا تھا۔ ادھورا اور نامکمل مسودہ۔
''کیا میں اسے مکمل کر پاؤں گا؟'' میں نے انگوٹھے کے ناخن سے مضمون پر لکیریں کھینچتے ہوئے سوچا۔
اور میری دس سالہ لکھنے کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنا ناول کسی صورت مکمل نہ کر پا رہا تھا۔ حالانکہ پبلشر کا کئی مرتبہ فون آ چکا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مارچ کے آخر تک میں اسے اپنا ناول دے دوں گا۔ مگر اب اپریل کا آغاز ہو چکا تھا۔
قارئین منتظر تھے۔ میرا اگلا شاہکار پڑھنے کو۔

حالانکہ جب میں اس نئے بنگلے میں شفٹ ہوا تو اس بنگلے کی پرسکون اور خوبصورت لوکیشن کو دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ میں بہت جلد اپنا ناول مکمل کر لوں گا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں مجھے کوئی جانتا بھی نہ تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ کوئی مجھے پہچان بھی نہ پائے۔
مکمل تنہائی اور یکسوئی۔
بس یہی تو چاہئے تھا مجھے۔ ایک اچھا اور خوبصورت ناول لکھنے کے لئے۔ مضبوط پلاٹ تو میرے پاس تھا ہی۔
''مگر ہوا کیا؟''
مجھے یہاں شفٹ ہوئے دو ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا اور ناول ادھورا تھا۔ نہ جانے کہانی کہاں اٹک گئی تھی۔ میں ہر شام مکمل آمادگی کے ساتھ پین دھو دھا کر نئی سیاہی بھرتا اور کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر اپنی رائٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھتا تھا۔ کہانی کا تانا بانا بنتے اور کرداروں کے مزاج پر غور کرتے کرتے...... میرا دھیان کھڑکی سے باہر چلا جاتا اور پھر میری نگاہوں کے عین سامنے کھلی کھڑکی پر جھکا نیلا آسمان اپنے رنگ بدلنے لگتا۔ پہلے اس کا رنگ بنفشی ہوتا پھر ٹیالا، اس کے بعد رات کا مصور سیاہی کا برش پھیر دیتا اور ذرا دیر نہیں گزرتی کہ رات کی مانگ ستاروں سے جگمگانے لگتی اور چاند کھڑکی میں مسکرانے لگتا۔
یونہی تکتے تکتے ''رات'' اور ''کہانی'' دونوں ہی اونگھنے لگتے اور میں سفید کورے کاغذوں پر آڑی ترچھی لکیریں دیکھ کر متحیر سا سوچنے لگتا۔
''کہانی رستہ کیوں بھول گئی ہے؟''
''کیا کہانی واقعی ایسا پرندہ ہے جو......''
یا کہانی کاروہ پرندہ ہے جس نے سمندر کے کنارے ایک دن جل پری کو دیکھا اور گھر کا رستہ بھول گیا تھا۔

* * *

میں آکاش فیروز ایک ناول نگار ہوں۔ ایک رومان پرور ناول نگار۔
جس کی تحریر کا اہم موضوع محبت ہے۔
کہتے ہیں میری تحریر میں محبت وادیٔ خوشنما لگتی ہے۔
بہار کے اولین دنوں میں کوئل کی طرح کوکتی اور بادِ صمیم کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ اسی لئے تو نقاد میری تحریروں کو کچی عمر میں دیکھے جانے والے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے

اور یہ بھول جاتے ہیں کہ کچی عمر میں دیکھے جانے والے خواب کبھی معدوم نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیشہ دل کے کسی کونے میں بیٹھے پلکیں جھپکاتے رہتے ہیں۔

شاید اسی لئے نوجوان نسل میری اور میری تحریروں کی دیوانی ہے۔ میری اس لئے کہ خوش قسمتی سے میں ایک اچھی پرسنالٹی کا مالک ہوں اور ناول کے پیچھے چھپنے والی میری تصویر دس سال پرانی ہے۔ تب جب بائیس برس کی عمر میں میرا پہلا ناول شائع ہوا تھا۔ زندگی کی تمام تر تلخیوں کے باوجود مجھے کم از کم اس میدان میں مقام بنانے کے لئے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کچھ اپنی فطری صلاحیت ورجحان کی بدولت اور کچھ قسمت کی مہربانی سے اور کچھ یوں بھی کہ حقیقت پسندوں کی اس دنیا میں، میں خواب دیکھنے والا پہلا شخص تھا اور خواب کیسا بھی ہو خوشنما ہی لگتا ہے۔

میرا پہلا ناول ''آرزو'' ہاتھوں ہاتھ بکا تھا اور دو ماہ میں ہی مارکیٹ سے غائب ہو گیا تھا۔ اور خریدنے والوں میں بڑی تعداد کالج سٹوڈنٹس کی تھی۔ اگر کسی سنجیدہ پڑھنے والے نے یہ ناول خریدا بھی ہوگا تو شاید پڑھ کر سامنے دیوار پر دے مارا ہوگا کہ یہ ایک کچے ذہن کی کچی تحریر تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود میں اس وقت کا بیسٹ سیلر ناول نگار تھا اور اس دس سال کے عرصے میں میرے سات ناول منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے تھے۔

لیکن کیا آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟ دنیائے ادب پر جگمگاتا ایک تارا۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن آکاش فیروز۔ جس کے سامنے لفظ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پر درحقیقت میں کون ہوں؟

وہی جو نظر آتا ہوں یا اس کے پیچھے کوئی اور آکاش ہے۔

یہ کوئی نہیں جانتا۔ آپ بھی نہیں۔ مگر آج میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔

ذرا ٹھہرئیے۔ ماضی میرے ذہن کے زنگ آلود مقفل دروازوں پر دستک دیتا ہے اور جب میں دروازہ کھولتا ہوں تو ایک منظر جاگتا ہے۔ ایک میلی صبح کی دھواں دھواں سی روشنی میں مجھے ایک میدان نظر آ رہا ہے اور دھیرے دھیرے یہ میدان آباد ہو رہا ہے۔ جھونپڑیاں، بارش کی دو بوندوں میں بہہ جانے والے خستہ حال کچے مکان مگر ان کی حالت ان کے مکینوں سے زیادہ خستہ تو نہیں۔ میں اس تعفن زدہ مانوس فضا میں بڑی سہولت سے سانس لے رہا ہوں اور گندی نالیوں میں سے ہوتا ہوا بستی کے آخری مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے چپکے سے دروازے سے جھانکنے کی کوشش کی ہے اور اب دم بخود دیکھ رہا ہوں۔

ایک کمرے کے مکان میں ڈھیر سارے بچے، میلے گندے، کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے۔ ان کی لڑائی کھلونوں کے لئے نہیں ہوتی، کتابوں کے لئے بھی نہیں ہوتی۔

وہ ننگ دھڑنگ اجڈ گنوار بچے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہیں جھونپڑی کے ایک کونے میں رنگ برنگے کاغذوں کا ڈھیر ہے۔ جس میں گھری ایک سانولی عورت کے کھنچی ہوئی نسوں والے ہاتھ بڑی سرعت سے کاغذ کے پھول بناتے ہیں۔ بچے اچھلتے کودتے کبھی کبھار اس کے کاغذ کے پھول روند جاتے ہیں۔ مگر شاید اسے احساس ہی نہیں ہوتا۔

اس عورت کا سانولا چہرہ دیکھ کر میرے دل میں محبت کا آبشار سا بہنے لگا ہے۔ گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس جاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے، میں بھاگ کر جاؤں اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ اس کی چھاتی سے لپٹ کر اس کے دودھ کی خوشبو محسوس کروں۔ دیکھیں اس نے سر اٹھایا ہے۔ وہ مجھے دیکھ رہی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ مگر اپنے پاس نہیں بلاتی۔ پھر سے سر جھکا کر پھول بنانے لگتی ہے۔

یہ ڈھیر سارے بچے وہی ہیں۔ جو میرے ساتھ ہی ماں کی چھاتی سے لپٹ کر اپنے حصے کا دودھ سڑ سڑ نچوڑا کرتے تھے۔ ان سارے بچوں میں میرے لئے اپنا آپ پہچاننا مشکل نہیں۔ میں وہیں بیٹھا ہوں، ماں کے پاس۔ چپ اور گم صم۔ میری نظریں اس کے ہاتھوں پر مرکوز ہیں۔ کبھی کبھی یونہی میں سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

''ماں! تم ہمیشہ کاغذ کے پھول کیوں بناتی ہو؟'' وہ جواب نہیں دیتی۔ بس مسکراتی ہے۔ میں پھر پوچھتا ہوں۔

''ماں! کاغذ کے پھولوں سے خوشبو کیوں نہیں آتی؟''

وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھتی ہے اور اس کی ویران آنکھوں کا بوجھل نم مجھے بے چین کر دیتا ہے۔

''آتی ہے پتر! اس میں سے روٹی کی خوشبو آتی ہے۔''

وہ گلوگیر لہجے میں کہتی ہے۔ اور میں ان پھولوں کو اپنی ناک کے ساتھ لگا کر زور زور سے سانس لے کر روٹی کی خوشبو اپنے اندر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں اور مسکرا دیتا ہوں۔ میرے کھال منڈھے چہرے پر یہ مسکراہٹ بڑی عجیب سی لگ رہی ہے۔ شاید میں ہنستا بھی نہیں تھا، روتا تھا۔ پر ماں سے کبھی یہ نہ کہتا۔

''ماں! روٹی کی خوشبو سے پیٹ نہیں بھرتا۔ مجھے روٹی چاہئے۔''

تب ہی وہ سارے بچے اس کے گرد جمع ہو کر شور مچانے لگتے ہیں۔

"ماں! مجھے روٹی دو۔"

"ماں! مجھے بھوک لگی ہے۔"

"ماں! میرے پیٹ میں آگ سی لگی ہے۔"

وہ ان سب سے نظر چرائے ٹوکرے میں پھول رکھ کر جھونپڑی سے باہر نکل جاتی ہے اور میں اس کے پیچھے ہوں۔ اس ننگے پیروں کی ابھرتی نسوں اور گھاگھرے کی بوسیدہ لہروں میں کھولا ہوا۔

پتا نہیں، میں اپنے باقی بہن بھائیوں جیسا کیوں نہیں تھا۔

پھر منظر بدل جاتا ہے۔

وہ ایک لڑکا ہے، سوکھا سڑا لمبا سا۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل رہا ہے۔ باہر کچی بستی چپ کے اندھیرے میں اونگھ رہی ہے۔ سورج ابھی نکلا نہیں۔ اس لڑکے کے ننگے قدم گندے نالے کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں اور وہاں جا رکتے ہیں۔ جہاں کھیت پر پھیلا خوابیدہ سبزہ ابھی واضح نہیں ہوا تھا۔

وہ وہاں کھڑا رہتا ہے۔ بے خبر، چپ چاپ، گم صم۔ تب ہی زمین کے کنارے سے روشنی سی پھوٹتی ہے اور اس کے چہرے پر بکھر جاتی ہے۔ آسمان کے ماتھے پر حنائی رنگ بکھر جاتا ہے اور اس کے سوکھے چہرے پر دو ویران آنکھوں میں چمک بڑھتی چلی جاتی ہے۔

نہ جانے کیوں اسے لگتا ہے سورج اور اس کی بہت گہری دوستی ہے اور جس دن اس نے دیکھا نہیں، سورج نکلے گا نہیں۔

ایک آخری منظر میرے شعور کے پردے پر منجمد ہو گیا ہے۔

وہی جھونپڑی ہے اور بہت گہرا سناٹا۔ حالانکہ چارپائی کے گرد وہ سب شور مچا رہے ہیں۔ ان ہی کے درمیان گھرا وہی سوکھا سا لڑکا بھی ہے۔ حسب معمول چپ اور گم۔ اس کے کان لحہ بہ لحہ قریب آتی موت کی آہٹوں پر لگے ہیں اور خوفزدہ آنکھیں چارپائی پر پڑے ساکن وجود کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہا ہے۔

"اگر ابا زندہ ہوتا تو کیا تب بھی ماں یونہی مرتی۔"

تب ہی اس عورت کے نیم مردہ وجود میں ہلکی سی جنبش ہوتی ہے اور اس کی لرزتی پلکیں کھل جاتی ہیں۔ اب وہ ان زرد، موت کے خوف سے سہمی آنکھوں میں جھانک سکتا ہے اور ان آنکھوں میں منجمد ہراساں سی مسکراہٹ۔ وہ حیران سا رہ گیا تھا۔ وہ آنکھیں صرف اسے

دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ بس ایک لمحے، ایک پل کو۔ اور پھر بند ہو جاتی ہیں۔ شاید ہمیشہ کے لئے۔

وہ سب چیخ چلا رہے ہیں۔ وہ لڑکا پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ٹوکرا کاغذی پھولوں سے بھرا تھا۔ وہ جھکا اور اس نے سارے پھول ماں کی چارپائی پر ڈھیر کر دیئے اور پھر جو بھاگا، تو کبھی لوٹ نہ سکا۔ ایک بار قدم اٹھ جائیں تو سفر ہمیشہ کے لئے مقدر ہو جاتا ہے۔

بس کبھی خضر ملتا ہے تو کبھی راستے نگل لیتے ہیں۔

میری قسمت اچھی تھی، تب ہی خضر مل گیا۔ پروفیسر ظہور فیروز کی صورت۔ ان کا ہاتھ میرے سر پر کیا آیا، میں ایک دم سے تپتی دھوپ سے چھاؤں میں آ گیا تھا۔

فون کی بیل بڑی تیز تھی۔ میں بری طرح چونک گیا۔ میرے عین سامنے کھلی کھڑکی پر جھکی عشق پیچاں کے پھول پتوں سے نوخیز صبح جھانکنے لگی تھی۔

میری ٹیبل پر مسودہ یونہی ادھورا پڑا تھا۔

نہ جانے کب میں، رات اور کہانی اونگھنے لگے، اور ماضی جاگ اٹھا تھا۔ میری ساری رات یونہی کرسی پر بیٹھے بیٹھے نکل گئی تھی۔ میں نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر تھکے ماندے اور اکڑے ہوئے وجود کو فارم میں لانے کی کوشش کی۔ فون کی بیل بدستور چیخ رہی تھی۔ میں نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو آکاش صاحب!" دوسری طرف وہی خرانٹ چہرے اور خوشامدی لہجے والا پبلشر تھا۔

"فرمائیے مجید صاحب! کیا رات بھر نیند نہیں آئی آپ کو؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ساتھ ہی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔ میں اس وقت اتنا اوپر تھا کہ ہر کوئی میری خوشامد کرنے کو تیار رہتا اور پبلشر حضرات کے ایسے ایسے روپ دیکھے ہیں میں نے کہ مت پوچھیں۔

"آپ کا نیا ناول، بھئی آکاش صاحب بڑا انتظار کروا رہے ہیں آپ۔"

"ہو جائے گا مجید صاحب! کیا جلدی ہے آپ کو؟"

میں نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا۔ جبکہ طلب اس وقت چائے کی تھی۔

"آکاش صاحب! مجھے نہیں، آپ کے قارئین کو دلچسپی اور جلدی ہے۔ فون کر کر کے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے مجید صاحب! ان شاء اللہ جلد ہی ہو جائے گا پورا۔" میں نے اسے پھر بہلا دیا۔ جبکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کہانی کھو جائے تو اسے ڈھونڈنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں نے اسے ٹالا اور پھر کھڑکی میں کھڑا ہو کر بنگلوں کی چھتوں پر اترتی نوخیز صبح کے رنگوں کو دیکھنے لگا۔ مگر دل و ماغ اس کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ مضمحل سی کیفیت ہو رہی تھی۔ بھوک کے باوجود ناشتے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ جاگنگ تو یوں بھی کئی دنوں سے چھوڑ چکا تھا۔

"ایک کپ چائے لینی چاہئے۔"

میں نے اپنی بیزاری طبیعت سے اکتا کر خود سے کہا۔ میں نے پلٹنا چاہا۔ تب ہی نگاہوں کی زد میں کومل آ گئی۔ بلیک ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس، گھنگھریالے بالوں کی اونچی سی پونی بنائے وہ جاگنگ سے واپس آ رہی تھی۔ اس کا پیارا کتا ٹائیگر اس کے ساتھ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کے ساتھ پارس ندیم کو نہ دیکھ کر ایک دیرینہ خوشی ہوئی تھی۔ ورنہ عموماً تو وہ ایک ساتھ ہی نظر آتے تھے۔ ابتدا میں، میں انہیں دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا کرتا تھا، اور وہ دونوں وہیں کھڑے کھڑے مجھے گڈ مارننگ کہتے تھے۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھڑے اتنے مکمل لگتے تھے کہ میں کسی ایک اکیلے کا تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ موسم بدل گیا۔ شاید میرے دل کا۔ کہ انہیں ایک ساتھ دیکھ کر ٹھٹک جاتا، گم صم ہو جاتا۔ وہ مجھے صبح بخیر کہتے تو میں ہاتھ ہلانا بھول جاتا۔

اور اب یہ حال تھا کہ اس لا ابالی و سادہ سے لڑکے کا وجود کومل کے ساتھ مجھے کھٹکنے لگا تھا۔ وہ کومل کے ساتھ نظر آتا تو حسد کی آگ سی میرے اندر بھڑکنے لگتی اور میں دانستہ کھڑکی سے ہٹ جاتا۔ حالانکہ میری سماعتوں میں ان کی باتوں کی آوازیں اور خاموش ٹھنڈی سڑک پر ابھرتی ان کے قدموں کی چاپ گونجتی رہتی۔ اور آج اس کے ساتھ پارس کو نہ دیکھ کر میری ساری کسل مندی اور ساری اداسی دور ہو گئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ جاگی۔ میں نے ذرا جھک کر دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جمائے۔ اس سے قبل کہ میں اسے پکارتا۔ آخری بنگلے کی اوٹ سے پارس ندیم نکل آیا۔

"تم اب آ رہے ہو لیزی بوائے۔" کومل اسے دیکھتے ہی چلائی۔

"یار آنکھ ہی نہیں کھلی۔ کیا کرتا۔" وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ جواباً کومل نے اس کے بازو پر مکا رسید کیا۔

"میں سب جانتی ہوں۔ اول درجے کے جھوٹے ہو اور کاہل بھی۔"

وہ دونوں یونہی باتیں کرتے آگے نکل گئے اور میں یونہی چوکھٹ پر ہاتھ جمائے خالی منظر کو تکتا رہ گیا تھا۔

* * *

دو ماہ پہلے تک کی بات ہے۔ جب میں اپنے ٹھکانے سے اکتا سا گیا تھا۔ مجھے نیا ناول لکھنے کے لئے جس یکسوئی کی ضرورت تھی، وہ یہاں مفقود تھی اور یوں بھی مستقل سکونت اختیار کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پرسکون گوشے کی تلاش مجھے یہاں لے آئی تھی۔ اس سڑک کو ٹھنڈی سڑک شاید اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہاں درختوں کی بہتات تھی۔ ٹھنڈی سڑک کے دائیں بائیں انگریزوں کے زمانے کے بنے قدیم طرز کے تین تین بنگلے تھے۔ ہر بنگلے کے سامنے ایک خوبصورت باغیچہ تھا اور ان کے بعد سڑک بل کھا کر نہر کے ساتھ چل دیتی تھی۔

میرا بنگلہ اس لین کا آخری بنگلہ تھا۔ میرے عین سامنے والے بنگلے میں ریٹائرڈ تحصیل دار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ دو بیٹیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ دو بیٹے تھے شادی شدہ۔ بڑا اسلام آباد میں مقیم تھا اور دوسرا ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرے بنگلے میں شکی سے شیخ اینڈ مسز شیخ رہتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے امریکہ میں مقیم تھے۔ وہ دونوں سارا دن اپنے باغیچے کی دیکھ بھال کرتے اور پوسٹ مین کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ تیسرے بنگلے میں بٹ صاحب کی فیملی رہائش پذیر تھی۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ فروا بٹ، حیا بٹ اور شہزا بٹ۔

میری طرف والی لین کا پہلا بنگلہ پارس ندیم کا تھا۔ اس کی بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ پنڈی میں رہتی تھیں۔ پارس کے والد دو سال قبل وفات پا گئے تھے۔ یوں گھر کی ساری ذمہ داری پارس کے کندھوں پر آ گئی تھی۔

دوسرا بنگلہ ریٹائرڈ کرنل فیروز خان کا تھا۔ ان کی بیوی بہت پہلے وفات پا گئی تھی۔ ایک ہی اکلوتی اولاد تھی۔ "کومل خان"۔

اور آخری بنگلہ میرے تصرف میں تھا۔ کیونکہ یہ بنگلہ کافی عرصے سے خالی تھا۔ سو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی بنا پر اس کے باغیچے میں جنگل سا اگ آیا تھا اور یہ بنگلہ جنگلی خودرو بیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر مجھے یہ بنگلہ مناسب و پرسکون لوکیشن کی بناء پر بہت پسند آیا تھا۔ سو میں نے چند ماہ کے لئے کرایے پر لے لیا۔ یہاں کا پتا سوائے امجد صاحب کے اور کسی کو نہ تھا۔

جس دن میں نے پہلی بار یہاں شفٹ کرنے کو اپنے سامان سمیت، جس میں کہ ظاہر ہے بک ریک ہی بک ریک اور کتابوں سے بھری الماریاں تھیں، لے آیا تو میں مزدوروں کی مدد سے سامان اتروا رہا تھا۔ تب ہی میری نظر اس پر پڑی۔ بلیک جینز، سفید کرتے میں ملبوس، گلے میں سکارف اور پاؤں میں جوگرز۔ وہ گھنگھریالے بالوں والی خوبصورت اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں اور گلابی رنگت کو دیکھ کر میرے ذہن کے کسی کونے میں اٹکا

افسانہ مکمل ہو گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے اس سے قبل نیلی آنکھیں یا گلابی رنگت نہیں دیکھی تھی۔ مگر کچھ تو ایسا تھا اس لڑکی میں کہ میں ذرا دیر کو رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں تحیر سا جاگا اور میں اس کی آواز سن کر جاگا تھا۔ وہ کسی مزدور سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا یہاں لائبریری کھل رہی ہے؟''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' میں اس کے سامنے آیا۔ اس کی نیلی آنکھوں نے مجھے سرتا پا دیکھا۔

''آپ کون ہیں؟''

''مجھے آپ لائبریرین سمجھ لیں۔'' میں مسکرایا۔

''اوہ۔'' اس نے گردن موڑ کر الماریوں میں بھری کتابوں کو دیکھا۔ ''مگر لائبریری کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی بک ریڈر نہیں۔ سوائے پارس اور ڈیڈی کے۔''

اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ میرے لئے یہ خبر خاصی اطمینان بخش تھی۔ ورنہ میں جہاں بھی جاتا' میرے چاہنے والے پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتے۔

''بکس ہوں گی تو بک ریڈر بھی پیدا ہو جائیں گے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' اس نے اپنے اسکارف کو ذرا سا جھٹکا دیا اور پلٹ گئی۔

* * *

خوشگوار سی صبح تھی۔ میں اپنے باغیچے کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھا۔

''ہائے۔'' مترنم سی آواز پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہی نیلی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وائٹ پینٹ پر پنک شرٹ اور وائٹ اسکارف میں ملبوس۔ گود میں سفید بلی اٹھائے وہ جنگلے کے اوپر سے جھانک رہی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال کندھوں پر بکھرے تھے۔

''آپ نے ابھی تک لائبریری کا بورڈ نہیں بنوایا مسٹر......''

''لائبریرین۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً اس کا نقرئی قہقہہ ابھرا تھا۔

''ویل مسٹر لائبریرین! کب لگا رہے ہیں لائبریری کا بورڈ۔'' نیلے کانچ جگر جگر کر رہے تھے۔

''جب بن جائے گا۔'' شاید اس کے ساتھ باتیں کرنا مجھے پہلے دن سے ہی اچھا لگا تھا۔

''میں نے پارس کو بتایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا تھا۔''

''پارس؟'' میں نے مستفسرانہ انداز میں اسے دیکھا۔

''مائی فرینڈ، بیسٹ فرینڈ۔ اظہار ندیم اس کا نام ہے۔ مگر وہ خود کو پارس کہلواتا ہے۔

اسٹوپڈ۔ ابھی تک اپنے لئے کوئی ڈھنگ کی جاب تو ڈھونڈ نہیں پایا۔ آپ کو اس ایریا میں اگر کوئی شخص بالکل فارغ نظر آئے گا تو وہ پارس ہو گا۔'' مجھے پارس کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ یہاں میں تعلقات بڑھانے نہیں آیا تھا۔

''آپ کے ہاں کوئی ملازم نہیں ہے۔'' اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

''ابھی تک تو نہیں ہے۔''

''شیخ صاحب کے مالی سے بات کر لیں۔ وہ سب ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔'' اس نے مفت مشورہ دیا۔

''اٹس او کے۔ میں سب کر لوں گا۔ مجھے عادت ہے۔''

میں نے رسانیت سے کہا کہ جب سے لکھنا پروفیشن بنا تھا۔ میں نے باغبانی کو ہابی بنا لیا تھا اور یہ بھول کر لان کی تراش خراش میں مصروف تھا کہ مجھے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا۔ نہ جانے کب دل اچاٹ ہو جاتا اور میں کہیں اور نکل جاتا کہ یہ خانہ بدوشی تو میرے اندر کہیں رچ بس گئی تھی۔

''میں چلتی ہوں۔ پھر ملاقات ہو گی۔'' مجھے یونہی سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ پلٹ گئی تھی اور میں سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

سورج جب عین میرے سر پر آ کر چمکنے لگا تو شدید بھوک اور تھکن کا احساس میرے وجود پر غالب آنے لگا۔ گھر میں ملازم ابھی تھا نہیں۔ قریب کوئی ایسا ریستوران بھی یقیناً نہیں تھا، جہاں میں پیٹ پوجا کے لئے رک سکتا۔ سو نہانے کے بعد میں نے کچن کا رخ کیا۔ آملیٹ کے ساتھ میں نے چائے بنائی اور ڈبل روٹی فریج سے نکالی۔ تقریباً پندرہ منٹ میں، میں لنچ سے فارغ ہو چکا تھا۔ اوپر کی منزل پر میں اپنا بیڈروم کم سٹڈی روم ٹھیک کر چکا تھا۔ باقی کمرے جوں کے توں لاکڈ تھے کہ مجھے ان کی فی الحال ضرورت نہیں تھی۔ کچھ دیر آرام کی غرض سے میں بیڈ پر دراز ہونے والا تھا۔ جب نیچے سے کسی نے پکارا۔ مجھے خاصی کوفت ہوئی۔ اگر یوں ہی لوگوں کی آمد و رفت جاری ہو گئی تو شاید جلد یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ وہ نیچے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو ہاتھ ہلا کر کہنے لگی۔

''ہائے مسٹر! میں کومل خان ہوں۔ آپ کی پڑوسن۔'' لفظ پڑوسن پر وہ ذرا مسکرائی۔ ''کیا آپ ہمیں شرفِ ملاقات بخشیں گے؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔

''اوپر آ جائیں۔'' میں نے دروازہ کھولا۔ ذرا سی دیر میں وہ سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔

"آئی ایم سوری۔ آپ کو ڈسٹرب کیا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"اندر آ جائیں۔" اس کے عقب میں ملازم ٹرے اٹھائے کھڑا تھا۔

"اوہ گاڈ، اتنی ساری بکس۔" اس کی نیلی آنکھوں میں تحیر جاگا۔ "یہ سب آپ کی ذاتی ملکیت ہیں اور آپ نے پڑھ رکھی ہیں؟" وہ میری طرف گھومی۔

"کئی بار۔"

"لگتا ہے ساری عمر سوائے پڑھنے کے اور کچھ نہیں کیا آپ نے۔"

"بس کچھ ایسا ہی ہے۔"

"میں آپ کے لئے لنچ لائی تھی۔" اسے یاد آیا۔

"لنچ تو میں کر چکا۔"

"اوہ سوری۔ میں تھوڑا لیٹ ہوگئی۔" اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"کوئی بات نہیں آپ رکھ دیں، میں ڈنر میں لے لوں گا۔" میں نے اس کا دل رکھا۔

"خیر، اب باسی کھانا تو نہیں کھلائیں گے آپ کو۔ ڈنر کتنے بجے کرتے ہیں آپ؟"

اس نے ملازم کو واپسی کا اشارہ کیا۔

"تقریباً نو بجے کے قریب لیکن پلیز آپ تکلیف مت کریں۔" میں نے اسے روکنا چاہا۔

"اب ایسا بھی کیا تکلف۔ پلیز آپ ڈنر کے لئے کوئی تردد مت کیجئے گا۔"

اور میں چاہتے ہوئے بھی اسے انکار نہیں کر پایا تھا۔

"میں اب چلتی ہوں مسٹر......" اس نے استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"لائبریرین۔" میں نے برجستہ کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر ہاتھ ہلا کر چلی گئی۔

میرا اب سونے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ سو میں رائٹنگ ٹیبل پر آ گیا۔ پھر جو لکھنے بیٹھا تو لکھتا ہی چلا گیا اور جس وقت میں نے قلم رکھا۔ شام کا حنائی ہاتھ کھڑکی پر دستک دے رہا تھا۔ میں نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی سڑک پر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ سامنے والے باغیچے میں شام کی چائے کے ساتھ اہل خانہ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ نیچے سڑک پر تین خوبصورت لڑکیاں چہل قدمی کے لئے نکلی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ذرا دیر کو ٹھٹکیں۔ ایک نازک سی خاتون پرام میں بچہ ڈالے بنگلے سے نکلیں۔ تب ہی کومل نظر آئی، گود میں سفید بلی اٹھائے۔ اس کے ساتھ ایک دراز قامت نوجوان تھا۔ جو یقیناً پارس ہوگا۔ ان دونوں نے دور ہی سے مجھے ہاتھ ہلایا تھا۔

میں پھر سے رائٹنگ ٹیبل پر آ کر ناول کے کرداروں پر غور کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں میں مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ کوئی کمی سی تھی۔ یونہی لکھتے، سوچتے اور پڑھتے ہوئے پورے نو بجے جب مجھے بھوک کا احساس ہوا تب ہی کومل کا ملازم مجھے بلانے آ گیا۔

"صاحب کہہ رہے ہیں کھانا بالکل تیار ہے۔"

مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ کرنل صاحب نے خوش دلی و گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھاما۔

"میں کرنل بہروز خان ہوں اور یہ میری بیٹی کومل خان۔"

"میں آکاش فیروز ہوں۔"

"تھینک گاڈ۔" کومل شرارت سے مسکرائی۔

"آیئے کھانا بالکل تیار ہے۔" کرنل صاحب مجھے ٹیبل تک لے گئے اور کھانے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے انہیں یہی بتایا کہ بابا کچھ جائیداد چھوڑ گئے ہیں۔ شادی ابھی کی نہیں اور یہ سچ تھا۔ فیروز بابا نے مجھے سگے بیٹے کی طرح چاہا تھا۔ اس کی بس ایک ہی بیٹی تھی جنہیں میں آپا کہتا ہوں۔ وہ شادی کے بعد جدہ چلی گئیں۔ بہت سے لوگ تو جانتے بھی نہ تھے کہ میں ان کا لے پالک ہوں۔ ان کی محبت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ انہوں نے اپنی جائیداد میرے اور آپا کے درمیان برابر تقسیم کی تھی۔

"کیا آپ ہمیشہ یونہی سوچ میں ڈوب جایا کرتے ہیں؟" کومل نے چمچ کو ہلکے سے بجایا۔ میں چونکا اور پھر جھینپ گیا۔

"میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ......"

"کھانے کی تعریف کس طرح کی جائے۔" اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگائیں۔

میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اس کے لئے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ کھانا واقعی بہت مزے کا تھا اور......"

"اور یہ کہ آپ نے ایسا کھانا مدتوں بعد کھایا ہے" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ڈیڈی! اب یہ ہمیں بنائیں گے۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔"

"یہ کہ آپ ہمیں بنا رہے ہیں۔"

"آپ کی بات سے اختلاف کیسے کر سکتا ہوں۔" میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ تب ہی کرنل صاحب کا قہقہہ گونجا۔

"ارے بھئی، کس بحث میں الجھ گئے ہو تم لوگ۔ کھانا مزے کا تھا۔ کیونکہ میں نے اور

میری بیٹی نے مل کر بنایا تھا۔" کرنل صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"آپ کافی پئیں گے یا چائے؟"

کومل نے ملازم کو برتن سمیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کافی۔" میں اور کرنل صاحب اٹھ کر لان میں آ گئے۔ کافی کے ساتھ باتوں کا دور چلا۔ جس میں بہت سے موضوعات پر بات ہوئی۔ مگر میں نے کومل کو اپنے مصنف ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں بھی میرا کوئی چاہنے والا نکل آئے۔ کبھی کبھی گمنامی کی زندگی گزارنے میں بھی بڑا مزا آتا ہے۔

* * *

"آپ...... آپ آکاش صاحب ہیں۔" گویا مجھے مطلع کیا جا رہا تھا کہ میں آکاش ہوں۔ میں نے بے بسی سے پہلے اپنے ہاتھوں میں تھامے گندے کپڑوں کو دیکھا پھر سامنے کھڑے بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس گوری رنگت والے نوجوان کو۔ اس نے آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں سادہ سی چپل، بکھرے بال، آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ پہلی نظر میں وہ مجھے مزاج کا سادہ، لاپرواہ لا ابالی سا نوجوان لگا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی تحیّر و اشتیاق کی ملی جلی کیفیت تھی جو اپنے سامنے کھڑی پسندیدہ ہستی کو دیکھ کر مداحوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

"مجھے جب کومل نے بتایا کہ آپ کا نام آکاس فیروز ہے تو میں ٹھٹک گیا۔ مگر مجھے تب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ آپ ہیں اور آپ یہاں آئے ہیں۔ بلکہ یہاں رہیں گے بھی۔ سر! آپ کو نہیں معلوم کہ میں آپ کا کتنا بڑا فین ہوں۔ میں نے تو آپ کے سارے ناول، سارے انٹرویو سنبھال کر رکھے ہیں۔ آپ کا وہ ناول "میری ریت پہ پھول اور پانی" تو میرا آل ٹائم فیورٹ ہے۔ سر! آپ واقعی وہی آکاش ہیں۔" اس نے ایک بار پھر اشتیاق سے میرا چہرہ کھوجا۔ "اور یہ اسٹوپڈ کومل، اسے پتا ہی نہیں چلا۔"

"مجھے کیسے پتا چلتا۔ آکاش صاحب نے بتایا ہی نہیں۔" کومل نے احتجاج کیا۔

"تمہیں نام سن کر چونک جانا چاہیے تھا۔"

"میں نے ان کی کوئی کتاب پڑھی ہوتی تو چونکتی۔" کومل نے منہ بنایا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

"آکاش صاحب! یہ پارس ہے۔ میرا بیسٹ فرینڈ اور آپ یہ مت سمجھیں کہ یہ صرف آپ کو دیکھ کر یوں ہونق سا لگ رہا ہے۔ اس کی شکل ہمیشہ سے ہی ایسی ہے۔"

"یہ...... یہ کیسا تعارف ہے۔" پارس نے اسے بری طرح گھورا۔

"جیسا بندہ، ویسا تعارف۔" اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکائے۔

"میں دیکھ لوں گا تمہیں۔" پارس نے دھمکی دی۔

"کیا دیکھو گے۔" کومل نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی۔ پارس اسے گھورتا ہوا میری طرف متوجہ ہوا۔

"سر! یہ کیا ہے؟" اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ہاتھی اٹھایا ہوا ہے، نظر نہیں آتا۔" کومل بول اٹھی تھی۔

"تم سے تو میں بعد میں نبٹوں گا۔"

تب میں ایک طویل سانس لے کر کھنکارا۔ وہ کب سے سڑک کے عین درمیان کھڑے لڑے جا رہے تھے اور میں ہونق سا بنا ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"سر! آپ کہیں جا رہے تھے؟" پارس نے پوچھا۔

"بس یہیں لانڈری تک۔"

"آپ کے ہاں کوئی ملازم نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"میرے ہاں بھی نہیں۔" وہ خفیف سی شوخی کے ساتھ ہنسا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر کپڑے لے لئے۔

"سر! میں دے آؤں گا۔"

"ارے نہیں پارس! کیوں تکلیف کرتے ہو۔" مجھے اچھا نہیں لگا۔

"چھوڑیں سر! آپ اچھے لگتے ہیں یہ کام کرتے ہوئے۔"

"آکاش صاحب! کرنے دیں۔ پارس اچھا لگتا ہے ایسے کام کرتے ہوئے۔" کومل نے ہنستے ہنستے طنز کیا۔ پارس نے ایک بار پھر اسے گھورا۔ میرے نہیں نہیں کرنے کے باوجود اس نے کومل کے ملازم عبدل کو آواز دی۔ جو کسی کام سے باہر نکلا تھا۔ اسے کپڑے دے کر لانڈری احتیاط سے پہنچانے اور واپس لانے کا کام سپرد کیا۔ پھر اصرار آمیز لہجے میں بولا۔

"آیئے نا سر! میرے گھر چلتے ہیں۔"

"نہیں پارس صاحب! پھر سہی۔ ابھی تو مجھے تھوڑا لکھنا ہے۔" میں نے شائستگی سے انکار کر دیا۔

"سر! بس ایک کپ چائے۔"

"تمہارے گھر سے چائے پی لیں یا نہر کا گرم پانی، ایک ہی بات ہے۔" جوتے کی نوک سے سڑک پر لکیریں کھینچتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

"تم۔" پارس تیورا کر اس کی طرف پلٹا۔

"کیا ہے بھئی۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ "اتنی گرمی ہے۔ کچھ رحم کرو آکاش صاحب پر۔ ابھی انہیں اپنا اگلا ناول بھی مکمل کرنا ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ واقعی سیدھا سا لڑکا تھا۔ تب ہی دوبدو جواب دینے کے بجائے بس جھنجھلاتا تھا۔

"ارے بھئی لڑنے کی بات نہیں ہے پھر سہی۔ ابھی تو میں یہیں ہوں۔" میں نے متانت سے پارس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک ہے سر! لیکن بعد میں آپ میرے گھر کھانا کھانے ضرور آئیں گے۔" اس نے اتنے محبت وخلوص سے کہا کہ مجھے وعدہ کرنا ہی پڑا۔

"سر! آپ اجازت دیں تو میں کبھی کبھی آپ سے ملنے آجایا کروں۔"

"ضرور۔" میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ ان سے اجازت لے کر میں واپس پلٹا۔ بنگلے کے پاس جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے لڑ رہے تھے۔ میں مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

* * *

جب میں دوپہر میں لنچ سے فارغ ہو کر پھر سے لکھنے بیٹھا تھا، پارس آدھمکا۔

"سوری سر! مجھ سے رہا نہیں گیا۔" وہ کان کھجاتے ہوئے خجالت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ میں نے حسرت سے اپنے سامنے بکھرے کاغذوں کے پلندے کو دیکھا۔ پھر متانت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔"

وہ دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"کوئی نیا ناول لکھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں، ایک ناول شروع کیا تو ہے۔"

"کہانی کیا ہے سر؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"قبل از وقت بتاؤں گا تو کیا مزا رہے گا۔" میں نے ہنس کر ٹالا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اور سناؤ کیا کرتے ہو تم؟"

"کچھ نہیں سر! جاب کی تلاش میں خوار ہوتا ہوں اور بس۔"

"بس پارس! یہ تو المیہ بنتا جا رہا ہے اس ملک کا۔ کتنے ہی باصلاحیت نوجوان یونہی ضائع ہو جاتے ہیں۔" میں نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "پیتے ہو۔"

"نہیں سر! بس ایک دفعہ ٹرائی کیا تھا۔ اس کول کی بچی نے ایسا ریکارڈ لگایا کہ بس۔ آپ پئیں۔"

"بہت دوستی ہے تم دونوں میں؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے یونہی پوچھا۔

"بہت زیادہ سر! بچپن سے ایک ساتھ ہیں ہم دونوں۔ سو لڑائی بھی خوب ہوتی ہے۔" اس نے شیلف میں لگے میرے ناولوں پر ایک نگاہ دوڑائی۔

"میں نے آپ کے سارے ناول پڑھے ہیں سر! سوائے "آرزو" کے۔"

"ہاں، یہ میرا پہلا ناول تھا۔"

"میں نے آپ کا پہلا ناول "گلابوں کے موسم" پڑھا تھا، اپنے ایک دوست سے ادھار لے کر۔ اس کے بعد تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا رہا ہوں۔"

"گلابوں کا موسم۔ چھ سات سال پہلے کی بات ہے۔"

"جی سر! تب میں کالج میں ہوتا تھا۔" وہ کچھ لمحے خاموش ہوا۔ پھر عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ "سر! آپ واقعی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بندہ ایک دم سے وہیں پہنچ جاتا ہے، جہاں آپ کے کردار رہتے ہیں۔ اور وہ دنیا...... وہ دنیا کتنی خوبصورت ہوتی ہے سر! جہاں غم نہیں ہوتا۔ بس محبت خوشی بن کر خوشبو کی طرح پھیل جاتی ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے، میں اس دنیا کو دیکھوں۔"

"خواب بند آنکھوں سے دیکھے جاتے ہیں پارس! میری کتاب پڑھ کر چند لمحوں کے لئے انسان اپنا غم بھول جاتا ہے تو مجھے لگتا ہے میرے لکھنے کا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا قاری پیسے دے کر غم خریدے۔ تم بھی بس اس دنیا کو محسوس کرو اور اپنے اندر بسا لو۔ کہ زندہ رہنے کے لئے سانس لینا ضروری ہوتا ہے۔"

میں نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔

"سر! آپ بولتے بھی بہت اچھا ہیں۔" وہ نیازمند لہجے میں بولا تو میں بے اختیار ہنس دیا۔ یہ میرے چاہنے والے مجھے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہم لکھنے والے اتنے خاص ہو جاتے ہیں کہ ہماری عام باتوں میں بھی وہ خاص معنی

ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں اور اگر یہ ہمیں کھوج لیں تو کیسا دھکا لگے انہیں کہ ہم بھی ان ہی میں سے ہیں، ان ہی جیسے۔ اپنے اپنے مسائل سے نبرد آزما، بے بس و کمزور انسان۔

"کیا سوچنے لگے سر؟"

پارس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں ایک طویل سانس لے کر سیدھا ہوا۔

"یہ تم مجھے سر سر کیوں کہتے ہو؟"

"بس یونہی۔ آپ بڑے انسان ہیں۔"

"چھوڑو پارس! کون چھوٹا ہے، کون بڑا، کون جانے۔ بس نقاب ہیں سب کے چہروں پر تصنع و ملمع کے۔ جب تک یہ نقاب باقی ہے۔ بس تب تک ہی انسان بڑا ہوتا ہے۔"

وہ سر اٹھا کر تحیّر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"سر! آپ نے یہ سب...... یہ سب کبھی اپنی تحریروں میں نہیں لکھا۔"

اور میں سر جھٹک کر ہنس دیا تھا۔ اب پہلی ملاقات میں اسے کیا بتاتا کہ جو میں لکھتا ہوں، اس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ یہ جو سب سے مسکرا مسکرا کر ملتا ہے۔ ڈھیروں ڈھیر تعریفیں وصول کرتے ہوئے بڑی نزاکت سے کندھے اچکاتے ہوئے، زندگی کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے، یہ تو کوئی اور ہے۔ میں...... میں تو اب بھی وہیں بیٹھا ہوں، ماں کی چارپائی کے پاس۔ کاغذ کے پھولوں سے روٹی کی خوشبو سونگھتا ہوا اور ماں کی نیم مردہ آنکھوں میں منجمد ہراساں سی مسکراہٹ دیکھ کر حیران ہوتا ہوا۔ ایک کچی آبادی کے جھونپڑے میں پیدا ہونے والا۔ بھوک جس کی سہیلی، موسم جس کا لباس ہو۔

یہ دھرتی اس کا گھر اور نیلا امبر اس کا سرپرست ہو۔ جس نے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے عوض اپنے بہن بھائیوں کو وحشیوں کی طرح لڑتے اور ماں کو بغیر دوا کے مرتے دیکھا ہو۔ وہ جب خوبصورت وادیوں، گنگناتے چشموں اور بس محبت کی باتیں لکھتا ہو تو یہ سوائے خود فریبی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

پر میں نے کبھی اپنی تحریر کی اس خامی کو مانا نہیں تھا۔ میرے پاس ہزار ہا دلائل تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس خود فریبی میں خود کو اور اپنے قارئین کو مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ پارس میرے کسی ناول پر تبصرہ کر رہا تھا۔ میں سر جھٹک کر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور مجھے قائل ہونا پڑا۔ بہت کم قاری ایسے ہوتے ہیں جو تحریر کی گہرائی میں اتر کر پڑھتے ہیں اور پارس بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس کے بات کرنے کے انداز میں بے ساختگی و سادگی تھی۔ مجھے حقیقتاً اس کے ساتھ بات کر کے خوشی ہوئی اور مجھے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب میں اپنا ناول بھول

بھال کر اس کے ساتھ باتوں میں مگن ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس نے دو بار چائے بنائی اور وہ بے تکلفی سے میری کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔

"سوری سر! میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔" کافی دیر بعد وہ اٹھ گیا۔

"کوئی بات نہیں پارس! مجھے اچھا لگا۔"

"میں اب چلتا ہوں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیں۔"

"نہیں بھئی، بہت بہت شکریہ۔" میں اس کے خلوص سے سچ مچ متاثر ہوا تھا۔

"سر! میں یہ لے جاؤں۔" اس کے ہاتھ میں میرا پہلا ناول "آرزو" تھا۔ اب میں اسے انکار تو نہ کر سکتا تھا۔ بس اتنا کہنے سے خود کو روک نہ سکا تھا۔

"بھئی، خیال رکھنا۔ یہ میری سب سے لاڈلی کتاب ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر! بس کل ہی واپس کر دوں گا۔"

* * *

"آکاش صاحب! آپ ہمارے ساتھ چائے پینا پسند کریں گے؟"

میرا دل چاہا میں اپنا سر پیٹ لوں۔ شاید پیٹ بھی لیتا۔ اگر یہ آفر کرنے والی تین خوبصورت لڑکیاں نہ ہوتیں اور میں بہرحال بدذوق نہ تھا۔

خوبصورت سلونی مگر قدرے گرم شام تھی۔ بنگلوں کی بیرونی دیواریں اور چھتیں سرخ، گلابی اور سفید پھولوں سے بھری ہوئی تھیں اور اس اوائل گرما کی خوشبو بھری سلونی شام میں تین خوبصورت لڑکیاں مجھے چائے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے انکار کر دیا۔

"یہ تو کوئی بات بھی نہ ہوئی۔ آپ کول کے گھر تو کھانا بھی کھا آئے تھے۔"

ان تینوں میں سے چھوٹی سفید رنگت والی خفا خفا سی لڑکی نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"آکاش صاحب! میں حیا ہوں۔ یہ میری آپی فروا اور یہ میری چھوٹی بہن شزا ہے۔"

ان کی سفید رنگت میں گلابیاں جھلکتی تھیں۔ سیاہ آنکھوں کی چمک خیرہ کر دینے والی تھی۔ اس کے ذرا سے مسکرانے سے دائیں گال میں ڈمپل پڑ جاتا تھا۔

وہ بلاشبہ ایک حسین لڑکی تھی۔ اگرچہ ان تینوں کے نقوش بہت ملتے تھے مگر حیا کے حسن میں عجیب سا بانکپن اور نکھار تھا۔ اس کے برعکس فروا ایک خاموش طبع اور الجھی ہوئی لڑکی تھی۔

یہ بٹ سسٹرز سے میری پہلی ملاقات تھی اور میرے نہ...... نہ کرنے کے باوجود مجھے

اپنے گھر لے گئی تھیں۔ بٹ صاحب گھر پر نہیں تھے اور مسز بٹ کھرپی ہاتھ میں لئے پودے سنوار رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں کچن میں جا گھسیں۔ جب کہ حیا مجھے لئے لان چیئر پر آ بیٹھی تھی۔ مسز بٹ بھی ہاتھ دھو کر وہیں آ گئیں۔ وہ فربہی مائل بظاہر خوش مزاج مگر نک چڑھی خاتون تھیں۔ پہلے تو وہ کرید کرید کر مجھ سے میری زندگی، خاندان اور کاروبار وغیرہ کے متعلق پوچھتی رہیں اور جب قدرے مطمئن ہو گئیں تو پھر میری طرف جھک کر قدرے رازداری کے ساتھ پوچھنے لگیں۔

"تمہیں سب سے پہلا ڈنر کومل نے دیا تھا؟"

تب فروا ٹیبل پر چائے کے ساتھ لوازمات سجا رہی تھی۔ اس نے قدرے ناگواری کے ساتھ پہلے اپنی ماں اور پھر حیا کی طرف دیکھا اور میں سر جھکا کر سوچنے لگا کہ یہ میری غلطی تھی کہ میں کومل کے گھر ڈنر کرنے چلا گیا یا کومل کی غلطی تھی کہ اس نے مجھے سب سے پہلے ڈنر پر انوائٹ کر لیا تھا۔ جبکہ مسز بٹ قدرے ناگواری سے کہہ رہی تھیں۔

"ہاں بھئی سارا دن تو وہ گھر سے باہر سڑکوں پر دندناتی رہتی ہے۔ کیا نام ہے اس لڑکے کا......" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "ہاں اظہار کے ساتھ۔"

"واحد ممی ہیں جو پارس کو اصل نام سے یاد رکھتی ہیں۔" فروا نے ہنس کر کہا۔

"ہاں بھئی وہی نکما سا لڑکا......"

"ممی! نکما تو مت کہیں۔ وہ تو اسے جاب نہیں ملتی۔" پاس بیٹھی حیا نے بے ساختہ ہی ماں کو ٹوکا تھا۔

پھر ماں کے گھورنے پر نچلا لب دانتوں تلے دبا کر خاموش ہو بیٹھی۔

"ہاں تو آکاش بیٹا! میں کہہ رہی تھی کہ جب سارا دن کالونی کی سڑکوں پر مٹر گشت کرتی ہے تو خود بخود خبر ہو جاتی ہے۔ کون آیا، کون گیا۔"

"ممی پلیز، آکاش صاحب! آپ یہ کیک لیں نا۔" فروا نے بہت آرام سے موضوع بدل دیا تھا اور مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شاید کومل کو پسند نہیں کرتیں۔ چائے کے دوران وہ تینوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں اور میں ایک کپ چائے اور ایک ٹکڑا کیک کا نگل کر بمشکل وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخر کیوں تین خوبصورت لڑکیوں کی خوبصورت کمپنی اور چائے کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات کے ہوتے ہوئے میں وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔

شاید تب ہی...... ہاں تب ہی مجھے مسز بٹ کا کومل کے لئے استہزائیہ لہجہ اچھا نہیں لگا

تھا۔

وہاں سے جان چھڑا کر گھر پہنچا تو پارس میری کرسی پر بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خجل سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"سوری سر! وہ میں ذرا......"

"کوئی بات نہیں۔ تم کب سے آئے ہو؟"

"بس سر ابھی۔ آپ کہاں گئے تھے؟"

"بٹ سسٹرز نے گھیر لیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کرسی سنبھالی۔

"سر! آپ ان سے ملے۔" وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"ہاں بھئی، بلکہ چائے بھی پی۔"

"سر! اچھی تھیں نا۔" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"کون؟" میں نے حیرانی سے اسے دیکھا تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"سر! وہ بٹ صاحب کی فیملی۔" وہ کان کھجاتے ہوئے ذرا اٹک کر بولا۔

"ہاں بھئی، خاصے خوش اخلاق لوگ ہیں۔"

"سب تو نہیں البتہ......" کوئی چیز ٹھاہ کر کے اس کی پشت پر لگی۔

"اف......" وہ بھنا کر پلٹا۔ نیچے جنگلے کے پاس کومل اپنی سفید بلی اٹھائے کھڑی تھی۔

"کیا مصیبت ہے تمہیں۔" دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکا کر وہ غصے سے بولا۔

"مجھے معلوم تھا تم یہیں ملو گے۔"

"تو کوئی پرابلم ہے تمہیں۔"

نہ جانے ان میں کیسی دوستی تھی۔ میں نے تو انہیں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے ہی دیکھا تھا۔

"مجھے نہیں، پوسٹ مین کو پرابلم ہے۔ ساری کالونی میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

اس نے اطمینان سے کندھے اچکاتے ہوئے بتایا۔

"اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔" وہ بھنا کر بولا۔ "اگر وہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر آیا ہو تو۔"

"ابھی لوگوں پر اتنا برا وقت نہیں آیا۔ اور آکاش صاحب اسے زیادہ لفٹ مت کروائیں۔ موصوف فارغ ہوتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا......"

"میں تمہیں نیچے آ کر پوچھتا ہوں۔" جھنجھلایا ہوا پارس تیزی سے نیچے اترا اور ظاہر ہے جب تک نیچے پہنچا، تب تک کومل مجھے ہاتھ ہلا کر غائب ہو گئی تھی۔

* * *

نہ جانے میرا مزاج ایکدم سے کیسے بدل گیا تھا۔ کوئی تبدیلی آئی تو تھی اور بہت غیر محسوس طریقے سے۔ مگر اچانک آئی تھی۔ میں ایکدم سے کاغذ قلم سے اکتا سا گیا تھا۔ کتابوں سے وحشت ہونے لگی تھی اور باہر کی دنیا بہت خوبصورت، انوکھی اور اپنی اپنی سی دکھائی دیتی۔ اگرچہ میں ہر روز اپنے مخصوص وقت پر ادھورا مسودہ کھول کر بیٹھ جاتا اور خود کو باور کرانے کی کوشش کرتا کہ میں بہت انہماک اور دلجمعی سے لکھنے لگا ہوں۔ مگر ہوتا کیا؟ ناول کے سارے کردار اجنبی سے ہو کر میرا منہ چڑانے لگتے۔ ایسے ہی میں کسی وقت پارس آ نکلتا۔ تو میں بہت آرام سے قلم بند کر کے اس کے ساتھ باتوں میں محو ہو جاتا۔ ان چند دنوں میں خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھار کومل بھی آ نکلتی، اپنی سفید بلی کو گود میں اٹھائے وہ سامنے ہوتی تو میں اسے دیکھتا تھا اور جب چلی جاتی تو اسے سوچتا اور محسوس کرتا۔

مسز بٹ کی مہربانی سے مجھے خانساماں بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ جو کھانا پکانے کے ساتھ میرے بہت سے دوسرے کام بھی نبٹا جاتا۔ اور میں اوائل گرما کی لمبی دوپہریں اکثر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی پر جھکے عشق پیچاں کے پھول پتوں کو دیکھتے ہوئے گزارتا تھا تو میری شامیں ٹھنڈی سڑک کا طواف کرتے ہوئے۔ ننھے منے بچوں کو چھیڑتے گدگداتے، بزرگوں کے ساتھ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے، بٹ سسٹرز کے ساتھ گپ شپ اور کومل، پارس کی نوک جھونک سنتے گزر جاتی تھیں۔ میں اپنا شمار زندوں میں کرنے لگا تھا۔ جیسے...... جیسے ایک طویل عرصے کے بعد میں نے خوشبو بھری فضا میں سانس لیا ہو۔ اب مجھے وہ بات غلط لگنے لگی تھی۔

”کتاب بہترین دوست ہے۔“

کتاب بہترین دوست ہے، مگر کبھی آپ کا دل انسانوں سے ملنے کو بھی چاہتا ہے۔

”یہ آپ ہمیشہ بیٹھے بیٹھے کہاں کھو جاتے ہیں۔“

مینگو سکواش کا ٹھنڈا ٹھار گلاس میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کومل نے پوچھا۔

”میں کرنل صاحب سے ملنے آیا تھا اور وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور شربت کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے لان میں کھلے پھولوں، موتی لٹاتے فوارے، سرسبز گھاس پر اٹکھیلیاں کرتے، خرگوش کے ننھے منے روئی کے گالوں جیسے بچوں کو دیکھنے لگا۔ کومل کی سفید بلی میاؤں...... میاؤں کرتی اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ میری نگاہوں کی زد میں دو سرسبز گھاس پر دھرے گلابی مائل سفید پاؤں آ گئے۔ جیسے دو پھول کھلے ہوں۔

”آج پارس کا انٹرویو تھا۔ پتا نہیں کیا بنے گا۔“

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سفید کاٹن کے کڑھائی والے ڈریس میں وہ ہمیشہ سے

زیادہ مختلف اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس لمحے اس کے منہ سے پارس کا ذکر اچھا نہیں لگا تھا۔ میں خاموشی سے شربت کی چسکیاں لیتا رہا۔

”آپ یہاں موجود ہوتے ہیں تو مسز بٹ کا بس نہیں چلتا کہ کیسے آپ کو یہاں سے نکال لے جائیں۔“

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر سے بولی۔

”میرا خیال ہے۔ تمہارے تعلقات ان کے ساتھ کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔“ میں نے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا۔

”حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ شیخ صاحب ہیں نا۔ آنٹی چاہتی تھیں ان کے بڑے بیٹے کے ساتھ فروا کی شادی ہو جائے۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”تو پھر؟“ میں بری طرح چونکا۔

”میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔“ اس نے اطمینان سے کندھے اچکائے۔

”پھر وہ باہر چلا گیا۔ اس نے وہیں شادی کر لی۔ اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہ ہوا۔“

”ہاں، اس میں تمہاری کیا غلطی۔“

”اب وہ سمجھتی ہیں کہ میں اور پارس۔ حالانکہ ہم لوگ بچپن سے ساتھ ہیں۔ خیر، اب تو فروا کی منگنی اس کے کزن کے ساتھ ہو گئی ہے۔ موصوف باہر ہوتے ہیں لیکن چھوڑیں ان کو۔ یہ بتائیں آپ کا ناول کہاں تک پہنچا۔“

اس نے جھک کر بلی کو اٹھایا اور گود میں بٹھا لیا۔

”ہاں، بس وہیں رک گیا ہے۔“

میرا ذہن تو اس کے اور پارس کے درمیان چکرانے لگا تھا۔

”کیوں، لکھ کیوں نہیں رہے آپ؟“

”شاید میں یہ ناول کبھی مکمل نہ کر پاؤں۔ کہانی کھو جائے تو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

نہ جانے کیوں میرے لہجے میں مایوسی در آئی تھی۔

”اوہ۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شاید ہم لوگ آپ کو بہت زیادہ ڈسٹرب کرنے لگے ہیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

"السلام علیکم۔" پارس خاصے برے حلیے میں آیا تھا۔ آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔
"جلدی سے ٹھنڈے شربت کا پورا جگ لے کر آؤ۔"
"عبدل۔" کومل نے جگ اٹھا کر ملازم کو آواز دی۔ "پیچھے نہر سے پانی بھر لاؤ۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا لڑکی۔ گھر آئے مہمانوں کی یوں تواضع کرتے ہیں۔" پارس اچھلا۔
"مہمان!" کومل حیران ہوئی پھر طنزاً بولی۔ "ہم بندہ دیکھ کر تواضع کرتے ہیں۔"
"بکو نہیں۔ پوری تین جگہوں پر انٹرویو دے کر آ رہا ہوں۔"
"کیسا رہا؟" اب کہ اس نے شرارت سے ملازم کو شربت لانے کا اشارہ کیا تھا۔
"بس انہوں نے ہر وہ سوال پوچھا جو مجھے نہیں آتا تھا۔" وہ قدرے مایوسی سے گویا ہوا۔
"مجھے یقین تھا۔" کومل نے جلتی پر تیل ڈالا۔
"میں چلتا ہوں۔" مجھے اپنا آپ ان دونوں کے درمیان خاصا مس فٹ لگ رہا تھا۔
"بیٹھیں نا سر! ذرا حواس ٹھکانے آ جائیں تو گپ شپ کرتے ہیں۔" پارس نے روکنا چاہا مگر میرا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا، تب ہی معذرت کر کے چلا آیا۔

* * *

"میں نے بریانی بنائی تھی۔ ڈیڈی کہنے لگے۔ میں آپ کو بھی دے آؤں۔"
جب میں ملازم کے سر پر کھڑا اسٹڈی روم کے جالے اتروا رہا تھا، تب وہ حسب معمول وارد ہو گئی۔ اس کے پیچھے عبدل ڈش اٹھائے کھڑا تھا۔ بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو نے بھوک کو چمکا دیا اور یہ پہلی بار نہ تھا۔ اکثر وہ کچھ خاص بناتی تو میرے لئے ضرور لاتی تھی۔
"وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اکیلا بندہ ہوں۔ یہ اتنی ساری بریانی کا کیا کروں گا۔"
"میں کیا کرتی۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے اور ڈال دو اور ڈال دو۔"
"اسلم! یہ کچن میں رکھ آؤ۔ آپ بیٹھیں نا۔" میں نے اشارہ کیا تو وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ عبدل اسلم کے ساتھ ہی کچن میں چلا گیا تھا۔
"ویسے آپ کے ہاتھ میں بس قلم اچھا لگتا ہے۔ یہ اس قسم کے کام آپ کو سوٹ نہیں کرتے۔"
"کس قسم کے؟"
"یہی گھریلو ٹائپ کے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔
"آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" وہ یونہی بے دھڑک سوال کرتی تھی۔ میں

ایک لمحے کو خاموش سا ہو گیا۔
سوال کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ ابھی تک اس بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ شاید آپا پاکستان میں ہوتیں تو کچھ سوچتیں اس بارے میں۔
میں ہنس دیا۔
"بس یونہی۔ کبھی گھر بنانے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔"
"ڈیڈی بہت تعریف کر رہے تھے آپ کی۔" اس نے آرام سے موضوع بدلا۔
"بائی داوے۔" میز پر کہنی ٹکاتے ہوئے وہ شریر سے لہجے میں بولی۔ "کیا جادو کیا ہے آپ نے ان پر۔ میرے ہوش میں آپ دوسرے شخص ہیں جن کی تعریف ڈیڈی نے کی تھی۔"
"اور پہلا کون ہے؟" میں اس کی جگر جگر کرتی آنکھوں میں بس ایک لمحہ ہی جھانک سکا تھا۔
"پارس۔" اس نے اطمینان سے کہا اور نہ جانے کیوں ایک پل کو میرے اندر سناٹا سا بکھر گیا اور وہ اس سے بے خبر کہہ رہی تھی۔
"دراصل وہ بہت سادہ لوح ہے۔ کسی سے دوستی کر لے تو اس کے لئے آخری حدوں تک جا سکتا ہے۔ ہر کسی کو اپنی ذات کے آئینوں میں دیکھتا ہے، تب ہی دھوکا کھا جاتا ہے۔ بھلا خلوص کی یہ قسم جو پارس میں پائی جاتی ہے، ہر کسی میں کہاں ملتی ہے۔ اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہے۔ بلکہ ان کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتا ہے اور حقیقتاً ڈیڈی کو اس کا یہی روپ اٹریکٹ کرتا ہے۔"
"اور میرے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ؟" میں نے یونہی ناخن سے میز کی سطح پر لکیریں کھینچتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔
"ان کے خیال میں آپ ایک سیلف میڈ انسان ہیں۔ پہلی بار آپ سے ملنے کے بعد انہوں نے کہا تھا" یہ وہ شخص ہے جس نے زندگی کو اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے اور جو تراشنے کا ہنر جانتے ہیں وہ کبھی ہارتے نہیں۔"
"وہ کھوئی کھوئی سی مسکان لبوں میں دباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"کیا واقعی انہوں نے یہ کہا؟"
اس نے میری بے یقین آنکھوں میں جھانکا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔
"بالکل ڈیڈی کی طرح۔ دراصل ڈیڈی کی اپنی زندگی بھی جدوجہد سے عبارت ہے۔"

انہوں نے جو کچھ حاصل کیا، اپنے بل بوتے پر کیا۔ دراصل ان کا تعلق ایک بہت چھوٹے اور غریب گھر سے تھا اور وہ میٹرک میں پوزیشن لینے والے اپنے گاؤں کے پہلے نوجوان تھے۔ شاید فوج میں جانے والے بھی اور انہوں نے اپنے ماضی کو کبھی چھپایا نہیں۔ ہمیشہ اس پر فخر ہی کیا ہے۔"

"بہت پیار کرتی ہے آپ کرنل صاحب سے؟"

"بہت۔ پر شاید وہ مجھ سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔ اکلوتی اولاد ہیں آپ۔"

"ہاں، ممی کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے جس طرح میرا خیال رکھا ہے۔ میں سوچتی ہوں۔ اگر ممی زندہ ہوتیں شاید میں تب بھی ان سے زیادہ محبت کرتی۔ آکاش صاحب۔" وہ ایکدم چونکی۔ "یہ محبت پر بھی کچھ لو اور دو کا اصول لاگو ہوتا ہے؟"

"شاید۔" میرا لہجہ مبہم سا تھا۔

"اتنی محبت دی ہے ڈیڈی نے مجھے کہ کبھی کسی رشتے کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بلکہ صرف محبت ہی نہیں، اعتبار بھی دیا ہے انہوں نے۔ آکاش صاحب۔" ایک بار پھر کوئی سوال اس کے ذہن میں کلبلایا تھا۔ "ضروری تو نہیں آپ جن لوگوں سے محبت کرتے ہوں، ان پر اعتبار بھی کرتے ہوں۔ یہ محبت اور اعتبار دو الگ چیزیں ہیں کیا؟"

"شاید۔" وہ کتابی باتیں نہیں کر رہی تھی اور میں کتابی جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی گفتگو میں روانی تھی اور فطری سادگی۔ اس لمحے مجھے ادراک ہوا۔ محبت لکھنا الگ چیز ہے اور محبت "جاننا" بالکل الگ۔ جیسے آگ کی تپش محسوس کرنا اور جلنا الگ تجربے ہیں۔ محض تپش سے آپ "جل" جانے کی اذیت نہیں جان سکتے۔ محبت کے بارے میں بے تحاشا لکھنے کے باوجود میری معلومات اس کے بارے میں صفر تھی۔ "ڈیڈی نے مجھے کبھی نہیں روکا۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات سے بھی نہیں۔ میں کہاں جاتی ہوں، کب آتی ہوں، کیا کرتی ہوں۔ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ مگر جب وہ سر اونچا کر کے کہتے ہیں۔ "مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔"

تو میرے گرد ان دیکھی حد بندیاں ہونے لگتی ہیں۔ میں ان کے اس فخر کو کیسے توڑ سکتی ہوں۔ حالانکہ وہ مجھے کسی بھی چیز سے روک سکتے ہیں اور میں بغیر کچھ پوچھے رک بھی جاؤں گی۔ اگر وہ مجھے کہیں کہ پارس سے ملنا چھوڑ دو تو میں ملنا چھوڑ دوں گی۔"

وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر چونک کر کھڑی ہوگئی۔

"اوہ گاڈ۔ کون سی باتیں لے بیٹھی میں اور ڈیڈی بریانی رکھ کر بیٹھے تھے کہ اکٹھے کھائیں گے۔"

وہ بہ عجلت واپس پلٹی۔

"میں چلتی ہوں، آکاش صاحب۔"

اور میں اس کے آخری الفاظ پر اٹکا ہوا تھا۔ شاید مجھے اب احساس ہوا تھا کہ پارس اس کے لئے کس قدر اہم ہے۔

* * *

"لیں جی۔ جنگ چھڑ گئی۔"

"کہاں؟" اپنے خیالوں میں گم پودوں کو پانی دیتے دیتے میں بری طرح چونکا تھا۔

اسلم ہنس دیا۔

"وہاں جی۔"

میں نے کھلے گیٹ سے باہر جھانکا۔ کومل اور پارس کی لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر جھگڑ رہے تھے۔ پارس اسے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ وہ غصے میں سرخ چہرہ لئے اس کی ہر بات سے انکاری تھی۔

"بس جی ان کو تو لڑے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی۔"

"کیا یہ ہمیشہ سے یونہی لڑتے آئے ہیں؟" میں نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"بچپن سے جی۔ ابھی اکٹھے بیٹھے کھیل رہے ہوتے، دوسرے پل جنگ چھڑ جاتی دونوں کے درمیان۔ ناخن چبھوئے جاتے، بال کھینچ کر روتے دھوتے اپنے گھروں میں گھستے۔ ابھی گھر والے صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتے، یہ دونوں پھر سے نہر کنارے پھول جمع کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے بغیر چین بھی کہاں پڑتا تھا انہیں۔ اتنے بڑے ہوگئے، پر عادتیں وہی کی وہی ہیں۔"

اسلم کو لمبی بات کرنے کی عادت تھی اور پھر وہ یہیں شیخ صاحب کے بنگلے میں کام کرتا رہا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں بات کرتا تو لگتا اپنے خاندان کے قصے سنا رہا ہے۔

"پر دل کے بڑے اچھے ہیں دونوں۔ ایک دفعہ میں بیمار پڑ گیا تو......"

"ہاں ٹھیک ہے نا۔ تم کام کرو بابا۔"

میں نے اس کی بات کاٹی تو وہ سر جھٹک کر کیاریوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں یونہی چلتا ہوا گیٹ تک آ گیا تھا۔

"تم بات مت کرو مجھ سے۔"

"کومل! یار بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" پارس نے کچھ کہنا چاہا۔

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا۔" وہ بہت خفا تھی۔

"ایک ذرا سی بات کی تھی تم سے۔"

"تمہیں پتا ہے نا، مجھ سے ادھوری باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ تو کیوں کرتے ہو ادھوری، نامکمل اور پُراسرار باتیں۔"

"پُراسرار۔" پارس ہنس دیا۔ "کم آن کومل! یہ پُراسرار نہیں، رومینٹک باتیں ہوتی ہیں۔"

"تو سنبھال رکھو اپنے پاس یا سناؤ اپنی اس پرنسس کو مجھے کیا بتاتے ہو۔" وہ خفا خفا سی واپس پلٹی۔

"اے کومل۔" وہ اس کے سامنے آیا۔ "اب تم ساری کالونی میں اعلان مت کرنا۔ کہا نا، سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔ اب بھی تو بتایا ہے۔" وہ صلح جو لہجے میں بولا۔

"خاک بتایا ہے۔" وہ جھنجھلائی۔ "اب ساری رات مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"ہاں تو کیسے بتا دوں۔ مجھے یقین تو ہونے دو کہ یہ حادثہ میرے ساتھ ہو چکا ہے، ہونے والا ہے یا میرا دل خوامخواہ بے ایمان ہو رہا ہے۔" پارس کے لہجے میں شرارت در آئی تھی۔

"تمہارا دل تو کیا، تم پورے کے پورے بے ایمان ہو۔" کومل نے جھنجھلا کر اسے دھکا دے کر راستے سے ہٹایا اور پاؤں پٹختی چلی گئی۔

"کیا مسئلہ ہے بھئی؟" میں نے آگے ہو کر پوچھا۔

"یونہی سر! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

گویا کومل کا خفا ہونا اس کے لئے "یونہی" تھا۔ میرے دل میں ناگواری کی لہر سی اٹھی۔

"تو پھر جھگڑا کس بات پر ہو رہا تھا؟" میں نے بظاہر عام سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"عادت ہے اس کو۔ یونہی الجھ پڑتی ہے۔ جنگلی بلی ہے پوری۔" اس نے پھر ہنس کر بات ٹالی۔ مجھے غصہ سا آ گیا۔ دل میں ناگواری کی لہر سی اٹھی ایک بار پھر۔

"یونہی کون الجھتا ہے۔"

"کومل۔" میرے لہجے پر غور کیے بغیر وہ بول پڑا۔ پھر ہنس دیا۔

"تجسس برداشت نہیں ہوتا اس سے۔ میں نے ایک بات کہہ دی تھی۔ ہاتھ دھو کر پیچھے

پڑ گئی۔"

"کون سی بات؟" پارس ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ چہرے کا رنگ ایک پل کو سرخ ہوا۔ پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں سر! کچھ خاص نہیں۔" پھر جھنجھلا کر بولا۔ "میں پھر بتاؤں گا سر آپ کو۔"

اور اتنے دنوں میں مجھے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ پارس کی یہ کیفیت تب ہوتی تھی، جب وہ کوئی بات چھپانا چاہتا ہو اور چھپا نہ پا رہا ہو۔

"اوکے!" میں نے یونہی کندھے اچکا دیئے۔ "مگر پارس! کومل کے ساتھ اتنا مت لڑا کرو۔"

"سر! آپ نے غور سے دیکھا نہیں۔ وہ غصے میں کتنی پیاری لگتی ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا اور میں کلس کر رہ گیا۔

(نہیں۔ اسے غور سے دیکھنے کا حق صرف تمہیں حاصل ہے احمق لڑکے)

میرا دل نہ جانے کیوں جھنجھلایا تھا۔

* * *

میں محسوس کر سکتا تھا کہ پارس الجھا ہوا ہے۔ پریشان تو نہیں تھا مگر ہر پل اس کے چہرے سے الجھن سی مترشح رہتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا مگر لب بھینچ کر رہ جاتا۔ میں نے ایک دوبارہ پوچھا بھی مگر وہ نفی میں سر ہلا کر رہ جاتا۔ یوں جیسے اپنے اندر الجھتی سوچ کی گتھیوں کو وہ خود ہی سلجھانا چاہتا ہو۔ وہ اب بھی اکثر آتا تھا۔ مگر پہلے کی طرح نہ کتابوں کو الٹ پلٹ کرتا، نہ بار بار کافی بناتا اور نہ ہی بحث کرتا۔ بس یونہی بیٹھا کھڑکی پر جھک آنے والی عشق پیچاں کی ایک ٹہنی سے پھول پتے نوچ نوچ کر نیچے پھینکتا رہتا اور میں یونہی سر جھکائے صفحے کے صفحے سیاہ کرتا رہتا۔ مگر نہ جانے کیا لکھتا رہتا تھا کہ ہر بات نامکمل اور ادھوری رہ جاتی۔ کوئی سرا ہی ہاتھ نہ آتا تھا۔ صبح ہی تو فون آیا تھا مجید صاحب کا۔

"کیا بات ہے آکاش صاحب! آپ کا ناول بہت انتظار کروا رہا ہے۔"

تب مجھے یاد آیا۔ ہاں وہ ایک ناول بھی تھا جس کا ادھورا مسودہ میری رائٹنگ ٹیبل کی داہنی دراز میں مقفل تھا۔ نہ جانے کچھ دنوں سے میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ میں ایک ناول مکمل کرنے کی خاطر تنہائی اور یکسوئی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔

تب ہی عین سامنے بیٹھے پارس کو یکسر نظر انداز کر کے میں نے دراز سے فائل نکالی اور اپنے لکھے کو ازسرِنو پڑھنے لگا۔

"سر۔" پھول نوچنے کے عمل سے بیزار ہو کر پارس میری طرف جھکا۔
"آپ اپنا ناول مکمل کیوں نہیں کر پا رہے ہیں؟"
تب میں نے حد درجے بیزار ہو کر فائل آگے کھسکا دی تھی اور کرسی سے ٹیک لگا کر قلم انگلیوں میں گھمانے لگا۔
"بہت پہلے سہیل احمد خان کی ایک نظم پڑھی تھی میں نے۔"
پارس کی متجسس نگاہیں میری طرف اٹھی تھیں اور میں بلا ارادہ ہی وہ نظم گنگنانے لگا۔

اک نظم کھو گئی ہے
دنیا کی وسعتوں میں
کچھ لفظ اس کے گم ہیں
نیلے سمندروں میں
کچھ حرف مٹ گئے ہیں
موسم کی بارشوں میں
اس کا کوئی کنایہ
بادل نے لے لیا ہے
ہنسوں کی درج میں اس کا
آہنگ کھو گیا ہے
عنوان، رفتگاں کے
خوابوں میں جاگتا ہے
الجھی ہوئی ہیں راہیں
میں جن پہ چل رہا ہوں
بکھرے ہوئے ہیں منظر
میں جن میں گھر گیا ہوں
اس منتشر جہاں میں
اک نظم ڈھونڈتا ہوں

"بس کچھ ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہوں میں بھی۔"
"مگر کیوں سر! ایسا کیوں ہوا ہے؟"
"شاید دھیان بٹ گیا ہے۔ ارتکاز توجہ نہ رہے تو کہانی کھو جاتی ہے۔"

"ہوں۔" وہ سر جھکائے لب کاٹتے ہوئے نہ جانے کیا سوچنے لگا تھا۔ میرے دھیان کی ننھی چڑیا سوچ کا دانہ منہ میں دبائے اِدھر اُدھر پر پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ کھلی کھڑکی میں جھانکتی دھوپ بڑے دھڑلے سے میری رائٹنگ ٹیبل پر بکھر گئی تھی۔ اس میں تپش تھی، باغیچے ویران اور در و دیوار پر سورج پگھل رہا تھا۔ پارس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ رائٹنگ ٹیبل ایک دم خالی خالی سی ہو گئی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈک آمیز نیم تاریکی تھی۔ سرسراتے پردوں کی آہٹیں۔ میرے دھیان کی ننھی چڑیا میرے سر پر بیٹھی چوں چوں کر رہی تھی۔
پارس نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر کھڑکی سے ٹیک لگا لی۔ دھوپ اس کے عقب میں روزنوں سے جھانکنے لگی تھی۔
"سر! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟"
ننھی چڑیا کے پھڑ پھڑاتے پر ساکن ہو گئے۔ اس نے سہمی ہوئی آنکھیں پٹپٹائیں اور در و دیوار سے سر ٹکانے لگی۔ مگر سارے دریچے، سارے روزن بند تھے۔ میرے شعور میں میرا ماضی جاگنے لگا تو میں پارس کے عقب میں دھوپ کی آنکھ مچولی دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔
"کیا میں نے کسی سے محبت کی ہے۔"
اور اونگھتا ہوا ماضی یونہی بے خیالی میں آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ ماں کی چارپائی کے پاس، میرے اردگرد میرے جیسے کئی بچوں کا شور جاگنے لگا۔ میرے ذہن کی دہلیز پر بغیر خوشبو کے رنگ برنگے پھول بکھرے تھے۔
اور وہ دو آنکھیں اور ان نیم مردہ آنکھوں میں منجمد ہراساں سی مسکراہٹ۔
"ہاں، کی ہے میں نے محبت۔ آج تک کرتا آ رہا ہوں۔ ان دو آنکھوں میں ابھرتی مسکراہٹ سے۔ جو صرف مجھے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔"
"مگر وہ صرف مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائی تھیں۔" شاید وہ جانتی تھیں۔ میں ان میں سے ہوں، مگر ان جیسا نہیں۔
اور ان دو آنکھوں کی محبت بھری مسکان کے سہارے ہی تو میں "مٹھو" سے آکاش بنا تھا۔
"سر! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ کسی لڑکی سے؟"
سوال وہی تھا مگر ذرا سے اضافے کے ساتھ۔ ننھی چڑیا اڑنے کو بے تاب تھی۔ میرے ذہن و دل کے دروازوں سے ٹکراتی اور چوں چوں کر کے شور مچاتی تھی۔
"کسی لڑکی سے محبت بھلا کیسے کی جاتی ہے؟" یہ آکاش فیروز کا خود سے سوال تھا۔ اس

آکاش کا، جس کا قلم محبت لکھتا تھا۔

بھلا میں کسی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا تھا۔ میرے خیال کی زمین پر تو آج بھی جھونپڑے اُگتے ہیں۔ گندی نالیاں بہتی ہیں۔ جہاں محنت کے بدلے بھوک کاشت ہوتی تھی۔ میں جو آج بھی اپنے ماضی کی سنسان و ویران سڑک پر کھڑا خالی ہاتھ ہلا رہا ہوں، بھلا کسی لڑکی سے محبت کیسے کر سکتا تھا۔

میں یہ سب پارس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس تلخ سی ہنسی ہنستا رہا۔

"ہاں مگر وہ ایک لڑکی ہے کومل۔" میرے دھیان کی ننھی چڑیا پھر سے اڑی اور دل کی منڈیر پر آ بیٹھی۔ اس کی چہچہاہٹ کسی مدھر وسندر گیت میں ڈھل گئی۔

وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ وہ سامنے ہوتی ہے تو میں سنتا رہتا ہوں۔ جب چلی جاتی ہے تو بس سوچتا ہوں۔ تم اس سے لڑتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ تمہاری باتیں کرتی ہے تو اداس ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھے "آکاش" کہتی ہے تو مجھے لگتا ہے۔ میں پھیل کر پوری کائنات پر چھا گیا ہوں۔ وہ خفا ہوتی ہے تو لگتا ہے ساری کائنات خاموش ہے، چپ اور گم صم۔ اس کی آنکھوں کے نیلے آئینے پر غبار چھاتا ہے تو نہ جانے کیوں...... نہ جانے میری آنکھیں کیوں دھندلا جاتی ہیں۔

"مگر تم یہ مت سمجھنا میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔"

مجھے لگا میں نے اس پل خود سے اور پارس سے جھوٹ بولا تھا۔ یا شاید میں تب آگہی کی اس منزل تک پہنچ ہی نہ پایا تھا۔ مگر میں نے یہ سب پارس سے نہیں کہا۔ میں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سوال سے میرے جواب تک کا فاصلہ خاموشی تھا۔

"نہیں، میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔"

تب پارس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور میری طرف جھکا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے تمتما رہا تھا اور دھوپ قدرے آزاد ہو کر کھڑکی کی درزوں سے جھانکنے لگی تھی۔

"سر! مجھے...... مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھلی تھی اور میں اس کے بعد سارے سوال بھول گیا تھا۔

* * *

نہر کے کنارے کنارے میں بہت دور تک نکل جانا چاہتا تھا۔

بھری دوپہر تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی۔ نہر کا پانی ساکن اور پرندوں کی آوازیں سوئی جاگی سی ہیں اور بائیں ہاتھ نظر آنے والے بنگلے خاموشی اور دھوپ میں ڈوبے تھے۔

"ہیلو سر!" نہ جانے یہ لڑکا مجھے ہر جگہ اور ہر وقت کیوں ٹکرا جاتا تھا۔

"سوچنے کے لئے یہ واقعی آئیڈیل جگہ ہے۔" وہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

"نہیں، میں کچھ سوچ نہیں رہا۔ بس یونہی۔"

"سر! یہ جگہ پکنک منانے کے لئے آئیڈیل ہے نا؟"

کافی دنوں بعد وہ پھر سے اپنی پرانی جون میں نظر آ رہا تھا۔ خوش باش اور لاپروا۔

"کومل سے تمہاری صلح ہو گئی؟"

"ہاں، ہو گئی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے بکھرے بال سیٹ کرتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولا۔

"اس دفعہ وہ واقعی خفا ہو گئی تھی۔ جب تک میں نے اسے بتا نہیں دیا کہ......"

"تم نے اسے بتا دیا۔" میں نے بے تابانہ اس کی بات کاٹی۔

"ظاہر ہے سر! اس کو نہیں بتاتا تو کسے بتاتا۔"

"ہاں۔" میں گم صم سا ہو گیا تھا۔

"سر! آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے بہت ٹٹولتی اور کھوجتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔" میرا لہجہ خود بخود سپاٹ سا ہو گیا تھا۔

"یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔"

"تو پھر سر ہو جائے ایک پکنک، ہماری صلح کی خوشی میں۔ ویسے ہم لوگ اکثر یہاں پکنک مناتے ہیں۔"

"تمہاری جاب کا کیا بنا؟"

"جاب۔ ہاں اب تو ڈھونڈنا ہی پڑے گی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

"تو پھر سر شام کو گھر آیئے گا، سب مل کر پلان کریں گے۔"

شام کو میرا بالکل ارادہ نہ تھا۔ مگر کومل خود بلانے آ گئی۔

"پارس کہہ رہا تھا۔ آپ نہیں آئیں گے۔"

میں نے معذرت کرنا چاہی تو وہ خفا ہونے لگی۔

"ہمیں پتا ہے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا مگر آکاش صاحب! آپ کا یہاں ہونا ہمارے لئے آنر ہے۔ آپ کو کیا معلوم ہم آپ کی کمپنی میں کتنا انجوائے کرتے ہیں۔ اگر آپ کی

"ڈسٹربنس کا خیال نہ ہو تو، خیر......"

اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"تو آپ نہیں آ رہے۔"

خفا ہو کر اس کا لہجہ کتنا بیگانہ سا مگر خوبصورت ہو گیا تھا اور میرے پاس اب انکار کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ سو میں اس کے ساتھ آ گیا۔ چھوٹے سے لاؤنج میں ہنگامہ سا ہو رہا تھا۔ بٹ سسٹرز بھی موجود تھیں۔

"لیں، وہ آ گئے۔" پارس چہکا۔ "نکالو سو روپیہ۔"

حیا نے برا سا منہ بنا کر سو روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ شرط ہار گئی تھی۔

"شام کو آئس کریم میری طرف سے۔" پارس نے فضا میں نوٹ لہرایا۔

"شرم نہیں آتی۔ اس سے پیسے لیتے ہوئے۔" پارس کی امی نے اسے گھرکا۔

"امی! اس نے خود شرط لگائی تھی کہ آکاش صاحب نہیں آئیں گے۔"

"لے کر تو میں آئی ہوں۔ یہ پیسے مجھے ملنے چاہئیں۔" کومل بول اٹھی۔

"حضور آپ لے لیجئے۔" وہ دونوں ہتھیلیوں پر نوٹ رکھ کر جھکا۔

"سدھر جاؤ۔" کومل نے اس کے بال کھینچ کر کہا۔ پھر میری طرف پلٹی۔ "آپ بیٹھیں نا۔"

پھر وہ سب پکنک ڈسکس کرنے لگے۔ پارس آج بڑی موج میں تھا۔ میری نگاہیں بار بار کومل کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا رویہ معمول کے مطابق تھا۔ بس جب پارس زیادہ موج میں آتا تو وہ تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورتی تھی۔ پھر آخر میں فیصلہ ہوا کہ یہ پکنک ون ڈش پارٹی ہوگی۔ ڈشز کا فیصلہ کرتے ہوئے بھی جھگڑا ہو گیا۔ اپنی امی کے بار بار گھورنے کے باوجود پارس بضد تھا۔ کیونکہ وہ بے روزگار ہے، سو اسے سب سے سستی ڈش دی جائے۔

"تمہیں تو نہ جانے کب تک بے روزگار رہنا ہے۔" حیا نے منہ بنایا۔

"تم دعا کرو تو میں بہت جلد برسر روزگار ہو جاؤں گا۔ چاہے گنڈیریوں کا ٹھیلا کیوں نہ لگا لوں۔" وہ اس کی طرف جھک کر بولا تھا۔

"ہاں، تمہاری یہی اوقات ہے اور مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے لئے دعائیں کرنے کی۔ کومل سے کہو۔" وہ قدرے جل کر بولی تھی۔ اپنے نام پر فروا سے باتیں کرتی کومل چونکی۔

"بھئی میں تو ہمیشہ اس کے لئے دعائیں کرتی ہوں۔ پر لگتا ہے میری دعاؤں میں اثر

ہی نہیں ہے۔" وہ فطری سادگی کے ساتھ بولی تھی۔

"نہیں، میں کسی کی بددعا کے زیر اثر ہوں۔" پارس نے ایک بار پھر حیا کو چھیڑا تھا۔

"میں نے کبھی تمہیں بددعا نہیں دی۔" حیا نے احتجاج کیا تو پارس نے فوراً نعرہ لگایا۔

"چورنی کی چٹیا میں جھاڑو۔"

اس بات پر دونوں میں ٹھیک ٹھاک لڑائی تھی۔ اسی دوران پکنک کے لئے دن کا تعین بھی کر لیا گیا اور صلح کے لئے پارس فریج سے ٹھنڈے ٹھار خربوزے نکال لایا تھا۔

"ارے بھئی، مجھے بھی تو بتاؤ، میں کیا لے کر آؤں؟" میں نے پوچھا تو کومل فوراً بول اٹھی۔

"آپ کچھ مت لائیں۔ آپ تو ہمارے چیف گیسٹ ہوں گے۔"

سب نے اس کی تائید کی تھی، مگر مجھے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ تب ہی جب میں "پزا" لے کر وہاں پہنچا تو وہ سب نرم نرم گھاس پر سراجمان لڈو کھیلنے میں مصروف تھیں۔ جبکہ کومل پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی تھی۔ پارس غائب تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" شمزا نے پزا تھام کر ٹوکری میں رکھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگا خالی ہاتھ آنا۔"

کومل نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ذرا سا مسکرائی اور پھر سے پاؤں سے چھینٹے اڑانے لگی۔

"پارس کہاں غائب ہے؟" میں نے کومل کو دیکھا۔ وہ ذرا جھک کر پھول توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب ہی اس نے ننھا سا سرخ پھول توڑ کر میری طرف بڑھایا۔

"ہم کب سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے تحیر سے اسے دیکھا۔ نیلے کانچ جگر جگر کر رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے پھول اس کے ہاتھ سے لیا۔ ہتھیلی پر وہ ننھا سا پھول رکھ کر میں نے غور سے دیکھا۔ پھول کا رنگ شوخ اور چمکدار تھا۔ میں نے آہستگی سے مٹھی بند کر لی۔ کومل دوبارہ پانی سے کھیل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی تراش میں بڑی مبہم سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

میں نے ذرا ہٹ کر درخت سے ٹیک لگائی اور نہر کے پانیوں میں جھانکنے لگا۔ یہ جگہ واقعی بہت خوبصورت اور پرسکون تھی۔ ہر طرف زمردیں گھاس کی چادر بچھی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے نیلے، پیلے، سرخ، کاسنی، بنفشی خودرو پھولوں کی بہتات تھی۔ جیسے قدرت نے ساتوں رنگوں کے چھینٹے یونہی بے خیالی میں اِدھر سے اُدھر بکھیر دیئے ہوں۔ دونوں اطراف سے شیشم کے درختوں کی چوٹیوں نے مل کر نہر پر چھت ڈال دی تھی۔ اس میں

سے دھوپ یوں چھن چھن کر پانی پر پڑ رہی تھی جیسے چاندی کے سکے یہاں سے وہاں تک بہتے جا رہے ہوں۔ فضا میں سبز پانیوں کی خوشبو نے خوشگواریت پیدا کر دی تھی۔ اس سارے ہنگامے سے بے خبر میرا سارا دھیان میری بند مٹھی کی طرف تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا، میرے ہاتھ پر رنگ ہی رنگ اتر آئے ہوں۔

خواہشوں اور خوابوں کے رنگ
آرزوؤں اور تمناؤں کے رنگ

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ سارے رنگ بکھر گئے۔ بے اختیار میری مٹھی بھینچ گئی تھی اور جب کھلی تو مسلا ہوا پھول ہتھیلی سے پھسل کر پانی میں جا گرا اور بہتا ہوا بہت دور تک جا نکلا تھا۔ میں ہاتھ جھاڑ کر پلٹا اور ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھا۔ ہاں میں نے اتنا دیکھا۔ نیلگوں آئینے دھندلا گئے اور دوسرے پل وہ رخ بدل گئی۔

میں ابھی یونہی خالی الذہنی کی کیفیت میں کھڑا تھا۔ جب پارس چلا آیا۔

"یہ کیا ہے؟" شزا نے بے اختیار پوچھا۔ جس کا جواب پارس کے ہاتھوں سے لڑھکتے ہوئے تین بڑے بڑے تربوز تھے۔ ایک فروا کی گود میں گرا، دوسرا حیا کے پاؤں پر اور چوتھا کومل سے ٹکرا کر پانی میں جا گرا اور خود پارس گھاس پر ڈھیر ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" کومل جھنجھلا کر پلٹی۔

"بدتمیزی نہیں، تربوز ہے۔" پارس نے سر اٹھا کر آگاہ کیا اور پھر سے گرا لیا۔

"تو تمہارے ذمے یہ تھا۔"

میں نے پانی میں تیرتا تربوز نکال کر گھاس پر رکھا۔

"یہ ہمیشہ سے کنجوس ہے۔ ہم نے اسے کہا تھا کچھ پھل لے آئے اور یہ تربوز اٹھا لایا ہے۔" حیا نے کہا تو پارس اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں، یہ اتنے بڑے بڑے تین عدد پھل نظر نہیں آتے تمہیں۔"

"اور سب سے سستا یہی پھل نظر آیا ہوگا تمہیں۔"

"جی۔ سب سے سستا یہی پھل تھا اور میں بے روزگار ہوں۔" اس نے حیا کی نقل اتاری اور ساتھ ہی مطلع بھی کیا۔

وہ دن میری زندگی کا ایک خوشگوار اور یادگار دن تھا، مگر قدرے اداس بھی۔ بظاہر میں خوش تھا مگر اندر دل کے نہاں خانوں میں خاموشی کی تہہ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ شزا نے پارسل گیم میں اپنی باری پر لطیفے سنا سنا کر خوب ہنسایا۔ وہ باقاعدہ ساتھ ایکٹ کر رہی تھی۔ فروا نے

الٹی گنتی سو سے سنائی تھی۔ وہ اٹھانوے پر ہی اٹک گئی۔ حیا نے ایک بہت خوبصورت گیت سنایا۔ اس کی آواز بھی پیاری تھی۔ گیت کی فرمائش مجھ سے بھی ہوئی تھی، مگر میں نے معذرت کر کے بس ایک شعر سنانے پر اکتفا کیا تھا۔ کومل کے پاس پرچی آئی تو میں نے یونہی ذرا سا جھک کر اس کے ساتھ پڑھا تھا۔

"دائیں طرف بیٹھے شخص کو رومینٹک ڈائیلاگ سنائیں۔"

اس کا چہرہ ایکدم سرخ ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے پرچی پھاڑ کر پانی میں پھینک دی تھی۔ اس کے دائیں طرف میں بیٹھا تھا۔

"کیا تھا؟" سب نے شور مچا دیا۔

"ایکدم فضول تھا۔" وہ منہ بنا کر اگلی پرچی اٹھانے لگی۔ میں گھاس اکھیڑتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ابھی میرے اور اس کے درمیان سے پارس اٹھ کر پیپسی لینے گیا تھا۔ اگر وہ یہاں اس کے دائیں طرف بیٹھا ہوتا تو کیا تب بھی وہ یہی کرتی۔ میری ان ہی سوچوں کے درمیان پارس نے پرچی اٹھائی تھی۔

"اپنی پسندیدہ ہستی کو پھول پیش کریں۔"

"اگر وہ یہاں موجود نہ ہو تو؟" اس نے کان کھجاتے ہوئے پوچھا۔

"اٹس امپاسیبل۔" سب نے ایکدم کہا۔

"او کے۔" اس نے تیزی سے نہر کے کنارے سے کئی پھول توڑے۔ انہیں ایک گلدستے کی شکل دیتے ہوئے اس کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ سب منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تب ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے گلدستہ میری طرف بڑھایا۔

"اٹس جسٹ فار یو سر۔"

"اف۔" شزا نے سر پر ہاتھ مارا۔ "پارس بھیا! ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ آپ یہ پھول کسی اور کو دیں گے۔"

"ڈیئر سسٹر! میں کسی کو خفا نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے سب کی خدمت میں ایک ایک پھول پیش کیا۔

"یونہی ہر کسی کو پھول نہیں دیتے پارس! کیا معلوم ہماری دی ہوئی چیز کسی کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔"

کومل نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ میں اپنی جگہ گڑ کر رہ گیا۔

"ڈیئر فرینڈ!" پارس نے اس کی ہتھیلی کھول کر اس پر کاسنی کا پھول رکھا۔

"میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جسے میں دے رہا ہوں، وہ میرے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔"

اس کی اس عجیب منطق پر کومل نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"تم واقعی بہت اچھے ہو پارس۔" کومل بے اختیار بولی تھی۔ میں لب بھینچ کر رہ گیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ اب کچھ کھایا جائے۔"

پارس نے کہا تو باسکٹ کا منہ کھل گیا۔

"کہاں کھو گئے سر۔" پارس نے ہاتھ ہلایا، تو میں چونکا۔

"سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں پارس۔" میرے لہجے میں رشک تھا۔

"اس کی ایک وجہ ہے سر۔" وہ گہری سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"وہ کیا؟" میرے ساتھ ساتھ باقی لوگ بھی متوجہ ہوئے۔

"میں اس کالونی کا واحد کنوارہ لڑکا ہوں۔"

"یو۔" وہ سب کی سب ایک ساتھ چیخیں اور دوسرے لمحے پارس نہر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

* * *

گرمی کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ فضاؤں میں ہر پل اک سلگتی ہوئی خاموشی کا راج رہتا۔ کھڑکی میں سے جھانکتے عشق پیچاں کے پھول پتے عجب بیزار بیزار سے دکھائی دیتے۔ میں سارا دن کھڑکی میں بیٹھا بھری دوپہر میں جھانکتا اور سگریٹ پھونکتا رہتا تھا۔ پارس ان دنوں اپنی ساری صلاحیتیں جاب کے حصول کے لئے صرف کرتا رہتا، سو کم کم آتا مگر آتا ضرور تھا۔ کومل نے تو آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار یونہی راہ چلتے آتے جاتے گھڑی دو گھڑی کی ملاقات ہوتی تھی اور بس۔ یا پھر کوئی اچھی چیز بنتی تو کرنل صاحب ملازم کے ہاتھوں بھجوا دیتے۔

اور میں کبھی کبھی اکتا جاتا تو نہر کے کنارے چلا آتا۔ نرم مخملیں گھاس پر آنکھیں موندے لیٹنا اور پھر گھنٹوں سوچنا عادت سی بنتی جا رہی تھی۔

اس دن پھر سنسان سڑک پر نظریں گاڑے میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ جب اسلم آج کی ڈاک لے کر آ گیا۔ میں نے بددلی سے ان لفافوں پر نظر ڈالی۔ دو تین انویٹیشن کارڈ تھے۔ کچھ خطوط میرے قارئین کی طرف سے تھے۔ سعودیہ کا لفافہ دیکھ کر میں نے بے تابی سے لفافہ کھولا۔

"تم انتہائی فضول اور گدھے ہو آکاش۔"

سلام دعا کے بعد پہلا فقرہ یہی تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ظاہر ہے اس بے تکلفی کے ساتھ مجھے آپا کے سوا کون پکار سکتا تھا۔ انہوں نے میرے خوب کان کھینچے تھے کہ میں نے انہیں اتا پتا کیوں نہیں دیا۔ ابھی بھی انہوں نے یہ خط مجید صاحب کے پتے پر بھجوایا تھا اور خوشی کی خبر یہ تھی کہ عامر بھائی میرے بہنوئی مستقل پاکستان شفٹ ہو رہے تھے۔ پہلے عامر کو یہاں آ کر اپنا بزنس سیٹ کرنا تھا۔ پھر آپا اور بچوں کو آنا تھا کہ آپا کی پوری سسرال وہیں سعودیہ میں رہائش پذیر تھی۔ آپا نے زور دیا تھا کہ جب عامر آئیں تو میں انہیں نہ صرف خود ریسیو کرنے جاؤں، بلکہ بزنس کے سلسلے میں جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کروں۔

اور یہ بھی لکھا تھا کہ میں سخت ست ہوں کہ ابھی تک اپنے لئے کوئی لڑکی تلاش نہیں کر سکا۔ سو میں تیار رہوں، وہ پاکستان آتے ہی میری شادی کر دیں گی اور انداز کچھ کہنے کا یہ تھا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا لکھنا پڑھنا اور کتابوں سے عشق۔ آرام سے شادی کر کے گھر بساؤ۔ تا کہ میں بھی دھڑلے سے بھائی کے گھر رہنے آ سکوں۔"

اور آخر میں انتہائی دلگیر جذباتی انداز میں لکھا تھا۔

"آکاش! میرے بھائی! میرے میکے کا مان تو اب تم ہی سے قائم ہے۔"

آپا کے آنے کی خبر نے میرے اندر خوشی کی رمق جلا دی تھی۔ وہ اس دنیا میں میری واحد رشتے دار تھیں۔ میں نے انہیں فوراً خط لکھنے کا قصد کیا۔ کاغذ، قلم اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اور باقی ڈاک کو یکسر نظرانداز کر کے میں نہر کنارے چلا آیا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ کومل نے دونوں ہتھیلیوں میں کتنے ہی پھول سنبھال رکھے تھے۔

"آیئے سر! یہ دیکھیں کومل کتنے بڑے مسئلے سے دوچار ہے۔" مجھے دیکھتے ہی پارس بول اٹھا۔ کومل نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"دیکھو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تھا۔" وہ قدرے غصے سے بولی تھی۔ مجھے اس وقت اپنی مداخلت بہت بری لگی تھی۔ میں واپس پلٹ جاتا مگر اب یہ ممکن نہ تھا۔ میں وہیں کچھ فاصلے پر درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"سر! آپ ناول لکھنے آئے ہیں؟" پارس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"سر! برف کے گولے کھائے ہیں کبھی آپ نے؟" پارس نے اشتیاق سے پوچھا۔ تب

میں نے دیکھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر گولے والا اپنا سائیکل روک کر ذرا ستانے بیٹھا تھا اور وہیں اونگھنے لگا تھا۔

''بچپن میں واحد یہی عیاشی تو نصیب ہوتی تھی اور وہ بھی کبھی کبھار۔'' پارس اٹھ کر گولے والے کے پاس چلا گیا۔

''او بھائی، برف ہے۔''

''ہے بابو جی۔'' وہ ہڑبڑا کر جاگا۔

''اور فالودہ۔'' اس نے خود ہی ڈھکن اٹھا کر جھانکا۔

''ہے جی۔''

''پارس! میں بھی کھاؤں گی۔'' کومل نے پکار کر کہا۔

''یہ تیسرا پیالہ ہے تمہارا۔'' پارس نے گھورا۔ کومل سر جھٹک کر میری طرف توجہ دیئے بغیر مزید پھول توڑنے لگی۔

''کہاں غائب رہتی ہیں کومل آپ؟'' میں نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

آج وہ پورے دو دن بعد مجھے نظر آئی تھی۔ کومل نے قدرے بے یقینی سے مجھے دیکھا پھر سر جھٹک کر اس نے ہاتھ بلند کئے اور سارے پھول پانی میں گرا دیئے۔

''یہیں ہوتی ہوں۔''

''اچھا۔''

''میں نے آپ کا ناول پڑھا تھا پارس سے لے کر ''آرزو'' آپ اچھا لکھتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے تعریف کی۔ جسے میں نے بہت سنبھال کر دل میں رکھ لیا۔

''ایک بات تو بتائیں آکاش صاحب۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''آپ حقیقت سے نظریں ملانا نہیں چاہتے یا ملانے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔''

''زندگی ایک سفاک حقیقت ہے۔ آپ اسے خوشنما خواب بنا دیتے ہیں۔ ایک خوشنما پیراہن اوڑھا دیتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آئینے کا دوسرا رخ نہ دیکھ سکیں۔''

''آپ کو میری تحریر کی یہ خامی اچھی نہیں لگی۔'' میں نے ذرا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔

''ایسا تو نہیں ہے۔ میں تو بس ایک بات کر رہی تھی۔''

''کومل!'' میں سیدھا ہو گیا۔ ''ان تلخ و بے رحم حقیقتوں نے انسان کو بہت ہراساں کر دیا

ہے۔ میں تو ان ڈری سہی آنکھوں میں اک ذرا سا خواب بھر دیتا ہوں۔ یہ خواب امید کا دوسرا نام ہی تو ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ میں حقیقت شناس تو ہوں، حقیقت پسند نہیں۔ اور پھر میں تو وہی لکھ رہا ہوں جو ہمارے اندر موجود تو ہے مگر ہم بھول گئے ہیں۔ حقیقت سفاک اور زندگی بے رحم ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پھول کھلنے بند ہو گئے۔ آسمان پر چاند نہیں چمکتا۔ رات کی رانی نے مہکنا چھوڑ دیا یا صبح کو برگ گل پر شبنم نہیں اترتی۔ کومل! ہم شبنم کو آنکھ کا آنسو کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ اسے رُتوں کا سنگھار کیوں نہیں کہتے۔''

کومل متحیر سی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''اینی وے۔ یہ بھی ہماری زندگی کا ایک رخ ہے۔'' میں نے پارس کو آتے دیکھ کر تقریباً بات ختم کر دی۔

''لیں سر جی! ٹھنڈا ٹھار فالودہ۔'' اس نے پیالے ہم دونوں کی طرف بڑھائے پھر اپنا پیالہ لے کر میرے پاس آ بیٹھا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''

''ان کی تحریر کے بارے میں۔'' کومل نے بتایا۔

''سر! آپ نے اس دن میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔'' ٹھنڈے فالودے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پارس نے پوچھا۔

''کون سا سوال؟''

''آپ نے محبت کی ہے؟'' اب کہ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں نے سنبھل کر کومل کی طرف دیکھا اور الٹا سوال داغا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا'' اس نے مسکراتے ہوئے کومل کی طرف دیکھا۔ وہ دانستہ اپنی نظریں پیالے پر مرکوز کئے ہوئے تھی۔

''میرا خیال ہے کہ آج سے پہلے تک تو نہیں کی۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟'' مجھے مزا آنے لگا۔

کہتے ہیں تحریر کسی حد تک لکھنے والے کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور آپ کی تحریروں سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ نے ابھی تک محبت کی وادی پرُخار کا سفر نہیں کیا۔ آپ کے نزدیک محبت یوں ہے جیسے پہاڑ پر کھڑے ہو کسی خوابناک و نیلگوں دھند میں ڈوبی کسی وادی کو دیکھنا۔ جبکہ سورج کی ہلکی زرد کرنوں کا غبار وادی کے درختوں پر چھایا ہو۔ ذرا

محسوس کریں۔ یہ کس قدر دلکش اور رومینٹک ہے اور جیسے کوئی تتلی رستہ بھول کر آپ کے چمن میں آ گئی ہو۔ ایک خوش رنگ اور خوبصورت تتلی۔ اب نہ وہ واپس جانا چاہتی ہے اور نہ آپ اسے چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کی محبت پھولوں کے کھلنے سے شروع ہو کر پھول کھلنے تک ہی محدود رہتی ہے۔

ایک خوش گلو پرندہ جسے خبر ہی نہیں کہ کبھی خزاں بھی آئے گی۔"

"بہت خوب۔ تم تو بہت اچھے نقاد یا شاعر بن سکتے ہو مگر پارس! اس سے یہ اندازہ کیسے ہوتا ہے کہ میں نے ابھی تک محبت نہیں کی۔" میں نے پیالہ گھاس پر رکھ دیا۔

"اس لئے سر! کہ محبت میں کھو دینے کا خدشہ آپ سے ایک قدم آگے ہوتا ہے۔" وہ عجیب پُراسرار لہجے میں بولا تھا۔ "ہجر کا خوف وصل کی خواہش سے بھی پہلے آنکھوں میں جگہ پاتا ہے۔"

میری اور کومل کی نگاہیں بے اختیار ملی تھیں۔ نیلے سمندروں میں تحیر آمیز دھند چھائی تھی۔ جس کے عقب میں کوئی خوف بے مہر ہواؤں کے مقابل بادبانی کشتی کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔

"اور یہ پارس۔" میں نے سر جھکا کر خاموش بیٹھے پارس کو دیکھا۔ وہ سرتاپا ہجر کے خوف میں ڈوبا گم صم تھا۔ میں نے لب بھینچ کر پانی میں جھانکا۔

"اف میرے خدا۔"

پانی کی شفاف سطح پر دو آنکھیں ابھری تھیں۔ یقیناً وہ آنکھیں میری ہی تھیں۔

مگر...... مگر وہ آنکھیں اتنی ڈری، سہمی اور خوفزدہ کیوں تھیں؟

* * *

"بس وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔"

میں نے بارہا خود کو یہی باور کروانے کی کوشش کی تھی مگر جب بھی یہ کوشش کی میرے دھیان کی ننھی چڑیا پھر سے اڑی اور دل کی منڈیر پر بیٹھ کر چوں چوں کرنے لگتی تھی۔ سوچ کا دانہ اس کے منہ سے پھسل کر دل کے کسی خالی کونے میں لڑھک گیا اور میں ہار گیا تھا۔ تب ہی جب کومل مجھے پارس کے ساتھ نظر آتی ہے تو میں راستہ بدل لیتا ہوں۔ وہ کھڑکی کے عین نیچے کھڑے ہو کر مجھے پکارتے ہیں تو میں بہرہ بن جاتا ہوں اور جب کبھی وہ آ جائیں تو ٹکر ٹکر ان کی شکل دیکھتا ہوں۔

مجھے تو شاید یہ بھی یاد نہیں کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیا کر رہا ہوں اور مجھے کیا کرنا

ہے؟

مگر میں کس سے بھاگ رہا ہوں؟

اس انکشاف سے، جو مجھ پر ہوا۔

یا اس اعتراف سے، جو میں نے خود کیا۔

ہاں مجھے کومل سے محبت ہو گئی ہے۔

مگر محبت جرم تو نہیں۔ پھر میں کیوں سب سے منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔

"کاش میں یہاں آیا نہ ہوتا۔ آ گیا تھا تو مجھے کومل نہ ملتی اور اگر مل گئی تھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو جاتی۔ جو محبت...... تو پھر یہ پارس درمیان میں کیوں؟"

* * *

مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے تھا مگر میں وہیں موجود تھا۔ نہ جانے کون سی سوچ میرے گرد پہرا دیتی تھی کہ میں چاہنے کے باوجود یہاں سے نہیں جا سکتا۔ بس ایک فرار تھا۔ تب ہی عامر آ گیا اور میں سارا سارا دن اس کے ساتھ آفس کے لئے زمین اور گھر ڈھونڈنے لگا۔ اتفاق سے اسے اچھی جگہ پر گھر اور آفس بنا بنایا مل گیا تو اسے اپنا بزنس سیٹ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ پیسہ اور تجربہ موجود ہو تو مشکلیں خود بخود آسان ہو جاتی ہیں اور ایک دن وہیں عامر کے آفس کے دروازے پر پارس ٹکرا گیا۔

"ارے سر! آپ۔" وہ لپک کر میرے قریب آیا تھا۔

"ہاں میں۔" بہت دنوں بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

"سر! کہاں غائب رہتے ہیں آپ؟"

"خود سے بھاگ رہا ہوں۔"

"جی۔" اس نے تحیر سے مجھے دیکھا تو میں سنبھل گیا۔

"تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

"سر! انٹرویو دینے آیا تھا۔"

"کیسا ہوا؟"

"انٹرویو تو بہت اچھا ہوا سر!" اس نے خوش ہو کر بتایا پھر میرے ہاتھ تھام کر قدرے لجاجت سے بولا۔

"سر! پلیز آپ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ آپ جانتے ہیں یہ جاب میرے لئے کتنی اہم ہے۔ اگر اب بھی مجھے جاب نہ ملی تو نقصان ہو جائے گا۔ بہت بڑا نقصان۔" وہ جذباتی سا ہو

رہا تھا۔ میں نے بروقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔

"آپ کے یہاں کوئی واقف ہیں؟" اس نے نہ جانے کس امید کے تحت پوچھا۔ میں ایک لمحے کو سوچ میں ڈوبا اور دوسرے لمحے میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں یہاں کسی کام سے آیا تھا۔"

"اچھا" وہ مایوس سا ہو گیا۔ "چلتا ہوں میں۔ ایک اور جگہ بھی انٹرویو دینا ہے۔"

میں نے وہیں کھڑے ہو کر اسے دور تک جاتے دیکھا اور عامر سے ملے بغیر واپس آ گیا تھا۔

* * *

"بھئی آکاش بیٹا! تم غائب کہاں رہتے ہو؟" آج کل اکثر لوگوں کو مجھ سے یہی شکایت رہتی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کرنل صاحب پودوں کو پانی دے رہے تھے۔

"کچھ کام تھے، ان ہی میں مصروف تھا۔" یہ کہہ کر میں رکا نہیں، یونہی اندر چلا آیا۔ مجھے یقین ہے کرنل صاحب نے میرے اس طرز عمل کو بڑی حیرت سے دیکھا ہوگا مگر مجھے اس وقت کسی کی پروا نہیں تھی۔ اندر جاتے ہی ایک اور کوفت پارس کی موجودگی کی صورت اٹھانا پڑی۔

"میں کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں؟"

"کوئی کام تھا؟" میرے اس قدر فارمل لہجے پر وہ ٹھٹک کر مجھے دیکھنے لگا پھر سر جھٹک کر بولا۔

"سر! میں آپ کو انوائٹ کرنے آیا ہوں۔"

"کہاں؟" میرا لہجہ سپاٹ تھا مگر وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

"سر! کل کومل کی برتھ ڈے ہے۔"

"تو کومل کو انوائٹ کرنا چاہئے تھا۔"

"وہ کب سیلیبریٹ کرتی ہے۔ سب کچھ تو ہم کرتے ہیں۔" وہ ہنس دیا تھا۔

"پارس! کل تو شاید میں نہ آ سکوں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں انکار کیا تھا، دل پر پتھر رکھ کر۔

"کل آپ کہیں جا رہے ہیں سر؟" وہ قدرے خاموش سا ہو کر پوچھنے لگا۔

"پارس! مجھے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔"

پتا نہیں میں اس لمحے اتنا خشک سا کیوں ہو گیا تھا۔ خود بھی سوچتا ہوں تو ندامت ہونے لگتی ہے اور پارس کی حیران، بے یقین نگاہیں میرے چہرے پر گڑی تھیں اور میں ان نگاہوں

کی چبھن سے بچنے کے لئے ہی سگریٹ سلگانے لگا تھا۔

"بہرحال سر! آپ آنا چاہیں یا نہیں۔ ہم لوگ آپ کا انتظار ضرور کریں گے۔"

وہ آہستگی و مایوسی سے کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ تب مجھے اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوا۔

"پارس!" میں نے پکارا تو وہ رک گیا۔

"تمہاری جاب کا کیا بنا؟"

"کون سی جاب؟"

"وہ اس دن جو تم انٹرویو دینے گئے تھے۔"

"سر! انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا رویہ بھی حوصلہ افزا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا پھر میں......" اس کی آنکھیں ایک دم جگمگائیں اور میرے اندر حسد کی آگ سلگا گئیں۔ میں نے بڑی بے دردی سے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا۔ پارس چلا گیا تھا۔ تب ایک کمزور لمحے کی زد میں آ کر میں نے وہ کیا، جو مجھ جیسے شخص کو کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں نے عامر کو فون کیا تھا۔

"عامر! اس دن ایک لڑکا اظہار ندیم انٹرویو دینے آیا تھا۔"

"ہاں بھئی بہت بریلینٹ نوجوان ہے۔ ہم نے اسے اپائنٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"نہیں عامر بھائی! آپ اسے جاب نہیں دے رہے۔" میرا لہجہ سنگین و کٹھور تھا۔

"مگر آکاش۔"

"پلیز میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔" میں نے فون بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"میں نہیں تو تم بھی نہیں۔" یہ حسد کی آگ میں جھلستے ایک کمزور لمحے کا فیصلہ تھا۔

* * *

پھولوں کی نوخیز، دلفریب و مسحور کن خوشبو بھی مجھے میری منتشر خیالی سے نجات نہیں دلا سکی تھی۔ میرے سامنے رنگ ہی رنگ بکھرے تھے۔ آنکھوں کو تراوٹ بخشتے خوبصورت رنگ اور سرگوشیاں کرتی چنچل سی خوشبو نے پوری فضا کو مہکا دیا تھا۔ اس کے باوجود پھولوں کی دکان کے عین سامنے میں ٹھس سا کھڑا تھا۔ پھول والا پھولوں پر پانی چھڑکتے ہوئے کئی دفعہ مجھے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے کئی لوگ آئے اور پھول خرید کر چلے گئے۔ میں چند قدم آگے بڑھا۔

"وہ گلدستہ دکھاؤ۔" میں نے لمبی ڈنڈیوں والے ادھ کھلے سرخ گلابوں کے گلدستے کی طرف اشارہ کیا۔

(یونہی کسی کو پھول نہیں دیتے۔ کیا پتا ہماری دی ہوئی چیز کسی کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔)

میں نے گلدستہ ہاتھ میں لے کر ان ادھ کھلی کلیوں کو دھیرے سے چھوا۔

"کیا اس گلدستے کا حشر بھی وہی ہوگا جو میں نے اس کے دیئے پھول کے ساتھ کیا تھا۔" اگرچہ میں اب تک اپنی اس حرکت پر پشیمان تھا۔

"مگر اسے وہ پھول مجھے نہیں، پارس کو دینا چاہئے تھا۔" شاید مجھے غصہ اسی بات پر تھا۔

اس لمحہ جو جذبات میں اس کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا، وہ مفقود تھے۔

"مگر تم نے ان آنکھوں میں جھانکا ہی کب تھا۔ شاید......"

"اے دل خوش فہم!" میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور اسی تذبذب میں کھڑا رہا۔

"کیا اس کے لئے یہ تحفہ اہم ہوگا؟"

(میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جسے میں تحفہ دے رہا ہوں۔ وہ میرے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے)

اور میں نے وہ گلدستہ خرید لیا۔

خوشبو بھری رات نے دھیرے سے دھرتی پر پہلا قدم رکھا تھا۔ ہوا خوشگوار تھی اور فضا میں پھولوں کی باس اور رات کی رانی کی مہک کھلی ملی سی تھی۔ میں نے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا۔

روشنی، ہنگامہ اور آوازیں۔

وہ سب فوارے میں جلتی بجھتی روشنیوں میں مگن تھے۔ ٹیبل پر سجے لوازمات اور کیک شاید میری آمد کے منتظر تھے۔ میں کھلے گیٹ سے دو قدم اندر ہوا۔ نگاہوں کے عین سامنے وہ ہی تھی۔

سفید ڈھلکتا آنچل سنبھالتی وینس، خوش اور مگن
پارس اونچا اونچا گا رہا تھا
بند ہیں لب اور بولتی آنکھیں
آ کر میرے حسن میں جھانکیں

چھلکے میرے دل کا جام
"نام بتا دو نام"

وہ سب تالیاں پیٹ پیٹ کر اس سے پوچھ رہے تھے اور پارس مزید ترنگ میں آ گیا تھا۔ اس کی معنی خیز نگاہیں بار بار کومل کی طرف اٹھ رہی تھیں اور وہ حیا کے کندھے پر سر رکھے مسکرائے جا رہی تھی۔

خوشبو کا جھونکا ہو جیسے
شاعر نے سوچا ہو جیسے
جیسے مہ کش کا انجام
نام بتا دو نام
نام بتا دو نام

"بتا دوں؟" پارس نے گانا روک کر ایک دم پوچھا تھا۔

"ہاں، ہاں۔" سب نے شور مچا دیا تھا۔

"بھئی اس راز سے تو بس کومل ہی واقف ہے لیکن آج میں تم سب کو بتاؤں گا کہ مجھے......"

"نہیں، نہیں۔ پارس پلیز ابھی نہیں۔" کومل نے فوراً روکا۔

"نہیں، ابھی بتاؤ۔" وہ سب بضد تھے۔ کومل نے جھک کر پارس کے کان میں سرگوشی کی۔ تب میں دو قدم پیچھے ہٹا۔ پاس پڑی کرسی پر میں نے گلدستہ رکھا اور اگلے پل میں واپس چلا آیا تھا۔

* * *

"آکاش صاحب!"

میں نے کترا کر نکل جانا چاہا مگر وہ عین میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے رکنا پڑا۔

"جی۔" آف وائٹ کرتے دوپٹے میں وہ قدرے مختلف سی لگی تھی۔ پارس نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔

"ہاں، ہاں۔ پوچھو ان سے۔ یہ اس دن کیوں نہیں آئے تھے؟"

وہ وہیں جنگلے میں پاؤں پھنسائے گیٹ کے پاس کھڑی حیا سے باتیں کر رہا تھا۔

"میں۔" میں نے بمشکل خود کو کچھ کہنے کے لئے آمادہ کیا۔

"تھوڑی دور ساتھ چلیں گے۔" اس نے آہستگی سے میری بات قطع کی۔

"کہاں تک؟" میں کہہ کر خود ہی چور سا بن گیا تھا اس نے بے معنی سی نظر مجھ پر ڈالی۔

"آپ کی مرضی کے خلاف زیادہ دور تک نہیں لے جاؤں گی۔ بس تھوڑی دور نہر کے کنارے تک۔"

اگرچہ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ جاؤں مگر کسی معمول کی طرح میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھا دیئے تھے۔ وہی پرسکون نہر کا کنارہ تھا۔

کبھی میں نے گھنٹوں یہاں بیٹھ کر اسے اپنے سامنے محسوس کیا تھا۔ ہزاروں باتیں کی تھیں۔ آج وہ سامنے تھی تو میں گھبرا رہا تھا۔

"بیٹھیں نا۔" وہ خود بھی چپل اتار کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا تھا۔ وہ چپ تھی اور میں گم صم۔

"میں نے کل آپ کا بہت انتظار کیا تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ میں نے معذرت کے لئے الفاظ ڈھونڈنے چاہے مگر سارے اجنبی و بیگانہ بنے کونے کھدروں میں جا چھپے تھے۔

"نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ آپ آئیں گے؟"

"میں آنا چاہ رہا تھا مگر......"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔" اس نے رسانیت سے کہا۔ "ہم سب یہ بھول گئے تھے کہ آپ ایک مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ آپ کے پاس ان چھوٹی چھوٹی تقریبات میں شرکت کا وقت ہی کہاں ہوگا۔ وہ تو ہم ہی کبھی کبھی غلط توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ویسا ہی ہوگا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ حالانکہ ضروری نہیں دوسرے بھی آپ کے بارے میں وہی جذبات رکھتے ہوں جو آپ ان کے لئے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں کول! بس کبھی کبھی ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے جھک کر درخت سے ٹیک لگالی۔ اس کا بھیگا بھیگا لہجہ مجھے اندر تک توڑ گیا تھا۔

"ایک بات تو بتائیں آکاش صاحب۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا مگر آج اس کے لہجے میں مخصوص کھنک موجود نہ تھی۔

"یہ ہم اپنے اندر قید ہو کر کیوں رہ جاتے ہیں۔ کیا ہم کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتے یا یہ چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں خود کھوج لے۔ یہ ہماری بے چاری سی ذات پر اتنے سارے پردے کیوں لٹکتے رہتے ہیں۔ نہ ہم لوگوں کو دیکھ پائیں اور نہ لوگ ہمیں۔ اپنی ذات میں کھلنے والی ساری کھڑکیاں، سارے روزن اتنی سختی سے کیوں بند کر دیتے ہیں۔ کیا ہم چھپ جانا چاہتے ہیں یا منتظر رہتے ہیں کہ کوئی ہاتھ اٹھے اور دستک دے مگر ہم دستک کے منتظر کیوں رہتے

ہیں۔ خود بڑھ کر کھڑکی کیوں ہیں کھول دیتے۔ کیا ہم آنے والے کو یہ خوشی، یہ اعتبار نہیں دینا چاہتے کہ "آؤ! ہم تمہارے منتظر ہیں۔"

میرے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔

"کہیں اس نے آگے بڑھ کر مجھے کھوج تو نہیں لیا۔"

میں نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ چپ چاپ ایک ایک کر کے پھول توڑتی، ہاتھوں میں مسلتی اور نہر کے پانیوں میں پھینکتی جا رہی تھی۔

"میں...... میں کل آیا تھا۔" بہت دیر کے بعد میں نے بے وقت کہا۔ وہ ہلکی سی ہنس ہنس دی۔

"ہاں، پھول لے کر۔ میں نے دیکھا تھا آپ کو مگر شاید آپ کسی کو اتنا وقت دینے کے قائل نہیں کہ کوئی آپ کو روک سکے۔" وہ قدرے افسردگی سے بولی تھی۔

میرے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔

"مجھے ضروری کام یاد آ گیا تھا۔ وہ پھول......"

"وہ پھول۔" وہ سر جھٹک کر ہنسی۔ "خوشبو پھولوں میں نہیں ہوتی آکاش صاحب! دینے والے کے جذبوں میں ہوتی ہے۔ اس کے لفظوں میں مہکتی ہے۔"

وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"وہ پھول وہیں پڑے ہیں۔ آ کر لے جایئے گا۔ مجھے خوشبو کے بغیر پھول اچھے نہیں لگتے۔"

وہ کہہ کر جا چکی تھی اور میں دم بخود پانی پر تیرتے مسلے ہوئے پھول دیکھ رہا تھا۔

* * *

یہیں پہ دیکھا، یہیں پہ کھویا
یہیں کہیں وہ صدا سنی ہے
ابھی ادھر سے پرانی صدیوں کی
سرسراہٹ گزر گئی ہے
کبھی اسے اپنے پاس دیکھا
کبھی بہت دور فاصلوں میں
کبھی نگاہوں سے دور
اوجھل جہاں کی نادیدہ بستیوں میں

کہاں ہے تو؟ میرے دن رات
تیری جستجو میں گزر رہے ہیں
میری مسافت میں ہر قدم پر
تیرے خیالوں کے سلسلے ہیں

میں خالی کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا کسی کے خیال کی سرسراہٹیں سن رہا تھا۔ جیسے آدمی رات کو کوئی دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا ہو۔ میرے دھیان کی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ گہری ہوگئی تھی۔ اس سے قبل کہ دستک درِ دل پر ہوتی اور منتظر کھڑا میں در کھول دیتا۔ وہ بول اٹھا تھا۔

"سر! آپ جارہے ہیں؟"

اس کے حد درجے متحیر لہجے پر میں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"سر! آپ واقعی جارہے ہیں؟" اس کی آواز میں مایوسی سی در آئی تھی۔

"مجھے جانا تو تھا ہی۔" میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور میں جب یہاں آیا تھا، تب یہ نوجوان ایسا نہیں تھا۔ وہ خود کو پارس کہتا تھا۔ اس کا چہرہ چمکتا تھا اور ذہانت بھری آنکھوں میں بڑی خوداعتمادی تھی مگر اب۔

میں اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہ کرسکا۔

وہ شکستہ نظر آرہا تھا اور بے یقین۔

کسی کو کھو دینے کا خوف اس کی آنکھ کے عین کنارے پر آٹھہرا تھا۔

"سر! آپ یونہی چلے جائیں گے۔"

اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے لہجے پر غور کرتا رہا۔ سر اٹھا کر اسے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ تب وہ عین میرے سامنے آرکا۔ تب بھی میں یونہی نظریں چرائے بند کھڑکی سے جھانکتی دھوپ کو دیکھتا رہا۔

"سر! ہم اپنی ذات پر اتنے تالے لگا لیتے ہیں کہ کوئی دوسرا تو کیا خود ہم بھی اپنے اندر جھانک نہیں سکتے۔ کیا ہم ڈرتے ہیں؟"

"مگر کس سے؟" اس نے خود ہی سوال اور پھر خود ہی جواب دیا۔

"شاید ہار جانے سے اور ہار جائیں بھی تو کیا؟ کیا اطمینان کے لئے اور زادِ راہ کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے کسی کو اور کسی نے ہمیں بڑی شدت سے چاہا تھا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا۔

"وہ کومل ہے نا۔ محبت کرنے لگی تھی آپ سے۔ بلکہ کرتی ہے۔"

میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں بھی کھڑکی کے کناروں سے پھوٹتی اور زبردستی اندر گھس آنے والی دھوپ سے الجھ رہی تھیں۔

"ہاں کتنے ہی دروازے کھڑکیاں بند کرلو۔ یہ دھوپ اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔"

"تم کیا کہہ رہے تھے پارس؟"

"یہی کہ وہ محبت کرتی ہے آپ سے۔ وہ والی نہیں جو آپ لکھتے ہیں۔ بلکہ وہ جہاں ہجر کا خدشہ وصل کی خواہش سے مغلوب دل سے ایک قدم آگے ہوتا ہے۔"

وہ واپسی کے لیے مڑا۔ پھر پلٹ کر اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر براہِ راست میری چور آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"شک بعض اوقات واقعات کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ آنکھیں دھوکا بھی تو کھا سکتی ہیں۔ آپ کہیں چلے جائیں مگر دھیان کی سڑک پر کھڑے انہی راستوں کو تکتے رہیں گے۔ بہتر ہے ابھی سے قدم بڑھا دیں۔"

"پارس! پارس! تم کس سے محبت کرتے ہو۔" میں نے جاتے ہوئے پارس کو بے تابی سے روکا۔ وہ شکستگی سے مسکرایا تھا۔

"وہ حیا ہے نا سر! شاید شاید کچھ دنوں تک اس کی شادی ہوجائے۔ اس کی ممی کو بہت جلدی ہے اور وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی بے روزگار کے ہاتھوں میں تو نہیں دیں گی۔"

اس انکشاف نے مجھے کسی اونچی عمارت سے نیچے دھکا دے دیا تھا۔ اس لمحے مجھے اپنا آپ کس قدر گھٹیا اور ظالم لگا تھا۔ پارس نے پلٹ کر پھر مجھے نہیں دیکھا۔ شاید وہ مجھے مزید شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور میں انکشاف کے اس لمحے کی زد میں آیا دم بخود تھا۔

* * *

محبت کے رستے بڑے گنجلک ہوتے ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے۔ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے۔ پہاڑی رستے کی طرح۔ جہاں نیا موڑ بالکل اچانک آپ کے سامنے آجاتا ہے اور آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس اگلے موڑ سے آگے منزل ہے یا گہری کھائی۔

میں نے کومل سے محبت کی اور آخر تک گریز کرتا رہا۔ خود کو دھوکا دیتا رہا شاید اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ پارس کومل کو چاہتا ہے۔ آج یا کل سے نہیں، شاید بچپن سے اور میں یوں بالکل اچانک ان کے درمیان نہیں آنا چاہتا تھا لیکن مجھے یہ خبر نہ تھی کہ ایکدم واقعات کی ترتیب یوں

بدل جائے گی۔ کیا یہ سوچا جا سکتا تھا کہ پارس کومل کے بجائے حیا سے محبت کرتا ہے اور کومل اس کی رازدار ہے۔ صرف کومل ہی نہیں، پارس نے بھی تو کومل کے راز کی پاس داری کی تھی۔ تاوقتیکہ خود اسے یقین نہ ہو گیا کہ میں بھی کومل کو چاہنے لگا ہوں۔

یہ سب کس قدر عجیب لگ رہا ہے مجھے۔

میں آکاش فیروز معروف ناول نگار، زندگی کے واقعات کی ترتیب ہی نہ سمجھ سکا مگر شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔

محبت لکھنا الگ ہے اور کرنا بالکل الگ۔ لکھنا یوں آسان ہے کہ محبت اور نفرت انسانی فطرت کے دو اہم جذبے ہیں۔ انسان اسے محسوس کر سکتا ہے، لکھ بھی سکتا ہے مگر بات وہیں آ ٹھہرتی ہے۔ مشاہدے اور تجربے کا فرق۔

بہرحال ایسا ہو سکتا ہے۔

راستہ اجنبی ہو اور مسافر نا آشنا تو...... تو انسان بھٹک بھی سکتا ہے۔

آپ حیران ہیں پارس کے ساتھ یہ سب کرنے کے بعد بھی میں شرمندہ نہیں ہوں۔ جی ہاں۔ میں واقعی پشیمان نہیں ہوں' کیونکہ میں نے اس غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ میں نے کچھ دیر پہلے ہی عامر کو فون کیا تھا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔''

یہ بات سننے کے بعد کہ کچھ بھی ہو جائے اس سیٹ پر پارس ہی کام کرے گا۔ وہ پہلے حیران ہوا، جھنجھلایا اور مجھ پر برس پڑا تھا اور میں نے آرام سے اس کی ساری گالیاں سن لی تھیں۔

میری رائٹنگ ٹیبل پر سرخ گلابوں کا گلدستہ رکھا ہے۔ یہ مجھے لے کر ابھی کومل کے پاس جانا ہے لیکن جانے سے قبل آپ کو ایک بات اور بھی بتا دوں۔ میرا ناول مکمل ہو گیا ہے اور میں نے اس کا عنوان رکھا ہے۔

''راستے محبت کے۔''

آپ اسے میری آپ بیتی سمجھ لیں۔

لیکن ایک بات اب تک مجھے سمجھ میں نہ آئی۔

''کہانی وہ پرندہ ہے جس نے سمندر کے کنارے......''

یا کہانی کار وہ پرندہ ہے جس نے سمندر کے کنارے ایک دن جل پری کو دیکھا اور رستہ بھول گیا تھا۔

* * *

گلاب رستے بدل لئے ہیں

آدھی رات کو وہ گھر لوٹا تھا۔

سارے ہنگامے دم توڑ چکے تھے۔ تھکی ہاری لڑکیاں ادھر ادھر لڑھک گئی تھیں۔ دادی' دادا اور آپا کے کمرے کی لائٹیں بند تھیں اور یہ اس کیلئے بہتر تھا۔ لاؤنج میں گیندے اور گلاب کے پھولوں کی پتیاں ادھر ادھر بکھری تھیں۔ شاید مایوں کی تقریب لاؤنج میں ہوئی تھی۔

جو یہ سب لائبہ مراد کے حوالے سے ہوتا تو کس قدر کیف آگیں اور سرور انگیز ہوتا۔

اس نے بکھری پتیاں ہتھیلی پر سمیٹ کر سوچا۔

اک ہاری ہوئی سوچ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور لائبہ مراد کو کھو دینے کا احساس اذیت بن گیا کر رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے پتیاں مسل کر پھینک دیں اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

تب ہی کچن کی طرف سے وہ نکلی تھی۔ سبز چوڑی دار پائجامہ' پیلا کرتا دوپٹہ جس پر چمپا کلی لگی تھی۔ ننگے پاؤں' دوپٹہ لاپروائی سے بازوؤں کے گرد لپٹا تھا۔ کھلے بال بے ترتیب' سوئی جاگی آنکھوں کے ساتھ وہ بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی۔ ارمغان کو دیکھ کر ٹھٹکی جبکہ ارمغان نے گویا اسے دیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے بڑی ہمت سے اسے پکارا تھا۔

''آج آپ بہت دیر سے آئے مان بھا۔'' اگلا لفظ اس نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر روکا تھا۔

''تو پھر؟'' وہ رکا تھا۔ پلٹا نہیں۔ سرد و سپاٹ لہجہ حد درجہ بیگانگی لئے ہوئے تھا۔ یہی تو تھی اس کے سارے خوابوں کو مسمار کرنے والی' معصوم صورت' محبت کے قاتل کا اگر کوئی نام تھا تو یہی تھا۔''

''نہیں' روز آپ جلدی آجاتے ہیں نا اس لئے......''

"تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل سنبھال رکھو۔" وہ ایک دم پلٹ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ سوئی جاگی آنکھیں پوری طرح بیدار ہوئیں۔ ان میں تحیر کے ساتھ خفیف سا خوف جاگا۔

"سنو! ہنی ڈیئر۔" اس کا لہجہ گہرے طنز کا آئینہ دار تھا۔ ایک ایک سیڑھی اترتا اس کے قریب آیا۔

"ج......ج۔" وہ دیوار سے جا لگی۔

"چار دن رہ گئے ہیں نا۔" دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس پر جھکتے ہوئے وہ سنگین و ناقابل فہم انداز میں بولا تھا۔ ہنی نے بہ دقت اثبات میں گردن ہلائی۔ بڑی بڑی ہراساں آنکھوں میں کاجل بہ کر پھیلا سا تھا۔

"پھر دیکھنا' میں تمہارا حشر کیا کرتا ہوں۔" سنگین و کٹھور لہجے میں کہہ کر وہ پلٹا اور دو دو سیڑھیاں چڑھ گیا۔ وہ دم بخود کھڑی تھی اور دوسرے پل اس نے وہیں بیٹھ کر دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

آپا کسی کام سے نکلی تھیں۔ اسے قالین پر گھٹنوں میں چہرہ دیئے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو لپک کر قریب آئیں۔

"ہنی......ہنی ڈیئر کیا ہوا؟" انہوں نے زبردستی اس کا سر اونچا کیا۔ اس نے باقی کسر آپا کے کندھے پر سر رکھ کر نکال دی۔ وہ بری طرح گھبرا گئیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی بھی آ سکتا تھا۔ ہونے والی دلہن کے رونے کا کیا جواز پیش کرتیں وہ کہ اسے تو رخصت ہو کر بھی کہیں نہیں جانا تھا۔

"ہنی میری جان! بتاؤ نا' کسی نے کچھ کہا۔" انہوں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ جواباً زور و شور سے اثبات میں سر ہلا تھا۔

"کس نے کہا ہے' مجھے بتاؤ۔" انہوں نے پیار سے اس کے آنسو صاف کئے۔

"وہی آپ کے لاڈلے بھائی نے' ابوالہول نہ ہوں تو......"

"ہیں۔" آپا سٹپٹائیں "کیا مان گھر آ گیا ہے۔" انہوں نے سر اٹھا کر کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔

"ہاں آ گئے ہیں چنگیز خان کے جانشیں' مرچیں چباتے ہوئے۔" آنسوؤں کی روانی میں تھوڑی کمی واقع ہوئی تھی۔ مایوں کے دوپٹے کے ساتھ ناک رگڑ رہی تھی۔

"بری بات حنا! وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔" بمشکل مسکراہٹ دبا کر انہوں نے سرزنش کی۔

"ہاں تو میں بھی تو ان کا ہونے والا شوہر......م...... میرا مطلب ہے ہونے والا بیوی ہوں۔"

"ہاں' وہی' وہ تو مجھے یوں دھمکیاں دیتے ہیں کہ کیا کسی پنجابی فلم میں ولن نے دی ہوں گی۔ آپا! میرا کیا بنے گا۔"

سوجی سوجی سرخ آنکھیں اب بھی لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔ نین کٹورے پھر سے چھلک جانے کو بے تاب۔

"افوہ! ہوا کیا؟ کیا کہا ہے اس نے......؟"

"آپ نے وہی تو کہا تھا' اس سے بات کیا کروں۔ میں نے پوچھ لیا کہ آپ اتنی دیر سے آئے ہیں۔ آگے سے بولے۔ چار دن رہ گئے ہیں۔ پھر دیکھنا' میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"ہیں یہ کہا ارمغان نے؟" مارے حیرت کے آپا کی آنکھیں پھیلیں۔

"تو اور کیا میں نے جھوٹ بولا ہے آپا......" ایک دم ان کا ہاتھ دبوچ کر وہ خوفزدگی کے عالم میں بولی۔

"کہیں وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں۔"

"افوہ! کیسی باتیں کر رہی ہو' فضول میں' ایسا کس طرح کر سکتا ہے وہ۔" آپا نے جھنجھلا کر کہا۔

"کر بھی سکتے ہیں' آپ تو چلی جائیں گی۔ پیچھے سے وہ مجھے زہر دے دیں یا گلا گھونٹ کر لان میں دبا دیں۔ آپ کو کیا پتا چلے گا۔"

"ارے کیا فضول بولتی رہتی ہو۔ انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔"

"میرا نہیں ان کا ہوا ہے۔" وہ ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اچھا اب خاموشی سے اپنے کمرے میں جاؤ۔ کوئی مہمان اٹھ گیا تو خوامخواہ وضاحتیں دینی پڑیں گی۔" انہوں نے بہلا پھسلا کر اسے بھیجا۔ پھر تنتناتی ہوئی اوپر پہنچیں وہ تکیے میں سر دیئے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"کیا بدتمیزی ہے ارمغان یہ۔" انہوں نے تکیہ کھینچا۔

"کون سی بدتمیزی' تکیہ ہے یہ۔"

"ایک تو آدھی رات کو گھر لوٹے ہو اور آتے ہی ہنی سے الجھ پڑے۔ کیا کہا ہے اسے تم نے۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے دوسرا تکیہ اٹھا کر سر پر رکھا اور اوندھا لیٹ گیا۔

"تو پھر وہ رو کیوں رہی ہے؟"

"اپنی چہیتی سے پوچھیں' وہ رو رہی ہے میں تو نہیں اور پلیز آپا! میں اس وقت تھکا ہوا ہوں۔" ان سے پورے چھ برس چھوٹا تھا۔ مگر ان دنوں ٹھیک ٹھاک بدلحاظ ہو گیا تھا۔

"جاتے ہوئے لائٹ بند کر دیجئے گا۔"

"تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔" آپا نے کہا۔ اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ مایوس ہو کر پلٹ گئیں۔

* * *

یہ دل اس کی محبت سے جدا ہو کر
دھڑکنا سیکھ جائے تو
نجانے کتنے جگنو مٹھیوں میں جگمگا اٹھیں
اندھیرے دور ہو جائیں
تمہاری راہ سے بھٹکیں تو منزل پر پہنچ جائیں

وہ کب سے انگلیوں میں پنسل گھماتے ہوئے یہ نظم بار بار دہرا رہا تھا۔ لائبہ مراد کے قدم دروازے میں ہی تھم گئے۔ ارمغان کے مدھم و مایوس لہجے میں ٹوٹتی آس کی کرچیاں اس کے دل میں پیوست ہوئی جاتی تھیں۔

تمہاری راہ سے بھٹکیں تو منزل پر پہنچ جائیں۔

اس نے ایک بار پھر گویا اس مصرعے پر غور کیا۔

تمہاری راہ سے بھٹکیں اور جو ہر راہ اس کی راہ ہو تو۔" اس نے سر جھٹک کر گویا خود کو کسی خیال کے سحر سے آزاد کرانے کی سعی کی۔

"بھٹکیں تو کس طرح بھٹکیں۔"

سامنے کے دروازے سے اندر آتے وسیم کی نگاہ دروازے میں ایستادہ لائبہ پر پڑی اس کی نگاہ غیر محسوس طور پر ارمغان تک گئی۔ جواب بھی اسی مصرعے کی گردان کرتے ہوئے گویا کوئی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہاری راہ سے......"

"آ جائیں مس لائبہ مراد! آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

وسیم کی آواز پر وہ دونوں ہی ہوش میں آئے لائبہ نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ارمغان کے مصرعے کی تکرار ختم ہوئی۔ مگر انگلی میں پنسل یونہی گھومتی رہی۔

"وعلیکم السلام۔" وسیم نے گویا اسے جتایا تھا' وہ چونکی پھر خجل سی ہو گئی۔ جبکہ ارمغان نے اپنے سامنے بکھری تصویروں پر نظریں جما دی تھیں۔

"ڈونٹ بی سلی لائبہ۔" اس نے خود کو ڈانٹا۔ پھر مسکراتی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو چھونے والی مسکراہٹ خودساختہ تھی۔

"یہ تم لوگ اتنے خاموش کیوں ہو؟"

"ہم آپ کے سلام کے منتظر ہیں۔" ساجد نے پوری سنجیدگی سے کہا تو اس نے ہنستے ہوئے سلام کیا' سب نے کورس میں جواب دیا تھا۔ ماسوائے ارمغان کے' وہ اسے یکسر نظرانداز کئے اپنے کام میں منہمک تھا۔

"آج آپ مضمون لائی ہیں یا نہیں۔ مجھے رائٹ ٹائم پر میگزین مارکیٹ میں لانا ہوتا ہے۔"

لائبہ نے چپ چاپ ہاتھ میں رول کئے پیپرز اسے تھما دیئے۔ پھر ارمغان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم آج بھی آفس آئے ہو؟" اس کے لہجے میں گزری رات کی پرچھائیاں تک نہیں تھیں۔ گویا اسے یاد ہی نہ تھا کہ بیتی رات کو سناٹے میں وہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر روئی تھی۔ وہاں اس جگہ پر اب بھی اس کے آنسوؤں کی نمی منجمد تھی۔ کسی کی ساعتوں میں اس کی سسکیاں ہمیشہ کیلئے مکین ہو گئی تھیں۔ ارمغان نے ذرا کی ذرا اس کے بظاہر مطمئن انداز کو دیکھا۔ پھر تلخ سے لہجے میں بولا۔

"آج کوئی خاص بات تھی؟"

"شادی اتنا غیر اہم واقعہ تو نہیں۔" اس نے اپنا بیگ اور ہاتھ میں پکڑی دوسری چیزیں ٹیبل پر ڈھیر کیں "آج......"

"میرے نزدیک گزرا ہوا کل زیادہ معتبر ہے۔" اس کا جتاتا ہوا انداز' لائبہ چپ سی ہو گئی۔

"ماضی میں زندہ رہنے والے حال کھو دیتے ہیں۔"

"تم حال کی بات کر رہی ہو میں تو اپنا ماضی بھی کھو بیٹھا۔" اس کا لہجہ شکستہ ہو گیا۔

"کیا تم لوگ جواں ادب کیلئے نیا اضافہ تخلیق کر رہے ہو۔" عالیہ نے طنز آمیز استعجاب سے پوچھا۔

"شادی والے گھر میں ڈھیروں کام ہوتے ہیں اور کچھ نہیں تو ایک چکر تم بھی پارلر کا لگا آتے۔ کم از کم یہ جو چہرے پر بارہ بجے ہیں۔ اس کا وقت کچھ آگے پیچھے ہی ہو جاتا۔" وہ نارمل سے بشاش لہجے میں بولی تھی۔

"شادی! کس کی شادی؟" وہ سب کے سب چونکے تھے۔

"ارمغان نے تم لوگوں کو نہیں بتایا۔" اس کی کانچ سی آنکھوں میں خودساختہ تحیر جاگا۔" کل

اس کی شادی ہے۔"

اس نے کتنے آرام سے کہہ دیا۔ ارمغان جز بز ہو گیا۔

"ہیں ارمغان۔" وہ سب کے سب متحیر سے اس کی طرف پلٹے۔

"تم لوگ ہی کیا۔ اس نے تو مجھے بھی انوائیٹ نہیں کیا۔ حالانکہ کتنی پرانی دوستی ہے ہماری۔"

ارمغان نے چونک کر بہت دھیان سے اس کا چہرہ کھوجا تھا۔ وہ مگن سی فائل میں پیپر ترتیب دے رہی تھی۔ محض دوستانہ سا شکوہ تھا اس کے لبوں پہ اور بس کوئی دکھ کی پرچھائیں' کوئی کھو دینے کا احساس۔

شکوہ کناں نگاہوں کی چبھن لائبہ نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔ تب ہی اس نے سر اٹھا کر فہمائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ سنبھل کر سیدھا ہوا۔

"تم نے بتایا بھی نہیں ارمغان۔" وسیم نے بہت سنبھل کر سوال کیا تھا۔ جبکہ اس کی نگاہیں بظاہر انجان ولاپرواسی لائبہ پر ایک لحظے کو ٹھہری تھیں۔

"بہت اچانک اور سادگی سے ہو رہا ہے یہ سب۔ میرا خیال تھا کہ میں بعد میں ٹریٹ دے کر سرپرائز دوں گا۔" وہ قصداً مسکرایا۔

"ٹریٹ تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ ہم تو دعوت لیں گے۔" عالیہ برجستہ بولی۔ وہ ہنس دیا۔

"جو حکم جناب۔" اب وہ خوش دلی سے ان کے شوخ جملوں کے وار سہہ رہا تھا۔ لائبہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس ماحول سے دانستہ کٹ گئی تھی۔

سارا دن وہ خود کو قصداً مصروف رکھے رہی تھی اور پھر وقت سے پہلے ہی اٹھ گئی۔ ارمغان کو وسیم نے روک لیا۔

"اکٹھے نکلتے ہیں۔"

وہ جانتا تھا۔ وسیم نے اسے کیوں روکا ہے۔ تب ہی خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے وسیم نے پوچھا۔

"یہ شادی تمہاری پسند سے ہو رہی ہے؟"

"ہاں' کیوں؟" اس کا لہجہ نارمل تھا۔

"مگر میں تو سمجھتا تھا تم....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا؟"

"میرا خیال تھا تم لائبہ سے۔ یونیورسٹی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہو۔ دوستی بھی خوب تھی۔ اتنے عرصے میں محبت ہو ہی جاتی ہے۔"

"ضروری نہیں' وی آر جسٹ فرینڈز۔"

اک غبار سا تھا جس نے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ بائیک اسٹارٹ کر کے ہوا ہو گیا۔

بس اسٹاپ پر اسے لائبہ نظر آئی تو غیر ارادی طور پر وہ رک گیا۔

"میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

بیگ کے اسٹریپ سے کھیلتی لائبہ نے جھکا سر اٹھایا۔

"تمہیں گھر جانا چاہئے۔"

"میں نے مشورہ نہیں مانگا۔" وہ بری طرح بگڑا۔

اس نے بھاگتی دوڑتی ٹریفک پر نظریں جما دیں زرد روشام کے رنگ اس کے چہرے پر اتر آئے۔

"نہ راستے ایک ہیں نہ منزل تو......"

"اور وہ جو پہلے تھا......"

"محض دھوکا دے رہے تھے خود کو......"

کتنے آرام سے بولی تھی وہ' ارمغان کا دماغ تپ گیا۔ اس نے بائیک کو کک لگائی اور ہجوم بیکراں میں گم ہو گیا۔ اس کا رخ یقیناً گھر کی طرف نہیں تھا۔

* * *

حسب معمول وہ آدھی رات کے بعد گھر میں گھسا تھا۔ خیال یہی تھا کہ مہندی کا ہنگامہ دم توڑ چکا ہوگا۔ مگر یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ لان میں ہنگامہ بدستور جاری تھا۔ بھیگی بھیگی خوشبودار رات میں ڈھولک پر پڑتی تھاپ بڑی خوشگوار و گدگداتی ہوئی لگتی' گر دل و دماغ قابو میں ہوتے۔

ان سب کے درمیان وہ بھی پھولوں سے سجی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پیلے جوڑے میں ملبوس' میک اپ سے مبرا' شاداب و نوخیز چہرہ تازگی لئے ہوئے تھا۔ ذرا ذرا ہنستی' تھوڑا تھوڑا جھینپتی۔ شرماتی ذرا سا ایک طرف کو جھکی آپا کی بات سن رہی تھی۔ آپا اس کے کان میں نجانے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں' ایک طرف دادو بھی بیٹھی تھیں۔ شاداں و فرحاں تالیاں بجا بجا کر لڑکیوں کو بک اپ کر رہی تھیں۔

ہنی آپا کی کسی بات پر بے ساختہ ہنسی تھی۔ ارمغان کا دل چاہا۔ اس کے مسکراتے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دے۔

"کاش میں تمہیں قتل کر سکتا۔"

مٹھیاں بھینچ کر اس نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کی نظروں سے بچتا لاؤنج میں آ گیا۔ خیال تھا چپکے سے اپنے کمرے میں جا گھسے گا۔ مگر پہلی سیڑھی پر دادا جان کی آواز قدموں سے لپٹ گئی۔

"کہاں سے آ رہے ہو دادا کی جان۔" چبھتا ہوا طنزیہ لہجہ۔

کاش دادا! آپ مجھ سے چھوٹے ہوتے تو میں بتاتا۔

وہ رکا ضرور مگر پلٹا نہیں۔ آخر اپنی ناراضی کا مکمل اظہار بھی تو کرنا تھا۔ یہ زبردستی کا ڈھول انہوں نے ہی تو اس کے گلے میں باندھا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" لہجہ سخت ہوا۔

"جہنم سے۔" وہ چپ چاپ ناخن سے گرل پر لکیریں کھینچتا رہا۔

"یہ کوئی وقت ہے گھر لوٹنے کا۔" اس کی خاموشی انہیں تاؤ دلا گئی۔

"شکر کریں' لوٹ آیا ہوں۔"

"تمہیں تو شاید یہ بھی یاد نہ تھا کہ آج تمہاری مہندی ہے۔"

"میری نہیں آپ کی اس چہیتی کی مہندی تھی۔" وہ کلس کر بدتہذیبی سے بولا۔

"ارمغان۔" اندر آتی آپا نے تنبیہی انداز میں پکارا۔ "یہ کس طرح بات کر رہے ہو۔"

"مجھے ایسے ہی بولنا آتا ہے۔" وہ دادا جان کا لاڈلا تھا۔ اب ان ہی سے بدتمیزی کر رہا تھا۔

"ارمغان!" آپا نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

"رہنے دو اسماء! اب یہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ مجھے آنکھیں دکھا سکے۔" دادا جان دل گیر لہجے میں بولے تھے۔ ایک لمحے کو وہ ندامت میں گھر گیا۔

"میرا قصور بس اتنا ہی تو ہے کہ اپنی یتیم نواسی کو مناسب ٹھکانا دینے کیلئے......"

"جی ہاں' اپنی اس یتیم نواسی کا بہت خیال تھا نا آپ کو اس یتیم پوتے سے کوئی محبت نہ تھی آپ کو جو قربانی کا بکرا بنا کر اپنی اس یتیم و مسکین نواسی کو......"

غصے میں اس کی آواز خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ اماں جی اپنے کمرے سے افتاں و خیزاں برآمد ہوئیں۔

"اے ہے کیا ہو گیا بیٹا......؟"

بیٹے صاحب دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھتے اوپر غائب ہو گئے۔ جانتے تھے' اب سب مل کر انہیں گھیر لیں گے اور وہ کچھ بھی نہ بول پائیں گے۔

"دیکھا' دیکھا تم نے اسماء! کیا سلوک کرنے لگا ہے یہ ہمارے ساتھ' کیا برا کیا ہے ہم نے' اتنی اچھی لڑکی ہے حنا' کم عمر' خوبصورت' پڑھی لکھی' جس طرح چاہے اپنے رنگ میں ڈھال لے۔ مگر یہ تو بے نتھے بیل کی طرح ہاتھ ہی نہیں آتا۔" اماں جی متفکر سی کہہ رہی تھیں۔ اسماء شرمندہ سی ہو گئی۔

"کل شادی ہے۔ حنا کے ددھیال والے بھی آئیں گے۔ اس کے یہی تیور رہے تو کیا

سوچیں گے وہ لوگ۔"

"ماں جی! آپ فکر مت کریں۔ میں سمجھاتی ہوں اسے۔"

"اچھی طرح سمجھا دینا۔ کل اس نے کوئی گڑبڑ کی تو بھری بارات میں گولی مار دوں گا۔" بابا جان طیش میں آ کر بولے۔

"آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔ یہ مبارک کام میں خود ہی کر لوں گا۔ آپ اپنی یتیم نواسی کی خیر منائیں۔" وہ اوپر سے برآمد ہوا اور پھر غائب۔

"یا الٰہی خیر۔" ماں جی دل تھام کر رہ گئیں۔

"میں دیکھتی ہوں' کہیں کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔" وہ اوپر جانے کو لپکیں۔ اکلوتے پوتے میں تو ان کی جان تھی۔

"رہنے دیں۔ آپ ہی کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے جو یوں آنکھیں دکھا رہا ہے۔" بابا جان خفگی سے بولے۔

"اے لو میں نے کون سے انوکھے لاڈ اٹھا لئے تھے۔ سات سال تک تو آپ کے کندھے پر جھولا کرتا تھا۔" ماں جی تنک کر بولیں۔

"بارہ سال تک اس کے منہ میں نوالے میں دیا کرتا تھا۔"

ان دونوں کی آپس میں بحث شروع ہو گئی تھی۔ اسماء طویل سانس لے کر اوپر آ گئیں۔ جانتی تھیں' وہ دونوں ہی ارمغان کو اپنی جان سے بھی بڑھ کر چاہتے تھے۔ ارمغان فون پر کسی کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر ریسیور پٹخ دیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہئے تھی ارمغان! اس طرح بات کرتے......"

"مجھے شرم کیسے آئے گی۔ ہمارے بڑوں کو تو آئی نہیں۔" وہ بدلحاظی سے کہتا آخری جملہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا تولیہ اٹھا کر واش روم میں جا گھسا وہ سر پکڑ کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ خیال یہی تھا کہ باہر آئے گا تو تفصیلی بات کریں گے۔ مگر وہ باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اے ارمغان! سو گئے ہو کیا؟"

"جی ہاں سو گیا ہوں۔ آپ بھی جا کر زحمت کریں سونے کی۔" وہ حد درجے تلخی سے بولا تھا۔ وہ کچھ لمحے یونہی بند دروازے کو گھورتی رہیں۔ پھر پلٹیں تو نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے کارڈز پر پڑی۔ انہوں نے اٹھا کر دیکھا۔ وہ اتنے ہی تھے جتنے انہوں نے ایک ہفتہ قبل اسے دیئے تھے کہ وہ اپنے دوستوں کو انوائیٹ کر لے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"کہیں سچ مچ ارمغان کے ساتھ زیادتی تو نہیں ہو رہی۔"

وہ یہی سوچتی ہوئی نیچے چلی گئی تھیں۔ بہت دیر بعد ان کے جانے کا یقین کر کے وہ باہر نکلا۔

”ہونہہ......“ اس نے تولیہ کھینچ کر ڈریسنگ ٹیبل پر دے مارا تھا۔ مارے غصے کے اسکے دل و دماغ کھول رہے تھے۔

”میری کسی کو پروا نہیں ہے۔ مروں یا جیوں اور وہ مہارانی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے یہاں آئے ہوئے اور سب کے دل و دماغ پر چھا گئی ہیں۔ مگر کب تک؟ مجھے برباد کرنے والی کب تک سکھ کا سانس لے گی۔ ایک بار میری دسترس میں آئے تو سہی وہ حشر کروں گا کہ شادی کا مطلب بھول جائے گی۔“

ہتھیلی پر مکا جماتے ہوئے وہ ادھر سے ادھر چکرا رہا تھا۔

”غصہ‘ جوش انتقام‘ لائبہ کو کھو دینے کا دکھ اسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا تھا۔

”اور وہ لائبہ۔“ وہ سر تھام کر بیڈ پر جا گرا۔

”کتنی آسانی سے راستہ بدل گئی۔ یوں جیسے میرے اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق‘ کوئی ناتا تھا ہی نہیں۔ اگر وہ ساتھ دیتی تو کیا میں اتنی آسانی سے ہار مان لیتا۔“

وہ کھولتے دل و دماغ کے ساتھ سوچتا رہا اور رات ڈھلتی رہی‘ نیند پلکوں پر مہربان نہ ہوتی تھی اور دماغ سلگتا تھا۔

تب ہی دروازے کے باہر چنچل آوازیں ابھریں۔

”اب کوئی آ نہ جائے۔“ اس نے کوفت سے سوچا اور دم سادھ کر لیٹ گیا۔ کسی سے سامنا کرنے کی ہمت تھی نہ آرزو۔

”بھئی‘ ہمارا تو رت جگے کا پروگرام ہے۔“

”رات کا ایک بج رہا ہے اور کتنا جاگنا ہے۔“ اسی یتیم و مسکین نواسی کی جھنجلائی تھکی ہوئی آواز ابھری۔ ارمغان نے غصے میں کروٹ بدلی۔

”تو تمہیں کیا فکر ہے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح کون سا بارات جانی ہے۔ تمہیں ایک چکر کوٹھی کا لگوا دیں گے۔“

ارمغان کی کزن کومل کی آواز تھی۔

”ہاں بھئی‘ لگی ہے ہنی۔“ دوسری نے کہا۔

”اچھا اب سو جاؤ تھوڑی دیر۔“ کومل نے کہا تو وہ جھنجلا کر بولی۔

سوؤں گی کیسے‘ یہ اتنی ڈھیر ساری مہندی جو تھوپ دی ہے۔“

”بس ابھی سوکھ جائے گی۔ پھر بے فکر ہو کر سو جانا۔“

وہ لوگ شاید اسے آرام کے خیال سے اوپر والے کمرے میں چھوڑنے آئی تھیں‘ کچھ ہی دیر میں خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ کچھ لمحے یونہی لب بھینچے لیٹا رہا۔ پھر ایک خیال سرعت سے اس کے اندر جاگا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ جبکہ باہر لان میں اب بھی ڈھولک پیٹی جا رہی تھی۔

اس نے دھیرے سے ساتھ والے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ ذرا سا جھکی پاؤں کی سائیڈ پر بنی مہندی کی بیل ٹھیک کر رہی تھی۔ سر اٹھا کر اس نے آنے والے کو دیکھا۔ پھر سراسیمگی میں کھڑی ہو گئی۔

”آ...... آپ!“ وہ یونہی دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اسے گھورے گیا۔

”ک...... کیا ہوا؟“ وہ ہکلائی۔

”سنو۔“ وہ سنگین و سنجیدہ لہجے میں کہتا اس کے قریب آیا۔ ”تمہارے پاس بس آج کی رات ہے۔“

”ک...... کیا مطلب۔“ حنا کی ٹانگیں ایک دم بے جان ہوئی تھیں۔ دھم سے بیڈ پر بیٹھ کر ہراساں نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میرا کچھ نہیں جائے گا حنا بی بی! تمہاری زندگی عذاب ہو جائے گی۔ میں تمہیں کبھی کوئی خوشی نہیں دے پاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم آج اور ابھی انکار کر دو۔“ اس کے حد درجہ سنجیدہ و کٹھور لہجے پر حنا نے بمشکل تھوک نگلا تھا۔

”م...... میں۔“

”ہاں تم۔“

”م...... میں نے انکار کیا تھا۔“

”پھر۔“ وہ بری طرح چونکا۔ گویا لڑکی اتنی بھی معصوم نہیں۔ جتنا وہ سمجھا تھا۔

”بابا جان کہنے لگے۔ اس کو یونہی بولنے دو۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارمغان تو یونہی بکواس......“ مہندی لگا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ کر اس نے ایک دم بات روکی۔ پھر سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”بکواس‘ میں بکواس کرتا ہوں۔“ ارمغان کی نگاہیں ایک دم لہو رنگ ہوئی تھیں۔

”میں نے تو......“

”بس ٹھیک ہے کل آنے دو۔ پھر پتا چلے گا سب کو کہ میں بکواس کرتا تھا یا نہیں اور تم...... تمہیں بھی مزا آ جائے گا۔ بہت شوق ہے نا شادی کا۔“

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ سے شادی کا۔ آپ کو جو کہنا ہے بابا جان سے کہیں۔ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں۔" وہ ایک دم رو دی تھی۔

"چپ۔" وہ زور سے دھاڑا۔ پھر اسی طرح دھاڑ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے اسے لگا' اس نے آپ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا ہے۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی حنا آپا کے گلے لگی دھواں دھار رو رہی تھی۔ اس نے بڑی کوفت سے اسے دیکھا۔ آپ بہلا پھسلا کر اسے چپ کروانے میں بمشکل کامیاب ہوئی تھیں۔ مووی کیمرہ آن تھا۔ حنا کے ددھیال والے بھی آئے تھے۔ دانیال نے بڑے غور سے ارمغان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی رمق تک نہ جاگی تھی۔ یونہی ٹھس سا بیٹھا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر مہمانوں کو ڈیل کرتی آپا کو جا پکڑا۔

"یہ ارمغان اس شادی سے خوش نہیں تھا کیا؟"

"نن' نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میاں کی بات سن کر وہ ٹپٹا کر رہ گئیں۔ "آپ سے کس نے کہا؟"

"مجھ سے کون کہے گا۔ ارمغان کا چہرہ کھلی کتاب کی مانند ہے۔"

آپا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی بھاگ جائے گا۔ چہرے سے کوفت' بیزاری' تھکن اور جھنجھلاہٹ مترشح تھی۔

"وہ بس اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا' ورنہ حنا پر تو اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔" انہوں نے بمشکل شوہر کو مطمئن کیا۔ مگر دبی دبی زبان میں یہی بات کئی لوگوں نے بابا جان اور ماں جی سے کہی تو وہ پریشان ہو گئیں۔

"اے عائشہ! ذرا سمجھاؤ اسے جا کر۔ ایسے کیوں بیٹھا ہے۔ ناک کٹوائے گا ہماری۔" آپا تن فن کرتی اس کے برابر جا بیٹھیں۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔"

"نہیں خراب ہو گیا ہے۔" اس کے منہ کے زاویے کچھ اور بگڑ گئے تھے۔

"لگ تو یہی رہا ہے۔ اس طرح منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو۔"

"زبردستی کی شادیوں میں یونہی منہ بنتے ہیں۔"

"آہستہ بولو۔ حنا سن لے گی۔"

"سن لے کیا۔ میں سب کچھ خود بتاؤں گا۔"

"حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی۔ بابا جان کیا سوچیں گے۔"

"جو بھی سوچیں۔ میرے بارے میں سوچا تھا انہوں نے۔" وہ آگ کے ڈھیر پر بیٹھا

پھنکار رہا تھا۔ آپا کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دو چھانپڑ رسید کر دیں۔ مگر اس کے حد درجہ بگڑے انداز دیکھ کر نرم و ملتجی لہجے میں بولیں۔

"دیکھو میرے پیارے بھائی! یہاں میرے سسرال والے بھی موجود ہیں۔ تمہارے بہنوئی بذات خود پوچھ چکے ہیں۔ میں واپس جا کر کس کس کو مطمئن کروں گی۔ بابا جان کا نہیں تو میرا ہی خیال کر لو۔"

اور ان کا خیال کر کے وہ یوں مسکرایا تھا جیسے گلے پر چھری رکھی ہو۔ انہیں غصہ تو بہت آیا' مگر اسے ہی غنیمت سمجھ کر اٹھ گئیں۔ رسمیں ختم ہوئیں تو وہ گویا رسی تڑا کر بھاگا تھا۔

بہت رات گئے آپا اسے ڈھونڈتے ہوئے اوپر آئیں تو وہ ایک خالی کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"یہ کیا مانی! تم نے سگریٹ پینا شروع کر دی۔" ان کے حد درجے متاسف لہجے پر اس نے چپ چاپ سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے مسلا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے اور پورے چاند میں بنتے لائبہ مراد کے عکس نے اس کے اندر زیاں کے احساس کو کچھ اور گہرا کر دیا تھا۔

اور یہ لڑکی حنا احتشام' کیا تمہاری جگہ لے سکے گی اور تم نے تم نے' کتنی آسانی سے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ ایک بار ایک بار تم مان جاتیں لائبہ تو میں سب کچھ چھوڑ دیتا۔

اور اس نے دیکھا لائبہ کے ہونٹوں پر ابھرتی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ شاید وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔

"مانی! کیا سوچ رہے ہو۔ چلو حنا تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" آپا نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ابھی میرا پارٹ باقی ہے اس ڈرامے میں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو' تمہاری نئی زندگی کی شروعات ہو رہی ہیں اور تم اسے ڈرامہ کہہ رہے ہو۔" آپا قدرے خفا ہو کر بولیں۔ وہ یونہی کھڑکی سے باہر جھانکتا رہا۔

"اچھا چلو' اب بہت رات ہو گئی ہے۔ ہنی انتظار کر رہی ہو گی۔"

"آپا! پلیز بس کریں اب' بابا جان کی ضد تھی کہ وہ ہنی کو ہمیشہ کیلئے اس گھر میں لانا چاہتے تھے اور وہ بھی میرے حوالے سے' سو لے آئے۔ میں کیا سوچتا ہوں' کیا چاہتا ہوں۔ یہ سوچنے کی زحمت کسی نے نہیں کی۔ وہ جو کل تک میرے کندھے سے لٹک کر مجھ سے ٹافیوں کی فرمائش کرتی تھی۔ اس کو میری بیوی بنا دیا۔ میں نے بھی کر دیا جو وہ چاہتے تھے۔ اب مزید مجھ سے کوئی توقع مت رکھیں آپ لوگ۔ بہت ہو گیا اپنی محبتوں کا بھرپور خراج لیا ہے آپ لوگوں نے اور میں کیا

کچھ ہار گیا ہوں یہ کسی کو خبر نہیں۔ خدا کیلئے اب تو مجھے بخش دیں۔"

وہ بھڑک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ آپا متحیر سی اسے دیکھے گئیں۔ پھر قدرے خفگی سے بولیں۔

"یہی سب کرنا تھا تو پہلے انکار کر دیا ہوتا۔ اب تعلق باندھا ہے تو نبھانا بھی سیکھو۔ ٹھیک ہے وہ تم سے کچھ چھوٹی ہے۔ مگر سمجھدار ہے۔ ایڈجسٹ کر لے گی تمہارے ساتھ یا پھر پہلے انکار کرتے۔"

"کیا تھا' بہت زور وشور سے کیا تھا۔ کنپٹی پر پستول رکھ کر منوایا گیا ہوں اور وہ بھی میری نہیں دادا جان کی۔ ایک بار تو دل چاہا پھر بھی انکار کر دوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی۔"

"اللہ نہ کرے۔" آپا نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اگر خدانخواستہ دادا جان کو کچھ ہو جاتا تو کیا تم خود کو معاف کر پاتے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔ بس اموشنل بلیک میلنگ تھی اور میں احمق' گدھا بلیک میل ہو گیا' پتا نہیں کیوں۔" آپا نے مسکراہٹ دبائی۔

"میں جانتی ہوں بہت چاہتے ہو تم ان کو' امی ابو کی وفات کے بعد جس طرح انہوں نے ہمیں سنبھالا ہے۔ جس طرح ہمارا خیال رکھا ہے۔ شاید ہی کسی دادا دادی نے رکھا ہو۔"

"ہاں اور چاہت کا کتنا غلط خراج لیا انہوں نے۔ بچپن سے لے کر آج تک ہر خواہش پوری کی انہوں نے میری' جوتے سے لے کر شرٹ تک اور ناشتے سے لے کر ڈنر تک ہر چیز میری پسند اور ناپسند کے مطابق ہوتی تھی اور اب میری زندگی کا کتنا بڑا فیصلہ کتنی آسانی سے خود بخود کر گئے۔ مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا۔ آج ہنی کی جگہ اگر......"

"کون......؟" آپا چونکیں۔

وہ ایک دم چپ ہو کر لب کاٹنے لگا۔ آپ کو اس پر ترس آ گیا۔ نجانے وہ کس اذیت میں گرفتار تھا۔ جذباتی تو وہ شروع سے ہی تھا۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھنا۔ خفا ہو جانا اس کی عادت ہی تھی۔ مگر اب تو اک نامعلوم سا دکھ تھا' جو اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگا تھا۔ اکلوتا لاڈلا بھائی۔ ان کے میکے کا مان۔

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پوچھنے لگیں۔

"بہت چاہتے تھے اسے......؟"

وہ بری طرح چونکا۔ پھر نظریں چرا کر رخ موڑ گیا۔ گویا ان کے خیال کی تصدیق ہو گئی ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"کون تھی وہ؟"

"تھی۔" اسے یہ لفظ بہت عجیب لگا۔ محض ایک دن کا فاصلہ اور وہ ماضی ہو گئی۔

"اب کیا فائدہ آپا......" سلگتا ہوا لہجہ تھا۔

"اچھا نہیں کیا دادا جان اور دادو نے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔ پھر ہنی کا خیال آیا۔

"پر بھیا! اس میں ہنی کا کیا قصور۔ وہ بھی تو مظلوم ہے۔ نہ باپ رہا نہ ماں' دودھیال والے رکھنے کو تیار نہ تھے۔ ذرا سوچو' کتنے مجبور ہیں دادا اور دادی' بیٹے اور بہو کے بعد بیٹی کی موت کا دکھ دیکھا ہے انہوں نے۔ نواسی کو کہاں چھوڑتے۔ اس کے ددھیال والوں کو تو اس کا کوئی خیال ہی نہیں آیا۔ اب ہر کسی کی دادی ہماری دادو جیسی شفیق نہیں ہوتیں۔ بھول گئے ہنی کو یہاں چھوڑ کر اب یہ نواسی کو کہاں چھوڑ آتے۔ اس کے اور ہمارے دکھ مشترک ہیں۔ اس نے بھی کم عمری میں ماں باپ کی جدائی سہی ہے اور ہم نے بھی۔ اس سے کیسی نفرت۔"

اگر وہ ایک لمحے کو اپنے دل میں جھانک کر ایمانداری سے' اپنا تجزیہ کرتا تو شاید جان لیتا کہ وہ کب اس سے نفرت کرتا تھا۔ وہ کم عمر' معصوم سی لڑکی اس کی کزن تھی۔ پھپھو کی وفات کے بعد تو اسے اور بھی عزیز ہو گئی تھی۔ اب تو بس لائبہ کے چھن جانے کا دکھ تھا۔ یا دادا جان کے اچانک فیصلے پر احتجاج اور غصہ تھا۔ ہنی بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی۔ پھر ایک دم اسے اپنی بیوی کے روپ میں قبول کرنا کس قدر مشکل تھا۔

"یہ گھر تو ہمیشہ سے حادثات کی زد میں رہا ہے اور پھر دادا دادی کو دیکھو۔ کیا کچھ سہا ہے انہوں نے اپنی جان پر' اب تو ان کی ساری خوشیاں تم سے اور ہنی سے وابستہ ہیں۔"

آپا اسے سمجھا بجھا کر دروازے تک لے آئیں۔ ساتھ ہی ایک مخملیں ڈبیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"لاکٹ ہے۔ اسے رونمائی میں دے دینا اور مان! پلیز آرام سے' پیار سے۔ اس سارے میں ہنی کا کوئی قصور نہیں۔"

"ارے دولہا میاں ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔" دانیال بھائی اچانک آ نکلے۔

"نیگ دیئے بغیر چلا جاتا۔" آپا مسکرائیں۔

"اکیلے اکیلے ہی۔" وہ حیرت سے مسکرائے۔

"یہ ہم بہن بھائی کا معاملہ ہے۔" انہوں نے ارمغان کو اندر دھکیلا۔ اس نے قدرے جھنجھلا کر دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھائی تھی۔

"کیا ملا زوجہ محترمہ؟"

"افوہ! دکھا دوں گی' آپ چلیں اپنے کمرے میں۔ میں منے کیلئے دودھ گرم کر لاؤں۔" وہ جھنجھلائیں۔ تو وہ سر جھٹک کر چلے گئے۔

"اے عائشہ بیٹی کیا چلا گیا؟" دادی جان نیچے سے اشارے سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی دادو" وہ مرے مرے قدموں سے نیچے آئیں اور سر پکڑ کر صوفے پر ڈھے گئیں۔

نیند میں آگے پیچھے ڈولتی ہنی ہوشیار ہوئی۔ پر ایک تھکن اور نیند اعصاب پر سوار تھی اور دوسرے وہ آیا ہی کچھ اس طرح تھا کہ آپا کے پڑھائے سارے سبق ذہن سے اڑنچھو ہو گئے۔ دوپٹہ کھسک گیا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھے گئی۔

"یہ کیا ناٹک ہے۔ نیند آرہی تھی تو سو جاتیں۔"

اس کی نیند بھری سرخ آنکھوں کو دیکھ کر وہ بگڑا۔ ہنی نے گھبرا کر دوپٹہ کھینچنا چاہا۔ وہ سارے کا سارا اس کے نیچے دب گیا تھا۔ شاید سو گئی تھی تو پنیں نکل گئی تھیں۔

"یہ پہن لینا' آپا نے دیا تھا" اس نے ڈبہ اس کی طرف اچھالا۔ سیدھی اس کی گود میں آکر گری۔ خود اس نے کوٹ اتار کر صوفے پر اچھالا۔ بیڈ پر گر کر تکیہ سر پر رکھ لیا۔ گویا ساری ذمہ داری پوری ہو گئی تھی۔

"سونے سے پہلے لائٹ آف کر دینا۔ کیا مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔" تکیے میں سے آواز آئی تھی اور آخری جملہ تو بطور خاص اسے سنایا گیا تھا۔ تکیے میں منہ دیئے وہ اس کے ردعمل کا منتظر تھا۔ ذرا دیر بعد محسوس ہوا کہ وہ بیڈ سے نیچے اتری ہے۔

"شاید چینج کرنا ہو" پر چٹخنی کھلنے کی آواز پر وہ بھڑک کر اٹھا۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟"

دروازے سے باہر نکلتی حنا وہیں ساکت ہو گئی تھی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں؟"

"م...... میں یہاں نہیں رہوں گی۔" وہ منمنائی تھی۔

"کیوں۔ کیا مصیبت ہے' کاٹتا ہوں میں۔" وہ غصے سے دھاڑا۔ خوف بھی مانع تھا اگرچہ سچ مچ نکل گئی تو......"

"واپس آؤ......" اس کے اتنے رعب کے جواب میں حنا نے بہ دقت نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"اتنی تو دھمکیاں دی تھیں اور اب اتنے غصے میں ہیں۔ پتا نہیں تمہارے ساتھ کیا کریں۔ مت جانا ہنی۔" ذہن نے فوراً مشورہ دیا۔

اسے وہیں ڈٹے دیکھ کر ارمغان کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہوں میں۔" وہ غضبناک ہو کر اٹھا تھا۔ ہنی کی چیخ تک حلق میں ہی گھٹ گئی تھی۔ مگر اس نے تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے دوڑ لگا دی۔ سیڑھیوں پر لہنگا پیروں میں پھنس

گیا۔ اور دوسرے پل وہ لڑھکتی ہوئی آپا کی گود میں سوار ہوئی تھی۔ دادو ہکا بکا رہ گئیں اور اوپر کھڑا ارمغان سرپیٹ کر رہ گیا تھا۔

* * *

"اب تم دونوں میں سے کسی نے گڑبڑ کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ سمجھو' وقت گزر گیا۔ اب تو بس نبھانی ہے۔ کچھ دادا' دادی کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا۔ کل جو کسی کی نظر پڑ جاتی تو دو کوڑی کی عزت نہ رہتی۔"

آپا سخت غصے میں تھیں۔ بڑی مشکلوں سے ہنی کو اس کے کمرے میں چھوڑنے آئی تھیں۔ وہ تو راضی ہی نہ تھی۔ کل کی رات دادی کے کمرے میں گزاری۔ خود مزے سے سوتی رہی' ان لوگوں کی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

"یہ خود گئی تھی' میں نے کیا کہا تھا۔" وہ سارا الزام اس پر دھر گیا۔

"گلا دبوا لیتی۔ چپ چاپ۔" "ہے نا۔"

"ہائے اللہ! ہیں ارمغان۔" آپا ہل کر رہ گئیں۔

"کس کی باتوں میں آ گئی ہیں' حد ہوتی ہے دروغ گوئی کی۔ میں نے خاصی معصوم لڑکی سمجھا تھا۔" ارمغان نے تپ کر کہا۔

"نہیں' ساری معصومیت تو آپ پر ختم ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" ارمغان گرجا۔

"دیکھا آپا۔" ہنی نے روہانسی ہو کر آپا کو دیکھا۔

"پاگل کر دو گے تم لوگ مجھے۔" وہ سر تھام کر رہ گئیں۔

"آپ کیوں ہونے لگیں۔ پلے تو میرے پڑی ہے میں ہوں گا پاگل۔" وہ بیڈ پر بیٹھا سلگ رہا تھا۔

"اور میں بھی۔" ہنی نے بڑی افسردگی سے کہا۔

"ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ شوہر ہے تمہارا۔" آپا نے ڈانٹا۔

"ان کی لغت میں خاموشی کا لفظ نہیں ہے۔ ملک الموت بھی آ گیا تو اس سے بھی پٹر پٹر باتیں بگھاریں گی۔"

لڑتی تو وہ پہلے بھی بہت تھی' مزاج میں ابھی بچپنا تھا' ضدی بھی تھی۔ ضد کر کے ہر بات منواتی۔ پہلے ارمغان اس کے جملوں کو انجوائے کرتا۔ اس کی ضدیں بھی پوری کر دیتا تھا۔ اب بھاری فیروزی اور پرپل کنٹراسٹ کے ولیمے کے جوڑے میں دلہن کا میک اپ کیے اور بھاری جیولری پہنے اپنی تمام تر معصومیت اور حسن کے باوجود یوں جواب دیتی زہر لگ رہی تھی۔ آج ان کا

ولیمہ بہت شاندار ہوا تھا۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر ارمغان کے چہرے کے تناؤ میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ آج تو ہنی بھی منہ بسورے بیٹھے رہی تھی۔ کئی لوگوں نے دبی دبی زبان میں سرگوشیاں کیں' پوچھا بھی' آپا اور دادی جز بز ہوتی رہیں۔

"اب سو جاؤ تم لوگ۔" آپا انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر اٹھی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہیں۔ یہ زیور تو اتار دیں۔ اتنا بھاری ہے۔"

آپا طویل سانس لے کر پلٹیں۔ ایک نظر ارمغان پر ڈالی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ہاتھ میں کتاب لئے بیزار سا بیٹھا تھا۔ پہلی رات کی ساری خوبصورتی تو غارت کر چکے تھے وہ لوگ' امید آج بھی کچھ نہ تھی۔

"ضرورت کیا تھی اس لیپا پوتی کی۔ شکل تو وہی رہی تھی۔ ہونق سی۔" ارمغان نے چڑایا۔

"جی نہیں۔ میں آج سب سے اچھی لگ رہی تھی۔ ہے نا آپا۔" ہنی نے اترا کر کہا۔ اس کے اترانے میں معصومیت کے ساتھ تیکھا پن تھا۔

"اپنے منہ میاں مٹھو۔"

"آپا! دیکھیں نا......"

"ارمغان بی ہیو یور سیلف۔" آپا نے ڈانٹا۔

"ہونہہ......!" وہ پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہوا۔ آپا نے اس کا سارا زیور اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سنبھال کر رکھا۔ میک اپ صاف کرتے ہوئے دل مسوس کر رہ گئیں۔ چار گھنٹے لگے تھے پارلر میں' کیا پریوں سا روپ آیا تھا۔ سب ہی نے تعریف کی اور ارمغان نے شاید اسے نظر بھر دیکھا بھی نہیں۔

"پتا نہیں کیا بنے گا۔" وہ متفکر تھیں۔ ہنی بڑے مزے سے سارے فنکشن کو یوں ڈسکس کر رہی تھی جیسے کسی اور کا ولیمہ اٹینڈ کر کے آئی ہو۔

"ہاں آپا! وہ مان نے جو لاکٹ دیا ہے نا۔ مجھے اس کا ڈیزائن پسند نہیں آیا۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں ارمغان کو دیکھا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"ہائے ہنی! وہ لاکٹ تو بہت پیار سے ارمغان نے دیا تھا رونمائی میں۔" آپا بے اختیار بولیں۔

"پیار سے تو نہیں دیا تھا۔ یوں کر کے پھینکا تھا۔" اس نے لاکٹ اٹھا کر اچھالا۔ وہ سیدھا ارمغان کی جھولی میں پڑا' وہ بھڑک کر اٹھا۔

"دیکھا آپا! کس قدر جاہل اور ال مینرڈ لڑکی ہے۔"

"اس طرح دیا تھا......" اس نے دل گرفتگی سے آپا کو دیکھا۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ فائدہ

ہی کچھ نہ تھا۔ بس سلیپنگ سوٹ اس کے ہاتھ میں دے کر ڈریسنگ روم کی طرف دھکیل دیا۔ جب وہ چینج کر کے باہر آئی تو وہ جا چکی تھیں۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے کاٹن اور نیل پالش ریموور اٹھایا اور بیڈ پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ارمغان نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ وہ پہلے دن کی طرح خوفزدہ نہیں تھی بلکہ دادی کی خوب سکھائی پڑھائی لگ رہی تھی۔

"بات سنو۔" اسے یوں مطمئن دیکھ کر اسے چین نہیں آیا۔

"جی۔" اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائیں۔

"اگر اس کمرے میں رہنا ہے تو ڈھنگ سے رہنا' میری کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔"

ہنی نے قدرے خفگی سے اسے دیکھا۔

"بچہ سمجھتے ہیں مجھے۔ نانو نے بھیج دیا ورنہ میں نہیں آ رہی تھی۔"

"تم میں عقل نہیں ہے۔" ارمغان نے چڑایا۔

"یہاں ہماری بھی بہت سی چیزیں رکھی ہیں' آپ بھی مت ہاتھ لگائیے گا انہیں۔" اسے بھی غصہ آ گیا۔

"تم......!" ارمغان حشر کر دیتا اس کا' مگر پتا تھا۔ کچھ بھی کہہ دیا تو وہ دادی کی گود میں جا چڑھے گی۔ اسے پروا بھی نہ ہوتی۔ مگر گھر میں کچھ مہمان ابھی بھی موجود تھے۔ اس نے غصے میں کتاب پرے اچھالی اور تکیے میں سر دے کر لیٹ گیا۔

"نہ جانے کس گناہ کی سزا ہو تم۔ کسی عذاب کی طرح مسلط کی گئی ہو مجھ پر۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ افسردگی سے منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

* * *

آپ کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دن یہاں رہ کر ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کریں گی مگر ایبٹ آباد سے ان کی ساس کا بلاوا آ گیا۔ وہ بیمار تھیں اور تنہا بھی۔

آپا اور دانیال بھائی نے بعجلت سامان باندھا اور روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے انہیں ایبٹ آباد کی پرزور دعوت دے گئے۔ ارمغان انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ گیا تھا۔ واپس آیا تو وہ ٹی وی لاؤنج میں دادی کی گود میں سر رکھے بیٹھی تھی۔

"کتنی اداس ہو گئی ہے نا آپا کے جانے کے بعد۔"

"اداسی کیسی' ساتھ خیریت کے اپنے گھر پہنچے ساس سسر کی خدمت کرے۔ میرے گھر کی رونق تو تم سے ہے۔" دادی نے نہال ہو کر اس کی پیشانی چومی۔ وہ کلس کر رہ گیا۔

"بیٹا! چھوڑ آئے انہیں۔" دادی نے اس کو آتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں، واپس لے آیا ہوں۔"

ہنی ہنسنے لگی۔ وہ نظرانداز کر کے اوپر جانے لگا مگر دادی نے پکار لیا۔

"دو گھڑی اپنی دادی کے پاس بھی بیٹھ جاؤ۔" وہ پلٹ کر صوفے پر بیٹھا اور ریموٹ سے ٹی وی آن کر دیا۔

نہ تو آئے گی نہ ہی چین آئے گا

میرے انگن کی ہری بیلوں کا پتا پتا سوکھتا جائے

جنید کی آواز پر وہ اٹھ بیٹھی۔

"اسی چینل پر لگا دیں۔"

ارمغان نے کھٹ سے بٹن دبا کر اسپورٹس چینل لگا دیا۔ بورسی سائیکل ریس لگی تھی۔ وہ پھر سے دادی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ غصہ تو آیا تھا بے عزتی بھی محسوس ہوئی۔ دادو نے پہلے گھور کر ارمغان کو دیکھا پھر شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"تمہاری بہن بہت اصرار سے کہہ کر گئی ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ کچھ دنوں کیلئے چلے جاؤ۔ ہنی کا دل بہل جائے گا۔"

"اس کا دل آپ ہی بہلایئے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ روکھے انداز میں بولا۔

"ایسے کون سے پہاڑ توڑنے ہیں۔ دنیا بھر کے میاں بیوی شادی کے بعد گھومنے جاتے ہیں۔"

"ارمغان! میرا دل چاہتا ہے میں پہاڑ کی چوٹی کو چھوتے بادلوں کو دیکھوں۔" ریگ ساحل پر قدم دھرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر نیلگوں فلک پر ڈولتی آتشیں رنگ میں بھیگی بدلیوں کو دیکھا تھا۔

"میں نے کبھی پہاڑ پر ہوتی بارش نہیں دیکھی۔ میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔"

"لاؤ ہاتھ۔" ارمغان نے اس کے سامنے آ کر ہتھیلی پھیلائی۔ لائبہ نے تحیر آمیز استعجاب سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت میں دیا تھا۔

"میں شادی کے بعد تمہیں دنیا کے سارے پہاڑ گھماؤں گا۔" اس نے ایک وعدہ کیا تھا۔

"کہاں کھو گئے۔ تمہارا دادا بھی یہی کہہ رہے تھے۔" وہ چونکا اور دل میں اترتے ملال کے رنگوں کو محسوس کرنے لگا۔ ہنی نے کہا کچھ نہیں مگر منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے پاس وقت نہیں۔" وہ ریموٹ ٹیبل پر اچھال کر دو دو سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

"پتا نہیں کیا سوچ رکھا ہے اس لڑکے نے......"

"پہلے مان کتنے اچھے ہوتے تھے۔ ہر بات مانتے تھے۔ اب تو ہر بات میں ڈانٹتے ہیں۔

نانو! آپ نے میری شادی زبردستی کیوں کی ان کے ساتھ۔"

"زبردستی کیسی؟"

"آپ مجھے بچی تو بالکل مت سمجھا کریں۔" وہ چڑ گئی۔ "اسی گھر میں رہتی تھی میں بھی۔ سب سمجھتی ہوں۔ وہ کسی اور کو چاہتے تھے۔"

"لو خوامخواہ ہی۔" آپا بتا کر گئی تھیں۔ مگر وہ صاف مکر گئیں۔ اس آئینے جیسی شفاف لڑکی کے شیشہ دل میں بال نہیں آنا چاہئے۔ عمر بھی کیا تھی اس کی۔ کچھ دنوں کے بعد محض سولہ برس کی ہوتی۔ انہوں نے شوہر کو سمجھایا بھی تھا۔

"پہلے زمانے کی بات اور تھی، سلیقہ طریقہ گویا گھول کر اتنی سی عمر میں پلا دیتی تھیں مائیں یہ آج کل کی لڑکیاں تو بیس برس کی عمر میں بھی بچہ بنی رہتی ہیں۔ بس کتابیں پڑھ لیں اور ٹی وی دیکھ کر خوش ہو لیا اور سمجھے کہ زندگی یہی ہے۔"

مگر انہوں نے آرام سے کہہ دیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اب وہ پوتے کی تیور دیکھ دیکھ کر ہولتی رہتیں۔ آپا نے سمجھایا۔ کچھ دنوں کیلئے میرے پاس بھیج دیں۔ تنہا گھومیں پھریں گے تو شاید دونوں کے دل میں کچھ فطری محبت جاگے۔ مگر یہاں تو وہ جانے کو تیار نہ تھا۔ دادی نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا اور میاں کو مٹھی میں کرنے کے تیر بہدف نسخے بتانے لگیں۔

"چھوڑیں نانو! وہ چھ فٹ کا بندہ میری نازک سی مٹھی میں کہاں سے آئے گا۔ دفع کریں اور گانے سنیں۔"

اس نے آرام سے میوزک چینل سیٹ کر کے لاپروائی سے کہا اور گانے سننے لگی۔ بے چاری نانو سر پکڑ کر رہ گئی تھیں۔

* * *

وہ آفس کیا آیا۔ سب نے اسے حسب توفیق گھورا اور حیرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

"یہ کہاں لکھا ہے کہ شادی کے بعد بندہ آفس نہیں آتا۔"

"برادرم! لکھا تو یہ بھی کہیں نہیں کہ شادی کے تیسرے دن آفس بھاگ آؤ۔ تم یقین کرو۔ تمہارے بغیر بھی یہ میگزین مارکیٹ میں آ جائے گا۔" وسیم نے کہا تو عالیہ بھی بول اٹھی۔

"ہمارا تو خیال تھا تم ہنی مون کیلئے نکل گئے ہو گے۔"

ان سب کے استعجاب آمیز استفہامیہ لہجے پر وہ جھنجھلایا تو تھا مگر سنبھل گیا۔

"ہاں جا تو رہے ہیں۔ میں تو یونہی تم لوگوں سے ملنے چلا آیا تھا۔"

وسیم اور ساجد بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگے۔

"تمہارا خیال تھا کہ ہم تمہارے بغیر اداس ہو گئے ہوں گے۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔" وہ خفا ہو کر اٹھنے لگا تو طاہر نے اس کا بازو تھام لیا۔

"ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ تم ہم سے بہت محبت کرتے ہو۔"

"ویسے ارمغان! تمہاری وائف بہت پیاری ہے۔ انوسینٹ اینڈ کیوٹ۔" عالیہ نے کہا۔ وہ سب ہی ولیمے پر آئے تھے۔ ماسوائے لائبہ کے۔

"ہاں واقعی۔ مگر ارمغان سے ذرا چھوٹی لگتی ہیں بھابی......"

"ہاں تھوڑی ینگ ہیں۔ مگر ارمغان کے ساتھ سوٹ کر رہی تھیں۔ ارمغان! تم لوگ واپس آؤ گے تو ہم لوگ تمہاری دعوت کریں گے۔" عالیہ نے کہا تو سب لوگ تائید کرنے لگے۔

"مگر تم لوگ جا کہاں رہے ہو......" ساجد نے پوچھا۔

"پہلے ایبٹ آباد آپا کے پاس۔ پھر وہاں سے آگے کہیں بھی......" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا۔ مقصد انہیں ٹالنا تھا۔ بہت انا پرست تھا۔ کسی دوسرے کو یہ شائبہ تک نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ یہ سب اچانک اور زبردستی ہوا ہے۔ وہ لوگ اب بھی حنا کو ڈسکس کر رہے تھے۔ ارمغان کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ اس نے اکتا کر لائبہ کی خالی ٹیبل کو دیکھا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

"لائبہ نہیں آئی آج......؟" اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"ہاں وہ کچھ دن آفس نہیں آئے گی۔ شاید کہیں جا رہی ہے۔" وسیم نے بتایا تو وہ بے اختیار ہو کر پوچھنے لگا۔

"کہاں؟ کہاں جا رہی ہے؟"

"میں نے پوچھا نہیں۔"

"ہاں ارمغان! وہ تمہارے ولیمے پر بھی نہیں آئی۔ کیا تم نے انوائیٹ نہیں کیا تھا۔" عالیہ نے اچانک پوچھا۔

"کیا تو تھا۔ شاید مصروف ہو گی۔" اس کا لہجہ خود بخود مدھم سا ہو گیا۔ پھر وہ کھڑا ہوا تو وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

"کدھر بھئی......؟"

"بس اب چلتا ہوں۔"

"ہاں' اب کہاں ٹھہرو گے۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا اور ارمغان بیزار سا ہو کر باہر نکل آیا۔

کچھ لمحے یونہی سڑکوں پر بائیک دوڑانے کے بعد اس کا رخ لائبہ کے فلیٹ کی طرف تھا۔

مگر فلیٹ پر تالا پڑا تھا۔ وہ کچھ لمحے بند دروازے کو گھورتا رہا پھر خاموشی سے پلٹ آیا۔

"کس سے بھاگ رہی ہو لائبہ مراد! مجھ سے یا اپنے آپ سے۔" پر رونق سڑک کے کنارے بائیک روک کر اس نے کسی آشنا چہرے کو تلاشنے کی کوشش کی۔

"شاید تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا۔ دوریاں محبتوں کو بڑھا دیتی ہیں۔ کیا تمہارے یوں چھپ جانے سے وہ تحریر مٹ جائے گی جو خود محبت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے ہمارے دل پر کندہ کی تھی۔"

اس کے دل پر اداسی قطرہ قطرہ برسنے لگی۔ بھری سڑک پر اس نے خود کو بے حد تنہا اور اکیلا محسوس کیا تھا۔

"کیا یوں تم مجھے بھول جاؤ گی لائبہ مراد!" اس نے اپنا تحیر بھرا سوال ہواؤں کے سپرد کیا تھا۔

* * *

تیری آنکھوں نے میرے گرد اک دیوار کھینچی ہے
میں اس سے بھاگ کر جانا بھی چاہوں تو کہیں اب جا نہیں سکتی
کہ پیروں سے کوئی زنجیر بے آواز لپٹی ہے
یہ وہ دیوار ہے جس میں کوئی روزن نہیں کھلتا
میں اس میں در بناتا ہوں تو ہر اک خشت میرا راستہ روکے
میرے کانوں میں اک پر کیف سی آواز آتی ہے
یہاں سے بھاگ کر جانا کوئی آساں نہیں ہے
محبت اس قدر کمزور میری جاں نہیں ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے
میں اس کو توڑنا چاہوں تو تیشہ سر کو آتا ہے
یہاں اڑنا کہاں اس طائر بے پر کو آتا ہے
میری ساری توانائی یہاں ناکام ہوتی ہے
یہیں اب صبح ہوتی ہے' یہیں اب شام ہوتی ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے
مجھے اس سے مفر کا ایک بھی رستہ نہیں ملتا
کہ اس دیوار کے پیچھے بھی اک دیوار لگتی ہے

جب میں نے پہلی بار لائبہ مراد کو دیکھا...... وہ اوائل اکتوبر کی مہکی مہکی' رنگوں میں ڈھلی شام تھی۔ پرانی طرز کے بنے بنگلوں کے گرد چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں پھول مہکتے تھے۔ ان کے

گرد بنے جنگلوں پر سرخ، کاسنی اور سفید ننھے منے پھولوں کی بیلیں کچھ اس طرح پھولوں سے لدی تھیں کہ سبز پتوں کا رنگ کہیں غائب ہوگیا تھا۔ چوڑی سڑک کے گرد سفید اور صنوبر کے طویل قامت درخت ایستادہ تھے۔ میں اور دادا حسب معمول واک کرتے ہوئے سڑک کی دائیں طرف اترے اور فٹ پاتھ عبور کرکے چرچ روڈ پر آگئے۔ یہاں درختوں کے چوڑے سبز پتوں میں چھپی شام کچھ اور گہری ہو رہی تھی۔ یہاں پرندوں کی بولیاں اپنی پوری آواز اور وضاحت کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں۔ اک مہکی سی خاموشی اور ٹھنڈک آمیز سکوت۔ سرخ پتھروں سے بنی چرچ کی خوبصورت عمارت سنسان پڑی تھی اور دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا۔ یہاں صرف اتوار کے اتوار سروس ہوتی تھی تب ہی نرسری کی سائیڈ سے نکل کر دو لڑکیاں سامنے آئی تھیں اور میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس ڈارک براؤن بالوں والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتی، اعتماد سے قدم بڑھاتی ہمارے سامنے سے گزر کر دائیں طرف مڑ گئیں۔

''کچھ لوگ دوسروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں بابا۔'' میں نے کہا تو بابا کھل کر مسکرائے۔

''بعض لوگ مختلف نہیں ہوتے گرینڈ سن! ہماری سوچ اور نظر کے زاویے انہیں مختلف بنا دیتے ہیں۔'' وہ میری نظروں کی چوری پکڑ چکے تھے۔ میں جھینپ کر صلیب پر اتری ننھی چڑیا کو دیکھنے لگا۔ مگر ذہن وہیں اس لڑکی کے براؤن بالوں اور پراعتماد چال میں اٹک گیا تھا۔ دل ایک دم اکتا سا گیا۔

''بابا! گھر چلیں۔''

''ابھی سے......'' بابا نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''بس موڈ نہیں رہا۔''

''تم جاؤ، میں ذرا شیرازی صاحب کے ہاں سے ہو کر آتا ہوں۔'' بابا نے کہا میں اکیلے ہی واپس پلٹ آیا۔ گیٹ کے پاس ہی تیز تیز پیڈل مارتی ہنی نے اپنا سائیکل عین میرے پاس آ کر روکنے کی کوشش میں مجھے دھکا دے مارا تھا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ جبکہ ہنی اور سائیکل دونوں نیچے گرے تھے۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور اپنی سائیکل سیدھی کرتے ہوئے پرجوش انداز میں بولی۔

''ہائے مان بھائی!''

''یہ جہاں میں نہیں ہوتا۔ وہاں تم سائیکل کیسے روکتی ہو؟'' میں نے اپنا بازو سہلاتے ہوئے اسے گھورا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ کو چوٹ لگی ہے۔''

''کچھ خاص نہیں، تم کیسے آئیں۔''

''نانو کے چاکلیٹ لے کر آئی ہوں۔'' اس نے ٹراؤزر کی پاکٹ تھپتھپائی۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ دادی جان ہنی کو دیکھتے ہی نہال ہوگئی تھیں۔

''پتا ہے نانو جان! کل پاپا نے مجھے ڈانٹا تھا۔'' وہ ان کی بانہوں میں سماتے ہی شکایت کرنے لگی۔

''پاپا نے کل ڈانٹا اور تم آج شکایت کر رہی ہو۔ تمہیں تو فوراً آنا چاہئے تھا۔'' میں نے اس کی عادت کے پیشِ نظر طنز کیا۔

''ہاں نا۔'' وہ فوراً ان کی بانہوں سے نکل کر میری طرف پلٹی۔ ''میں تو آ رہی تھی۔ مگر فیصل آباد سے چھوٹی پھپھو آگئیں۔''

''فرخندہ آئی ہے۔'' دادی نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں انکل سے لڑ کر آئی ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے بتایا، دادی تو اچھل ہی پڑیں۔

''وہ کس لئے؟''

''آئی ڈونٹ نو......'' اپنے گھنگھریالے بالوں کی ننھی سی پونی جھلاتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی۔

''تم نے کچھ سنا بھی نہیں۔'' دادی جان کے اندر کھد بد شروع ہوگئی تھی۔

''نو۔'' اس نے نفی میں سر ہلا کر چاکلیٹ نکالے۔ ''دیکھیں نانو! میں آپ کیلئے چاکلیٹ لائی ہوں۔''

دادی جان کی دلچسپی چاکلیٹ سے زیادہ اس کی پھپھو میں تھی۔ مگر وہ چاکلیٹ انہیں تھما کر فوراً کھڑی ہوگئی۔

''مان بھائی! ریس لگائیں گے۔''

''آج نہیں۔'' میں نے ٹالا۔

''آپ میری کبھی کوئی بات نہیں مانتے۔'' اس نے خفگی سے منہ پھلایا تو مجھے بے اختیار اس پر پیار آگیا۔

''کل اسی وقت، ٹھیک ہے۔''

''اوکے۔'' وہ کچھ سوچ کر فوراً مان گئی۔

''گڈ گرل۔'' میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ تب مجھے بہت پیاری، بہت عزیز تھی اور جب وہ مجھے مان کہتی تو میرا سچ مچ اس کا مان بن جانے کو چاہتا تھا۔ پھپھو کی ڈیتھ کے بعد تو وہ ہمارے کچھ اور بھی قریب ہوگئی تھی۔ شاید میں اب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتا۔ اگر وہ میرے اور لائبہ کے درمیان نہ آتی۔''

اس کا قلم ایک دم رک گیا۔ بہت دیر تک وہ لائبہ کے نام پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ پھر اک طویل سانس لے کر اس نے لکھنا شروع کیا تھا۔

"میں اور ہنی سائیکلوں پر چرچ روڈ کی طرف نکلے تھے۔ جب میں نے تمہیں دوسری بار دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا۔ ہنی کی خواہش کہ سڑک کے کنارے بہت دور تک چلتے ہیں کو رد کر کے اس طرف آنے میں میری کسی لاشعوری خواہش کا عمل دخل تھا کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں' مگر کیوں؟ میری سائیکل کی رفتار خود بخود آہستہ ہوگئی۔ ایسا کیا ہے اس میں۔" میں نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ تیکھے تیکھے سے نقوش' شہابی رنگ' پراعتماد بے نیاز انداز' ہلکے سبز لباس میں وہ اس دن سے زیادہ خوبصورت لگی۔ اس کے ساتھ آج بھی کل والی لڑکی تھی۔

"ہرے۔" ہنی نے نعرہ لگایا تو میں نے چونک کر سائیکل کی رفتار بڑھائی۔

"اوہ مان بھائی! آپ آج بھی ہار گئے۔" پھولی پھولی سانس کے ساتھ مسرور سی ہنی نے کہا۔ اس کی گلابی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ نوخیز چہرے پر بڑا جوش اور خوشی تھی۔

"تم نے سبز ڈریس والی لڑکی دیکھی......کیسی ہے؟"

ہنی نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔ پھر کندھے اچکا کر بولی۔

"میں نے تو انہیں دیکھا ہی نہیں۔"

"بدھو ہو تم۔"

"آئیں۔ واپس چلتے ہیں۔" ہم دونوں واپس پلٹے۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہنی نے رفتار آہستہ کی۔

"ہائے۔" اس کی پرجوش آواز پر ان دونوں نے چونک کر دیکھا۔ پھر ہاتھ ہلا کر اسے جواب دیا تھا۔ ہنی پیڈل مارتی میرے قریب آئی۔

"بس ٹھیک ہے' کچھ خاص نہیں۔"

"تم واقعی ڈفر ہو۔" میں نجانے کیوں چڑ گیا اور وہ مجھ سے خفا ہوگئی تھی۔ پھر یہ میری روٹین میں شامل ہوگیا تھا۔ کبھی دادا کے ساتھ تو کبھی اکیلے میں چہل قدمی کیلئے ضرور نکلتا۔ مگر وہ کبھی اکیلی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ لڑکی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی۔ میں چاہتا تو ذرا سی کوشش سے اس کا گھر معلوم کرسکتا تھا۔ مگر ایسی کوئی خواہش میرے اندر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں بس اسے دیکھتا اور دیکھ کر خوش ہو جاتا۔ مجھے اس کی بے نیازی بھاتی کتنے دنوں سے میں اس کے پاس سے گزرتا تھا مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ گویا اسے خبر ہی نہیں کہ میں صرف اسے دیکھنے کیلئے یہاں آنے لگا ہوں۔

پھر وہ غائب ہوگئی اور میں بے قرار چرچ کے اطراف میں منڈلانے لگا۔ مگر وہ پھر نظر نہ

آئی۔

"تمہیں خبر نہیں کہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہوگئے ہیں' اگر پڑھائی کا ارادہ ترک کر دیا ہے تو اپنے دادا کے ساتھ فیکٹری سنبھالو۔"

ایک دن دادی جان نے مجھے ٹوکا تھا اور میں نے ایڈمیشن لے لیا انگلش ڈیپارٹمنٹ میں اور تعارفی کلاس میں میں لیٹ آنے کی بنا پر سب سے آخر میں بیٹھا تھا اور جب میری دائیں سائیڈ والی رو کی دوسری کرسی سے اٹھ کر اس نے اپنا تعارف لائبہ مراد کے طور پر کروایا تو میرا دل چاہا میں کرسی پر چڑھ کر بھنگڑا ڈالوں۔ اپنا تعارف کرواتے ہوئے میں نے بطور خاص پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میرے دیکھنے پر وہ پروفیسر ادریس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ تمام وقت میں گاہے گاہے اسے دیکھتا رہا۔ مگر اس کے بعد اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد میں سیدھا اسی کی طرف آیا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

"ہیلو......" میرے پرجوش انداز پر اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "آپ یہاں۔" میرے لہجے میں کسی دیرینہ دوست سے ملنے والا والہانہ پن تھا۔

"مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا......؟" اس نے بے حد سادگی سے سوال کیا تھا۔

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" اس نے غور سے مجھے دیکھا پھر فائل میں کاغذ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔"

"ہم وہاں اکثر چرچ روڈ پر ملا کرتے تھے۔" میں نے اسے یاددہانی کرائی۔ اس نے سر اٹھا کر تحیر سے مجھے دیکھا۔ پر اطمینان سے گویا ہوئی۔

"میں وہاں اکثر جایا کرتی تھی' مگر میں آپ سے کبھی نہیں ملی۔" وہ باہر نکل گئی اور میں خجل سا ہوگیا۔ سچ ہی تو تھا۔ وہ مجھ سے ملی کب تھی جو پہچانتی۔ کلاسز شروع ہوگئی تھیں۔

اس دن نے جب میں میڈم رضوی کی کلاس لے کر باہر نکلا تو فرحانے مجھے بازو سے کھینچ لیا۔

"ارمغان! ارمغان! میری بات سنو۔"

میں لڑکھڑا کر پیچھے سے آتی لائبہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹی۔ پھر خشمگیں نگاہوں سے مجھے اور فرحانہ کو گھورتی باہر نکل گئی۔ فرحانہ کا نجانے کیا مسئلہ تھا۔ میں ٹھیک طرح سے سن ہی نہ سکا۔ دھیان پورے کا پورا دروازے سے نکلتی لائبہ کی طرف تھا۔

"افوہ! تم میری بات نہیں سن رہے۔" فرحانہ نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ تو میں ایک طویل سانس لے کر بیٹھ گیا۔

"ہاں کہو!" وہ میری کالج فیلو بھی تھی اور بے تکلف دوست بھی۔ اسے میری وہ والی اسائنمنٹ درکار تھی جو آج ہی میڈم رضوی نے واپس کی تھی۔

"تمہاری نقل والی عادت ابھی تک نہیں گئی۔" میں نے جھنجھلا کر اسے فائل تھمائی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"جب تک تم ہو' مجھے کیا ضرورت ہے دماغ کھپانے کی۔"

میں باہر نکلا تو لائبہ کاریڈور میں وسیم کے ساتھ نجانے کس بات پر جھگڑ رہی تھی۔

"تمہیں میری بات ماننا ہوگی وسیم۔"

"لائبہ! مجھے ابھی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں' تم ہرایرے غیرے کی مدد لے سکتے ہو' صرف میری نہیں۔" وہ خفا ہو کر کہہ رہی تھی۔

"اچھا بابا! ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" وسیم نے گویا ہار مان لی تو وہ مسکرا دی تھی۔ پھر اک سرسری نگاہ مجھ پر ڈال کر وسیم سے پوچھنے لگی۔

"شام کو گھر آؤ گے؟"

"ہاں......!"

"اوکے' پھر شام میں بات ہوگی۔" وہ میرے قریب سے نکل کر کاریڈور کے سرے پر غائب ہوگئی۔

"تم لائبہ کو جانتے ہو؟" مجھے اس وقت سخت حسد ہو رہا تھا۔ آخر یہ اردو ڈیپارٹمنٹ کا وسیم یہاں لائبہ سے ملنے کیوں آتا ہے' تب ہی بے اختیار وسیم کے سامنے آ کر اس سے پوچھنے لگا۔

"ہاں' میرے فادر کے دوست کی بیٹی ہیں۔" اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔ میں سر ہلا کر کاریڈور کی سیڑھیاں اتر گیا۔

* * *

"تمہارا نام بہت خوبصورت ہے۔" بینچ کے آخری سرے پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر دوبارہ سے ملٹن کو پڑھنے لگی تھی۔

"کس نے رکھا تھا؟" اس کی یہ بے نیازی مجھے کچھ اور اکساتی تھی۔

"میرے پاپا نے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے؟" مجھے تو بس بات کو آگے بڑھانا تھا۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر سے کتاب پر نظریں جماتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی تھی۔

"جنت کی حور یا شاید جنت کی سردار حور کا نام ہے۔"

"واؤ۔ شاید اسے ہی اسم بامسمّٰی کہتے ہیں۔" میں بے اختیار بولا۔

"بس یا کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔" وہ بے حد بیزاری سے بولی۔ میں ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔

"تمہاری ابھی تک کسی سے فرینڈشپ نہیں ہوئی۔"

"کیا ضروری ہے؟"

"بہتر اور اچھا وقت گزارنے کیلئے بہت ضروری ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"میرا وقت میرے اپنے ساتھ زیادہ اچھا گزرتا ہے۔" وہ اپنے بالوں کو مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر مسکرائی۔

"گویا تم دوستی جیسے خوبصورت اور سچے رشتے سے انکاری ہو۔" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ کتاب بیگ میں ڈال کر کھڑی ہوگئی۔

"میں کافی اچھا انسان ہوں مس لائبہ مراد۔"

"مجھے تمہاری اچھائی برائی سے کیا لینا؟" وہ کھٹ کھٹ کرتی کلاس روم میں چلی گئی تھی۔

"لعنت ہے تم پر ارمغان کتنی لڑکیاں ہیں جو تم پر مرتی ہیں اور تم اس کے پیچھے پاگل ہو اور اس سے بھی زیادہ اس بات پر لعنت کہ تم اتنے دنوں میں اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکے۔ لیکن لائبہ مراد اگر میں ایسا نہ کر سکا تو یونیورسٹی چھوڑ دوں گا۔"

میں میڈم رضوی کو دیکھ کر دل ہی دل میں ارادے باندھتا کلاس میں داخل ہوگیا اور عین لائبہ کے پیچھے والی سیٹ سنبھالی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ منہ بنا کر اپنی فائل کھولنے لگی اور جب میڈم رضوی کا لیکچر اپنے عروج پر تھا اور اس کا قلم بڑی سرعت سے اپنا کام کر رہا تھا میں نے اک روتا بسورتا کارٹون فگر بنا کر عقب سے ہاتھ بڑھا کر خاموشی سے اس کی فائل پر رکھ دیا۔ اس کا قلم ٹھٹک گیا اور میں دبی دبی مسکراہٹ لبوں میں دبائے اس کے متوقع ردعمل کا منتظر رہا۔ مگر اس نے کاغذ اٹھا کر فائل کے نیچے دبایا اور پھر سے لکھنے لگی۔

"تمہیں میری ڈرائنگ کیسی لگی؟" پیریڈ کے اختتام پر میں نے متبسم لہجے میں پوچھا تو وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

"ہاں' تمہارا سیلف اسکیچ اچھا تھا۔"

میں تلملا کر رہ گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ میری کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی تھی' پھر میں نے اک نیا طریقہ اختیار کیا۔ کبھی فرحانہ' کبھی کبھی نوشابہ' لائبہ کی تیوری کے بل کچھ اور بڑھے۔ مگر مجھے اس سے فائدہ ہونے کے بجائے الٹا میری شہرت کو ہی نقصان ہونے لگا۔ میں بری طرح جھنجھلا کر اب اکثر "بس ہو چلا یقین کہ برے ہم ہیں دوستو" گنگنایا کرتا۔ مگر وہ پتھر کی مورت ٹس

سے مس نہ ہوتی۔ انہی دنوں وسیم نے ایک نئے میگزین ''جواں ادب'' کا اجرا کیا۔ لائبہ اس کی نائب مدیرہ تھی۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں انہیں جوائن نہ کرتا۔ وسیم کو یوں بھی ایسے افراد کی ضرورت تھی جو فری میں اس کا ساتھ دے سکیں۔

* * *

ٹھہرے ہوئے پانی میں
یوں دور بیٹھ کر کنکر نہ پھینکو
اس ہلچل سے کیا حاصل
قریب آؤ اور آخری بار
آئینۂ آب پر
اپنے حسین خدوخال ثبت کر دو
سوکھتے تالاب کو اس سے زیادہ کی آرزو بھی نہیں

ٹھہرے ہوئے...... جب میں چوتھی بار اس نظم کو دہرانے کرنے لگا تو جہاں لائبہ نے کوفت سے مجھے دیکھا تھا وہیں طاہر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مانا پیرزادہ قاسم نے اپنی خواہش کا اظہار انتہائی خوبصورت لفظوں میں کیا ہے مگر ہمارا کیا قصور ہے۔''

میں خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔

''بائی داوے' آج لہجے میں اتنی مایوسی کیوں ہے؟'' وسیم نے کسی نوآموز مصنف کے مسودے سے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''تم لوگ کیسا انسان سمجھتے ہو؟'' میرے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔

''سچ سچ بتائیں۔'' طاہر ہنسا۔

''ہاں۔''

''بھئی' خاصے شریف اور معقول انسان ہو۔'' وسیم نے کہا۔

''تو پھر لائبہ مجھ سے اتنا کتراتی کیوں ہے؟''

''کیا مطلب؟'' میرے اچانک کہنے پر لائبہ سمیت سب ہی چونکے تھے۔

''مطلب یہ......'' میں نے براہ راست لائبہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''لائبہ صرف مجھے ہی کیوں اگنور کرتی ہے۔ دو باتیں ہی ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ مجھے پسند نہیں کرتی یا پھر اس کی اس حد درجہ بے نیازی کے عقب میں کوئی اور جذبہ جھانک رہا ہے۔''

میں نے لائبہ کی آنکھوں میں غصے کی اٹھتی لہر دیکھی۔

''تم وسیم اور طاہر کی نظر میں تو شریف اور معقول انسان ہو سکتے ہو مگر ضروری نہیں کہ یہ رائے میری بھی ہو۔'' وہ چبا چبا کر بولی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' کم از کم میں لائبہ سے ایسی کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔

''مطلب یہ کہ تم انتہائی گھٹیا اور جاہل انسان ہو۔'' وہ غصے سے بولی تو میں بھی غصے میں آ گیا۔ حالانکہ میرا ارادہ اسے اطمینان اور سکون سے گھیرنے کا تھا مگر میرا غصہ ہمیشہ کی طرح ایک دم عود کر آیا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے گھورا۔

''تم نے کون سا گھٹیا پن دیکھا ہے میرا؟ دوستی ہی تو کرنا چاہی تھی تم سے۔''

''مجھے کسی فلرٹی شخص کے ساتھ دوستی نہیں کرنی۔'' غصہ اگر مجھ میں تھا تو کم وہ بھی نہ نکلی پھر جو بات بگڑی تو بگڑتی چلی گئی' وسیم نے ہم دونوں کو خاموش کروانے کی بہت کوشش کی اور تھک کر وہی طریقہ استعمال کیا تھا۔ ہم دونوں کو پاس کے ملحقہ کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ ہم دونوں ایک دم خاموش ہو کر بند دروازے کو گھورنے لگے۔

''اب تم دونوں ذرا اس بات پر غور کرو کہ تم دونوں نے کس قدر جہالت کا ثبوت دیا ہے۔'' وسیم کی آواز آئی تھی۔

''وسیم! دروازہ کھولو۔'' لائبہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''کھول دوں گا۔ مگر ابھی نہیں۔''

''وسیم! شام ہو رہی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' سخت غصے میں اور جھنجھلائی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس میں خاصے اطمینان سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد میں دروازہ کھول دوں گا۔ تب تک تم لوگوں کی ایک دوسرے کے بارے میں جتنی بھی الجھنیں ہیں سلجھا لو۔'' وسیم نے اطمینان سے کہا اور پھر لائبہ کے بار بار پکارنے پر بھی اس کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔

''لائبہ! بیٹھ جاؤ۔''

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ غصے میں پھنکاری۔

''ہاں۔'' میں نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ وہ غصے میں مجھے فلرٹی' جاہل' عیار قرار دیتی رہی اور میں اسے نک چڑھی' سنگدل اور ڈرامے باز کہتا رہا۔ قصداً اس کا اور اپنا غصہ نکالنا تھا' اور ٹھیک پندرہ منٹ کی دوبدو جنگ کے بعد ایک وقت وہ آیا جب میری بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ وہ کچھ لمحے مجھے گھورتی رہی۔ پھر اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کو وہ رخ بدل گئی۔ تب میں نے کمرے میں موجود واحد کرسی اسے پیش کی اور خود اس کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے شروع ہو گیا۔ اپنے پہلے احساس سے لے کر آخری حماقت تک سب کچھ سنایا۔ وہ حیرت و بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی اور

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد جب وسیم نے دروازہ کھولا تو ہم گہرے دوست بن چکے تھے۔

اس نے تھک کر قلم رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

''نانو پوچھ رہی ہیں۔ آپ نے کھانا نہیں کھانا؟'' ہنی کی آواز پر وہ چونکا۔ ہلکے نیلے کڑھائی والے سوٹ میں وہ خفا خفا سی پوچھ رہی تھی۔ ارمغان کو یاد آیا۔ جب اس کی لائبہ کے ساتھ صلح ہوئی تھی تو وہ ہنی کو شاپنگ کیلئے لے گیا تھا۔

''آپ کو کھانا نہیں کھانا تو ہم لوگ کھا لیں۔'' وہ لٹھ مارنے والے انداز میں بولی۔

''میری بلا سے زہر کھا لو۔''

''زہر کھائیں میرے دشمن۔''

وہ تلملا کر پلٹا۔ ظاہر ہے اس وقت ارمغان سے بڑا دشمن کون تھا اس کا' وہ کھڑاک سے دروازہ بند کر کے بگٹٹ وہاں سے بھاگی تھی۔

''ایڈیٹ......!'' وہ کچھ لمحے اپنے کھولتے دل و دماغ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ اور پردے ہٹا دیئے۔ بنفشی شام کے رنگ دھرتی پر بکھر رہے تھے اور ارمغان کی نگاہوں میں آج سے دو سال قبل سمندر کے کنارے گزری اک ایسی ہی رنگوں بھری شام جاگ اٹھی۔ جہاں ریگ ساحل پر بپھری ہوئی سبز موجیں' لرزتی شام کی زرد چمکیلی دھوپ کو چھو رہی تھیں۔ دور سمندر کے اورنج پانیوں پر ڈولتی کشتی کا بادلوں شام کے بنفشی رنگوں میں رنگ گیا تھا اور یہی شام آسمان کی ہتھیلیوں پر اتر کر اسے حنائی رنگ دے گئی تھی اور یہی شام لائبہ اظہار پر بھی اتری تھی۔ نم ہوا کے جھونکے اس کے مہکتے تن سے ٹکرا کر ارمغان کے آس پاس بکھر رہے تھے ارمغان پلٹا اور اس کا قلم اسی شام کو لکھنے لگا تھا۔

''اے لائبہ!'' میں نے اپنے گرد بکھرے اس خاموش طلسم کو توڑنے کی سعی کی۔

''ہوں۔'' اس شام کا طلسم لائبہ کو مسحور کر گیا تھا۔ ہتھیلیوں کے پیالے میں چہرہ سجائے اس کی نگاہیں وہاں تک سفر کر رہی تھیں۔ جہاں بادبانی کشتی دھیرے دھیرے ڈول رہی تھی۔

''خدا نہ کرے کہ کبھی کوئی ایسی شام آئے جب میں تمہارے سورج کو غروب ہوتا دیکھوں۔'' میرے لہجے میں اک نامعلوم سا خوف ڈول رہا تھا۔

''فرض کرو اگر کوئی ایسی شام آ گئی تو؟'' وہ متبسم لہجے میں پوچھنے لگی۔ میں نے ذرا سا جھک کر اس کی کانچ سی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر جارحانہ انداز میں بولا۔

''جانتی ہو پھر کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا؟''

''پھر یہ سورج نہیں ڈوبے گا۔''

''امپاسبل' ہمارے جیسے کئی آئے اور گئے۔ سورج کا طلوع و غروب تو یونہی جاری رہے گا۔'' اس کے لہجے میں خفیف سی شرارت جاگی تھی۔

''تو پھر اسے دیکھنے کیلئے ارمغان نہیں ہوگا۔''

''مطلب؟''

''اسٹوپڈ گرل۔'' میں پتھریلی دیوار سے کود کر نیچے اترا۔ ''اس دن میں خودکشی کر لوں گا۔''

''کیسے؟'' وہ ترنگ میں آ گئی۔

''ایسے۔'' میں نے دونوں بازو پھیلا کر سمندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر ایک دم رک کر اس کی طرف پلٹا۔

''لیکن میں کیوں؟''

''مجھے تمہاری محبت کا ثبوت چاہئے۔'' وہ متبسم و شریر لہجے میں گویا ہوئی۔

''مجھے بھی تو چاہئے۔'' میں نے اسے کھینچ لیا۔ کتنا دل چاہتا تھا۔ میں اس کے سنگ زمین کا آخری کنارہ بھی چھو آؤں۔ زندگی کتنی حسین و خوبصورت ہو گئی تھی اور ہر خوشی کی انتہا پر کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور رقم ہوتا ہے۔ اس شام میں گھر گیا تو انکل احتشام کی ڈیڈ باڈی گھر میں رکھی تھی اور اک کہرام مچا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور چھوٹی سی لڑکی رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر تھپتھپایا تو وہ مجھ سے لپٹ کر سسک اٹھی۔

''مان بھائی! پاپا مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔''

پہلے پھپھو اور اب احتشام انکل وہ تنہا ہو گئی تھی۔ ہم لوگ اسے اپنے گھر لے آئے۔ یوں بھی اب وہاں اس کا اپنا تھا بھی کون اس کے چچاؤں کے اپنے بچے' اپنی لائف تھی۔ ان لوگوں نے بخوشی ہنی کا سامان پیک کر دیا۔ اس کی بیسٹ فرینڈ اور اس کے چھوٹے چچا کی بیٹی ماہا اس سے لپٹ کر کتنا روئی تھی۔ میں نے بمشکل انہیں الگ کیا۔

''ہنی کوئی زیادہ دور تو نہیں جا رہی۔ جیسے پہلے ہم سے دن میں دو دو بار ملنے آیا کرتی تھی۔ ویسے ہی تم سے ملنے آئے گی۔'' میں نے پیار سے سمجھایا تو وہ آنسو پونچھ کر اسے وہ چیزیں یاد دلانے لگی جو انہیں ساتھ لے جانی تھیں۔

دادی جان اور دادا...... شاید کچھ لوگ اس دنیا میں دکھ اٹھانے کیلئے آتے ہیں۔ اپنی اولاد اور پیاروں کی جواں مرگی نے انہیں زندہ درگور کر دیا تھا۔ پہلے بیٹا اور بہو' پھر بیٹی اور اب داماد۔

میرا اور ہنی کا دکھ تو یوں بھی مشترک تھا۔ سو میں لاشعوری طور پر اس کے بے حد قریب آ گیا تھا۔ تین دن کے بعد مجھے لائبہ کی خفگی کا خیال آیا۔ دادی جان اور آپا جو اس حادثے کے موقع پر آئی تھیں کمرے میں تھیں۔ دادا جان سارا سارا دن گھر سے باہر گزارتے تھے۔ ہنی نجانے کہاں

تھی۔ میں نے نمبر ملایا لائبہ ہی نے ریسیو کیا تھا۔

''کہاں ہو ارمغان؟'' اس کے لہجے کی بے تابی مجھے سرشار کر گئی۔ کبھی یہ بے تابی صرف میرے لہجے میں چھلکتی تھی۔ ''کم از کم بتا تو دیا کرو ارمغان!''

''حادثے تو بتا کر نہیں ہوتے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا۔

''میں نے اسے دیکھا ہے۔ بہت پیاری بچی ہے اور اتنا بڑا دکھ تم اس کا خیال رکھنا......''

''ارمغان' ارمغان!'' آپا مجھے پکار رہی تھیں۔

''اوکے لائبہ! پھر بات کریں گے۔'' میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ پھر بہت سے دن گزر گئے ہنی ایک دم چپ ہو گئی تھی۔ اسکول جاتی' واپس آتی تو کمرے میں بند ہو جاتی۔ چاکلیٹ' سائیکلنگ' آپا کا بیٹا مانی' اسے کسی چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ دادی جان اسے دیکھ دیکھ کر ہولتیں اور میں کڑھتا کرتا۔ آپا کچھ دن رہ کر چلی گئیں تو وہ جو مانی کی کھلکھلاہٹوں نے تھوڑی بہت گھر کی فضا بدلی تھی پھر سے سنسان ہو گئی۔

''ہنی! تم مسکراتی کیوں نہیں ہو۔''

اس نے اپنی بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولی تھی۔

''نہیں چاہتا مان بھائی۔''

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ ''دیکھو گڑیا! یہ جو زندگی ہے نا یہ بس ایسی ہی ہے۔ جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے وہ ہو جاتا ہے۔''

''لیکن میرے ساتھ ہی کیوں؟'' وہ قسمت سمیت سب سے خفا تھی۔

''صرف تمہارے ساتھ۔'' میں نے اس کی معصوم نگاہوں میں تیرتی خفگی کو دیکھا۔ ''تم تو بہت خوش قسمت ہو ہنی! تمہارے پاس اپنے پاپا اور مما کو یاد کرنے کیلئے بہت کچھ ہے۔ کچھ عرصہ سہی مگر وہ تمہارے پاس رہے تو۔ تم نے ان کا پیار سمیٹا' ان کی آوازیں سنیں' ان سے لاڈ اٹھوائے۔ تمہارے پاس تو بہت بڑا خزانہ ہے۔ ذرا اپنے مان بھائی کو دیکھو' ان کے پاس کیا ہے۔ نہ باتیں' نہ یادیں' نہ آوازیں' بس کچھ بے جان تصویریں' کیا وہ میری تشفی کر سکتی ہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میری ممی کیسے مسکراتی تھیں۔ میرے بابا کی آواز کیسی تھی۔ پھر بھی دیکھو کیا تم نے کبھی مان بھائی کو روتے دیکھا۔ وہ اللہ کی امانتیں تھیں۔ اس نے واپس لے لیں اور میں اس بات پر شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے پاس دادی اور دادا ہیں اور ہنی تمہارے پاس تو مان بھائی بھی ہیں۔ جن کے سامنے تم رو سکتی ہو' اپنے سارے پرابلمز شیئر کر سکتی ہو۔''

ہنی کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''آؤ ہم بہت اچھے دوست بن جائیں۔ پھر تم اپنی ساری فیلنگز میرے ساتھ شیئر کیا کرنا او کے۔''

''یس۔'' وہ بے اختیار بولی تھی۔

''آؤ پھر آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔'' اس شام ہم بہت دیر تک باہر گھومے تھے۔ بار بار آئسکریم کھائی تھی۔ ہنی کو میں نے ٹینس ریکٹ اور جنون کا نیا البم دلایا اور بہت دنوں بعد اسے کھل کر ہنستا دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا تھا مجھے کیا معلوم تھا میری ہنی کیلئے یہ بے ضرر سی چاہتیں اور محبتیں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اور ہی رنگ لائیں گی۔ ہمارے فائنل ایگزام نزدیک تھے۔ سو میں سب کچھ نظر انداز کئے اپنے امتحانوں کی تیاری میں مگن ہو گیا۔

''کیا ٹاپ کرنے کا ارادہ ہے؟'' لائبہ میرا انہماک دیکھ کر چھیڑتی۔

''یہی سمجھ لو۔ آخر تمہارے پاپا کے سامنے کچھ تو بن کر جانا ہے۔ وہ تو کہہ دیں گے۔ فیکٹری تو تمہارے دادا کی ہے تم کیا کرتے ہو۔'' اس نے یہ بات ایک بار مذاق میں کہی تھی۔ میں نے پکڑ ہی لی۔

''تمہارے ساتھ زندگی گزارنی بہت مشکل ہو گی۔ تم تو بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہو۔''

اس نے بالوں کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔

''سنو یارو! یہ اپنا ببلو پامسٹری سیکھ گیا ہے۔'' وسیم نے ہمارے پاس آ کر اعلان کیا۔ ببلو واک آؤٹ کرنے والا تھا مگر میں نے اسے کھینچ لیا۔ اس کے گول مٹول صحت مند چہرے کی بنا پر سب سہیل کو ببلو کہہ کر چھیڑتے تھے۔ جس پر وہ خاصا چڑتا تھا۔

''میرا ہاتھ دیکھو۔'' میں نے فوراً اس کے سامنے ہتھیلی پھیلائی۔

''پوچھو کیا پوچھنا ہے۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولا۔

''اس کی لیلیٰ کب ملے گی۔'' کسی نے لقمہ دیا۔

''مجھے میری محبت کب ملے گی۔'' میں نے آرام سے پوچھا۔ لائبہ نے مجھے بری طرح گھورا۔ باقی سب بری طرح چیخے تھے۔ سہیل نے بہت غور سے میرے ہاتھ کی لکیروں کو کھوجا۔ پھر مایوسی سے سر ہلایا۔

''ہجر کی لکیر یوں کاٹ گئی ہے۔'' اس نے ناخن سے میری ہتھیلی پر لکیر کھینچی۔ میں نے اپنی انگلیوں کو سمیٹا اور دوسرے پل میرا مکا اس کی ناک پر لگا تھا۔ سب ششدہ رہ گئے تھے اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے غائب ہو گیا۔

بعد میں لائبہ نے میرے خوب لتے لئے تھے۔

''کیوں ذرا سی بات پر اپنا ٹمپر لوز کر بیٹھتے ہو۔''

''بس اب بہت ہوگیا۔ میں آج ہی گھر میں بات کرتا ہوں۔ ہماری انگیجمنٹ ہوجانی چاہئے۔شادی ایگزامز کے بعد ہوتی رہے گی۔''

''اچھا اور جو میرے پاپا نے پوچھ لیا کہ لڑکا کیا کرتا ہے تو......'' اس نے کہا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ مسکرایا تھا۔

''یہ بہت پرابلم ہے۔اب تو کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا ہی ہوگا۔''

دروازہ ایک بار پھر سے کھلا تھا اور اس پر بار بار اک خوبصورت خواب سے جاگنے والی کوفت طاری ہوگئی تھی۔

''کیا پرابلم ہے تمہیں؟'' اس نے بے حد چڑ کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں مجھے کپڑے لینے تھے۔'' ہنی اس کے لہجے پر گھبرا گئی۔

''بہتر ہے کہ سارے کپڑے یہاں سے لے جاؤ۔''

''نانو سے پوچھوں گی۔'' اس نے آہستگی سے کہہ کر وارڈ روب کھولی۔ پھر سوٹ نکال کر چلی گئی۔ کچھ بھی تھا اس کا یہ رویہ اس کیلئے بے حد تکلیف دہ تھا۔

وہ دوبارہ لکھنے لگا تھا۔

مجھے لگا۔ وہ کچھ الجھی الجھی کچھ پریشان سی ہے۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھا۔مگر وہ ٹال گئی۔مگر اس کے ساتھ کچھ پرابلم تھی۔ جو اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ وہ ہم میں موجود ہوتے ہوئے بھی کبھی ہمارے درمیان نہ ہوتی۔ پروفیسرز لیکچرز دے کر چلے جاتے اور اس کی نوٹ بک کے صفحات سفید کے سفید رہ جاتے۔

''لائبہ! کیا بات ہے' کوئی پرابلم ہے۔''

''نہیں تو۔'' وہ نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی۔

''کوئی پریشانی ہے تو شیئر ہی کرلو۔'' وہ کچھ لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر مسکرادی۔

''یونہی وہم ہے تمہارا۔ کیا پریشانی ہوگی۔''

''شیور۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔

''ہاں۔چلو کہیں چلتے ہیں۔'' اس نے پہلی بار کہا تھا۔ ہم دونوں ساحل پر نکل آئے۔

''ارمغان! فرض کرو' زندگی کے کسی لمحے میں بہت سالوں کے بعد تمہیں اچانک احساس ہو کہ تم جس ایک محبت کے پیچھے خوار ہوئے ہو وہ تمہارے لئے اتنی اہم نہیں اور وہ محض اک جذباتی غلطی تھی تو تم اس محبت کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

اس نے اچانک پوچھا اور اس کا سوال اور لہجہ دونوں بہت عجیب تھے۔

''محبت کوئی چیز تو نہیں' جو باسی ہوجائے تو اٹھا کر پھینک دی جائے۔ ہر گزرتا لمحہ جذبوں

کے رنگ کچھ اور گہرے کر دیتا ہے اور محبت جتنی پرانی ہو اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے۔ کسی پرانے برگد کے درخت کی طرح جس کی جڑیں زمین کے اندر' اندر بہت اندر تک چلی جائیں۔ محبت مضبوطی ہے کمزوری نہیں۔'' یہ میرا نقطہ نظر تھا۔

''اور اگر کچھ محبتیں مل کر ہمیں کمزور کردیں' ہار دینے پر مجبور کردیں تو۔'' نجانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی۔ میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''کون سی محبتیں؟''

''محبت میں کوئی ایک شکل تو نہیں ہوتی۔ یہ کئی رشتوں میں بٹ کر اپنی شکل بدل لیتی ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بھی محبت ہمیں رستہ بدلنے پر مجبور کرسکتی ہے اور اگر ایسی کوئی محبت رستے میں حائل ہو تو بھی مجھ میں اتنا حوصلہ ہے میں اس محبت کو ٹھکرا سکوں۔'' میرے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ لائبہ اک طویل سانس لے کر کھڑی ہوگئی۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔''

* * *

اور میں نے سوچا تھا۔ میں جلد ہی گھر میں بات کروں گا۔مگر چند دنوں کے بعد ہی دادا جان نے مجھے ساتھ لیا تھا اور ہم دونوں چرچ روڈ کی طرف نکل گئے اور یہیں میں نے لائبہ مراد کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ جاگی۔

''شادی کے بارے میں کیا ارادہ ہے برخوردار'' دادا جان کی لاٹھی کی زد میں آکر ایک کنکر اڑتا ہوا دور جا گرا۔ اور میرے لبوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

''خاصا نیک خیال ہے۔'' میں نے کان کھجاتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''ہم...... میں اور تمہاری دادی چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کردیں۔''

میرا دل قہقہے لگانے کو چاہا۔مگر بات کیونکہ ان کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ سو قدرے سنجیدگی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا تھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے دادا! میری اسٹڈیز تو مکمل ہوں۔''

''جلدی ہے۔'' دادا کا لہجہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھا۔ ''تم نے دیکھا یہ زندگی اور موت کا کھیل کتنا عجیب ہے۔ ہم نے زندگی میں بہت کچھ کھویا ہے۔ ارمغان! مگر خدا کا شکر ہے کہ تم ہمارے پاس ہو اور ہنی۔ ہماری بوڑھی خوشیاں بس تم لوگوں سے وابستہ ہوکر رہ گئی ہیں۔'' وہ کچھ لمحے خاموش ہوگئے۔ ''شاید تمہیں میری بات تھوڑی عجیب لگے۔مگر غور کرو گے تو اتنی عجیب نہیں لگے گی۔''

”کون سی بات؟......“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں تمہاری اور ہنی کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے ردعمل دیکھنے کو نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں اور میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میری شادی ہنی سے کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ تب ہی ان کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر بول اٹھا تھا۔

”میری تو ٹھیک ہے مگر ہنی تو ابھی بچی ہے‘ میٹرک کا ایگزام بھی نہیں دیا اس نے ابھی۔“

انہوں نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر نظروں کا زاویہ بدل کر بولے۔

”میں تمہاری شادی ہنی کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔“

اور مجھے ایک دم لگا‘ یہ میرے گرد کھڑے طویل قامت درخت اور پر کو اڑ گئے ہوں اور اوپر ٹنگا آسمان سر پر آ گرا ہو۔ میں نے کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بے یقین نگاہوں سے دادا کو دیکھا اور پھر وہاں سے بھاگ آیا۔“

اس سے آگے ارمغان کا دل چاہا کہ وہ قلم کی نوک توڑ دے۔ مگر کیا ایسے کرنے سے تقدیر کا لکھا مٹ سکتا تھا۔ اس نے بے حد تھکے تھکے انداز میں لکھا تھا۔

اور پھر میں ہار گیا‘ ہاں مجھے ان لمحوں کی اذیت دہرانے کی تاب نہیں۔ مجھے ہارنا تھا۔ میں ہار گیا۔ لیکن مجھے کسی اور نے نہیں لائبہ مراد نے ہرایا ہے۔ کتنا گڑگڑایا تھا میں اس کے سامنے۔

”میرا ساتھ تو دو لائبہ! میں تمہارے لئے ساری دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔“

مگر اس کی نم آنکھیں ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہتیں۔

نجانے اسے میری محبت پر اعتبار کیوں نہ آیا کہ وہ کتنے آرام سے کہہ گئی۔

”تم ہنی سے شادی کر لو۔“

میرا دل چاہا‘ میں اسے مار ڈالوں۔ جو بات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ مجھے اس پر عمل کرنے کو کہہ رہی تھی۔ اس پر میری کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔

”اور اب......اب نجانے وہ کہاں جا چھپی ہے۔“

شاید میری نگاہوں میں ابھرتے سوال پڑھ لئے تھے اس نے۔

اگر میرے ساتھ چلنا نہیں تھا تو ساتھ چلنے کا جھانسا کیوں دیا؟

تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا تو آزما لیا ہوتا۔ یا اگر میرے ساتھ ڈوبنے کا حوصلہ نہ تھا تو سمندر کے سفر پر نکلیں ہی کیوں؟

اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو میرے ساتھ شادی سے انکار کیوں کیا۔

اگر کبھی ملو لائبہ مراد! تو ان سوالوں کے جواب ضرور دینا۔“

کیا مجھے کسی اور کو سونپ دینا تمہارے لئے اتنا ہی آسان تھا۔

* * *

”پلیز نانو! آپ مت جائیں۔ آپ تو رک جائیں۔“ نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا وہ گھر لوٹا تو دادی جان بیگ تیار کئے بیٹھی تھیں اور ہنی ان کی منتیں کر رہی تھیں۔

”ایسے ہی گھبرا رہی ہو بچی! چند دنوں کی تو بات ہے میں ہفتے بھر کیلئے تو جا رہی ہوں۔“ انہوں نے پیار سے پچکارا۔

”آپ بھی جا رہی ہیں۔ دادا بھی جا رہے ہیں میں تو بالکل تنہا ہو جاؤں گی۔ پلیز نانو مت جائیں نا۔“ وہ ملتجی لہجے میں بولی۔

”اے ہے تنہا کیوں؟“ خیر سے ارمغان ہے تمہارے پاس۔“

”ان ہی سے تو ڈر لگتا ہے۔“ وہ منمنائی۔

”لو ڈر کیسا‘ خیر سے شوہر ہے تمہارا۔“

”جانے دو ہنی! کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔“ وہ سخت نروٹھے پن سے کہہ کر دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھ گیا۔

”ان کے حوالے کر کے جا رہی ہیں مجھے۔“ ہنی نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”بس ذرا غصے میں ہے۔ تمہیں پتا ہے اس کا غصہ ذرا تیز ہے۔ ورنہ تو بہت پیار کرتا ہے تم سے......“

”خاک بھی نہیں۔“

”اچھا میں ذرا دیکھتی ہوں اسے۔“ دادی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

”میں صدقے۔ میری جان کیوں روٹھے رہتے ہو۔ صداقت علی (دادا کے بھائی) کا فون آیا ہے۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ان کی۔ اسی لئے ذرا گوجرانوالہ جا رہے ہیں۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے انشاء اللہ جلد ہی آ جائیں گے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔ یہ بیماری کا تار بھی اسی پلاننگ کا حصہ ہے۔“ وہ چڑ کر بولا۔ دادی کھسیا گئیں اور پھر صاف مکر گئیں۔

”لو خوامخواہ ہی۔“

”آپ کچھ بھی کر لیں مگر ان تلوں میں تیل نہیں۔“ وہ اتھرے گھوڑے کی طرح بپھر رہا تھا۔

دادی اک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔ تبھی دادا اپنی لمبی چوڑی نصیحتوں کے ساتھ آ گئے۔ وہ بڑے صبر اور بے زاری کے ساتھ سنتا رہا اور جب آخری نصیحت مکمل کی کہ ”کبھی کبھی فیکٹری کا چکر

لگا لیا کرنا اور ہنی کا خیال رکھنا۔'' وہ تڑخ کر بولا تھا۔

''ظاہر ہے۔ مجھ پر چھوڑ کر جا رہے ہیں تو میں ہی خیال رکھوں گا۔ محلے والے تو آنے سے رہے۔''

دادا نے لبوں پر در آنے والی مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔ پھر دادی کو اشارہ کیا تو وہ ان کے پیچھے باہر نکلیں۔

''دیکھو میاں! ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے کہیں......'' دادی نے پریشان ہو کر پوچھنا چاہا تو دادا ہنس دیئے۔

''میں اس کا دادا ہوں۔ اتنا وہ اپنے آپ کو نہیں جانتا جتنا میں اسے سمجھتا ہوں۔ تم چلو' واپس آئیں گے تو سب ٹھیک ہوگا۔''

ہنی نے انہیں بے حد افسردگی کے ساتھ رخصت کیا تھا کہ اپنی خیریت کچھ مشکوک لگ رہی تھی۔

ارمغان نے ان کے جانے کے بعد پہلا کام تو یہ کیا کہ ہنی کو واپس اس کے کمرے میں شفٹ کیا۔ اسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ ملازمہ کتنی مشکوک ہوئی۔ اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

''کیوں صاحب جی؟''

تو ارمغان نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ ہنی حیران سی اپنا سامان دوسرے کمرے میں شفٹ کرواتی رہی۔ ارمغان نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

''تم ابھی ینگ ہو۔ اس رشتے کی نزاکتوں سے زیادہ اس کی خوب صورتیوں سے متاثر ہو۔ جو کہ ظاہر ہے کیبل کی مرہون منت ہے۔ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ مگر جو میرے ساتھ ہوا ہے وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ جب تم کسی قابل ہو جاؤ گی تب فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اس رشتے کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔''

''پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' وہ بدمزا سی ہو کر بیزاری سے بولی۔

''تمہاری سمجھ میں بھی آ جائے گا اور خدارا یہ بھڑکیلے کپڑے پہننے بند کر دو۔ مجھے کوفت ہوتی ہے دیکھ کر۔''

''وہ تو بس نانو کے کہنے پر...... ورنہ اچھے تو مجھے بھی نہیں لگتے۔'' وہ آہستگی سے بولی تھیں۔

وہ فطرتاً نرم مزاج تھا۔ ہنی کی ساری ضرورتوں کا خیال رکھتا مگر رویہ اب بھی وہی تھا' لئے دیئے سا رہتا۔ ہنی اس سے بات کرنے کو ترستی۔ اب تو اس کے لہجے کی خونخواری بھی کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔ شاید یہ احساس تھا کہ اب اسے رونے کیلئے دادی کی گود بھی میسر نہیں گھر' فیکٹری'

یونیورسٹی' اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ ہنی چند دنوں میں اس گھر کے سناٹے سے گھبرا گئی تھی۔

* * *

''کہاں کھو گئی ہو لائبہ؟''

کبھی کبھی وہ بیچ سڑک پر رک کر ایک ایک چہرے کو تکنے لگتا۔ اس کے فلیٹ پر تالا جوں کا توں تھا اور وہ ہر پل لاشعوری طور پر اس کا منتظر رہتا تھا۔ مگر اک مایوسی سی ہر گزرتے دن کے ساتھ اس پر طاری ہو رہی تھی۔ کھو جانے والے تو مل بھی جائیں۔ مگر جو دانستہ گم ہو جائیں انہیں کون ڈھونڈے۔

''تم مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتیں۔'' کبھی کبھی وہ تلخ ہو کر اس پر الزام دھرنے لگتا۔ اس دن وسیم نے اسے سرسری انداز میں بتایا تھا۔

''لائبہ ایگزام ہی نہیں دے رہی۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' اس نے بری طرح چونک کر پوچھا۔

''خود لائبہ نے۔''

''وہ...... وہ یہاں آئی تھی؟'' ارمغان کے لہجے میں بے تابی سی در آئی۔

''نہیں۔ فون پر بات ہوئی تھی۔''

''کہاں ہے وہ......''

''اپنے ددھیال میں۔''

''کہاں؟''

''یہ تو نہیں بتایا اس نے بس کبھی کبھی فون کر لیتی ہے۔ کہہ رہی تھی موڈ نہیں ہے پیپر دینے کا۔''

''اس کا فون نمبر دو گے مجھے۔'' ارمغان نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں اس نے کبھی فون نہیں کیا؟'' وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے کہاں وہ اس قابل سمجھتی ہے۔'' ارمغان کا لہجہ تلخ سا ہو گیا۔

''نمبر تو اس نے مجھے بھی نہیں دیا۔'' وسیم نے سوچتے ہوئے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔ مگر ارمغان کو لگا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ تب ہی تلملا کر اٹھ گیا۔ ہنی کاریڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھی لان میں بھاگتے خرگوشوں کو دیکھ رہی تھی۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔ وہ سہم گئی۔ قدم قدم پر شبہ دیتی نانو

بھی تو نہ تھی۔

"یونہی بیٹھ گئی تھی۔"

"ایک کپ چائے بنوادو۔"

"رشیدہ تو چلی گئی۔"

"تمہیں چائے بنانا تو آتی ہی ہوگی۔" اس نے طنزاً کہا۔ پہلے تو ہنی کا دل چاہا۔ وہ صاف انکار کردے مگر نانو کی نصیحتیں یاد آ گئیں۔ تو چائے بنانے اٹھ گئی۔ ارمغان نے اپنے کھولتے دل و دماغ کو قابو کرنے کیلئے ایک گولی نیند کی اور چائے کے انتظار میں بیڈ پر گر گیا۔ ہنی چائے لے کر آئی تو وہ غنودگی میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

"مان! چائے لے لیں......" ہنی نے اس کا بازو جھنجھوڑا اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"رکھ دو......" اس نے تکیہ سر پر رکھ لیا۔

"مان! میں ماہا سے ملنے چلی جاؤں؟"

ارمغان نے سنا نہیں تو وہ پھر سے اس کا بازو جھنجھوڑ کر بولی۔

"مان......!"

اور وہ جیسے بھر کر چیخا تھا "جہنم میں جاؤ۔"

وہ کچھ لمحے بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی' پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا گھسی تھی اور چیخ چیخ کر روتے ہوئے خود سے لڑتی خدا سے شکوہ کرتی رہی اور اسے خاموش کروانے والا کوئی بھی نہ تھا۔

* * *

ہنی کی پھپھو اچانک ہی آئی تھیں۔ ہنی کو دیکھ کر حیران سی رہ گئیں۔

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کتنی بجھی بجھی سی لگ رہی ہو اور یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں۔"

ارمغان نے سٹپٹا کر ہنی کو دیکھا۔ وہ حسب معمول جینز اور لانگ شرٹ میں ملبوس' بکھرے بکھرے بالوں کے ساتھ بیزار بیزار سی دکھائی دی۔ ہنی سے زیادہ وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"اور اتنی خاموش کیوں ہو۔ پہلے تو نچلا بیٹھنا نہیں جانتی تھیں۔"

"دادی جان نہیں ہیں' اس وجہ سے کچھ ڈسٹرب ہے۔" ارمغان جز بز ہو کر بولا۔

"کیا تم اس کا خیال نہیں رکھتے؟" انہوں نے ارمغان کو پکڑا۔ اس نے سٹپٹا کر ہنی کو دیکھا تو وہ بول اٹھی۔

"مانی تو بہت خیال رکھتے ہیں پھپھو۔" اپنا برم رکھنا اس نے نانو سے سیکھا تھا۔ ورنہ بابا نے

تو ہمیشہ اسے اک چھوٹی سی بچی سمجھا تھا۔ ورنہ بابا نے تو ہمیشہ اسے اک چھوٹی سی بچی سمجھا تھا۔ نانو کی نصیحتیں نہ ہوتیں تو شاید وہ چیخ چیخ کر سب کو ارمغان کے رویے کے بارے میں بتاتی۔ پھوپھو کو جلدی تھی۔ انہیں آج ہی ملتان جانا تھا۔ ان کی نند کی بیٹی کی شادی تھی ورنہ نجانے وہ کیا کچھ جان لیتیں۔

"تمہارے پاس کچھ ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔" ان کے جانے کے بعد ارمغان اس پر برس پڑا۔

"پہلے تو یہی پہنا کرتی تھی۔ نانو نے تو بہت بھاری بھاری ڈریس بنوائے تھے۔ وہ پہن لیا کروں۔" وہ روٹھی روٹھی سی بولی کہ خود اس نے ہی تو وہ سب پہننے سے منع کیا تھا۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ تلملا کر بولا' پھر اٹھ کر باہر نکل گیا' شام کو آیا تو وہ ٹی وی کھولے بیٹھی تھی۔ اس نے کپڑوں کا شاپر اس کے سامنے پھینکا۔

"یہ لو اور آئندہ اس اول جلول حلیے میں مت نظر آنا۔"

ہنی نے حیرت سے شاپنگ بیگ کو دیکھا' ارمغان اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"دیکھا چھوٹی بی بی! میں نے کہا تھا نا مان صاحب دل کے برے نہیں ہیں۔" ملازمہ نے خوش ہو کر کہا۔

"اب آپ پہن کر ان کو دکھائیں۔ خوش ہو جائیں گے۔"

"مجھے نہیں پہننے۔" اس نے بیزاری سے شاپر پرے کیا۔

"نہ ہنی بی بی اتنے شوق سے لائے ہیں۔"

"کوئی شوق سے نہیں لائے۔ شوق سے لائے گئے گفٹس یوں نہیں دیئے جاتے۔ پھینکنے والے انداز میں۔" اسے ارمغان کا انداز بہت برا لگا تھا۔

"لو مردوں کا غصہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ابھی آپ کو دیکھیں گے تو سارا غصہ بھول جائیں گے۔ اٹھیں تیار ہو جائیں۔" وہ اس کے بے حد اصرار پر تیار ہو کر اس کے کمرے میں گئی تھی۔

"مان......وہ۔"

وہ جو ابھی ابھی کتابیں نکال کر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھنجھلا کر چیخ اٹھا۔

"کتنی بار منع کیا ہے' یوں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے مت آیا کرو۔"

خفت سے ہنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ پلٹ کر باہر نکل گئی۔ ارمغان سر پکڑ کر رہ گیا۔ عجیب سی ٹینشن تھی جو ہمہ وقت اس کے اعصاب پر طاری رہتی۔ اس کا دل چاہتا یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہنی کے ساتھ ایسا سلوک کرے مگر اس کے سامنے آتے ہی

وہ مشتعل ہو جاتا۔ ہنی کو دیکھتے ہی اک احساس زیاں اس کے اندر جاگنے لگتا تھا۔

''کاش یہ زندگی اپنے اختیار میں ہوتی یا پھر نہ ہوتی۔'' اس نے جھٹکے سے کتابیں سامنے سے ہٹائیں۔ پھر باہر نکل آیا۔ حسب معمول وہ کاریڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھی پول سے لپٹی بیل کے پتے نوچ رہی تھی۔ نئے سوٹ کے دوپٹے کا ایک کونہ گود میں تھا۔ باقی سیڑھی پر پڑا تھا۔

''تمہیں کرنے کو کوئی کام نہیں ملتا۔'' پانی ہمیشہ نشیب میں رہتا ہے۔ وہ اس کے سامنے بے بس تھی۔ سو وہ اپنی ساری ٹینشن اسی پر نکالتا تھا۔ ہنی گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ دوپٹہ کھینچ کر کندھے پر ڈالا۔

''پڑھنا نہیں تم نے' سکول کیوں نہیں جاتی ہو۔'' اسے خاموش دیکھ کر ارمغان کچھ اور چڑ گیا۔

''مجھے یہاں نہیں رہنا۔'' بے اختیار ہنی کے منہ سے نکلا۔ ''آپ مجھے چاچو کے ہاں چھوڑ آئیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ کتابیں نکال کر دیکھو۔ اگر کوئی پرابلم ہے تو ٹیوشن کا بندوبست کر دوں گا۔''

وہ اسی جھنجلائے ہوئے سخت انداز میں کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں جا گھسی۔

* * *

ہنی کے چاچو نے اسے گھر بلا کر بے عزتی کی تھی۔ وہ نہ صرف وہاں جانے پر مجبور تھا بلکہ سب کچھ سننے پر بھی۔ بہر حال اتنی شرافت تو اس میں تھی ہی ہنی صبح اسے بغیر بتائے وہاں چلی گئی تھی۔ اسے تو خبر بھی تب ہوئی جب ان کا ملازم انہیں بلانے آیا اور نجانے اس نے چاچو کو کیا بتایا تھا کہ وہ اس پر برس ہی پڑے تھے اور وہ سب کچھ سننے پر مجبور سنتا رہا تھا۔

''اگر تم اس کا خیال نہیں رکھ سکتے تھے تو اس کی ذمہ داری اٹھائی ہی کیوں تھی۔''

اٹھائی کہاں تھی۔ زبردستی سر ڈالی گئی ہے۔

''وہ تمہیں پسند نہیں تھی تو شادی سے انکار کر دیتے۔''

''میں تو سرے سے ہی ہنی کی شادی کے خلاف تھا۔''

''عمر کیا ہے اس کی مگر تمہارے دادا اور دادی محترمہ ہی پیچھے پڑ گئیں۔ ورنہ مجھ پر بھاری نہ تھی ہنی۔'' آنٹی گھر پر نہ تھیں' انہوں نے خوب کھل کر اس کے لتے لئے۔

''خدا کا شکر کرو کہ تمہاری آنٹی گھر پر نہیں ہیں۔ ورنہ ابھی پورے خاندان میں ڈھنڈورا

پیٹ ڈالتیں۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں ہنی نے آپ کو کیا بتایا ہے۔'' ارمغان بیزار ہو کر بول اٹھا۔

''اسے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔'' چاچو نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ مجھے تو حیرت اس بات کی ہے سارا گھر یونہی چھوڑ کر وجاہت صاحب گوجرانوالہ جا بیٹھے ہیں نہ کاروبار کی فکر نہ گھر بار کی ہنی! ہنی!''

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے انہوں بآواز بلند ہنی کو پکارا تھا۔ وہ مجبوراً وہاں تک آئی۔ ارمغان نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ہنی نے گھبرا کر چاچو کو دیکھا۔

''شاباش بیٹا! گھبرانا نہیں' کچھ نہیں کہے گا تمہیں۔'' انہوں نے پیار سے ہنی کو ساتھ لگایا۔ وہ تحیر سے انہیں دیکھنے لگی۔

''چاچو! مجھے وہاں نہیں جانا۔''

''بری بات' ایسے نہیں کہتے...... میں نے کان کھینچے ہیں اس کے۔ اب نہیں تنگ کرے گا......'' وہ اسے پیار سے نجانے کیا کچھ سمجھا رہے تھے اور وہ تحیر سے سوچ رہی تھی۔

''کیا میرا اب اس گھر پر کوئی حق نہیں اور اگر پاپا زندہ ہوتے تو کیا یہ سب سننے کے بعد بھی مجھے اس کے ساتھ بھجواتے۔''

وہ بہت دل گرفتہ سی واپس آئی تھی اور ارمغان گھر آتے ہی اس پر برس پڑا تھا۔ اتنا کچھ تو چاچو نے بھی اسے نہیں کہا تھا جتنا ارمغان نے اسے سنائیں۔ ہنی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے کمرے میں گھس کر جی بھر کر رو لیتی۔

* * *

دادا کا فون آیا تھا۔ انہیں نجانے کون کون سے خاندانی معاملات سلجھانے تھے۔ سو ابھی انہیں مزید وہیں رہنا تھا۔ وہ ان کی چالاکی پر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

''یہاں آپ کے بغیر سب خیریت ہے۔'' وہ ٹھیک ٹھاک بدلحاظ ہو گیا تھا۔ ہنی کے ساتھ اس کا رویہ ہنوز وہی تھا۔ ہنی اس کے سامنے آنے سے بھی گھبراتی۔ اس کے بلاوجہ کے اعتراضات اور چیختے چنگھاڑتے روپ نے اسے سہا کر رکھ دیا تھا' وہ صبح سکول جاتی' واپس آتی تو کمرے میں ہی گھسی رہتی' خاص طور پر جب ارمغان گھر پہ ہوتا۔ ارمغان کبھی کبھی بے چین سا ہو جاتا لیکن وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا۔ ہنی کو دکھ دینے کا وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر اب وہ مرجھا گئی تھی' نانو کا فون آتا تو رو رو کر واپس آنے کا کہتی۔ مگر نجانے کیوں نانو پر اس کے آنسوؤں کا کوئی اثر

ہی نہ ہوتا۔ چاچو کی طرف سے تو اتنی بدظن ہوئی تھی کہ پھر کبھی گئی ہی نہیں۔ بس چاچو ہی کبھی کبھار آ کر اس کی خیریت دریافت کر جاتے تھے۔ وہ بھی کھڑے کھڑے۔

وہ فیکٹری سے واپس آ رہا تھا جب بلا ارادہ ہی گاڑی کا رخ ''جواں ادب'' کے دفتر کی طرف کر دیا۔ کتنے ڈھیر سارے دن گزر گئے تھے۔ وہ عملاً ان سے کٹ چکا تھا۔ آج اک انجانی طاقت تھی جو اسے کھینچ لائی۔ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر ایک کمرے پر مشتمل دفتر کتنی خوبصورت اور انمول یادیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب یہیں اس نے محبت کی پہلی تحریر لائبہ کی آنکھوں میں رقم کی تھی۔

یہیں اس نے تاعمر ساتھ چلنے کا وعدہ لائبہ کے آنچل سے باندھا تھا۔

یہیں اس نے محبت کو رفاقت بنانے کی خواہش لائبہ کی آنکھوں میں پیدا کی تھی۔

نجانے کیوں ارمغان کو لگا وہ سب یکطرفہ تھا۔

شاید شک اور بدگمانی یونہی واقعات کا مفہوم بدل دیتی ہے۔

ارمغان نے دروازہ کھولا۔ پہلا قدم اندر رکھا اور پھر ساکت ہو گیا۔

وہ اس کی محبت کا خوبصورت چہرہ تھا جو اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔

ارمغان نے سر جھٹک کر خود کو کسی خواب کے سحر سے آزاد کرانے کی سعی کی۔ مگر سارا منظر جوں کا توں تھا۔ وہ عین اس کی نگاہوں کے سامنے ٹیبل پر ہاتھ رکھے ذرا سا جھکی وسیم کے سامنے رکھے کاغذ پر پنسل سے نشان لگا رہی تھی۔ اس نے اسی زاویے میں جھکے جھکے کسی کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کیا۔ پھر اسی طرح ساکت ہوئی تھی۔

کسی نامعلوم احساس پر وسیم نے چونک کر پہلے لائبہ' پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر ارمغان کو دیکھا۔

''بہت موقع پر آئے ہو ارمغان۔'' وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے اٹھا۔ وہ دونوں بری طرح چونکے۔

''تم تو یہیں بھول ہی گئے یار۔'' وہ اس سے گلے ملتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''کون جانے' کون کس کو بھولا۔'' ارمغان نے وسیم کے کندھے کے اوپر سے لائبہ کو دیکھا۔ وہ نچلا لب کاٹتے ہوئے رخ بدل گئی۔

''کیسی ہو لائبہ؟'' ارمغان گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

''ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو؟'' لائبہ نے آہستگی سے پوچھا' وہ دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کچھ مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔

''مجھے کیسا ہونا چاہئے تھا؟'' وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔ لائبہ نے جواب نہیں دیا۔ رخ بدل کر میز سے کچھ پیپرز اٹھا کر رول کرنے لگی۔

''بہت اچھا موقع ہے۔ لائبہ بھی موجود ہے۔ ارمغان جو گلے شکوے ہیں ابھی کر لو ورنہ پہلے کی طرح سٹور میں بند کر دوں گا۔'' وسیم نے ہنستے ہوئے دھمکی دی۔ لائبہ قصداً مسکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں اور ہم میں کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں ارمغان......!'' وہ اس کی طرف پلٹی تو وہی پراعتماد سی لائبہ تھی۔ ''یونہی مصروفیت میں تم سے رابطہ نہ رکھ سکی۔ مگر میں آؤں گی ہنی سے ملنے کیسی ہے وہ؟''

''اچھی ہے......'' ارمغان جانتا تھا' وہ کبھی نہیں آئے گی۔ وہ محض وسیم کے سامنے پوز کر رہی تھی۔

''تو کھڑی کیوں ہو' بیٹھو ناں میں چائے منگواتا ہوں۔''

''نہیں آج کچھ جلدی میں ہوں پھر سہی' ارمغان! ہنی کو میرا اسلام کہنا۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ ایک بار بھی پلٹ کر ارمغان کو نہیں دیکھا۔ ارمغان گم صم سا ہو گیا۔

''ارمغان!'' وسیم نے پکارا تو وہ چونک گیا۔

''ہوں۔''

''میں نے لائبہ کو پرپوز کیا ہے۔'' وسیم بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا اور ارمغان کی رگیں تن گئیں۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اضطراری انداز میں مڑ گئیں۔

''اس نے......اس نے کیا کہا۔'' وہ بمشکل خود کو پوچھنے پر آمادہ کر پایا۔

''آئی ہوپ' وہ انکار نہیں کرے گی۔'' وسیم کا لہجہ پریقین تھا۔ اور ارمغان کا دل چاہا وہ یہ مکا اپنے ہی منہ پر دے مارے اس لڑکی سے محبت کا دعویٰ تھا اسے جو اتنی آسانی سے اسے فراموش کر گئی۔ جیسے ارمغان کوئی جیتا جاگتا وجود نہیں۔ اک بے جان شے تھا۔ جو اس کے پاس ہے نہ رہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

''میں چلتا ہوں۔'' میز پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اس نے اپنا غصہ یا شاید دکھ ضبط کرنے کی کوشش کی۔

''ارے ابھی تو آئے ہو تم۔''

''کچھ کام یاد آ گیا ہے۔'' وہ اسے بنا خدا حافظ کہے باہر نکل گیا۔ حسب توقع وہ اسے بس سٹاپ پر مل گئی تھی۔ اپنے بیگ کے اسٹریپ سے کھیلتے ہوئے اس کی نگاہیں اک غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں۔ ارمغان کی گاڑی عین اس کے پاس آ کر رکی۔ لائبہ نے چونک کر سر اٹھایا پھر پلکیں جھکا

لی تھیں کہ آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی ارمغان اس کے دل پر لکھی تحریر پڑھے۔

"ساتھ چلنے کو نہیں کہوں گا کہ تمہاری منزل کوئی اور ہے بس ایک سوال کا جواب چاہئے اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو تم نے شادی سے انکار کیوں کیا جبکہ میں تمہاری خاطر سب ہی کچھ چھوڑنے کو تیار تھا۔"

لائبہ بالکل خاموش رہی تھی۔ وہ کچھ لمحے اس کے جواب کا منتظر رہا تھا۔ پھر مایوس سا ہو کر چلا گیا۔ لائبہ نے سر اٹھا کر دور جاتی اس کی گاڑی کو دیکھا۔ پھر آنکھوں میں در آئی نمی کو چپکے سے انگلیوں کی پوروں میں جذب کیا تھا۔

"کیوں...... کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں کھایا میں نے اتنا بڑا دھوکا اور میں میں اب بھی منتظر تھا کہ وہ آئے گی تو شاید......مگر نہیں میں ہی احمق تھا۔"

اس نے کمرے کی ایک ایک چیز توڑ دی تھی۔ کتنے ضبط سے وہ گھر لوٹا تھا۔ مگر اس کا جذباتی پن اب اشتعال اور غصے میں بدل گیا تھا۔

وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ہنی اپنے لئے چائے بنا کر کچن سے باہر آئی تھی۔ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کئی سیڑھیاں پھلانگتا اس کے سامنے آیا۔

"یہ صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"م...... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" اس کی سرخ آنکھیں اور بپھرا ہوا انداز اسے لرزا گیا۔

"نہ تم ہمارے درمیان آتیں اور نہ وہ یہ سب کرتی......تم۔"

"مان......!" اس نے سہم کر کچھ کہنا چاہا۔

"بھاڑ میں گیا مان۔" ارمغان نے بپھر کر ہاتھ مارا۔ گرم چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں الٹ گیا۔ مگ کی کرچیاں اس کے پیروں میں بکھریں اور گرم چائے اس کے ہاتھ اور پاؤں کو جلاتی چلی گئی۔ اسے ایک دم چیخنا چاہئے تھا مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اور وہ اسے ساکت نظروں سے دیکھتی دیوار سے جا لگی تھی۔ ایک جامد اور بے جان تاثر اتنے شدید غصے اور اشتعال میں بھی ارمغان کو کسی غیر معمولی صورتحال کا احساس ہوا تھا۔ وہ اک دم چپ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چپ چہرے پر کوئی ایک تاثر بھی زندہ نہ تھا۔ بس اس کے لب تھے جو سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔

"ہنی!" ارمغان نے اس کا بازو تھام کر ہلایا تو درد کی تیز لہر نے اسے جھنجوڑ دیا۔ اس کی

ساکت آنکھوں میں تکلیف کی شدت جاگی۔ دوسرے پل وہ اپنا بازو چھڑا کر اندر بھاگی۔

"ہنی!" ارمغان اس کے پیچھے لپکا۔ مگر اس نے کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔

"ہنی! دروازہ کھولو۔" ارمغان کا سارا جنون نجانے کہاں گم ہو گیا۔ بس اک احساس تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ کمرے سے ہنی کی سسکیوں اور آہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ رو رہی تھی اور تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

"ہنی گڑیا! دروازہ کھولو۔ فار گاڈ سیک' دروازہ کھولو۔"

وہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر تھک گیا اور وہ روتے روتے بے حال ہو گئی۔

"ہنی پلیز! جو چاہو سزا دے لو۔ مگر خود کو یوں تکلیف مت دو۔ تمہیں درد ہو رہا ہے۔" وہ ملتجی لہجے میں پکار رہا تھا۔

دروازہ اک جھٹکے سے کھلا۔

"مجھے تکلیف ہو رہی ہے تو آپ کو کیا۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔"

"ہنی!" ارمغان نے آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہا مگر وہ کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کچھ نہیں لگتی میں آپ کی۔ آپ کو تو نفرت ہے نا مجھ سے' آپ تو یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں اس گھر میں رہوں۔ آپ نے ہی تو کہا تھا میں تمہارا دوست ہوں' اپنی ساری پرابلمز مجھ سے شیئر کرنا۔ کہاں ہے وہ مان جن سے میں اپنی پرابلمز شیئر کیا کرتی تھی۔ آپ تو وہ نہیں ہیں آپ سے تو ڈر لگتا ہے مجھے۔ میں نے کتنا چاہا کہ آپ کو بتاؤں۔ مجھے راتوں کو ڈر لگتا ہے مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ مگر آپ نے مجھے ہر بار دھتکار دیا۔ اتنی نفرت تھی آپ کو مجھ سے......" وہ بے تحاشا روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہنی! پلیز میری بات سنو۔"

"ہنی......"

"ہٹ جائیں۔ مت پاس آئیں میرے۔ بہت ظالم ہیں آپ......" وہ دیوار سے جا لگی اور وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ "آپ نے تو مجھ سے میرا مان بھی چھین لیا۔ مجھے تو زندہ ہی نہیں رہنا چاہئے تھا۔ کاش میں پاپا کے ساتھ ہی مر جاتی۔ پاپا' پاپا آپ کیوں چلے گئے؟"

یہ وہ لڑکی تھی۔ جس کی آنکھ میں وہ کبھی ایک آنسو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جو کبھی پیار سے اسے مان کہتی تو اس کا دل اس کا مان بن جانے کو چاہتا تھا۔ جو کبھی وہ اداس ہوتی تو اس کا بس نہ چلتا کہ کہاں سے کوئی ایسی خوشی خرید لائے جو اس کی اداس آنکھوں میں مسکراہٹیں بھر دے۔ آج وہ رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے وہ بے اختیار آگے بڑھا اور اسے کھینچ

کر اپنے سینے میں بھینچتے ہوئے خود بھی رو دیا تھا۔

''آئی ایم سوری ہنی!''

اور وہ کچھ اور شدتوں سے رو دی تھی۔

* * *

ابھی کچھ دیر پہلے رات نے پلکیں جھکائی ہیں
مری مٹھی میں اب تک
رات کی پلکوں سے ٹوٹے کچھ ستارے ہیں
دکھوں کے استعارے ہیں
میں ان کو دیکھتا ہوں تو!
تو میری آنکھوں میں ڈھیروں خواب
تعبیروں کے دکھ میں کوئی چہرہ سوچتے ہیں
اور وہ چہرہ شناسا شناسا سے
کئی چہروں میں تبدیل ہوتے ہیں
پھر ان چہروں سے یادوں کے' کئی منظر ابھرتے ہیں
نظر میں رقص کرتے ہیں
وہ چہرے' جو مری تنہائیوں کے اشک پارے ہیں
مجھے ہر حال میں خود سے بھی پیارے ہیں
سب ہی چہرے تمہارے ہیں

''اور آج تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے تم سے شادی سے انکار کیوں کیا۔

نہیں تم نے یہ نہیں پوچھا تم نے تو یہ کہا کہ اگر...... اگر مجھے تم سے محبت تھی تو میں نے تم سے شادی سے انکار کیوں کیا۔

''اگر......'' شک کا نوکیلا کانٹا تھا جو تمہارے بیگانہ لہجے نے میرے دل میں گھونٹ دیا اور اسی تین حرفی لفظ ''اگر......'' نے مجھے تم سے شادی سے انکار کرنے پر مجبور کیا تھا۔

نہیں سمجھے۔

آؤ میں سمجھاتی ہوں۔

میں نے ارمغان حیدر کو وہیں چرچ روڈ پر دیکھا تھا۔ میری خالہ زاد بہن ارم کی شادی تھی اور خالہ نیویارک سے یہاں صرف اپنی بیٹی کی شادی کیلئے آئی تھیں اور وہ خود ہمارے فلیٹ پر آ کر

ہمیں مدعو کر کے گئی تھیں۔ ایک طویل عرصے تقریباً بیس برس کے بعد ممی خالہ سے ملی تھیں، اور میں نئی کزنز ارم اور فائقہ کے ساتھ' فائقہ کے ساتھ تو میری فوراً ہی دوستی ہو گئی تھی۔ سو ہم لوگ پاپا سے اجازت لے کر خالہ کیلئے عارضی طور پر لئے گئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ وہی گھر خالہ نے خرید کر ارم کے نام کر دیا تھا۔ جہاں وہ اب اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میں اور فائقہ اکثر شام ڈھلے سارے ہنگاموں سے نظر بچا کر واک کیلئے چرچ روڈ کی طرف نکل آتے تھے۔ مجھے یہاں کی ٹھنڈک آمیز پرسکون فضا بہت پسند تھی۔

''تم واپس چلی جاؤ گی فائقہ! تو میں تمہیں بہت مس کروں گی۔'' سرخ پھولوں کا گچھا توڑتے ہوئے میں نے فائقہ سے کہا۔ ان چند دنوں میں وہ مجھے کتنی عزیز ہو گئی۔

''میں بھی' لیکن واپس تو جانا ہے نا۔ ابھی تو میری اسٹڈیز باقی ہیں۔''

''میں ممی کے چہرے پر جو خوشی اور رنگ آج دیکھ رہی ہوں وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا۔ وہ بہت اکیلی تھیں۔ خالہ سے ملنے کے بعد جیسے جی اٹھی ہیں۔''

''مجھے تو سرے سے یہ ساری سٹوری ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ محض پسند کی شادی پر جوان لوگوں کا حق بھی تھا۔ یوں ان سے سارے تعلق توڑ دینا ویری اسٹرینج۔'' وہ کندھے اچکا کر تحیر بھرے لہجے میں بولی تھی۔ میں ہنس دی۔

''یہ پاکستان ہے اور اس معاشرے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''لیکن پسند کی شادی سے تو ہمارا مذہب بھی منع نہیں کرتا۔''

''ہمارا معاشرہ تو کرتا ہے نا اور ہم پر ہمارے مذہب سے زیادہ ہماری سوسائٹی کا پریشر ہے۔'' میں نے اک سرسری نگاہ سامنے سے آتے سائیکل سواروں پر ڈالی۔ وہ بچی سائیکل دوڑاتی آگے نکل گئی تھی اور اس نوجوان کی رفتار سست ہو گئی۔ میں نے اس کی نظروں کی تپش کو محسوس تو کیا مگر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی۔ یہاں آتے جاتے ایسی بہت سی نظریں ہم پر اٹھتی ہیں جنہیں ناگواری کے ساتھ برداشت کر کے نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے نکل گئے۔

''تم اپنے ددھیال والوں سے کبھی نہیں ملیں۔'' فائقہ نے پوچھا۔

''میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا اور مجھے اس بات کی کچھ پروا بھی نہیں۔ جنہوں نے اپنے سگے بیٹے کو چھوڑ دیا۔ ان کے نزدیک میری یا ممی کی کیا حیثیت۔'' میرے لہجے میں بے زاری در آئی۔

''اور انکل' وہ بھی ان سے کبھی نہیں ملے۔''

''نو! پاپا مجھ سے اور ممی سے بہت محبت کرتے ہیں' ہماری محبت میں تو وہ انہیں بھول ہی

گئے۔“ میرے لہجے میں فخر سا در آیا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ پاپا نے میرے سامنے کبھی بھی اپنے گھر والوں کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ کہتے۔ ”میری دنیا بس تم لوگ ہو۔“ مجھے کیا معلوم تھا وہ ہم سے زیادہ خود کو یقین دلاتے تھے۔ ہماری محبت میں کھو کر ان محبتوں کو بھول جانے کی یہ دانستہ و شعوری کوشش تھی جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئے۔

”ہائے۔“ نوخیز پرجوش آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ وہ سائیکل والی بچی تھی۔ بچپن کو خدا حافظ کہہ کر لڑکپن کی سرحدوں کو چھوتی۔ اس خوبصورت چھوٹی سی لڑکی کو ہم نے بے اختیار ہاتھ ہلایا تھا۔

پھر اگلے اور اس سے بھی اگلے دن...... فائقہ نے مجھے ٹھوکا دیا۔

”یہ نوجوان عنقریب تمہیں کافی کی آفر دے گا۔“

وہ ہمارے عقب میں نکل گیا تھا۔ میں نے فائقہ کو گھور کر دیکھا۔

”یہ نیویارک نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”کراچی کی اکثر جگہوں اور لوگوں کو دیکھ کر مجھے نیویارک کا ہی شبہ ہوتا ہے۔“

”مانا تمہاری بات کسی حد تک سچ ہے۔ مگر میں بھی ان ہی لوگوں میں سے ہوں جو اپنے گھر اور لوگوں کی برائی دوسروں کے منہ سے نہیں سن سکتے۔“

”دوسرا کسے کہا ہے۔“ فائقہ نے مجھے پیٹ ڈالا۔ پھر ارم کی شادی ہوگئی۔ خالہ اور فائقہ واپس چلی گئیں۔ ممی پھر سے اداس ہوگئیں۔ ہم لوگ اپنے فلیٹ میں واپس آ گئے تھے۔ میں گریجویشن کے بعد بالکل فارغ تھی۔ سو سارا دن ممی کا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہتی۔

”ممی!“ ارم کی شادی کی تصویریں دیکھتے دیکھتے میں نے ایک دم انہیں پکارا۔

”ہوں۔“ ممی نجانے کس تصور میں مگن تھیں۔

”پاپا ابھی تک نہیں آئے۔“ میری نگاہیں وال کلاک سے ٹکرا کر واپس لوٹیں۔ شام کے سات بج رہے تھے اور پاپا ہمیشہ پانچ بجے گھر پر موجود ہوتے تھے۔

”ہاں آج تو واقعی لیٹ ہوگئے ہیں۔“

”آج نہیں ممی! ہم جب سے لوٹے ہیں پاپا اکثر لیٹ آنے لگے ہیں۔“

”السلام علیکم، کیسی ہو لائبہ گڑیا۔“ پاپا کی آواز اور ان کے مخصوص جملے پر میں چونک کر اٹھی۔“

”سوری۔ کچھ کام پڑ گیا تھا۔“ انہوں نے بریف کیس ممی کو تھمایا۔

”چائے بناؤں پاپا۔“ میں نے تصویریں سمیٹیں۔

”نہیں، چائے میں نے پی لی تھی، یہ کیا ہے؟“ انہوں نے بیڈ پر نیم دراز ہو کر میرے ہاتھ سے تصویریں لے لیں۔

”ارم کی شادی کی تصویریں ہیں۔“ میں پاپا کے پاس بیٹھ کر انہیں ہر تصویر کا بیک گراؤنڈ بتانے لگی۔ ممی کچن میں چلی گئی تھیں۔ کھانے کے وقت تک ہم لوگ باتیں کرتے اور ٹی وی دیکھتے رہے۔ پاپا کا معمول حسب موڈ بہت خوشگوار تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے آواز دے کر ممی کو کسی نہ کسی بات پر چھیڑ دیتے۔ کھانے کے بعد ہم لوگ واک کیلئے نکل گئے اور حسب معمول آئس کریم کھا کر ہی لوٹے تھے۔ پھر پاپا نے میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا دیا۔ جہاں پروفیسر ادریس کی کلاس کے بعد وہ فوراً میرے سامنے آیا تھا۔ کچھ لمحے۔ میں اسے پہچان ہی نہ سکی۔ دیکھا بھی کہاں تھا اسے۔ بس اک سرسری نگاہ، مگر ارمغان کا والہانہ انداز قابل دید تھا۔

”آپ یہاں؟ کس قدر اشتیاق اور خوشی تھی اس کے لہجے میں۔ ایک پل کو میں ٹھٹک سی گئی۔ مگر اتنی جلدی کسی کے ساتھ فری ہو جانا میری فطرت نہ تھا۔

”ہم وہاں اکثر چرچ روڈ پر ملا کرتے تھے۔“

اک دم جھماکا ہوا تو یہ موصوف وہ ہیں۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ رہی تھی۔ یاددہانی یوں کروا رہا تھا جیسے ہم وہاں اکٹھے واک کرتے رہے ہوں۔ یا تو احمق تھا یا پھر ضرورت سے زیادہ ہوشیار سو میں رکھائی سے جواب دے کر چلی آئی۔ بعد میں جب میں نے ارمغان کو اپنے پہلے تاثر کے بارے میں بتایا تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا کہ میں پہلی نظر میں تم سے محبت کر بیٹھا اور تم مجھے احمق، شاطر، عیار اور نجانے کیا کچھ سمجھتی رہیں۔“

”کیا لکھ رہی ہو لائبہ......؟“

ممی کی آواز پر وہ بھی طرح چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کھلے دریچے کے باہر رات بہتی تھی۔ جس کا آدھا سفر اختتام پذیر ہونے کو تھا۔

”کچھ سوالوں کے جواب باقی تھے ممّا!“

”یہ کوئی وقت اور موقع تو نہیں بیٹا۔“ انہوں نے بے حد تھکے تھکے انداز میں کہا۔ لائبہ نے سر اٹھا کر اپنے قریب کھڑی عورت کو دیکھا، جسے اک عمر کے بعد اپنے سفر کے رائیگاں جانے کا احساس ہوا تھا۔

”یہی تو وقت ہے ممی! پھر کون جانے، کون کہاں ہوگا۔ مجھے اس کہانی کا اختتام تو کرنے دیں۔ سوال ادھورے رہ جائیں تو ریشم کی ڈوری کی طرح ساری کہانی الجھی رہ جاتی ہے۔“ وہ

بہت آہستگی سے نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ممی خاموشی سے پلٹ گئیں۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے کہ نئی صبح ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگی۔ میں نہیں جانتی وہ زندگی کیسی ہوگی۔ آسان' مشکل یا شاید بہت مشکل اور تب زندگی کتنی سہل لگتی تھی۔ اک مہربان دوست جیسی' مجھے ارمغان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مزا آتا اس کی شرارتیں' اس کے جملے' اس کی کوشش اور جھنجلایا ہوا انداز میں بہت انجوائے کرتی۔ لیکن یوں تو بات بہت لمبی ہوجائے گی۔

بس وہ سب ہونے کے بعد ہماری صلح ہوگئی۔ اور دوستی نے محبت کا روپ دھار لیا۔ زندگی کی کتنی مصروف مگر خوبصورت ہوگئی تھی۔ صبح یونیورسٹی' پھر جواں ادب کا آفس۔ ہم دونوں لڑتے جھگڑتے' بہت بحث بھی کرتے۔ مگر محبت بہت احتیاط کے ساتھ چھپا کر رکھ لی تھی۔ سب لوگ سمجھتے کہ ہم میں صرف دوستی ہے۔ بہت گہری دوستی' کبھی کبھی ہم سب سے نظر بچا کر سمندر کی طرف نکل جاتے۔ وہ مجھ سے دادا' دادی جان اور ہنی کی باتیں کرتا۔ میں اسے ممی اور پاپا کے بارے میں بتاتی۔ اپنی مصروفیات میں میری توجہ ممی کی طرف سے کافی کم ہوگئی تھی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کب اور کہاں تبدیلی آئی۔ بس ممی ایک دم خاموش سی ہوگئی تھیں اور جب مجھے محسوس ہوا تو میں نے بے اختیار پوچھا۔

"ممی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

وہ پالک کاٹ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

"طبیعت ٹھیک نہ ہوتی تو کیا میں کچن میں کام کر رہی ہوتی۔"

"نہیں' آپ کچھ چپ چپ سی لگتی ہیں۔"

"یونہی سارا دن کام کاج میں لگی رہتی ہوں تو تھکن سی ہوجاتی ہے اور تمہیں بھی تو میری ذرا پروا نہیں ہے کہ تھوڑا سا ہاتھ ہی بٹا دو۔"

صاف لگتا تھا وہ مجھے ٹال رہی ہیں۔ میں نے بے حد حیرت سے انہیں دیکھا۔ آج سے قبل تو ممی ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ یہاں کل تین نفوس کا کام ہی کتنا ہے اور اب ایسی کیا بات ہے جو ان کے وجود میں تھکن بن کر اتر آئی اور شاید میری کھوجتی نگاہوں سے خائف ہوکر انہوں نے مجھے ٹوکا تھا۔

"چائے کا پانی اتنا نہیں ابالتے۔"

"ممی! پاپا کہاں مصروف ہوتے ہیں آج کل؟" میں نے چائے کی پتی پانی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ فریج سے گوشت کا پیکٹ نکالنے لگیں۔

"پتا نہیں۔" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ پھر ہنس دی۔ "ممی! پاپا پانچ منٹ بھی لیٹ ہوجائیں تو آپ کو فون کر دیتے ہیں۔"

"اب نہیں کرتے......" ممی کے سپاٹ لہجے نے میری ہنسی کو بریک لگا دی۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں اور یہ بال کی کھال اتارنا تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔"

انہوں نے جھنجلا کر مجھے ڈانٹا تو میں بہت کچھ پوچھنے کی خواہش دبا کر چائے بنا کر کمرے میں آگئی۔ میں اس وقت ممی کو ارمغان کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی۔ مگر ان کا موڈ دیکھ کر ارادہ بدل دیا اور اپنے کمرے میں آکر پھر سے سوچنے لگی۔ کچھ تھا جو میرے لاشعور سے شعور پر دستک دیتا تھا۔ اک نامعلوم سا احساس' کوئی چھوٹی سی تبدیلی' جیسے آپ دیوار پر لگی پینٹنگ ہٹا دیں۔ یا کارنس پر دھرا بڑا سا گلدان کہیں منتقل کرنے کے بعد کمرے میں داخل ہوں تو اچانک غیر محسوس سی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ ایک ثانیے کو سہی اس جگہ کو دیکھتے ضرور ہیں۔

مگر پینٹنگ بھی اپنی جگہ پر تھی اور گلدان بھی۔ اس کے باوجود مجھے کسی کمی' کہیں خالی پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے بیزاری سے سامنے دھری کتابوں کو دیکھا۔ مجھے نوٹس بنانے تھے اور معاشرے میں بڑھتے ہوئے تشدد کے واقعات پر جواں ادب کیلئے ایک مضمون بھی لکھنا تھا جس کے بارے میں ارمغان نے مجھے ٹھیک ٹھاک اعداد و شمار اکٹھے کر دیئے تھے۔ بس ایک ماہر نفسیات مسز فضہ رحمان سے ملنا باقی تھا اور یہ کام ظاہر ہے کہ مجھے ہی کرنا تھا۔ مگر میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ میں بہت دیر تک یونہی بیٹھی رہی۔ مجھے پاپا کا انتظار تھا۔ پاپا آئے مگر کہیں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ نہ ہی ممی نے ان سے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ چند آوازوں کے بعد اک گہری خاموشی پورے گھر پر چھا گئی تھی اور میرے لئے یہ خاموشی کتنی اجنبی اور نامانوس سی تھی۔ پاپا کے گھر آتے ہی گویا پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی تھیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آئی۔ پاپا سامنے ہی کاؤچ پر بیٹھے اپنی کنپٹی مسل رہے تھے۔

"پاپا! آپ ٹھیک تو ہیں؟" میں گھبرا کر ان کے قریب بیٹھی۔

"ہاں۔" انہوں نے چونک کر ہاتھ ہٹایا۔ پھر مجھے دیکھ کر مسکرا دیئے۔ "کیسی ہو لائبہ جانو!"

"میں تو ٹھیک ہوں مگر آپ......" میں نے تشویش سے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" انہوں نے دھیرے سے میرے گال تھپتھپائے اور بیڈ روم میں چلے گئے اور پتا نہیں کیوں مجھے ان کے انداز میں مخصوص بے ساختگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس سے قبل کہ میں اس بارے میں کچھ اور سوچتی ارمغان کا فون آگیا۔

"سنو! فوراً تیار ہو جاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے تمہارے لئے ڈاکٹر فضہ رحمان سے ٹائم لیا ہے۔ ہمیں اسی وقت ان کے گھر جانا ہے۔"

"تھینک یو ارمغان! میں سوچ ہی رہی تھی کہ......"

"اپنا شکریہ اپنے پاس رکھو۔" وہ جل کر بولا۔ "بس دس منٹ ہیں تمہارے پاس۔" اور میں نے اسے بنا خدا حافظ کہے ریسیور رکھا تھا۔

"ممی! میں ڈاکٹر فضہ رحمان سے ملنے جا رہی ہوں۔ ارمغان مجھے پک کرے گا۔" میں نے کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اطلاع دی۔

"ارمغان کون......؟" انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"میرا کلاس فیلو ہے۔" میں نے بتایا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں تیار ہو کر نیچے آئی تو ارمغان کی گاڑی پارکنگ میں کھڑی تھی۔

"میرا خیال تھا' مجھے تمہارا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"تم میرے بارے میں زیادہ خیال مت کیا کرو۔ میں گزشتہ دس منٹ سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے گاڑی نکالتے ہوئے بتایا تب ہی میری نگاہ پی سی او پر پڑی تو میں اچھل گئی۔

"تم نے یہاں سے فون کیا تھا۔"

اس نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو تم اوپر کیوں نہیں آئے۔ میں تمہیں ممی اور پاپا سے ملواتی۔" مجھے افسوس ہونے لگا۔ ارمغان نے بہت اچھا موقع مس کیا تھا۔

"کیا کہہ کر ملواتیں......؟"

"تم کیا کہلوانا پسند کرتے؟" میں نے برجستہ پوچھا۔

"جو میں کہلوانا پسند کروں گا۔ اس کیلئے مجھ سے زیادہ میرے دادا جان کو تمہارے پاپا سے ملنا چاہئے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' پاپا تمہیں بنا دیکھے پاس کر دیں گے۔" میں نے چڑایا۔

"ہم چیز ہی ایسی ہیں۔" اس نے کالر کھڑا کیا۔

"ہونہہ خوش فہم۔" یونہی ہلکی پھلکی باتوں میں کلینک آ گیا۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو ہم ساحل پر آ گئے اور ہم یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ وہ ساتھ ہوتا تو میں سب کچھ بھول جاتی۔ بس

یہی جی چاہتا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے دور بہت دور نکل جاؤں۔ ہم چپ چاپ ننگے پاؤں چلتے جاتے...... چلتے جاتے اور ہمارے قدموں تلے گیلی ریت لمحوں کی طرح پھیلتی جاتی اور تب ہی وہ اچانک خوفزدہ ہو کر پوچھنے لگتا۔

"لائبہ ساتھ تو نہ چھوڑ جاؤ گی......؟"

اور میں حیرت زدہ سی اس سے پوچھتی۔

"یہ محبت میں بے یقینی کیسی؟"

"کل میں نے اک نظم پڑھی تھی۔ نوشی گیلانی کی۔

وصال رت کی یہ پہلی دستک ہے سرزنش کی

کہ ہجر موسم نے رستے رستے سفر کا آغاز کر دیا ہے

"یہ صرف واہمے ہیں۔" وہ نظم میں نے پوری نہیں ہونے دی ارمغان نے کبھی دعوے نہیں کئے تھے۔ مگر اس شام وہ بار بار اپنی محبت کا یقین دلاتا تھا۔ جینے مرنے کی قسمیں کھاتا تھا۔ مجھے وہ بہت خوش' مگر کچھ خوفزدہ سا لگا اور اسی شام واپس لوٹتے ہوئے میں نے ایک گاڑی کو رکتے دیکھا اور اس میں سے نکلتے لوگ۔

وہ پاپا تھے' وہ میری ہم عمر لڑکیاں اور تین چھوٹے لڑکے اور ایک چالیس پچاس سالہ خاتون' ارمغان گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے اسے روکا نہیں' گھر آ کر ممی سے پاپا کے بارے میں پوچھا۔

"کہیں باہر گئے ہیں۔"

"بتایا بھی نہیں۔"

"نہیں اور تمہیں کیوں اتنی تشویش ہو رہی ہے؟" انہوں نے الٹا مجھ سے پوچھا تو میں خاموش ہو گئی۔

کون ہو سکتے تھے وہ۔ پاپا کے کسی دوست کی فیملی اس صورت میں ان کے دوست کو ساتھ تو ہونا چاہئے تھا۔

میں پاپا سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ وہ خاموش ہو کر ممی کو دیکھنے لگے۔

"تمہارے تایا کی فیملی تھی۔"

"تایا کی فیملی۔" میں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ پھر پاپا کی طرف پلٹی۔

"پاپا! آپ ان سے ملتے ہیں؟"

"کیا نہیں ملنا چاہئے۔" وہ الٹا مجھ ہی سے پوچھنے لگے۔ تو میں سٹپٹا گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ مگر آپ نے چھپایا کیوں؟"

"میں نے نہیں۔ تمہاری ممی نے چھپایا ہوگا۔ کیونکہ شاید رابعہ یہ نہیں چاہتیں کہ میں یا تم ان لوگوں سے ملیں۔"

اف اتنا سنگدل اور کٹھور لہجہ تھا پاپا کا۔ ممی کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ پاپا چلے گئے تھے۔ میں حیرت زدہ تھی۔

"ممی! ٹیک اٹ ایزی۔" میں نے دھیرے سے ان کا ہاتھ دبا کر تسلی دینا چاہی۔

"میں نے تو ایسا کبھی نہیں چاہا لائبہ!" کتنی بے چارگی تھی ان کے لہجے میں۔

"آئی نو ممی! پاپا کب سے ان لوگوں سے مل رہے ہیں؟"

"جب سے ان کے رویے میں تبدیلی آئی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے......؟"

"لائبہ؟ مجھے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں رہا کہ مراد اپنے گھر والوں سے نہ ملیں۔ ناراضی ہماری طرف سے نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرف سے تھی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی یہ جان کر کہ ان لوگوں نے ہمیں معاف کر دیا۔ لیکن اب احساس ہوتا ہے انہوں نے صرف اپنے بیٹے کو معاف کیا ہے، مجھے نہیں۔" وہ بے حد دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم ان سے جا کر ملیں گے تو پاپا کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی کہ آپ نہیں چاہتیں۔"

"تم نے مراد کا رویہ دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ صرف مجھے قصوروار سمجھ رہے ہوں۔"

"ڈونٹ وری ممی! ایوری تھنگ ول بی آل رائٹ۔" مجھے یونیورسٹی سے دیر ہو رہی تھی۔ مگر وہاں جا کر مزید کوفت ہوئی، ارمغان آج آیا ہی نہ تھا۔ سو میں جلد ہی واپس آ گئی تھی اور وہ مزید دو دن نہ آیا تو میں پریشان ہو گئی اور اس سے قبل کہ اس سے خفا بھی ہو جاتی اس کا فون آ گیا تھا۔ ہنی کے والد کا سن کر مجھے واقعی بہت افسوس ہوا تھا۔ میری ارمغان سے مختصر سی بات ہوئی تھی اور اگلے دن پاپا نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"لائبہ! تایا سے ملنے چلو گی؟"

میں نے ممی کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"صرف میں نہیں ممی بھی جائیں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا تو پاپا نے بے یقینی سے ممی کو دیکھا۔

"رئیلی......!"

"اب تو آپ کو مجھ پر اعتبار ہی نہیں رہا مراد۔" ممی نے افسردگی سے کہا تھا۔ وہ جانے کو تیار تو تھیں مگر اس دن انہیں بخار آ گیا۔ میں انہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی مگر انہوں نے مجھے زبردستی بھیج دیا۔

"تمہارے پاپا نے ان لوگوں کو بتا دیا ہوگا، اچھا نہیں لگے گا۔"

وہ اک بہت کھلا اور پرانی طرز کا گھر تھا۔ پاپا بے حد ایکسائیٹڈ تھے۔ مجھے اپنے بچپن کی ہر بات بتا رہے تھے۔ کہاں انہوں نے سائیکل چلانا سیکھی، کہاں وہ گرے تھے۔ اپنے بابا سے ڈانٹ کھا کر وہ کون سے درخت پر چھپا کرتے تھے۔ اس لان میں انہوں نے چھوٹی پھپھو کے ساتھ کئی بیٹ منٹن کے میچ کھیلے تھے اور انہیں ہمیشہ ہرایا تھا۔ میں حیرت زدہ سی سنتی رہی۔ پاپا کو تو کچھ بھی نہ بھولا تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کی ہر بات انہیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھی۔ وہ مجھے سیدھا اپنی امی یعنی میری دادی کے کمرے میں لے گئے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں پاپا کو دیکھ کر جو چمک ابھری تھی، اس کے سامنے ہزاروں ستاروں کی روشنی ماند تھی۔ میں مبہوت سی رہ گئی۔ ان کی بانہیں پھیلیں اور پاپا کا لمبا چوڑا وجود ننھے بچے کی طرح نحیف بازوؤں میں سما گیا۔

دیکھیں اماں لائبہ آئی ہے۔" پاپا نے کہا تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ماشاء اللہ، کتنی بڑی ہو گئی ہے۔" انہوں نے پاس بلا کر مجھے پیار کیا۔ لیکن اس پیار میں وہ بے ساختگی نہیں تھی جو پاپا کیلئے تھی۔ ذرا سی دیر میں تایا جان اور ان کی فیملی آ گئے۔

تایا جان تو بالکل پاپا کی دوسری کاپی تھے۔ تائی مجھے کچھ مغرور سی لگیں۔ انہوں نے مجھے سر تا پا دیکھا۔

"اچھا تو یہ ہے لائبہ، اکلوتی اولاد اور وہ بھی بیٹی چہ...... چہ۔"

مجھے ان کا تبصرہ انتہائی فضول لگا تھا۔ میں نے پاپا کو دیکھا۔ وہ تایا جان کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے شاید سنا ہی نہیں۔

"خیر سے میرے دو بیٹے ہیں۔ اس وقت ٹیوشن پڑھنے گئے ہیں......" پتا نہیں وہ کیا جتانا چاہ رہی تھیں تب ہی جامنی سوٹ میں ملبوس ایک نازک سی لڑکی نے آگے بڑھ کر انہیں ٹوکا۔

"ممی! پلیز۔" پھر مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "میں ماہا ہوں اور یہ ماہ نور ہم دونوں تمہاری کزنز ہیں۔" وہ بہت پیاری ہنس مکھ سی لڑکیاں تھیں۔

"تمہارے بیوی نہیں آئی مراد۔" دادی جان نے پوچھا تھا۔

"اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔" پاپا نے بتایا تو تائی جان طنزاً مسکرائیں۔

"اس کی طبیعت تو اب خراب ہو گی ہی۔ اس کی ساری کوششوں پر پانی جو پھر گیا۔" ان کا

تبصرہ خاصا سنگ دلانہ تھا۔ مجھے برا لگا تو بول اٹھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے تائی جان! ممی تو خود جا رہی تھیں۔ مگر انہیں بخار تھا اور چکر بھی آ رہے تھے۔''

''سب سسرال والوں سے نہ ملنے کے بہانے ہیں بیٹا۔'' دادی جان کی بات پر مجھے حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔ ماہا مجھے وہاں سے نہ لے جاتی تو شاید میں کچھ بول ہی دیتی۔ تو یہ ہے پاپا کے رویے میں تبدیلی کی وجہ۔ انہیں ممی سے بدظن کیا جا رہا تھا۔ مگر کیوں؟ اتنے عرصے کے بعد وہ لوگ ان دونوں میں دوری پیدا کر کے وہ کون سے بدلے لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سارے قصے میں پاپا کا قصور تو کچھ زیادہ نکلتا تھا۔ اگر ممی نے انہیں بہکایا تو وہ اک باشعور اور سمجھدار انسان تھے۔ انہوں نے کیوں نہ اپنے والدین کی مرضی شامل کی۔ مگر مجھے لگا خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں پاپا بھی سارا الزام ممی پر رکھنے میں مصروف ہیں اور میرے لیے ان کا یہ روپ خاصا تکلیف دہ تھا۔ میں آتے ہوئے جتنی ایکسائیٹڈ تھی جاتے ہوئے اتنی ہی افسردہ تھی۔

''کیسے لگے تمہیں سب لوگ؟'' پاپا ساری محبتوں کو پا کر بہت سرشار تھے۔

''اچھے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا اور یہ پہلی بار تھا کہ انہوں نے میرے لہجے پر غور نہیں کیا اور مطمئن ہو گئے۔ میں ممی سے کچھ نہ چھپا پائی تھی۔ سب کچھ بتا دیا۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا۔ تمہارے پاپا کا رویہ اس بات کا ثبوت تھا۔'' وہ کتنی دکھی ہو گئی تھیں۔ پاپا تو جیسے ہمیں بھولنے ہی لگے تھے۔ اکثر ہی رات کو دیر سے گھر آتے' کھانا بھی وہیں کھاتے۔ نجانے کیوں وہ بیلنس نہیں رکھ پائے نہ تب اور نہ اب۔

یہ مسئلے اپنی جگہ تھے اور یونیورسٹی کی اپنی زندگی۔ اگلے دن ارمغان آیا تو میں نے اس سے بے تابی سے پوچھا۔

''ہنی کیسی ہے؟''

''کیسی ہو سکتی ہے۔'' وہ کچھ سنجیدہ نظر آیا۔

''ہاں حادثہ بھی تو اتنا بڑا ہے۔''

''ایک دم چپ ہو گئی ہے۔'' کتنا فکرمند تھا وہ اس کیلئے گویا اس کا بس نہ چلتا ہو کہ کہاں سے ایسی کوئی خوشی ڈھونڈ لائے جو ہنی کے لبوں پر ہنسی کھلا دے۔

''تم اس کا خیال رکھا کرو۔'' مجھے کیا معلوم تھا اسے یہ ڈیوٹی مستقل طور پر سونپ دی جائے گی۔

''کوشش تو بہت کرتا ہوں۔ مگر ابھی نیا نیا صدمہ ہے۔''

''کسی دن اسے لے کر ہمارے گھر آؤ نا۔''

''تمہارے ہاں۔'' وہ چونکا۔

''ہاں' رات کو میں نے ممی کو تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔''

''ہوں۔'' وہ نجانے کس سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

''تو پھر لاؤ گے۔ شاید وہ اسی طرح بہل جائے۔''

''ہاں دیکھوں گا۔''

مگر اسی رات گھر میں جھگڑا ہو گیا تھا' ممی اور پاپا کا پہلا جھگڑا۔ جس نے میری زندگی اور سوچوں کا رخ بدل دیا۔ شادی کے پچیس برس کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہ شادی ان کی جذباتی غلطی تھی۔ وہ ایک ''محبت'' خاموش' غم زدہ و پژمردہ ایک کونے میں پڑی اپنی حرماں نصیبی پر بین کرتی رہی اور وہ ڈھیروں ''محبتیں'' اس پر غالب آ گئیں۔

اف پاپا کی وہ آواز اور ممی کا سپید پڑتا چہرہ۔

''اگر تمہیں محبت ہوتی شہلا مراد تو تم مجھے کبھی میرے والدین سے الگ نہ کرتیں۔''

جو ساری کشتیاں جلا کر نکلیں تو ان کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے؟

کیا ہاتھ آیا اک عمر کی سیاحی کے بعد۔

اک الزام' محض اک شک۔

محبت تو کل بھی فاتح تھی اور آج بھی فاتح ہی رہی۔

تو پھر ہارا کون؟

اور پھر تقدیر نے دوسرا وار کیا۔

کھلتے پھولوں کی آہٹوں کو ساعتوں میں پروتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''ہم وہاں ملیں گے جہاں کوئی نہ ہو اور جہاں سورج اپنے آخری قدم دھرتا ہے۔''

محبت پھر امتحان میں تھی۔

مجھے اپنی محبت کو بچانا تھا اور میں محبتوں کو ہارتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی تو تمہارے گرد دعاؤں کا حصار باندھتی تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں پر شام کی لالی باندھ لی۔

میں شام کا کنارہ نہیں۔

تم سورج کی لالی نہیں۔

ہم ان دونوں کے بیچ حد فاصل ہے۔

اس فصیل کائنات کو عبور کر تو لیتی لیکن......

اس کے عقب میں سورج طلوع نہ ہوتا تو؟

اک خوف سا من میں ڈولتا تھا کہ اعتبار کی ڈوری ہاتھوں سے پھسل رہی تھی۔

یہ خوف میری آخری حد تھا کہ اس کے بعد مرگ صفت سناٹا اس کائنات کی گود میں سسکتا ہے۔

(اس کے عنابی لبوں کی گھنی مسکراہٹ میں طنز کا زہر کیوں اترا تھا)

اے ابن آدم! حوا کی بیٹی کا دکھ جان سکو تو کیونکر۔

وہ محبتوں سے گندھی مورت ہے اور تم اسے محبت کرنا سکھاؤ گے؟

یہی وہ مقام ہے جہاں طنز اس کے ہونٹوں سے اتر کر میرے ہونٹوں پر جم جاتا ہے۔)

''محبت......؟''

ازل سے اس دل کا انتساب ہے

اور تم اس کے معنی پوچھتے ہو۔

تم نے محبت کو وجود میں دیکھا۔

میں نے روح کو بالشتوں میں ناپا ہے

اور تم کہتے ہو میں تمہیں وہاں ملوں جہاں سورج کے آخری قدم......؟

آخری قدم کے بعد جانتے ہو کیا ہے؟

شام کا کنارہ

رات کی تاریکی

محبت کا مفہوم تم کیا جانو

یہ طلوع ہے غروب نہیں

ہاں یہ مضبوطی ہے کمزوری نہیں

مگر مجھے کسی ایک نہیں ان ساری محبتوں کی مضبوطی درکار ہے۔ جو تمہارے گرد دعاؤں کا حصار باندھتی ہیں۔

* * *

دروازہ لائبہ کی ممی نے کھولا تھا۔ اسے دیکھ کر چونک گئیں۔

''تم......!'' ارمغان نے اضطراری انداز میں دروازے پر ہاتھ رکھا۔

''مجھے لائبہ سے کچھ بات کرنی ہے۔ بس اپنے ایک سوال کا جواب اس پر قرض ہے میرا۔''

''اندر آ جاؤ۔'' انہوں نے راستہ دیا۔ وہ ان کے پیچھے اندر چلا آیا۔ سارا فلیٹ بے ترتیبی کا شکار تھا۔ سارا سامان الٹ پلٹ تھا۔

''آپ لوگ کہیں جا رہے ہیں؟''

''میں جا رہی ہوں۔'' انہوں نے رسانیت سے بتایا تو وہ چونک گیا۔

''کہاں......؟''

''اپنے شوہر کے پاس' انہوں نے بلایا ہے مجھے۔''

''لائبہ......؟'' ارمغان نے پوچھنا چاہا وہ اس کی بات کاٹ کر پوچھنے لگیں۔

''چائے بناؤں تمہارے لئے۔''

''نہیں......ہنی گاڑی میں میرا انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے منع کیا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولیں۔

''میں لائبہ کو بھیجتی ہوں۔''

وہ چلی گئیں تو ارمغان ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اسے یہاں نہیں آنا تھا۔ آج ہنی کا آخری پیپر تھا۔ وہ اسے پک کر کے واپس لوٹا تو بلا ارادہ ہی گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا تھا۔

''مجھے معلوم تھا' تم آج آؤ گے۔'' اس کی پشت سے آواز ابھری۔ ارمغان کھڑا ہو کر پلٹا۔ سفید نیٹ کے ڈریس میں سارے بالوں کو سمیٹے وہ مبہم سا مسکرا رہی تھی۔

''بیٹھو۔''

''مجھے بیٹھنا نہیں ہے لائبہ!'' اس کے لہجے کی سنجیدگی پر لائبہ خاموش سی ہو گئی۔ پھر اس کے قریب سے نکل کر سامنے والی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے ہاتھوں میں سفید جلد والی ڈائری تھی۔

''ہنی کیسی ہے؟''

''اچھی ہے......؟''

''ہاں' وہ تو ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ ارمغان منتظر سا اسے دیکھتا رہا۔ لائبہ کی ممی نے ایک بیگ لا کر صوفے کے قریب رکھا۔

''میں' میں وسیم سے شادی کر رہی ہوں۔'' لائبہ نے بیگ پر نظریں جماتے ہوئے آہستگی سے بتایا۔ ارمغان کے اندر سناٹے سے اتر آئے۔

''ہاں' تم میرے علاوہ کسی سے بھی شادی کر سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ' پچھتاوا اور دکھ مترشح تھا۔ لائبہ نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر اسے دیکھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''چلتا ہوں۔''

''اپنے کسی سوال کا جواب نہیں لو گے۔''

''ہر سوال کا جواب تو مل گیا۔'' وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوا۔

''کسی سوال کا جواب نہیں ملا ارمغان! جلد بازی مت کیا کرو۔'' وہ چند قدم چل کر اس کے سامنے آئی۔ کچھ لمحے اس کی بے تاب نگاہیں ارمغان کے چہرے پر بھٹکتی رہیں اور وہ ان نم آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ کتنے خوبصورت لمحے' کتنی محبتیں' کتنی چاہتیں اور بے تابیاں ان نگاہوں میں پنہاں تھیں۔

''ایسا کیوں کیا تم نے۔'' وہ کتنا بے تاب ہو کر مگر ہارے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ لائبہ کا دل چاہا ایک بار تو اس کے شانے پر سر رکھ کر سارے آنسو بہا دے۔ اس سے قبل کہ نوک مژگاں پر مچلتا قطرہ آب اس کے سارے ضبط توڑ دیتا۔ اس نے آہستگی سے چہرہ جھکا دیا۔

کچھ آنسو بہت سنبھال کر رکھنے پڑتے ہیں۔ اس نے بھی پلکیں جھپک کر اس آنسو کو دل کے کسی کونے میں گرا دیا۔ آواز بہت زور سے آئی تھی۔ قیامت کا شور ہوا۔ پھر چار سو ہو کا عالم تھا۔

''یہ ڈائری......'' اس نے سیاہ جلد والی ڈائری اس کی سمت بڑھائی۔ ''پڑھ لینا' سارے جواب مل جائیں گے۔'' اس کے حلق میں پھندا سا پڑا۔ پھر بھی سب جرم میرے نکلے تو معاف کر دینے کا حوصلہ پیدا کرنا کہ مجھے بددعاؤں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

ارمغان نے تنویمی کیفیت میں ڈائری پکڑ لی۔

''جاؤ ہنی انتظار کر رہی ہو گی۔'' وہ رخ بدل گئی۔

''لائبہ......!''

''کچھ نہ کہو تو بہتر ہے۔'' لائبہ کے ایک ہی جملے نے اس کے سارے الفاظ منجمد کر دیئے۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹا۔ لائبہ کی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں نے اسے ساکت سا کر دیا تھا جو پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔

''ہاں ارمغان! تمہیں کسی اور کو سونپ دینا اتنا بھی آسان نہ تھا۔''

ہنی اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا تھا۔ گاڑی سٹارٹ کرنا چاہی مگر رہا نہ گیا تو ڈائری کھول لی۔

''پہلا صفحہ' دوسرا' تیسرا' یکے بعد دیگرے وہ صفحے پر صفحہ پلٹتا چلا گیا۔ ہر چیز ساکن تھی۔ بس لفظ بول رہے تھے۔ تصویریں بنا رہے تھے۔ منظر دکھاتے تھے' وہ اور سارے منظر جواب تھے' اس کے اندر اڑتی بدگمانیوں کی گرد بیٹھنے لگی۔

پھر اس کی نگاہ آخری صفحے پر جم گئی۔

اور لائبہ مراد نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہ نظم خود اپنے ہاتھوں مکمل کرے گی۔

وصال رت کی یہ پہلی دستک ہی سرزنش ہے
کہ ہجر موسم نے رستے رستے سفر کا آغاز کر دیا ہے
تمہارے ہاتوں کا لمس جب بھی میری وفا کی ہتھیلیوں پر حنا بنے گا
تو سوچ لوں گی
رفاقتوں کا سنہرا سورج غروب کے امتحان میں ہے
ہمارے باغوں سے گر' کبھی تتلیوں کی خوشبو گزر نہ پائے تو یہ نہ کہنا
کہ تتلیوں نے گلاب رستے بدل لئے ہیں
اگر کوئی شام یوں بھی آئے کہ جس میں ہم تم لگیں پرائے
تو جان لینا
کہ شام بے بس تھی شب کی تاریکیوں کے ہاتھوں تمہاری خواہش کی مٹھیاں بے دھیانوں میں کبھی کھلیں تو یقین کرنا
کہ میری چاہت کے جگنوؤں نے
تمہارے ہاتھوں کے لمس تازہ کی خواہشوں میں
بڑے گھنیرے اندھیرے کاٹے
مگر یہ خدشے یہ وسوسے تو تکلفاً ہیں
جو بے ارادہ سفر پہ نکلیں
تو یہ تو ہوتا ہے' یہ تو ہو گا
ہم اپنے جذبوں کو منجمد رائیگانیوں کے سپرد کر کے یہ سوچ لیں گے
کہ ہجر موسم تو وصل کی پہلی شام سے ہی
سفر کا آغاز کر چکا تھا۔

''یہ سچ کہ ہم نے گلاب رستے بدل لئے ہیں۔ مگر کانٹوں کا سفر یہ بھی نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد تھا' تمہاری محبت پر بھی یقین تھا۔ مگر ایک اعتبار ان محبتوں پر بھی تھا جو تمہیں پر امید نگاہوں سے تکتی تھیں کہ یہ محبتیں کبھی نہ کبھی تم سے اپنا آپ منوائیں گی۔ تم انہیں اپنے اندر سے کھرچ نہیں سکتے' یہ جب تمہیں ہراتیں تو تم میری محبت کو پچھتاوے کے ترازو میں تولنے لگتے اور تب تمہارا یہ جملہ مجھے مار دیتا۔

''اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو مجھے اپنوں سے کبھی الگ نہ کرتیں لائبہ مراد۔''

شاید میں تب بھی انکار نہ کرتی۔ مگر وہ جو تمہارے لوگ ہیں۔ میرے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں التجا دیکھی' ان کے ہونٹوں پر پلتی پکار سنی اور وہ تو ہنی وہ اتنی معصوم ہے کہ اسے دکھ دینے والا کبھی خوش نہ رہتا۔ میں نے انہیں ان کا مان لوٹا دیا' ہماری محبت ان سے زیادہ قیمتی تو نہ تھی۔ آج تمہیں میرا فیصلہ عجیب لگے گا مگر ارمغان! یہ محبتیں ہم پر قرض ہوتی ہیں اور یہ قرض لوٹانے ہیں۔ مجھے بھی اور تمہیں بھی۔

کوشش کرنا لائبہ کو بھول جاؤ۔

ارمغان گم صم سا بیٹھا رہا۔ ہنی چونک کر جاگی۔

''کیا مان؟''

''کچھ نہیں' گھر چلتے ہیں۔'' ارمغان نے گاڑی سٹارٹ کی اور ڈائری کے اوراق پھاڑ کر ہواؤں کے سپرد کرتے ہوئے سوچا تھا۔

''میں تمہیں کسی مقدس راز کی طرح دل میں چھپا کر رکھوں گا لائبہ مراد! کبھی بھولوں گا نہیں کہ تم سے میں نے محبت کرنا سیکھا ہے۔''

(تمت بالخیر)